مولانا سید مناظر احسن گیلانی

ادارہ ادبیات دلی

مقالاتِ احسانی

تصوف و احسان کے موضوع پر چند ایمان افروز اور روح پرور مضامین کا نادر مجموعہ

از

مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ

ناشر

ادارہ مجلس علمی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طبع دوم ——— ۱۳۹۹ھ

تعداد ——— ایک ہزار ایک سو

قیمت ——— ۳۶/- روپے

ملنے کے پتے

۱۔ المکتبۃ البنوریہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی ۵

۲۔ مکتبہ رحمانیہ ۱۸۔ اردو بازار لاہور

۳۔ یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

۴۔ ملک برادرز، کارخانہ بازار فیصل آباد

۵۔ ذوالنورین اکادمی، بھیرہ ضلع سرگودھا

پرنٹر محمد شریف، طفیل آرٹ پرنٹرز ۱۸۷۔ سرکلر روڈ لاہور

فہرست مقالاتِ احسانی

عرضِ ناشر

مقالاتِ احسانی کے نام سے یہ جو جلیل القدر کتاب قارئین کرام کے سامنے ہے یہ دراصل تصوّف و احسان پر چند روح پرور مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے نے تحریر فرمائے اور ان کا بیشتر حصہ متفرق علمی ماہناموں میں شائع بھی ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ تصوّف و احسان کے موضوع پر بھی اردو زبان میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بکثرت مضامین کے علاوہ سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اس کتاب میں موضوع کے جن پہلوؤں پر جس خاص انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے شاید کسی دوسری کتاب میں نہ مل سکے اور بعض بحثیں تو اس کتاب میں بالکل نئی ہیں مثلاً تصوّف کی عام کتابوں کے برعکس اس کتاب میں اطلاقی تصوّف کے عنوان سے ایک بحث ہے جس میں یہ ثابت اور واضح کیا گیا ہے کہ وہ روحانی کیفیت جس کو قرآن و حدیث میں لفظ احسان سے تعبیر کیا گیا ہے غالباً اس لیے کہ اس سے اسلامی زندگی میں ایک طرح کا حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔ اس احسانی کیفیت کا حصول صرف اُن اعمال و اشغال ہی پر موقوف اور منحصر نہیں جو فنِ تصوّف کی متداول کتابوں میں اصحابِ سلاسل کی نسبت سے مذکور ہیں بلکہ وہ ان کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی ہے، لہٰذا یہ خیال غلط ہے کہ جب تک کوئی مسلمان ائمۂ تصوّف کے تجویز کردہ مشہور طریقوں میں سے کسی طریقہ کو اختیار نہ کرے اُسے درجۂ احسان حاصل نہیں ہو سکتا۔ مولینا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں متعدد شہادتیں پیش فرمائی ہیں اور اگر وہ اجمالی طور پر صرف ایک ہی شہادت پیش فرما دیتے تو ثبوتِ مدعا کے لیے کافی تھی، اور وہ یہ کہ خیر القرون کے مسلمان فنِ تصوّف کے ان مخصوص طریقوں کو جانتے بھی نہ تھے، لیکن اس کے باوجود ان کو محض شرعی احکام کی پابندی سے احسان کا وہ بلند مرتبہ حاصل ہوا جس کا بعد والے تصوّر بھی نہیں کر سکتے، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "سمعات" میں ایک جگہ لکھا ہے (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے زمانے میں چند نسلوں تک اہلِ کمال کی توجہ زیادہ تر شریعت کے ظاہری

اعمال کی طرف رہی اور ان لوگوں کو باطنی زندگی کے جملہ مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل ہی میں حاصل ہو جاتے تھے چنانچہ ان بزرگوں کا احسان یعنی حاصل تصوّف یہ تھا کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے، ذکر و تلاوت کرتے تھے، روزے رکھتے تھے، حج کرتے تھے، صدقہ و زکوٰۃ دیتے تھے اور جہاد کرتے تھے ان میں سے کوئی ایسا نہ ہوتا جو سر نیچے کیے بحرِ تفکر میں غرق نظر آتا۔ یہ بزرگ خدا تعالیٰ سے قرب و حضوری کی نسبت اعمال شریعت اور ذکر و اذکار کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل کرنے کی سعی نہ کرتے[1] فرق صرف یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک جو چیز صرف خیر القرون تک محدود ہے۔ مولینا گیلانی کے نزدیک وہ محدود نہیں بلکہ عام ہے اور ہر زمانے میں ممکن ہے البتہ خاص فطری استعداد اور افتادِ طبع کا اس میں ضرور دخل ہے، اس بحث سے حضرت مولینا گیلانی کا مقصد تصوّف کو ناکارہ قرار دینا نہیں بلکہ اس غلط خیال کی اصلاح کرنا ہے جو تصوّف کی حقیقت اور حیثیت کے متعلق عموماً ذہنوں پر چھایا ہوا ہے اور نیز واضح کرنا ہے کہ جو مسلمان صحیح العقیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ شرعی اوامر و نواہی کے پوری طرح پابند ہیں اُن کو محض اس وجہ سے کمتر سمجھنا گمراہی ہے کہ وہ تصوّف کے مشہور سلاسل میں سے کسی کے ساتھ وابستہ نہیں اور ان کی زندگی صوفیانہ اعمال و اشغال اور ریاضتوں اور مجاہدوں سے عاری ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض کو احسان کا وہ بلند درجہ حاصل ہو جو ایک بڑے سے بڑے صاحبِ ریاضت و مجاہدہ صوفی کو بھی نصیب نہ ہو۔ کتاب کے دوسرے حصّہ میں جس کا نام مجالسِ الشیخین ہے، صوفیانہ حقائق و معارف کی دو عظیم الشان کتابوں یعنی فتوحاتِ مکیّہ اور مثنوی رومی کے بعض مقامات کی نہایت عارفانہ اور مؤثر انداز میں توضیح و تشریح کی گئی ہے جسے پڑھ کر واقعی ایمان تازہ ہوتا اور روح کو سکون و اطمینان ملتا ہے۔

غرضیکہ ان مضامین کی اعلیٰ علمی حیثیت اور غیر معمولی افادیت کا تقاضا تھا کہ ان کو ایک مستقل کتاب کی شکل میں شائع کیا جاتا، الحمدللہ کہ یہ سعادت ادارہ مجلسِ علمی کے حصّہ میں آئی جس کا مقصدِ وجود ہی ایسی کتابوں کو محض علمی و دینی خدمت کے نقطۂ نظر سے شائع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجلسِ علمی کی اس خدمت کو حُسنِ قبول سے نوازے اور اصحابِ ادارہ کو دونوں جہان میں اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

امید ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ایک طرف تصوّف کے متعلق صحیح اسلامی زاویۂ نگاہ سامنے

---

[1] "ہمعات" اردو ترجمہ از پروفیسر محمد سرور

ناسپاس گزاری ہوگی اگر ہم اس موقعہ پر اپنے محترم دوست جناب مولانا غلام محمد صاحب (بی اے عثمانیہ) اور محترم جناب سید ازہر شاہ صاحب قیصر مدیر ماہنامہ دار العلوم کا شکریہ ادا نہ کریں جنھوں نے ازراہ کرم ہمارے لیے اس کتاب کا مواد بہم پہنچایا، حقیقت یہ ہے کہ اگر ان حضرات کا مخلصانہ تعاون ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو ہم ہرگز اس کتاب کو پیش نہ کر سکتے، خصوصیت کے ساتھ ہمارے شکریے کے بہت زیادہ مستحق جناب مولانا غلام محمد صاحب مدظلہم ہیں، جنھوں نے نہ صرف یہ کہ اس کتاب کا مواد فراہم کرنے میں بہت کچھ زحمت گوارا فرمائی بلکہ اس کی ترتیب، تبویب اور عنوان بندی وغیرہ کا پورا کام بھی کافی توجہ اور محنت کے ساتھ سرانجام دیا، جزاهم الله احسن الجزاء۔

"ادارہ"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرۂ احسن

(یعنی حضرت مولینا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سوانح حیات)

سادات کا ایک کنبہ آج سے تقریباً دو صدی قبل عرب سے نکل کر ایران اور ایران سے گزر کر ہندوستان پہنچا اور صوبہ بہار کی زمین کو ان کے قدم نے پُر بہار کر دیا۔[1] اسی قبیلہ کی ایک شاخ نے ضلع پٹنہ میں ایک مختصر سی بستی گیلانی کے نام سے بسائی۔ یہ حضرت مولانا سید مناظر احسن رح کے اجداد تھے۔[2]

وطن

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۹۲ء میں بمقام گیلانی پیدا ہوئے، وہ قصبۂ گیلانی جو برسہا برس گمنام رہا اور آج بھی وہاں ڈاکخانہ تک موجود نہیں، مولانا کا مولد و مدفن بنکر اب شہرت اور تاریخی حیثیت حاصل کر گیا ہے۔ مولانا اپنے نام کے ساتھ لفظ گیلانی سے اسی وطنی نسبت کا اظہار فرماتے ہے جس پر بہت سوں کو نسبت باطنی (یعنی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ سے نسبت) کے اظہار کا گمان ہوتا رہا جو صحیح نہ تھا۔ گو مولانا اس نسبت قادریہ کے بھی باضابطہ حاملین میں سے تھے۔

ابتدائی ماحول

مولانا نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اسمیں فارغ البالی اور علم پروری ہم آغوش تھی۔ آپ کے والد ماجد ابوالخیر صاحب تو زیادہ تر زمینداری میں مشغول رہے مگر مولانا ابونصر جو حقیقی چچا تھے علم و فضل اور شعر و سخن میں ایک مقام رکھتے تھے! اور جد امجد مولانا سید محمد احسن رح تو اس اطراف کے جید عالم مشہور تھے۔

تعلیم

مولانا کی ابتدائی تعلیم اپنے چچا ہی کے زیر نگرانی ہوئی۔ پھر وہ ٹونک بھیج دیئے گئے جہاں تقریباً نو برس تک امام معقولات مولینا حکیم برکات احمد[3] ٹونکی کے حلقہ درس میں شامل رہے

---

[1] یہ روایت میں نے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رح سے سنی ہے۔

[2] حضرت گیلانی رح مجھ سے فرماتے تھے کہ "ہمارا خاندان اور سید صاحب کا خاندان ایک ہی سلسلہ کی دو شاخیں ہیں۔"

[3] حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا گیلانی کے دادا پیر حضرت شاہ کمال اللہ المعروف بہ "مچھلی والے شاہ صاحب" قدس سرہٗ مقیم حیدرآباد دکن سے بیعت تھے اور توحید وجودی کی خاص نسبت کے حامل تھے، وحدۃ الوجود پر ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا۔

اور استاذ کی نظر میں امتیازی مقام حاصل کر لیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ اجمیر میں قیام فرمایا جہاں حکیم صاحب موصوف ہی کے شاگرد خاص مولانا معین الدین اجمیریؒ سے بھی مذاکراتی استفادہ فرمایا۔ اور ان کے کمال کے اس قدر معترف ہوئے کہ ان کو بھی اپنا استاذ ہی سمجھتے رہے۔

اس کے بعد منقولات کی تکمیل کے لیے مولانا دارالعلوم دیوبند پہنچے اور یہاں سے دو سال میں سند فراغ حاصل فرمائی[1] یہاں مولانا کو ان اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل رہا جن پر مدرسہ کی عظمت ختم تھی یعنی شیخ الہند مولینا محمود الحسنؒ علامہ انور شاہ کشمیریؒ وغیرہ

قیام دیوبند

ٹونک کی طرح دارالعلوم دیوبند میں بھی مولانا اپنی ذہانت اور شوق مطالعہ کی وجہ سے اساتذہ کے منظور نظر بن گئے تھے اور جوں ہی فارغ التحصیل ہوئے مسند درس ان کو عطا کی گئی اور دارالعلوم کے رسالہ القاسم کی ادارت بھی ان کے سپرد کر دی گئی۔ جو وہاں کا بڑا اعزاز تھا۔ مولینا ان دونوں حیثیتوں میں کامیاب رہے اور اہل نظر سے داد حاصل کی۔

قیام حیدر آباد اور جامعہ عثمانیہ سے تعلق

دیوبند میں شاید دو برس رہنے پائے تھے کہ جامعہ عثمانیہ نے ان کو اپنی طرف کھینچا جہاں پہنچ کر مولانا کے امتیازی جوہر خوب کھلے۔

بات یہ ہوئی کہ ان دنوں جامعہ عثمانیہ کی روز افزوں وسعت و ترقی کے ساتھ شعبۂ دینیات میں ایک ٹھوس عالم کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، اتفاقاً ۱۹۱۹ء میں مولانا گیلانی کا حیدر آباد آنا ہوا اور یہاں علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی ملاقات ہوگئی، علامہ فراہیؒ اس جوہر قابل کو پہچان گئے، مولانا سے خواہش کی کہ وہ جامعہ میں لیکچرری کے لیے درخواست دیں، مگر دیوبند سے مولینا کو اس قدر انس ہو گیا تھا کہ اس مشورہ کی تکمیل میں ان کو تامل ہی رہا۔ لیکن جب خود حضرات دیوبند نے اس مشورہ کی تائید فرمائی تو مولانا کو اس کی تعمیل کرنی پڑی اور ۱۹۲۰ء میں بحیثیت لیکچرر "دینیات لازم" جامعہ عثمانیہ سے متعلق ہوگئے پھر کچھ عرصہ بعد شعبۂ دینیات میں منتقل کیے گئے اور ریڈر بنے، پروفیسر ہوئے اور بالآخر اس شعبہ کی صدارت کو کئی سال تک زینت بخش کر ۱۹۴۹ء میں ریٹائر ہو گئے۔ وہ شعبۂ دینیات کی جان تھے اور شعبۂ دینیات

---

[1] اس کی کچھ تفصیل خود مولانا کے قلم سے "سوانح قاسمی" کی جلد اول میں آگئی ہے۔

ان کا مجسم ارمان۔

مولانا گیلانیؒ کی دقت فکر، وسعت نظر، علوم دینی میں ان کا تبحر اور مسائل حاضرہ پر ان کی دسترس ان کی علمی دیانت اور مجتہدانہ جرأت، ان کی بے لوث خدمت اور جامعہ سے ان کی شیفتگی نے ان کی شخصیت کو ہر دور کے طلباء اور ہر شعبہ کے اساتذہ میں وہ عظمت و محبوبیت عطا کر دی تھی جو ان سے پہلے یا بعد کسی کو نہ مل سکی۔ ع "یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا"

واپسیٔ وطن

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وقعت یونیورسٹی سینٹ کی نظروں میں ایسی تھی کہ وہ ضابطہ کی میعاد ختم کرنے پر بھی اپنی خدمت سے سبکدوش نہ ہو سکتے تھے اور خود مولانا کو بھی جامعہ اور حیدرآباد سے گوناگوں وجوہ کی بناء پر اس درجہ الفت ہوگئی تھی کہ سرکاری تعلق ختم ہونے پر بھی وہ حیدرآباد سے مفارقت کا ارادہ نہ رکھتے تھے لیکن سقوط حیدرآباد نے دنیا ہی بدل ڈالی۔ نیا اقتدار اپنی اندھی عصبیت میں شعبۂ دینیات کو برداشت نہ کر سکا، اس شعبہ کو فوراً ختم کر دیا گیا اور دنیا کی آنکھ میں خاک جھونکنے کے لیے نئے غیر دینی نصاب کے ساتھ ایک "شعبۂ اسلامیات" قائم کیا گیا۔ اس صورت حال سے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ کسی غیر کو کیا ہو سکتا ہے لاچار ملازمت کے دن پورے ہوتے ہی افسردہ و شکستہ اپنے مولد گیلانی لوٹ گئے مگر جو زخم دل نے کھایا تھا وہ ناسور بنتا چلا گیا۔ اس کا اندازہ مولانا کے ان گرامی ناموں سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے شاگردوں اور معتقدوں کو لکھے ہیں مثلاً خود مجھ ہی کو کس دردانگیز پیرایہ میں زمانۂ سابق کی یاد دلائی ہے لفظ لفظ سے مولانا کا قلبی تاثر اور جامعہ اور حیدرآباد سے جدائی کا رنج عیاں ہے۔

> "حیدرآباد! آہ حیدرآباد! اسی سرزمین میں آپ بھی پلے پوسے گئے لکھائے گئے پڑھائے گئے اور یہ کور نصیب گو حیدرآباد میں پیدا تو نہیں ہوا لیکن میرے جسم میں بھی جو کچھ ہے حیدرآباد ہی کا ہے، اب بھی حیدرآباد ہی میرے سد رمق کا ذریعہ ہے۔ پھر اپنی محبوب تعلیم گاہ ہماری جامعہ عثمانیہ جس میں میرے دماغ نے دل نے آنکھیں کھولیں اسی کے ماحول میں میری پرورش بھی ہوئی اور آپ کی بھی"

سفر آخرت

وطن کی قصباتی غیر علمی زندگی مولانا کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی، بارہا تحریر

فرمایا ہے اور جگہ جگہ اس کا اظہار کیا ہے کہ

"آج کل ایک گاؤں اور وہ بھی ایسے گاؤں میں آکر مقیم ہو گیا ہوں کہ جہاں شریف مسلمانوں کے صرف ۲ خاندان باقی رہ گئے ہیں۔ ان کے سوا عام ہنود اور عام طبقہ کے کچھ مسلمان ہیں۔ ان سے کسی قسم کی ایمانی گفتگو کا موقع ہی نہیں ملتا نہ سننے کا نہ سنانے کا۔

غرض دل کا سکون یوں ہی رخصت تھا کہ ایسے میں ایک روز گھر بھی لٹ گیا۔ ادھر مولانا کے اکلوتے فرزند جو پاکستان میں مقیم تھے اور ان کی طرف سے بھی ان کو کچھ اطمینان حاصل نہ تھا، غرض ضعیفی میں طرح طرح کے مصائب جھیلنے پڑے اور اس یقین سے جھیل لیے گئے کہ یہ اخروی راحتوں اور دائمی مسرتوں کا پیش خیمہ ہیں مگر صبر کے گھونٹ کی تلخی کا طبعی اثر بہر حال ہو کر رہا۔ ۱۹۵۳ء کے اواخر سے قلبی دورے پڑنے لگے تنفس کی شکایت پہلے ہی سے چلی آرہی تھی، اب ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے کی قطعی ممانعت کر دی اور یہی پرہیز مولانا کے لیے سخت ترین امتحان تھا چنانچہ وہ اس میں پورے نہ اتر سکے جتنا کچھ موقع مل گیا اور طاقت و ہمت ساتھ دے گئی اس میں ایک طول وطویل تصنیف "سوانح قاسمی" مرتب فرما دی۔ کچھ مضامین تصوف کے مختلف موضوعات پر تحریر فرمائے۔ اور تقریباً تین سالہ علالت کے بعد ۵ جون ۱۹۵۶ء والی شب کو ہشاش بشاش بستر خواب پر لیٹ کر چپ چاپ "دار السرور" کو سدھار گئے۔ اور اس خاموشی سے رخصت ہو گئے کہ پاس ہی چارپائی لگائے مولانا کے چہیتے بھائی مکارم احسن صاحب لیٹے تھے مگر وہ بھی اس کوچ کی آہٹ تک نہ پا سکے اور صبح جب انہوں نے اپنے محبوب بھائی کو جگانا چاہا تو خود اپنی غفلت پر کف افسوس مل کر رہ گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ؁

کرامت مرگ حضرت گیلانی کی حسّی کرامات زندگی میں خواہ نہ دیکھی گئی ہوں مگر اس عالم ناسوت سے جاتے ہوئے انہوں نے عقیدت کے ماروں اور روحانیت کے بے خبروں کے لیے عجیب کرشمہ دکھایا، مکارم احسن صاحب کا بیان[1] ہے کہ مرض الموت میں اکثر یہ

---

[1] صدق جدید مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۶ء۔

فرماتے تھے کہ جنّت میں کوئی بوڑھا نہ جائے گا۔ ہر شخص جوان ہو کر جائے گا چنانچہ جیسے جیسے وہ اپنے وقتِ موعود سے قریب ہوتے جارہے تھے ان میں جوش و مسرت بڑھتا جارہا تھا یہاں تک کہ جس رات سفرِ آخرت طے تھا اس میں تو فرطِ انبساط سے بے قابو ہوئے جارہے تھے۔ اور اسی عالمِ فرح و انبساط میں بظاہر سو بھی گئے مگر صبح جب ان کی روح پرواز کر چکی تھی تو چہرہ پُر گوشت تر و تازہ تھا۔ سفید ڈاڑھی بالکل سیاہ تھی اور لاغر و نزار جسم گداز ہو گیا تھا۔ دیکھنے والوں کو یوں نظر آرہا تھا جیسے کوئی ۲۵ سالہ جوان لیٹا ہے۔ اس منظر کو مکارم احسن صاحب ہی نے نہیں دیکھا بلکہ ہر شریکِ جنازہ نے حیرت کی آنکھ سے دیکھا اور اس میں لذّتِ روحانی محسوس کی، مولانا کے جنّتی ہونے کی اس سے زیادہ واضح نشانی اور کیا ہو سکتی ہے

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میؔر کیا دوانے نے موت پائی ہے

اعلی اللہ مقامہٗ!

حلیہ قد میانہ، نہ چھریرا نہ زیادہ گداز، رنگ سرخ و سفید، گول ماہتابی چہرہ، گرداگرد سفید ڈاڑھی نہ زیادہ گھنی نہ چھدری، فراخ پیشانی، روشن آنکھیں، شخصیت میں سادگی اور سادگی میں دلفریبی کا اثر تھا۔

بیٹھتے تو آنکھیں بند کیے اور سر کو جھکائے رکھتے تھے مگر جب بولتے تو ان کی زبان سے پھول جھڑتے تھے اور ان کی شگفتگی اور ذکاوت مخاطب کو مسخر کر لیتی تھی چلنے میں چھوٹے چھوٹے قدم تیز تیز اٹھاتے تھے ایسے کہ ایڑی برائے نام ٹکنے پاتی، زور پنجوں ہی پر پڑتا تھا، اور گردن جھکائے تواضع کا متحرک پیکر نظر آتے تھے۔ ان کی ہر ادا میں سادگی کا حسن تھا، بے ساختگی کی کشش تھی۔

لباس لباس کے معاملہ میں مولانا کسی خاص وضع کے پابند نہ تھے، سر پر سفید پنجگوشہ ٹوپی یا ترکی ٹوپی ہوتی تھی، کبھی کبھی صافہ بھی باندھ لیتے تھے، سیاہ عمامہ سب سے زیادہ زیب دیتا تھا، شیروانی کے اندر کبھی کرتہ ہوتا اور کبھی قمیص، پاجامہ البتہ ہمیشہ تنگ مہری کا پہنتے تھے جو ٹخنوں سے علانیہ اونچا ہوتا تھا، پاؤں میں سلیم شاہی جوتہ یا پمپ شوز جو بھی بے تکلف میسر آتا پہن لیتے تھے۔ کبھی کبھی شانہ پر چھوٹا سا مدنی رومال بھی ڈال لیتے تھے عام طور پر لباس نہ زیادہ قیمتی ہوتا نہ بہت ہی معمولی بلکہ اوسط درجہ کا اور صاف ستھرا ہوتا تھا۔

ذہنی بناوٹ مولانا قدس سرہٗ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے خیرآباد و دیوبند کے اکابر

اساتذہ کے فیض یافتہ تھے پھر جب حیدر آباد آئے تو یہاں علامہ حمید الدین فراہیؒ سے استفادہ فرمایا جو ایک خاص فکرِ قرآنی کے مالک تھے! ادھر جامعہ عثمانیہ کے تعلق سے مغربی افکار اور مغربی ذہن سے واقفیت ہی نہیں بلکہ اس سے گہرا ربط قائم ہو گیا تھا۔ ان گونا گوں مؤثرات میں مولانا کی جو ذہنی تشکیل ہوئی وہ واقعتہً "ندوۃ العلمائی"[1] نہج کی تھی۔ چنانچہ جامد مولویت کو (جو مسائل حاضرہ سے بے خبر ہو) خود مولانائے مرحوم ناقص تصور فرماتے تھے اور لیکچر اور گفتگو کے دوران میں جب مسائل حاضرہ پر مجتہدانہ روشنی ڈالتے تو "بیچارے مولوی نے سمجھا ہی نہیں" کا جملہ اکثر مسکراہٹ کے ساتھ ان کی زبان سے نکل جاتا تھا۔

مولانا کا حافظہ مثالی، ذہن بہت اخاذ، فکر بہت دور رس اور نظر بڑی مجتہدانہ تھی۔ انتقالات ذہنی بہت دقیق، ان کی پہلی کتاب ابوذر غفاریؓ کو دیکھ کر جو طالبعلمانہ دور کی یادگار ہے۔ عارف تھانویؒ (مولانا اشرف علی قدس سرہٗ) نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ اس کتاب کا مؤلف آئندہ چل کر محقق ہوگا[2]۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قرآنی، حدیثی، فقہی، معاشی، سیاسی علوم میں مولانا نے تحقیق کے وہ جوہر دکھلائے کہ خود ان کے استاذ عالیمقام مولینا شبیر احمد عثمانیؒ بھی ان کے کمال کے معترف ہو گئے تھے۔

---

[1] مولانا کی کتاب "نظام تعلیم و تربیت" پر تبصرہ فرماتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے معارف میں یہ لکھا تھا کہ مولانا کی تعلیم گو دیوبند میں ہوئی مگر ان کا ذہن ندوۃ العلمائی ہے۔ اس پر مدیر برہان (دہلی) نے ایک اختلافی شذرہ لکھا تھا۔ ایک روز جب میں مولانا کی خدمت میں گھر پر حاضر ہوا تو برہان کا یہ شمارہ لیے ہوئے مولانا باہر نکل آئے۔ محبت سے بٹھایا اور فرمانے لگے:۔ "آپ نے اس مہینے کا برہان دیکھا ہے؟"

راقم الحروف نے عرض کیا "جی ہاں! مولانا سعید احمد نے حضرت والا (سید سلیمان ندویؒ) کے اس جملے پر تنقید کی ہے کہ مولانا کا ذہن ندوۃ العلمائی ہے۔"

مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "جی ہاں میں یہی دکھانا چاہتا تھا۔ بیچارے سعید احمد صاحب نے سید صاحب کے مطلب کو سمجھا ہی نہیں خواہ مخواہ ان کے جملے پر تنقید کر دی۔ ہمارے سید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہی ٹھیک ہے۔" (غ م)

[2] حکیم الامتؒ کا جملہ خود اسی کتاب میں یہ نقل ہو گیا ہے:۔

"مقالہ نگار سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں لیکن اس مضمون کو دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ محقق نہیں ہو چکے ہیں تو محققیتِ متوقعہ کی دلیل ان کا یہ مضمون ضرور ہے۔" (ملاحظہ ہو، مقالہ اطلاقی تصوف کی ذیلی سرخی "حاصل کلام" کی آخری سطریں)

تصنیف و تحریر

مگر ان سارے کمالات کے ساتھ طبیعت پر جذب کا اثر کچھ اس درجہ غالب تھا کہ مولانا کی کوئی تحریر کامل طور پر مرتب و مربوط نہیں ملتی، علوم کا ورود اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ متعلق و غیر متعلق کا انتخاب ان کے لیے محال ہوجاتا تھا۔ وہ تیزی سے قلمرانی فرماتے فقروں کی تقسیم اور عنوانات کے قیام کا ان کو مطلق شعور نہ رہتا تھا اور قلم روکنے سے پہلے ان کو خود اندازہ نہ ہوتا تھا کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ مضمون ہوگا یا کتاب بن جائے گی۔ اور اس سب کے باوجود اپنے مسودات پر دوبارہ نظر کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہ فرماتے تھے۔ ان مسودوں کی ترتیب و تدوین ان کے معتمد علیہ شاگردوں اور عقیدتمندوں کے سپرد ہوتی تھی یا ناشروں کے رحم و کرم پر منحصر رہتی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے "النبی الخاتم" اور "الدین القیم" کو مولانا کے شاگرد رشید ڈاکٹر غلام دستگیر رشید (پروفیسر فارسی نظام کالج حیدر آباد دکن) نے مرتب فرمایا ہے۔ سورۂ کہف، تدوین حدیث اور مقالات احسانی کی ترتیب کا شرف مجھے ملا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی اور بعض کتابوں کی تنظیم ناشر کتب نے اپنے طور پر کردائی ہے البتہ مولانا کے ہزارہا ہزار صفحات کے مسودوں کی تبییض ان کے ایک عزیز اور خاص شاگرد جناب مخدوم محی الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) کیا کرتے تھے۔ جن کی زود نویسی اور خوشنویسی حیرت انگیز ہے۔

مولانا خود فرماتے تھے کہ ان کی کوئی تصنیف بھی باضابطہ "تصنیفی پروگرام" کے ماتحت انجام نہیں پائی۔ یہی ہوتا رہا کہ کسی نے کسی مضمون کی فرمائش کی مولانا لکھنے بیٹھ گئے جب لکھ چکے تو وہ مضمون، مضمون نہ رہا بلکہ کتاب تیار ہوگئی۔ چنانچہ "نظام تعلیم و تربیت" اور خود "النبی الخاتم" وغیرہ اسی قبیل کی تصنیفات ہیں، اس قسم کی کتابوں کے علاوہ دوسری صورت یہ ہوتی رہی کہ کالج کے لیکچرز کی تیاری یا ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کے طلباء کے مقالات کی رہبری کے سلسلہ میں مختلف موضوعات پر جو معلومات فراہم کرنا پڑیں، وہ اتنی زیادہ اور قیمتی تھیں کہ ہر موضوع کی ایک مستقل کتاب خود بخود تیار ہوگئی، الدین القیم، اسلامی معاشیات، تدوین حدیث اور تدوین قرآن وغیرہ سب اسی نوعیت کی تالیفات ہیں۔

مذکورہ صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مولانا کی تصنیفات جدید طرز تصنیف کے معیار حسن کو نہیں پہنچتیں مگر بقول عہد حاضر کے مشہور محقق محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ان تصانیف کو اسلوب نگارش اور ربط تحریر کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ کہ ان میں علوم و حقائق اور استنباط و استخراج مسائل کا کس قدر گراں بہا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔

علاوہ ازیں مولانا کی تحریریں جہاں ربط و ترتیب کے حسن کی کمی ہے وہاں بعض خوبیاں ایسی بھی ہیں جو اس کمی کی تلافی کر جاتی ہیں مثلاً ہر تحریر میں بے ساختگی، زور استدلال اور سوز و گداز کچھ ایسا موجود ہے کہ اس کی وجہ سے ربط کلام ٹوٹنے پر بھی کتاب چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔

ایک اور اعتبار سے بھی مولانا میں عجیب تصنیفی امتزاج ملتا ہے۔ اہل قلم علماء یا تو صاحب "ایجاز" بلیغ گئے یا اہل "اطناب"۔ مگر ہمارے مولانا کہیں ایجاز کے بادشاہ معلوم ہوتے ہیں کہیں اطناب کے مالک، اپنی کسی تصنیف میں ہزار ہا ہزار صفحوں کا مواد چند اوراق میں جمع فرما گئے ہیں اور کسی تالیف میں چند اوراق کو ہزاروں صفحات پر پھیلا گئے ہیں۔ ان کے ایجاز کا کمال النبی الخاتم پر ختم ہے اور اطناب کا زور سوانح قاسمی پر!

مولانا کی تصانیف میں سے یوں تو ہر تصنیف گراں بہا ہے مگر مندرجہ ذیل تصانیف کو امتیازی اہمیت حاصل ہے:۔

النبی الخاتم۔ الدین القیم۔ تدوین قرآن۔ تدوین حدیث، تدوین فقہ، اسلامی معاشیات، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی اور تفسیر سورہ کہف۔

مولانا کی کتابوں کے علاوہ ان کے بیسیوں مضامین ہیں جو اہمیت و افادیت کے اعتبار سے ان کتابوں سے کسی طرح کم نہیں مثلاً الفرقان (لکھنؤ) کے مجدد الف ثانی نمبر اور شاہ ولی اللہ نمبر ہی میں جو مضامین آ گئے ہیں وہ مولانا کی جامعیت علمی اور ذہانت و فطانت کی انمٹ یادگاریں ہیں کاش مولانا کے کل مضامین فنی تقسیم کے ساتھ مرتب ہو جائیں۔

تقریر

یوں تو مولانا کی تحریر میں بھی بڑا زور اور اثر ہے لیکن ان کی تقریر تو اس سے بھی کہیں زیادہ پرسوز و جاں گداز ہوتی تھی اور تقریر کا رنگ واعظانہ نہیں بلکہ خطیبانہ ہوتا تھا۔ درمیان درمیان میں لطائف و ظرائف اور منتخب اشعار اس موزونیت سے آ جاتے تھے کہ عالمانہ تقریر عوام کے لیے بھی نہایت دلچسپ و دلنشین بن جاتی تھی۔ حالانکہ نکتہ آفرینی اور علمی معلومات کا سیلاب تھا جو اُمنڈا چلا آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریر میں خود بیخود ہو جاتے تھے جس کے اثر سے سامعین پر بھی ایک کیف طاری ہو جاتا تھا۔

مولانا گیلانی اپنے دور میں حیدر آباد کے چار پانچ چوٹی کے مقررین میں شمار کیے جاتے تھے،

جب کہ حیدر آباد کا معیار خطابت ہندوستان کے عام معیار پر فوقیت رکھتا تھا۔

مولانا یوں تو تھے ہی ایک کامیاب خطیب مگر جب وہ اپنے مخاطبین میں غیرت ایمانی کو ابھارنا چاہتے تو ان کی خطابت بے مثل بن جاتی تھی، ایک واقعہ سے مولانا کے اس کمال کا اندازہ ہوگا۔ حیدر آباد ہی کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ "میلاد النبیؐ" کے جلسہ میں ہزاروں کے مجمع کو خطاب فرمارہے تھے۔ صدر نشین جلسہ لسان الامت قائد ملت[1] نواب بہادر یار جنگ مرحوم تھے۔ مولانا کا عنوان جہاں تک یاد پڑتا ہے "والذین امنوا اشد حبا للہ" تھا وہ عوام کی غیرت ایمانی کو جگانا چاہتے تھے اس کے لیے انہوں نے عام مسلمانوں کے ضعف ایمانی پر اظہار افسوس کیا اور اس صورت حال کی تفصیل بیان فرمائی کہ کس طرح آج کا مسلمان ہر ادنیٰ سے ادنیٰ دنیوی فائدہ کی خاطر دین کے بڑے سے بڑے مطالبہ کو بلا تامل قربان کر دیتا ہے اس کے بعد حق تعالیٰ کے انعام و احسان کی گراں باری اور اس کے حق محبت کا تذکرہ نہایت مؤثر انداز میں شروع کیا۔ یہاں تک کہ مولٰنا کی بند آنکھیں کھل کر پھٹی جا رہی تھیں، چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور خشیت و جلال میں ڈوب کر مولانا نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے فرمایا کہ "ایسے محسن کی یہ نا احسان شناسی؟" اور اس کے ساتھ ہی غالب کا یہ شعر استفہامیہ لہجہ میں ان کی زبان فیض سے ادا ہوا ؎

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے

آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

یوں محسوس ہو رہا تھا گویا یہ شعر آج اسی موقع کے لیے لکھا گیا تھا۔ سارا مجمع غرق ندامت ہوگیا اور سب کی غیرت ایمانی دفعتہً چمک اٹھی۔

شاعری

مولانا کی ذات میں شاعری کے سارے لوازم، وہبی ہوں یا کسبی، پوری طرح جمع تھے شگفتگی بلکہ رنگینی ان کی طبیعت پر غالب تھی، ان کا احساس قوی، مشاہدہ عمیق، اور قوت تخیل بلند تھی۔ عربی اردو فارسی اور ہندی زبان کے کلاسکی کلام تک ان کی پوری طرح رسائی تھی اس کا اندازہ

---

[1] یہ لقب غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانان ہند نے نواب بہادر یار جنگ مرحوم ہی کے لیے مخصوص کیا تھا اور تجویز لقب کا سہرا مسلمانانِ مدراس کے سر تھا۔ اسی لیے نواب صاحب کی رحلت کے بعد راقم الحروف نے ان کی سوانح جو لکھی تو اس کا نام صرف "قائدِ ملت" ہی رکھا تھا، البتہ بعد میں یہ لقب شہید ملت خان لیاقت علی خاں کے لیے بھی استعمال ہوا، اور پاکستان میں اب یہی معروف ہے۔

اس وقت ہوتا تھا جب وہ مختلف زبانوں کے کلام کا موازنہ فرماتے اور ان کی باریکیوں کو اجاگر کرتے تھے ان چاروں زبانوں کے سیکڑوں منتخب اشعار ان کے نوکِ زبان تھے! وہ خود بھی اردو، فارسی، عربی اور ہندی میں معیاری اشعار کہہ لیتے تھے، اس کی مثال میں ان کی دو نعتیں اس تالیف کے ختم پر شامل ہیں، افسوس کہ مولانا کی منظومات محفوظ نہ رہ سکیں۔

مذکورہ جامعیت کی وجہ سے مولانا خود ایک اچھے شاعر بن گئے تھے۔ جوانی ہی سے سخن سنجی میں بھی داد حاصل کرتے رہے تھے، وہ بے تکلف فارسی اردو ہندی میں اپنے جذبات کو شاعری کے قالب موزوں میں ڈھال لیتے تھے۔ عربی میں بھی ممکن ہے کہ کچھ کہہ لیتے ہوں مگر ہم اس سے واقف نہیں۔

شعر پڑھنے کا انداز بھی مولانا کا نہایت اثر آفریں تھا۔ وہ ڈوب کر پڑھتے تھے اور سننے والوں کو محوِ کیفیت بنا جاتے تھے۔

خلق مولانا کے فضائل اخلاق میں "بےنفسی" کو سب سے نمایاں مقام حاصل تھا۔ دوسرے کی غلطی پر خود معافی خواہ ہو جانا، کوئی کھنچا چاہے تو خود بڑھ کر اس سے قریب ہو جانا اپنے تسامح کا علم ہونے پر علی الاعلان سراپا معذرت بن جانا، اپنے دامن کو ہمیشہ طبقاتی ادارتی تعصب سے پاک وصاف رکھنا اور اظہارِ حق میں تحسین و ملامت کی قطعاً پرواہ نہ کرنا مولانا کا شعار تھا۔

اپنے معاصرین کی قدر کرنا اور ان کے کمال کا اعتراف کرنا وہ وصف عالی ہے جو ہر زمانہ میں نادر رہا ہے مگر مولانا میں یہ نادر وصف بدرجہ اتم موجود تھا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ اپنے چھوٹوں کے کمالات کو بھی بڑی فراخدلی سے تسلیم کرتے اور علانیہ اس کا اظہار فرماتے تھے۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے مولانا سے لڑکپن میں کچھ پڑھا تھا اس لیے وہ ہمیشہ مولانا کی ایسی ہی عزّت و عظمت کرتے تھے جیسے ایک سعادتمند خصوصی شاگرد کو کرنی چاہیے لیکن چونکہ وہ ایک بڑے خطیب اور مخلص قائدِ ملت تھے اس لیے مولانا کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی کہ خود عوام کی سطح پر اتر کر ان کی عزّت کریں۔ وہ مناظر اب تک آنکھوں میں پھر رہے ہیں جب استاذ و شاگرد کی بھری محفلوں میں تعظیم و تکریم میں مسابقت کی کوشش ہوتی اور بالآخر استاذ گرامی کو اپنا منصب قبول ہی کرنا پڑتا۔

مولانا اپنے سارے علمی انہماک اور خشیت باطنی کے باوجود نہایت ظریف اور بذلہ سنج انسان تھے اور اسی لیے ہر محفل کو بآسانی اپنا لیتے اور سب کی نظروں میں محبوب بن جاتے تھے۔

مولانا کے قلب اطہر میں اُمت محمدیہ کی محبت اور اس پر شفقت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ مسلمانوں کی فلاح سے ایسے مسرور ہوتے تھے جیسے خود ان کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچ گیا ہو۔ وہ مشرباً پکے حنفی تھے مگر یہ ان کے جذبۂ شفقت کا اثر تھا کہ زبانی بھی اور تحریراً بھی اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ موجودہ حالات میں علمائے کرام کو عام مسلمانوں کے لیے سہولت ہی کا پہلو اختیار کرنا چاہیئے خواہ اس میں مسلک حنفیہ کو چھوڑ کر کسی اور مسلک کی اقتدا کیوں نہ کرنی پڑے؟ کیونکہ فقہا کے اجتہادات کو بہر حال منصوصات کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

طلباء پر مولانا کی شفقت، عہد قدیم کے اساتذہ کے لطف و کرم کی ایک زندہ یادگار تھی ان کی شفقت افادۂ علم ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اپنے شاگردوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے وہ جامعہ کے اندر اور باہر ہمیشہ پوری قوت صرف فرماتے رہے بلکہ بعض صورتوں میں ان کے نجی معاملات مثلاً شادی بیاہ میں بھی مولانا کے پدرانہ الطاف برابر شامل رہتے تھے۔

مولانا کی تنخواہ معقول تھی، آخر زمانہ میں ہزار، بارہ سو تک پہنچ گئی تھی لیکن اس کا خاصہ حصہ اعزاز و اقربا کی امداد اور عام دینی امور کی معاونت میں صرف فرماتے رہے۔ خود اپنی ذات کے لیے سادگی ہی پسند فرما لی تھی۔ ایک عاشق نبوی کا طرز اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

عالمانہ امتیاز

تفصیل کا یہاں موقع نہیں، اشارتاً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مولانا گیلانی کو اپنے معاصر علمائے دیوبند پر مندرجہ ذیل وجوہ سے تفوق حاصل تھا۔

(۱) وہ درسیات کے ماہر معلم ہی نہیں بلکہ ایک "صاحب نظر" عالم تھے۔

(۲) وہ تاریخ اور علوم عصریہ سے بھی راست واقفیت رکھتے تھے۔

(۳) تحقیقات علمی میں ان کی نگاہ دیوبندی اور غیر دیوبندی نقطۂ نظر کی پابندیوں سے آزاد تھی۔

(۴) انہوں نے خدمت دینی کی جدید راہیں اختیار کیں اور مردانہ وار نکل گئے۔ اس سلسلہ میں وہ سلف کے اقوال یا طرز عمل کو رفیق طریق بنا کر پھر متاخرین کے اختلاف یا معاصرین کے ایراد و اعتراض کی پروانہ کرتے تھے۔

(۵) انہوں نے قدیم لٹریچر کو جدید ضروریات کے لیے اس حسن و خوبی سے برتا کہ اس کی وجہ سے اسلامی محققین اور مجتہدین کی دھاک متجددین پر قائم ہو گئی اور یہ ذہنی مرعوبیت کا ایک مؤثر علاج ثابت ہوا۔

وسعت وپاکیٔ مشرب

قادری وچشتی ہونے کی وجہ سے اپنے اکابر سلسلہ سے حضرت گیلانی کو جو تعلق اور رابطہ قلبی تھا وہ تو تھا ہی مگر شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ کے تو وہ بالکل شیدائی تھے۔ حالت یہ تھی کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کا سفرنامہ مشرق وسطی جب جریدۂ "صدق" (لکھنؤ) میں چھپا مگر شہر دمشق کے تذکرہ میں شیخ اکبرؒ کا کوئی ذکر نہ تھا اس پر حضرت گیلانیؒ نے فوراً ایک خط میں بڑے سوز وحسرت سے اس مفہوم کا جملہ تحریر فرمایا تھا کہ " یہ بھی تو مولانا نے لکھا ہوتا کہ ہمارے شیخ اکبر قدس سرہٗ کے نام لیوا ابھی ابھی وہاں کچھ باقی ہیں یا نہیں؟" ـــــ غرض اس شدید شخصی میلان کے باوجود قلب گیلانی میں وہ وسعت اور ذوق میں ایسی نفاست و پاکیزگی تھی کہ اور سلسلوں کے بزرگوں پر قلم اٹھاتے تو کبھی تقابل اور ترجیح وتنقیص کی جھلک تحریر میں آنے نہ پاتی چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ یا امام غزالیؒ وغیرہ پر جو مضامین تحریر فرمائے ہیں وہ ان کی وسعت وپاکیٔ مشرب کے کھلے گواہ ہیں ورنہ آج کے عام اہل علم وقلم کا یہ وطیرہ بن گیا ہے کہ اپنی ساری بے مائگی اور کم نظری کے باوجود اکابر صوفیاء میں موازنہ کرنے لگتے ہیں، خصوصاً یہ تو ایک فیشن سا ہو گیا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ پر جب کچھ لکھا جائے تو سرتاج عارفین حضرت شیخ اکبرؒ پر ایراد وانتقاد ضرور ہو، اناللہ!

منصب ارشاد سے گریز

فنائیت کے غلبہ اور طالب علمانہ مذاق سے دلچسپی کی وجہ سے حضرت گیلانیؒ دوہری خلافت رکھنے اور خود صاحب معرفت ہونے کے باوجود مسند ارشاد کی ذمہ داریوں سے ہمیشہ گریزاں ہی رہے اور جہاں تک میرے علم میں ہے کبھی کسی کو مرید نہیں کیا[1] ورنہ وہ اگر اس طرف توجہ فرماتے تو فیوض علمی کی طرح فیضان روحانی کا بھی دریا بہہ نکلتا مگر جو مقدر نہ تھا وہ ہو کیسے جاتا۔ حضرت گیلانیؒ نے طالب علمانہ حیثیت ہی اپنے لیے تجویز فرمالی تھی، اسی نقاب میں وہ کمالات باطنی کو چھپائے رہے اور اسی اخفا کے ساتھ اس دنیا سے پردہ فرما گئے مگر سچ یہ ہے کہ

ع " درسینہ ہائے مردم عارف مزار اوست "

ہیچمدان
غلام محمدؐ

---

[1] اب معلوم ہوا کہ صرف مخدوم محی الدین صاحب بی اے (عثمانیہ) مولانا کے مبیضہ نویس اور شاگرد عزیز کو آخر زمانہ میں حضرت گیلانیؒ سے بیعت کا شرف مل سکا تھا اور بس!! (غ م)

تعارف مقالات

۱۹۵۳ء کے تقریباً وسط میں حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف " اطلاقی تصوف " کا ایک حصہ مجھ کو ماہر صاحب (مدیر فاران) کے توسط سے ملا۔ یہ وہ اوراق تھے جو حیدرآباد دکن کے ایک ماہنامہ " الحق " میں شائع ہوئے تھے، اس کے بعد پھر حضرت مولاناؒ نے اس کے کچھ اور غیر مطبوعہ اوراق اس ہدایت کے ساتھ بھجوائے کہ ان کو مرتب کر کے کسی ذریعہ سے شائع کراؤں۔

اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے ابھی اس جانب توجہ نہ کر پایا تھا کہ حضرت مولانا چل بسے اب ان کی وصیت کا خیال زیادہ اہمیت پا گیا، " اطلاقی تصوف " کو حرفاً حرفاً دیکھا موضوع کے اعتبار سے مضمون ناتمام تھا اور درمیان میں کئی مباحث مستقل حیثیت اور افادیت کے آگئے تھے جن کا نفسِ موضوع سے کوئی راست تعلق نہ تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس شکل میں اس کتاب کو کس طرح شائع کیا جائے۔

جولائی، اگست ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد دکن کا سفر پیش آیا یہاں مولانا گیلانی کے ایک شاگرد خاص جناب مخدوم محی الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) سے بھی ملاقات ہوگئی اور موصوف نے " اطلاقی تصوف " کی آخری قسط مجھ کو عنایت فرمائی کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی یہی وصیت تھی، برادر موصوف نے بتایا کہ اس مسودہ کی تکمیل مولانا نے ۱۹ شعبان ۱۳۷۵ھ کو فرمائی اور ۵ شوال ۱۳۷۵ھ کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس اعتبار سے یہ تالیف افادات گیلانی کی آخری قسط ہے۔

حضرت گیلانی کے وصال کے بعد ادارہ " مجلس علمی " (کراچی) کے سرپرست محترم مولینا محمد ابن موسیٰ میاں صاحب[1] مدظلہ

---

[1] افسوس کہ سنہ ۱۹ء کو رحلت فرما گئے۔ بڑے تاجر، باضابطہ عالم، علامہ سید انور شاہ کشمیری کے شاگرد، علم و علمائے دین کے بڑے قدردان، نہایت متواضع، فراخ دل، کشادہ دست اور کریم النفس انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ مدارج عالیہ عطا فرمائے۔ آمین (غ م)

کو اختیار کرنے اور اس کے باوجود مسبب الاسباب پر بھروسہ رکھنے کا ڈھنگ سکھایا جاتا ہے۔ گویا اس میں تصحیح فکر ہی پر تمام تر زور صرف کیا جاتا ہے اور اصلاح فکر ہی کے ذریعہ "مقام احسان" تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، اس طریق میں سالک کو طول طویل مجاہدات اور ریاضتوں کی حاجت نہیں ہوتی جیسی کہ طریق غزالیہ میں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت گیلانی کی یہ تجویز دراصل ان کے شیخ عالیمقام حضرت مولانا محمد حسین چشتی صاحب حیدرآبادیؒ کے طریق کی تلقین کا نتیجہ ہے اس کا اندازہ حضرت مولانا محمد حسین صاحبؒ کے ایک جملہ سے ہوگا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ :-

"ایک انسان لا الہ الا اللہ کا اقرار کرکے ایک سیکنڈ میں
کفر سے نکل کر دائرۂ اسلام میں آجاتا ہے اور ایک مسلمان
"ان اللہ معنا" کا استحضار کرکے ایک سیکنڈ میں مرتبۂ
احسان کو پہنچ جاتا ہے۔"

اس استحضار کے قیام کے لیے حضرت شیخ تصحیح فکر کو کافی تصور فرماتے تھے اور اسی تصحیح فکر کو اصلاح اخلاق میں بھی موثر سمجھتے تھے۔

"حصول احسان" کی یہ راہ عملاً عام بھی ہوسکتی ہے اور اس کا نفع تام بھی ہوسکتا ہے یا نہیں اس پر بحث یہاں بے محل ہوگی البتہ اس کے قبول کرنے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ ذی فہم اور سلیم الطبع لوگوں کے لیے یہ ایک سہل ترین راستہ ہے بشرطیکہ شیخ بھی کوئی حضرت محمد حسینؒ یا حضرت گیلانیؒ کے پایہ کا انسان ہو۔ مولانا گیلانی کے سامنے چونکہ بیشتر طبقہ اہل علم و فہم ہی کا تھا اس لیے مولانا کی یہ ترٹپ کہ اس راہ سے ان کو احسان تک پہنچا دیا جائے دینی ہمدردی کا لازمی نتیجہ تھی۔

مقالہ نمبر (۵) ابن تیمیہ کا نظریہ مخذومیت

علمی راہ سے مولانا گیلانی جس درجہ امام ابن تیمیہ کے معترف ہیں، تصوف و احسان کی راہ سے مولانا کو ان سے اتنا ہی شدید اختلاف ہے۔ اور یہ حضرت مولانا ہی کا منصب تھا کہ اعتراف و اختلاف کو اپنی اپنی جگہ پوری قوت سے ظاہر فرماتے تھے چنانچہ اس مقالہ میں مولانا نے ابن تیمیہ کے نظریہ مخذومیت

کی وضاحت فرمائی ہے اور خود ابن تیمیہ ہی کی کتاب " النبوات " کے حوالوں سے اہل اللہ کی کرامات پر ان کے سوئے ظن یا ان کی سوئے تعبیر کو واضح کیا ہے اور اس طرح ان کی زیادتی کو ثابت کر دکھایا ہے۔

یہاں اتنی بات واضح کر دوں کہ امام ابن تیمیہ کرامات کے منکر نہیں بلکہ انہوں نے خود کرامات کی صحیح تعیین پر ایک رسالہ "کرامات" کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے اور زیر نظر کتاب میں المرشدی پر الزام "مخدومیت" کے جواب میں خود انہی کی کتاب " النبوات " سے نفس کرامات کی تائید ہمارے مولانا نے بھی نقل فرمائی ہے، مگر عام طور پر صوفیائے حقانی پر جو سخت سے سخت تنقید بلکہ ایراد و تعریض کر جاتے ہیں اس کی وجہ محض وقتی مصالح ہیں، اس تفصیل سے میرا مطلب یہ ہے کہ ان معاملات میں امام سے نہ تو سوئے ظن رکھا جائے نہ ان کی بات کو تحقیقی مرتبہ دیا جائے اور اس سے استناد کا کام لیا جائے بلکہ ایک مصلح امت کی ایسی تدبیر و تجویز پر محمول کیا جائے جس کی ضرورتِ وقت متقاضی تھی۔

مقالہ نمبر (۶) مجالس الشیخین یا "دل کا چین"

حضرت مولانا گیلانی جب حیدر آباد کی علمی مجلسوں اور دینی ماحول سے الگ ہو کر ایک قصبہ میں "جہاں شریف مسلمانوں کے صرف دو گھرانے آباد تھے" جا بیٹھے تو وہاں دو بزرگوں کی معنوی صحبت سے زیادہ تر انس و تسکین پاتے رہے۔ ایک مولانا رومی دوسرے شیخ اکبر قدس سرہما، ان عارفین کی کتابوں کو اپنے " دل کے چین" کے لیے بار بار دیکھتے رہے، پھر جو کچھ ہوا اس کو خود مولانا ہی کی زبان میں سنیئے :-

" جیسا کہ عرض کر چکا ہوں محض ذاتی تسکین و تشفی کے لیے شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اور حضرت مولانا معنوی کے افادات کو مذکورہ بالا عنوان کے تحت فقیر نے قلم بند کرنا شروع کیا تھا۔ حاشیہ خیال میں یہ بات نہ تھی کہ اس قدر جلد شائع ہو جانے کی صورت سامنے آجائے گی مگر حالات ایسے پیش آئے کہ نظر ثانی کیے بغیر دار العلوم کے لیے اس مضمون کو بھیج دینا پڑا۔ چھپنے کے بعد محسوس ہوا کہ دوسروں کو سمجھانے کا خیال لکھنے کے وقت غالباً نہ تھا۔ اسی لیے بہت سی باتیں ادھوری اور مجمل شکل میں درج ہو گئی ہیں نیز بعض مواقع میں ایسی باتیں بھی درج ہو گئی ہیں جن سے ممکن ہے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ آئندہ کے لیے اب یہ ارادہ ہے کہ خود فہمی کے

ساتھ دوسروں کے سمجھانے کا پہلو بھی انشاءاللہ پیشِ نظر رہے گا۔"

یہی وجہ ہے کہ مجالس الشیخین کی ابتداء میں مسائل نسبتاً ادق ہیں اور آخر میں سہل، باقی لوگوں کو غلط فہمی کی جو خلش حضرت گیلانی کو تھی وہ اب عنوانات کے قیام کے بعد اُمید ہے کہ رفع ہوگئی ہوگی۔ اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ موٴلف قدس سرہٗ اور مرتب حقیر کی مساعی کو قبول و مشکور فرمائے۔

ان مقالات کے دوران میں کہیں کہیں حاشیے اس عاجز کے قلم کے بھی ملیں گے جن کو (غ م) کے اشارہ سے ظاہر کیا گیا ہے یہ یا تو کسی ابہام کی وضاحت کے لیے ہیں یا کسی خدشہ کے ازالہ کی خاطر، کاش تدوین حدیث کی طرح اس کتاب کے سلسلہ کی سعی حقیر بھی حضرت گیلانی کی نظر سے سندِ قبولیت پا جاتی تو میری تشفی کا پورا سامان ہو جاتا مگر اب تو ایک یقین بخش اُمید ہی کا سہارا ہے ؎

مہر تو عکسی بر ما نیفگند — آئینہ رویا آہ از دلت آہ
الصبر مرٌّ والعمر فان — یا لیت شعری حتیٰ مَ القاہ
حافظ چہ نالی گر وصل خواہی — خوں بایدت خورد ناگاہ و بیگاہ

امیدوارِ رحمت

غلام محمد عفی عنہٗ

مقدمہ

تصوّف

اور

اُس کے دو۲ طریقے

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تصوّف اور اُس کے دو طریقے

کیا تصوّف بدعت ہے

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب عبقات میں اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے۔

لیس الاجتهاد عندنا منحصرا فی الفقه المصطلح بل له عموم فی کل فن ثم لکل اهل فن طریق علیحدة فی الحاق المسکوت بالمنطوق (عبقات ص ۱۳۲)

اجتہاد کا کاروبار ہمارے نزدیک صرف اسی فن کے ساتھ مختص نہیں ہے جس کا اصطلاحی نام فقہ رکھ دیا گیا ہے۔ بلکہ ہر (دینی) فن میں لوگوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے۔ البتہ شریعت میں جن امور کی تصریح کی گئی ہے ان کے ساتھ ان مسائل اور قوانین کو مربوط کرنے میں جن کا تصریحی ذکر شرعی نصوص میں نہیں ملتا یعنی مسکوت کو منطوق کے ساتھ مربوط کرنے میں ہر فن کے لوگوں کا خاص خاص طریقہ ہے۔

اور یہ وہی بات ہے جسے علامہ شعرانی بصری کے حوالے سے حاشیہ میں نقل کر چکا ہوں مولینا شہیدؒ نے اسی بنیاد پر لکھا ہے کہ "فقہاء" کے پیدا کیے ہوئے قیاسی نتائج کو تو شرعی علوم میں شمار کیا جاتا ہے لیکن آئمہ صوفیہ نے شرعی نصوص ہی سے جن مسائل کا استنباط کیا ہے ان پر "بدعت" وغیرہ کے الفاظ کا اطلاق آخر کیسے درست ہو سکتا ہے۔ اسی موقع پر یہ لکھنے کے بعد کہ

فجمیعها علوم شرعیة وائمتها مویدون من الغیب ومقلد وهم متبعون للحق۔

یعنی فقہ ہو، یا تصوّف یا کلام یہ سارے علوم شرعی علوم ہی ہیں۔ اور ان دینی علوم کے سارے

آئمہ کی تائیدِ غیب سے کی گئی ہے ان کی تقلید کرنے
والے حق ہی کے پیرو ہیں

پھر "ملا اور صوفی" کے ان خرخشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولینا شہید نے لکھا ہے۔

وانکار اھل فن علی اھل فن اخر نیشاء عن الغفلۃ بمقاصدھم ومبادیھم وطریق قیاسھم فینسبون تارۃ مسائلھم التی فرعوھا الی البدعۃ۔ (ص ۱۳۲)

مذکورہ بالا دینی علوم جن میں تصوف بھی شریک ہے ان میں سے کسی فن والے دوسرے فن والوں کا جو انکار کرتے ہیں (مثلاً ملّا صوفیوں پر معترض ہیں یا صوفیہ ملّاؤں سے روٹھے رہتے ہیں) یہ ساری باتیں صرف غفلت سے پیدا ہوئی ہیں یعنی ہر فن والے کی دوسرے فن والوں کے مبادی اور مقاصد سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اسی لیے (مولوی لوگ صوفیہ کی باتوں کو) کبھی کبھی بدعت کہہ دیتے ہیں۔

مولینا شہیدؒ نے اسی کے بعد بالکل صحیح فرمایا ہے کہ تصوف ہی کی کیا خصوصیت ہے فقہ کے بھی سارے مسائل کا صراحتہً ذکر شرعی نصوص میں نہیں پایا جاتا لیکن تصریحی مسائل کو پیش نظر رکھ کر ائمۂ فقہ نے جیسے غیر مصرحہ مسائل پیدا کیے ہیں ائمۂ صوفیہ نے بھی یہی کیا ہے۔

لا شک ان فروع کل فن لیست مصرحۃ عن صاحب الشرع۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر فن کے جزئیات (مثلاً فقہی مسائل) کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جنکے متعلق صاحب شریعت سے صراحتہً حکم منقول نہیں ہے

بلکہ اجتہاد سے کام لے کر منصوصاتِ شرعیہ سے بطور نتیجہ کے ان کو پیدا کیا گیا ہے پھر جب فقہی جزئیات کو بدعت کہنا جیسے صحیح نہیں ہے اسی طرح صوفیہ کے پیدا کیے ہوئے اجتہادی نتائج پر بے دھڑک "بدعت کا" ہتھیار چلا دینا، خود سوچنا چاہیئے کہ کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

جو حیثیت فقہ اور فقہا کی ہے وہی حیثیت تصوّف اور صوفیا کی ہے

کچھ بھی ہو، چاہے بیان و تفصیل کی صلاحیت سلیقہ مندی عوام میں نہ ہو، لیکن عموماً مسلمانوں میں سمجھا یہی گیا کہ دینی دائرے میں جیسے فقہ اور فقہا کے

اجتہادی وقیاسی مسائل داخل ہیں یہی حیثیت تصوف اور صوفیاء کی بھی ہے اور بقول مولینا شہید رحمۃ اللہ علیہ فقہ میں.........

کا التفرق بین فقہاء الشیعۃ واھل السنۃ — جیسے شیعہ فقہا اور اہل سنت فقہا میں فرق سمجھا جاتا ہے۔

یعنی جیسے اہل سنّت کے فقہاء کو حق پر اور شیعی فقہا کو سمجھا جاتا ہے کہ حق پر نہیں ہیں اسی طرح صوفیوں میں بھی سمجھا جاتا ہے کہ ان میں بھی سب ہی حق پر نہیں ہیں۔ مثال دیتے ہوئے مولینا نے سمجھایا ہے کہ صوفیوں میں۔

ومن من یستعین فی مراقباتہ بالخمور والمسکرات ومن من یستعین فیھا بالاذکار والصلوٰۃ ومن من یعالج عجب القلب بترک شعار الشرع ومن من یعالجہ بملاحظۃ المعاصی او القصور فی الطاعات (ص ۱۳۳)

بعض لوگ اپنے مراقبات میں شراب اور نشہ آور چیزوں سے مدد حاصل کرتے ہیں اور بعض لوگ اذکار و نماز سے اسی فائدے کو حاصل کرتے ہیں یا شرعی مطالبات کو چھوڑ کر ان میں بعض لوگ نخوت و غرور کے جذبات کا علاج کرتے ہیں یعنی نماز روزہ چھوڑ بیٹھتے ہیں اور اسی مقصد کو بعض لوگ اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں۔

الغرض جو حیثیت فقہ اور فقہاء کی مسلمانوں کی عام نظروں میں تھی، تصوف اور صوفیہ کی حیثیت بھی یہی رہی نہ مولویوں ہی کی چیخ پکار کی صوفیہ کے مقابلہ میں پروا کی گئی نہ فقہا اور فقہا کا جو صحیح قدرتی مقام تھا وہ چھینا جا سکا۔ اگرچہ صوفیوں کی طرف سے کہنے والے کہتے رہے۔

ع درکنز و ہدایہ نتواں یافت خدا را

اختلاف سلاسل کی نوعیت

اور ٹھیک جیسے فقہ میں باوجود اختلافات کے حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی مکاتب خیال اہل السنت یا اہل حق ہی کے مکاتیب خیال سمجھے جاتے ہیں اسی طرح قادری، نقشبندی، سہروردی اور چشتی وغیرہ صوفیوں کے ان مختلف طرق و سلاسل کے متعلق یہی باور کیا جاتا ہے کہ ان میں ہر طریقہ صحیح اور درست ہے اختلافات جو کچھ بھی صوفیوں کے ان مختلف طریقوں میں پائے جاتے ہیں ان کا تعلق صاحب طریقہ کے فطری رجحانات

یا ان لوگوں کے خصوصی حالات سے ہے جن میں پہلے پہلے یہ طریقہ مروج ہوا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تفہیمات الٰہیہ میں طریقہ نقشبندیہ کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

ان الشیخ بہاؤ الدین نصب مجدد اللاحسان فی ارض الترک وکانوا اقوی البہیمۃ وکان ھو مجذوبا قد قبل سرہ الملکی نورا الٰہیا وتدلیا فتولد من نسبتہ وتربیتہ طریقۃ مفیدۃ غایۃ الافادہ۔ (تفہیمات ص۸۶ ج۱)

شیخ بہاؤ الدین (طریقہ نقشبندیہ کے امام) ترکوں کی سرزمین میں مقام احسان کی تجدید کے لیے مقرر کیے گئے تھے ترک قوم میں بہیمی قوت بہت زیادہ زوردار تھی حضرت شیخ مجذوب تھے (یعنی حق تعالیٰ کے لطف خفی نے ان کا انتخاب کرلیا تھا) اور ان کے ملکی سر نے الٰہی نور اور تدلی کو قبول کرلیا تھا۔ اسی لیے آپ کی نسبت اور آپ کی تربیت کا جو خاص قاعدہ تھا اسی سے ایک ایسا مفید طریقہ نکل آیا جو حد سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوا۔

اگر غور کیا جائے تو اسی قسم کے اسباب کا سراغ صوفیہ کے دوسرے طریقوں میں بھی چلایا جاسکتا ہے میرے سامنے اس وقت مسئلہ کی تفصیل نہیں ہے بلکہ کہنا یہی ہے کہ "صوفی اور ملا" کے قصوں کے ختم کرنے میں میرا خیال ہے کہ اس رات کی حیثیت ایک خاص تاریخی رات کی ہے جس میں اپنی آنکھوں سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے صوفیوں کے ایک سرخیل حارث محاسبی اور ان کے رفقاء کے حال و قال دونوں کا معائنہ فرمانے کے بعد اپنے اس فیصلہ کا اعلان فرمایا جس سے غریب صوفیوں کے متعلق پھیلی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگیا۔ لیکن کہتے ہیں، خطیب نے تاریخ بغداد میں اس تاریخی رات کے متعلق جو روایت درج کی ہے اس کے آخر میں ہے کہ وہی اسمٰعیل بن اسحٰق السراج جن کے مکان پر حارث محاسبی اور ان کے رفقاء امام احمد کے اشارے سے جمع کیے گئے تھے اپنے ان ہی شاگرد اسمٰعیل کو مذکورہ بالا باتوں کے بعد حضرت امام نے یہ ہدایت بھی کی تھی۔

وعلی ما وصفت من احوالہم فانی لا اری لک صحبتہم (ص۲۱۵ ج۸ تاریخ بغداد)

یعنی حارث محاسبی اور ان کے ساتھیوں کے حالات کے متعلق میں نے جو کچھ بیان کیا (وہ تو تم نے سن لیا لیکن با ایں ہمہ) ان لوگوں کی صحبت میرا خیال

یہی ہے کہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔

یہی فقرہ جو خطیب والی روایت میں امام احمد کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ صوفیوں کی طرف سے جن کے دلوں میں گرانیاں ہیں ظاہر ہے کہ وہ تو قدرتاً اسی نتیجہ کو اس فقرے سے نکالیں گے کہ امام نے حارث اور ان کے رفقاء کے طریقہ کو پسند نہیں کیا۔ اسی لیے اپنے شاگرد اسمٰعیل السراج کو ان لوگوں کی صحبت سے دور رہنے کا حکم دیا، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اسی صورت میں اسی روایت کے ان اجزاء کا کیا مطلب ہوگا۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حارث اور ان کے رفقاء کے قال و حال دونوں ہی سے حضرت امام غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور کتنے زیادہ متاثر؟ آپ سن چکے کہ حضرت والا پر روتے روتے غشی طاری ہوگئی۔ میں نہیں خیال کرتا کہ اگر ان صوفیوں کا قال و حال اسلامی دائرہ سے باہر تھا تو امام جیسے محتاط بزرگ کا اس سے اثر پذیر ہونا ممکن بھی تھا۔ بلکہ ناواقفیت کی وجہ سے جیسے حضرت امام کے معاصر امام ابوزرعہ حارث محاسبی اور ان کے ہم مذاق بزرگوں کے طرز عمل اور ان کے اقوال یا کتابوں کو بدعات یا ضلالات قرار دے رہے تھے۔ امام احمد بن حنبل بھی یقیناً کچھ اسی قسم کا فتویٰ صادر فرماتے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ بجائے اس کے خود امام پر ان صوفیوں کے حال و قال سے گویا وہی کیفیت طاری ہوگئی جس کی تعبیر حال ہی کے لفظ سے صوفیہ میں عموماً کی جاتی ہے۔

قطعی طور پر تو مجھے کہنے کا حق نہیں ہے، بولنے والا ہی صحیح معنوں میں بتا سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا اس کا واقعی مطلب کیا تھا؟ لیکن جہاں تک قرائن و قیاسات کا اقتضاء ہے اپنی سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ محاسبی اور اس کے رفقاء کار کی دینی زندگی کا جو معیار اس تاریخی رات کے چشم دید مشاہدات نے امام احمد کے سامنے قائم کر دیا تھا۔ اسمٰعیل السراج کے خاص حالات کے لحاظ سے امام رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کی دینی زندگی کو ان کے لیے مناسب خیال نہیں فرمایا۔ اسی لیے ان لوگوں کی صحبت سے احتراز کا حکم آپ نے دیا[1]

---

[1] میرا مقصد یہ ہے کہ خطیب ہی نے تاریخ بغداد میں اسمٰعیل السراج کے حالات میں لکھا ہے کہ نیشاپور جو ان کا وطن تھا وہاں سے منتقل ہو کر بغداد آگئے تھے جہاں معاش کے لیے تجارت اور حدیث کے درس و تدریس کو دینی مشغلہ بنا رکھا تھا۔ اسی کے مقابلہ میں محاسبی کا رنگ یہ تھا خطیب ہی نے اس کا تذکرہ ان کے حالات کے ذیل میں کیا ہے کہ اپنے والد سے وراثت میں لاکھوں لاکھ دراہم کے مالک ہوگئے تھے، مگر بعض اعتقادی مسائل میں والد سے چونکہ اختلاف رکھتے تھے اس لیے لکھا ہے کہ ———

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

طریق غزالیہ کی مشکلات

بہرحال محاسبی اور ان کے ہم مذاق صوفیوں نے دینی زندگی کا جو بلند معیار قائم کیا تھا اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ان ہی لوگوں کی کتابوں کو پیش نظر رکھ کر احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت وغیرہ مرتب کی تھی اسی طریقہ کی تعبیر شیخ مرشدی نے جیسا کہ ابتداء کتاب میں آئے گا طریقۂ غزالیہ کے عنوان سے کی تھی دینی زندگی کی یہ ایک ایسی راہ ہے جس پر چلنے والوں کے لیے نہ معاشی مشغلوں ہی کے لیے زیادہ وقت نکل سکتا ہے اور نہ شرعی علوم مثلاً قرآن وحدیث وفقہ وغیرہ کی خدمت کا موقع صحیح معنوں میں ان مشاغل کے ساتھ میسر آسکتا ہے اگرچہ اس قسم کی یکسوئی تصوف کے طریقۂ غزالیہ ہی کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ دین تو دین واقعہ یہ ہے کہ جن علوم وفنون کا تعلق صرف دنیا ہی سے ہے مثلاً سائنس ہو یا کیمیا تاریخ ہو یا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ما اخذ منہ حبّۃ واحدۃ وقال اھل ملتین لا یتوارثان (صـ۲۱۴ ج ۸)

ایک حبّہ بھی والد کی متروکہ دولت سے حارث نے نہ لیا کہتے تھے کہ دو ملت والوں میں وراثت جاری نہیں ہوتی۔

بیان کیا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ حارث کی اس مالی قربانی اور استغنا کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر گواہی بھی دیا کرتے تھے کہ محاسبی نے اس متروکہ دولت پر جس زمانہ میں لات ماری اس وقت وہ

لمحتاج الی دانق فضۃ

چاندی کے چھوٹے سے چھوٹے سکے کے محتاج تھے۔

حضرت جنید کے حوالہ سے خطیب نے ایک طویل روایت درج کی ہے حاصل جس کا یہ ہے کہ حارث ہمیشہ فقر وفاقہ میں مبتلا رہتے تھے ایک دن ان کے سامنے جب وہ آئے تو چہرے سے معلوم ہوا کہ وہ بہت بھوکے ہیں حضرت جنید نے عرض کیا اگر میں کچھ کھانا حاضر کروں تو اس کی اجازت ہے؟ اجازت تو مل گئی لیکن مہمان کے اکرام کا خیال کرکے بجائے اپنے گھر کے حضرت جنید نے اپنے چچا کے ہاں سے مختلف قسم کے کھانوں سے سجا ہوا خوان لاکر پیش کر دیا ان کے چچا ایک دولتمند آدمی تھے عموماً ان کے باورچی خانے میں طرح طرح کے کھانے تیار رہتے تھے لیکن جوں ہی کہ یہ خوانچہ حارث کے سامنے لایا گیا دیکھا گیا کہ ایک لقمہ کو لے کر منہ میں گھماتے رہے لیکن نگل نہ سکے اور کھڑے ہو گئے، دروازہ پر پہنچ کر اس لقمہ کو بھی اگل دیا۔ حضرت جنید نے جب دریافت کیا تو بولے کہ

"بھائی میری ناک مشتبہ کھانے کی بو کو برداشت ہی نہیں کر سکتی۔" (صـ۲۲۴ ج ۸)

فلسفہ، دیکھا جا رہا ہے کہ جب تک ہر طرف سے یکسو ہو کر ان ہی میں ڈوب جانے والے انہماک کے ساتھ ڈوب نہیں جاتے ہیں معیاری کمال تک ان علوم میں بھی اپنے آپ کو نہیں پہنچا سکتے منتہو ہی ہے کہ سب کچھ جب تک نہیں دیا جاتا اس وقت تک کچھ حصہ بھی علم کا حاصل کرنا دشوار ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسناد کا مقام ہر علم میں بعضوں ہی کو حاصل ہو سکا ہے بھروسہ اور اعتماد ان ہی لوگوں پر کیا جاتا ہے اسی کا نام تقلید ہے [1]

سچ تو یہ ہے کہ تصوّف کی نوعیت بھی اگر وہی ہوتی جو فقہ وکلام تفسیر وحدیث وغیرہ علوم کی ہے تو اس میں کچھ حرج نہ تھا کہ ہم اس راہ میں بھی تصوّف کے مستند ماہرین اور ان ماہرین کے نکالے ہوئے نتائج کی تقلید پر قناعت کر لیتے۔ جیسے دین و دنیا کے دوسرے علوم میں ہم تقلید ہی سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن تصوّف صرف علم ہی تو نہیں ہے بلکہ علم کے ساتھ ساتھ دین کی معیاری زندگی تک اپنے آپ کو پہنچانے کے لیے اس میں عمل کی بھی ضرورت ہے اب ظاہر ہے کہ طریقۂ غزالیہ جو حارث محاسبی اور ان ہی جیسے بزرگوں کی راہ ہے اس کے مطابق اپنی عملی زندگی کو ڈھالنے میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو ہر طرف سے یکسو ہو کر اسی میں غرق ہو جائے عموماً اس راہ میں امتیاز ان ہی شخصیتوں کو حاصل بھی ہوا ہے۔ جن کی زندگی میں یکسوئی کا رنگ پیدا ہو گیا تھا اسی بنیاد پر بظاہر یہی خیال گزرتا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگردوں اسماعیل السراج کو آخر میں محاسبی اور ان کے رفقاء کی صحبت سے الگ رہنے کا جو حکم دیا تھا اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ اس رنگ میں رنگ جانے کے بعد اسماعیل اسی کے ہو رہتے۔ اپنے بال بچوں کی پرورش تجارت کی راہ سے جو وہ کر رہے تھے اسی معاشی ذریعہ سے بغداد

---

[1] تقلید درحقیقت آدمی کے جہل کی ایک قدرتی ضرورت ہے۔ فقہ ہی کی حد تک تقلید کو محدود خیال کرنا ایک جاہلانہ غلط فہمی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فقہ کے سوا، دوسرے دینی علوم مثلاً حدیث وتفسیر کلام سب ہی میں مقلد بننے پر عوام مجبور ہیں آخر امام بخاری کسی حدیث یا حدیث کے راوی کے متعلق جو فیصلہ صادر کر چکے ہیں کیا ان کے اس فیصلہ کو مسترد کرنے کی جرأت ہر عامی مسلمان کر سکتا ہے، یعنی وہی جس نے علم حدیث اور فن روایت کی تحقیق وتنقیح میں وہی کام نہ کیا ہو جو امام رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے اور یہی حال دوسرے دینی علوم کلا ہے اور دینی علوم ہی کیا؟ لوگ ڈاکٹروں طبیبوں کے علاج ومعالجہ میں تقلید ہی نہیں کرتے ہیں تو اور کیا کرتے ہیں جس نے طب کی تعلیم نہیں پائی ہے وہ کرے کیا؟ اگر اطباء کی تقلید نہ کرے تو کیا خودکشی پر راضی ہو جائے۔

میں فارغ البالی اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے اس مشغلہ سے بھی ان کا تعلق کمزور ہو جاتا اور دین کی خدمت اسی بغداد میں درس حدیث کی راہ سے جو انجام دیتے تھے اس خدمت کے مواقع بھی ان کے لیے ختم ہو جاتے گویا سمجھنا چاہیے کہ حضرت امام نہیں چاہتے تھے کہ دنیا اور دین کے اس کاروبار سے اسمٰعیل بے تعلق ہو جائیں اور اسی لیے طریقۂ غزالیہ والے ان صوفیوں کی صحبت آپ کے نزدیک اسمٰعیل السراج جیسے مشغول آدمی کے لیے مناسب معلوم نہ ہوئی۔

کیا "طریق غزالیہ" کے علاوہ بھی حصولِ احسان کی کوئی راہ ممکن ہے؟

مگر سوال یہی ہوتا ہے کہ دین کی معیاری زندگی کا نام " احسان " ہے یا دوسرے لفظوں میں چاہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ دین کی حیثیت آدمی کے لیے صرف قانون ہی کی نہ رہ جائے بلکہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا احسانی تعلق قائم ہو جائے۔

یا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مسئلہ کو سمجھاتے ہوئے ہوامع شرح حزب البحر میں یہ جو ارقام فرمایا ہے کہ جیسے برف کے ڈلے کو ہانڈی میں رکھ کر آگ پر چڑھا دیا جائے تو بتدریج برف گھلتے ہوئے پانی بن جاتا ہے اور پانی بھی آہستہ آہستہ بھاپ کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے تا آنکہ وہی برف جو پتھر کی طرح سخت اور ٹھوس تھا گرمی پہنچانے کے بعد دیکھا جاتا ہے کہ

ہوائے خالص گشت ہوا بن کر اڑ گیا۔

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ کچھ یہی رنگ انسانی نفوس کا بھی ہے کہ یہی عام نفوس ابتدائی حالات سے منتقل ہوتے ہوئے ترقی کر کے ایک ایسے درجہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں پہنچنے کے بعد یہی نفوس انسانی

درسطح عرش متلاشی و انانیت خود را فراموش ساخت

عرش کی سطح میں گم ہو جاتے ہیں جہاں اپنی انانیت کا شعور آدمی میں نہیں رہتا گویا اپنی ذات کے شخصی شعور کو وہ بھول گیا۔

شاہ صاحب کا بیان ہے کہ برف سے ہوا بننے تک جیسے پانی کو مختلف مدارج سے گزرنا پڑتا ہے اسی طرح انانیت فراموشی یعنی آدمی میں اپنی داشت یا انانیت کا شعور باقی نہ رہے اس درجہ تک انسانی نفوس بھی مختلف حالات سے گزرتے ہوئے ہی پہنچتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں کہ

ایں تدریجات ارادیہ مسمی بہ سلوک است و آں

سلوک (جو صوفیوں کی عام اصطلاح ہے) اس سے

حالات مختلفہ مسمیٰ بہ نسبتہا است (ص ۸ ہوامع)

مراد۔ نفوس کی یہی تدریجی ترقیاں ہیں اور "نسبت" کی اصطلاح سے صوفیہ کا اشارہ ان حالات ہی کی طرف ہے جن سے ان کے نفوس کو اس راہ میں گزرنا پڑتا ہے۔

انہوں نے ان ہی صوفیانہ نسبتوں کو سمجھاتے ہوئے لکھا ہے کہ

حالتے ہست کہ مسمیٰ بہ عشق باشد و حالتے ہست کہ مسمیٰ باستغراق و یادداشت باشد و حالتے ہست مسمیٰ بہ التجا و صدق و انقیاد و حالتے ہست تخلق باخلاق اللہ (ص ۸ ہوامع)

(سلوک کی راہ میں نفوس کو جن حالات سے گزرنا پڑتا ہے اصطلاحاً جن کی تعبیر "نسبت کے لفظ سے صوفیوں کے ہاں کی جاتی ہے) ان ہی حالات میں ایک حال کا نام عشق ہے، ایک کا استغراق اور یادداشت نام ہے اسی طرح التجا، صدق (سچائی) انقیاد (سرافگندگی) وغیرہ نام بھی ان ہی پیش آنے والے حالات کے ہیں۔ تخلق باخلاق اللہ (یعنی اپنے خالق کے اخلاق وصفات سے آراستہ ہوجانا) ایک نام ان ہی حالتوں میں سے ایک حال کا ہے۔

تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان ہی صوفیانہ نسبتوں کو حاصل کر کے سلوک کی راہ طریقۂ غزالیہ کے سوا کیا کسی اور طریقہ سے بھی طے کی جاسکتی ہے؟ دوسرے لفظوں میں چاہے تو کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے دوسرے دینی و دنیوی کاروبار میں مشغول رہتے ہوئے بھی کیا ان بیچاروں کے لیے بھی اس کا امکان ہے کہ وہ سلوک کی راہ طے کر کے دینی زندگی کے اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں جس کی تعبیر حدیثوں میں "الاحسان" کے لفظ سے کی گئی ہے اور قرآن مجید میں "المحسنون" کے لفظ سے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے مراد وہی لوگ ہیں جن کی دینی زندگی ستھری ہو کر حسن وجمال کے اس مقام تک ترقی کر جاتی ہے جس کا نام "الاحسان" ہے۔

سیدھے اور سادہ الفاظ میں گویا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صوفی بننے اور صوفیہ سلوک کی جس راہ کو طے کر کے جن نسبتوں کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں کیا ان ہی نسبتوں کے حصول کی گنجائش ان لوگوں کے لیے بھی پائی جاتی ہے۔ جو کسی وجہ سے دین اور دنیا کے عام مشاغل اور دھندوں سے اپنے

حالات کی وجہ سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتے۔

رجال اللہ" کی سہ گانہ تقسیم، شیخ اکبرؒ کی تشریحات میں

رجال لاتلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ (کچھ لوگ ہیں جنہیں تجارت اور بیع و فروخت کے مشغلے اللہ کی یاد سے غافل ہونے نہیں دیتے۔)

کا مطلب طبقہ صوفیہ کے اکابر واساطین نے جو بیان کیا ہے سب تو نہیں بلکہ اس سلسلہ میں بعض بزرگوں کی تصریحات کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یوں تو اب تک جو کچھ عرض کر چکا ہوں اسی سے سمجھ لیا ہوگا کہ طریقہ غزالیہ کے سوا بھی کوئی راہ اس باب میں کھلی رکھی گئی ہے شیخ مرشدی اور شاہ ولی اللہ جیسے مستند حضرات کے اقوال آپ سن چکے لیکن ان بزرگوں کے اشاروں میں اجمال کا رنگ غالب تھا اس اجمال کی تفصیل ممکن ہے مندرجہ ذیل شہادتوں میں مل سکتی ہو۔

سنیئے کسی مولوی مُلّا کا بیان نہیں بلکہ جس کی ہستی تصوف اور صوفیہ کے دائرہ میں ایک ایسی حیثیت حاصل کر چکی ہے کہ موافقین ہی نہیں بلکہ مخالفین بھی تصوف اور صوفیہ کا تصور ان کی شخصیت کے تصور کے بغیر شاداب کر نہیں سکتے۔ میرا اشارہ شیخ ابن عربی الاندلسی انطا کی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ہے جو اپنوں میں شیخ اکبر کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور غیروں میں خواہ ان کو کچھ بھی سمجھا جاتا ہو لیکن تصوف کے باب میں بہر حال ان کا قول ان غیروں پر بھی چاہیئے تو یہی کہ حجت ہو۔

انہی شیخ نے اپنی مشہور کتاب فتوحات مکیہ کی جلد ثانی باب ۳۰۹ میں "رجال اللہ" یعنی "مردان خدا" کی مختلف خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ

ان رجال اللہ ثلاثۃ لا رابع لھم — مردان خدا کی تین قسمیں ہیں ان کے سوا کوئی چوتھی جماعت ان میں پائی نہیں جاتی۔

پہلا طبقہ

پھر اپنے الفاظ میں ان میں سے ہر ایک طبقہ کا حال بیان کیا ہے پہلی قسم کی خصوصیتوں کو ظاہر کرتے ہوئے شیخ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے

ان لوگوں پر زہد (ترک دنیا) اور دنیاوی لذتوں سے علیحدگی کا جذبہ غالب ہو جاتا ہے۔ سارے اچھے کام جن کی شریعت میں تعریف کی گئی ہے ان کی تعمیل کرتے ہیں اسی طرح اپنے

باطن کو بھی ان صفات سے پاک رکھنے کی کوششوں میں مشغول رہتے ہیں جن کی شریعت میں مذمت کی گئی ہے۔

مگر اسی کے ساتھ جیسا کہ شیخ ہی نے بیان کیا ہے:-

" مذکورہ بالا ظاہری اعمال معنوی صفات و اخلاق کی تصحیح کے سوا احوال و مقامات اور وہبی و لدنی علوم و معارف، اسرار و مکاشفات وغیرہ جیسی چیزوں کے متعلق کسی قسم کی واقفیت ان میں نہیں پائی جاتی۔"

شیخ نے لکھا ہے کہ " رجال اللہ " یا " مردان خدا " کے اسی طبقہ کو

یقال لہم العباد عباد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

عبّاد یا عبادت گزاروں کی اس جماعت کی ایک خصوصیت شیخ کے بیان کے مطابق یہ بھی ہے کہ " دعا کرانے کے لیے ان کے پاس جب کوئی آتا ہے تو عموماً اسے جھڑک دیتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ بھائی! میری کوئی حقیقت بھی ہو، بھلا اس قابل کب ہوں کہ کسی کے لیے دعا کروں۔"

لکھا ہے کہ یہ طریقہ حاجت مندوں کے سامنے اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ خود پسندی خود بینی کے جذبات کے ابھرنے کا خطرہ ان کے پیش نظر رہتا ہے ہر وقت نفس کی بری خواہشوں اور نکوہیدہ اقتضاآت کے استیلاء کا خوف ان کے دل پر غالب رہتا ہے ریاکاری خود نمائی ان کی دینی زندگی میں کہیں شریک نہ ہو جائے اس سے وہ ڈرتے ہیں۔

آخر میں شیخ نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ:-

" عموماً اس طبقہ کے لوگوں کو تم دیکھو گے کہ ایسی کتابیں جیسی کہ محاسبی کی " کتاب الرعایۃ "[1] وہ اس کے مطالعہ میں مشغول ہیں۔"

---

[1] شیخ نے نام تو امام غزالی کی کتابوں کا اس موقع پر نہیں لیا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ محاسبی ہی کے نقش قدم پر امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابیں احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت وغیرہ مرتب کی ہیں یہی وجہ ہے کہ امام کی ان کتابوں کے شائع ہو جانے کے بعد اس سلسلہ کی کتابوں کا مطالعہ لوگوں نے ترک کر دیا تھا۔ کیونکہ اپنی عالمانہ مہارتوں سے کام لے کر جیسا کہ شروع کتاب ہی میں عرض کیا گیا ہے امام نے ان ساری کتابوں کا بہترین خلاصہ اپنی کتابوں میں درج کر دیا تھا۔ طریقہ بیان

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دوسرا طبقہ

العباد (عبادت گزاروں) کے اس طبقہ کے بعد رجال اللہ (مردان خدا) کی دوسری قسم کی نشاندہی کرتے ہوئے شیخ نے لکھا ہے کہ :-

"عباد کی مذکورہ بالا جماعت سے بلند درجہ رجال اللہ کی دوسری قسم کا ہے جن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کائنات کی ساری کارفرمائیوں میں وہ دیکھتے ہیں کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہو رہا ہے ان میں یہ احساس قائم ہو جاتا ہے کہ خود کسی قسم کے فعل سے قطعاً ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

شیخ کا بیان ہے کہ منطقی نتیجہ ان کے اس احساس اور دریافت کا یہ ہوتا ہے کہ :-

زال عنھم الریاء جملة واحدة — ریاکاری اور خودنمائی کا کوئی سوال ہی ان کے سامنے باقی نہیں رہتا۔

کسی فعل اور کام میں جب اپنی خودی کا احساس ہی انسان سے غائب ہو جاتا ہے۔ سب کچھ اللہ ہی کر رہا ہے، یہی ان کی یافت اور ان کا وجدان بن جاتا ہے تو اپنے آپ کو دکھانے یا ناز یا ان کرنے کے خیال کی گنجائش ہی ان کے کاروبار میں کیا باقی رہتی ہے۔

شیخ نے لکھا ہے کہ شرعی اعمال وافعال اور دینی مطالبات کی تعمیل میں ان کی جدوجہد اور کدوکاوش کی نوعیت وہی ہوتی ہے جو نوعیت رجال اللہ کے پہلے طبقہ کی اس راہ میں ہوتی ہے ترک دنیا، پرہیزگاری، پارسائی، توکل، اور ان کے سوا دوسرے امور جو اس راہ کی عام باتیں ہیں ان سب میں یہ وہی سب کچھ کرتے ہیں جس کا پہلا طبقہ (عباد) پابند ہوتا ہے۔

مگر توحید افعالی یعنی آدمی کے اندر اور باہر جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب اللہ ہی کے حکم اور ارادہ واذن سے ہو رہا ہے اس کیفیت میں استغراق کا نتیجہ جیسا کہ شیخ نے لکھا ہے یہ ہوتا ہے کہ سلوک کی راہ پر چلنے والے جب ان پر پیش آنے والی دشواریوں کو پیش کرتے ہیں تو لاپرواہی کے ساتھ ان کو اس قسم کی قرآنی آیتیں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

بھی ان کا جیسا کہ چاہیئے حد سے زیادہ دلنشین اور دل آویز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابن عربی کے زمانہ تک تو محاسبی وغیرہ کی کتابیں بھی لوگوں کے استعمال میں تھیں لیکن اب تو کتب خانوں میں بھی قلمی نسخے کتاب الرعایة وغیرہ جیسی کتابوں کے مشکل ہی سے مل سکتے ہیں۔

سنا سنا کر ٹال دیا کرتے ہیں مثلاً

اغیر اللہ تدعون ان کنتم صادقین۔ (الانعام) کیا اللہ کے سوا غیر کو پکارتے ہو اگر تم سچوں میں ہو۔

یا پڑھ دیتے ہیں

قل اللہ ثم ذرھم فی خوضھم یلعبون (الانعام) بول اللہ، اور چھوڑ دے ان کو اپنی سخن سازیوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے۔

شیخ نے لکھا ہے کہ اسی کے ساتھ رجال اللہ کے پہلے طبقہ یعنی العباد میں اور اس دوسرے طبقہ کے رجال اللہ میں ایک فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ عباد کی طرح وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ جس حال میں وہ ہیں اس کے سوا اور کچھ ہے بلکہ

یرون ان شیئاً فوق ماھم علیہ من الاحوال والمقامات والعلوم والاسرار والکشوفات والکرامات وہ سمجھتے ہیں کہ جس حال میں وہ ہیں اس سے بھی بلند تر مدارج ہیں جن سے ان احوال اور مقامات علوم و اسرار اور مکاشفات کا تعلق ہے (جو اہل اللہ کی طرف منسوب ہیں)

چونکہ وہ ان چیزوں کے منکر نہیں ہوتے اس لیے بقول شیخ رجال اللہ کے اس دوسرے گروہ کے اندر ذوق ان چیزوں کا پایا جاتا ہے اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کو بھی وہ حاصل کریں آگے شیخ ہی کا بیان ہے کہ کد و کاش سے اس سلسلہ کی کوئی چیز اگر ان کو مل جاتی ہے تو بجائے چھپانے اور مخفی رکھنے کے وہ

ظھروا بہ فی العامۃ من الکرامات اپنی کرامتوں کو عام لوگوں میں ظاہر کرتے ہیں[1]

چونکہ نقطۂ نظر ہی ان کا بقول شیخ یہ ہوتا ہے کہ

جو کچھ ہو رہا ہے سب اللہ میاں ہی کر رہے ہیں تو خدا کے کاموں کے چھپانے کی ضرورت ہی کیا ہے[2]۔

مطلب وہی ہے کہ اپنی خود نمائی اور خود بینی کا سوال ہی جب ان کے سامنے باقی نہیں رہتا تو خدا کی کارفرمائی کو چھپانے سے کیا فائدہ جو ذرہ ذرہ پتہ پتہ میں نمایاں ہیں۔

---

[1] یعنی ان کے اخفا کا اہتمام نہیں کرتے۔ (غ۔م)

[2] "کیونکہ اخفا (یعنی چھپانے) کا اہتمام بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی غیر کا خیال باقی ہے۔"

وھذا قول المرشد العارف العلامہ السید سلیمان الندوی قدس سرہٗ (غ۔م)

شیخ نے لکھا ہے کہ عوام الناس میں "صوفیہ" کے خاص نام سے رجال اللہ کا یہی طبقہ مشہور ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ گو

ھم اھل خلق وفتوۃ — یہ بلند کردار اور جوانمردی والے لوگ ہیں۔ یہ ستودہ صفات اور عالی ہمت لوگ ہیں۔

تیسرا طبقہ

لیکن تیسرا طبقہ رجال اللہ یا مردان خدا کا وہ ہے جن کی خصوصیتوں کو شیخ نے اس کے بعد بیان کیا ہے اس تیسرے طبقہ یعنی "صوفیہ کے اس تیسرے گروہ کے متعلق یہ خیال پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ

اصحاب رعونات واصحاب نفوس — یعنی رعونت یا خودپسندی سے کلیتہً پاک نہیں ہوتے ہیں اور یہ اصحاب نفوس ہوتے ہیں یعنی نفسانیت کا اثر ان میں باقی رہتا ہے [1]

لکھا ہے کہ اسی وجہ سے ان کے تلامذہ اور مریدوں کو دیکھا جاتا ہے کہ :-

یشمرون علی کل احد من خلق اللہ و یظھرون الریاسۃ علی عباد اللہ۔ — اللہ کی ہر مخلوق کے مقابلہ میں کمر کس کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اللہ کے بندوں پر اپنی برتری جتاتے ہیں۔

تیسرے گروہ رجال اللہ کے سلبی و ایجابی علامات

شیخ نے اس سلسلہ میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس کو ذہن نشین کرانے کے لئے ہم اس گروہ کے آثار و علامات کو شیخ ہی کے کلام کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یعنی کچھ تو اس گروہ کے سلبی اور منفی صفات ہیں پہلے ہم ان ہی کو نمبروار درج کرتے ہیں۔ شیخ نے بھی پہلے ان ہی علامات کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں۔

(۱) نمازوں میں ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ پانچ وقت کے فرائض اور ان کی سنتیں جنہیں رواتب کہتے

---

[1] یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ خیال خود شیخ کا نہیں ہے شیخ کا قول آگے آرہا ہے کہ فھم طبقۃ العلیاء (سب سے اونچا طبقہ ان ہی لوگوں کا ہے) (غ۔م)

ہیں بس ان نمازوں سے زیادہ نمازوں میں مشغول ہوتے ہوئے ان کو نہیں پایا جاتا۔

(۲) اور نمازوں ہی کی حد تک نہیں بلکہ سارے دینی مطالبات اور فرائض کے متعلق ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ عوام کے مقابلہ میں کسی قسم کا امتیاز ان کے طرز عمل سے پیدا نہ ہو گویا ایک عامی مسلمان ان فرائض کو جس طرح ادا کرتا ہے اسی طرح وہ بھی ان کو ادا کرتے ہیں اور مذہب کے ان مطالبات کی تکمیل میں اپنے آپ کو ان ہی عامیانہ حدود تک محدود رکھتے ہیں بلکہ ان ہی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

(۳) وہ عام لوگوں کی طرح بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں اور لوگوں سے بات چیت میں چاہتے ہیں کہ امتیاز کا رنگ بھی نہ پیدا ہو۔

(۴) اس کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر دیکھنے والی آنکھ ان کو اسی نظر سے دیکھے جیسے ایک عام آدمی کو دیکھتی ہے۔

(۵) لباس میں اسی وضع قطع کو اختیار کرتے ہیں جس کا رواج عام آبادی میں ہوتا ہے جس شہر میں داخل ہوتے ہیں اس شہر کے عام لوگوں کے لباس کو قبول کر لیتے ہیں۔

(۶) مسجد میں اپنی نماز کے لئے کسی خاص مقام کا انتخاب نہیں کرتے بلکہ جہاں بھی جگہ مل جاتی ہے وہیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جمعہ کے دن خاص طور پر کوشش کرتے ہیں کہ ان کی کوئی خاص جگہ متعین نہ ہو جائے یہ لوگ عوام میں اپنے آپ کو گم کئے رہتے ہیں اور انہی میں گھلے ملے رہتے ہیں[۱]

ان سلبی اور منفی خصوصیتوں کے بعد رجال اللہ کے اس گروہ کے جن اثباتی اور ایجابی علامات کا ذکر شیخ نے کیا ہے اپنے الفاظ میں ان کو بھی ہم نمبروار درج کرتے ہیں۔

(۱) دل میں اندر ہی اندر تنہا اللہ کے ساتھ اپنے آپ کو اس طریقے سے باندھے رکھتے ہیں کہ خدا کے سوا گویا ان کے اندر اور کچھ نہیں ہے۔

(۲) اس معاملے میں پوری قوت کے ساتھ اپنے قدم کو جماتے ہیں ایسا کامل رسوخ ان کو حاصل ہو جاتا ہے کہ ان کو لاکھ ہلایا جائے لیکن ہل نہیں سکتے۔

---

[۱] پچھلی دو سلبی خصوصیتوں کا ذکر شیخ نے ان ہی لوگوں کے حالات کے ذیل میں دوسری جگہ کیا ہے۔ دیکھو فتوحات ج ۱ صفحہ ۲۳۶ میں نے وہیں سے اخذ کر کے ان کو یہاں درج کر دیا ہے۔

(۳) اپنے مالک اور معبود کے ساتھ بندگی کے علاقے اور رشتہ کو ہمیشہ تر و تازہ رکھتے ہیں، اس احساس سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوتے۔

(۴) خدا کی پروردگاری اور آقائی کے دباؤ اور وزن سے ان کے قلوب ہمہ دم مغلوب رہتے ہیں۔ خدا کے سامنے اپنی ہیچ میرزی، خاکساری، محتاجی، ذلت کا احساس ان میں ہر وقت ہر حال میں بیدار رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی برتری اور فضیلت کے خطرے کی گنجائش کا دروازہ ہی ان پر بند ہو جاتا ہے۔ بڑے بن کر جینے کی ہوک ان میں کبھی نہیں اٹھتی۔

(۵) مگر بایں ہمہ علل و اسباب کے جن قوانین کی پابند بنا کر یہ دنیا پیدا کی گئی ہے اس نظام کے احترام میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ اور جس کام کے لیے قدرت نے جس قانون کو مقرر کر دیا ہے اس کی طرف سے کبھی لاپرواہی اختیار نہیں کرتے اگرچہ کھانے پینے، سوتے جاگنے، بات چیت کرنے الغرض ہر حرکت و سکون میں ان کی نظر کے سامنے یہ مشاہدہ بھی مسلسل قائم رہتا ہے کہ یہ سب جو کچھ بھی ہو رہا ہے خدا ہی کی طرف سے ہو رہا ہے (وہی کھلاتا ہے، وہی پلاتا ہے، وہی جگاتا ہے، وہی سلاتا ہے) لیکن بایں ہمہ جس چیز کے لیے جو سبب بھی مقرر کر دیا گیا ہے اس سبب کے اختیار کرنے میں وہ کامل احتیاط سے کام لیتے ہیں اسباب کی حکمتوں کو وہ خوب پہچانتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ قدرت کی طرف سے جس چیز کا سبب جس شئے کو بھی بنایا گیا ہے۔ اس میں خدا کی مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔

شیخ اکبر کی نظر میں تیسرا گروہ ہی سب سے زیادہ قابل تعریف ہے

شیخ نے علاوہ اس باب کے فتوحات ہی کے دوسرے مقامات میں رجال اللہ کے اس گروہ کی ان ہی خصوصیتوں کا ذکر دوسرے الفاظ میں بھی کیا ہے[1]۔ اس مقام پر بھی اور دوسری جگہوں میں بھی اہل اللہ کے اس خاص گروہ کی مدح و ستائش میں اتنا کچھ

---

[1] خصوصاً قدرتی قوانین کے اقتضاؤں کی تکمیل میں لکھا ہے کہ ان کا مذاق کلیتہً وہی ہوتا ہے کہ جو عوام کا ہوتا ہے فرق ظاہر میں نہیں بلکہ باطن میں یہ ہوتا ہے کہ خدا اور بندوں کے درمیان اسباب کا یہی نظام عامیانہ مذاق کی رو سے پردہ بنا ہوا ہے اور رجال اللہ ان اسباب ہی کی راہ سے خدا کو پاتے ہیں۔ شیخ کے بعض فقرے یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ فانہ من رفع السبب عن الموضع الذی وضعه فیه واضعه وهو الحق فقد سفه نفسه وجهل قدره (یعنی سبب کو رکھنے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لکھا ہے کہ سب کا نقل کرنا یہاں ناممکن ہے اس موقع پر دیکھئے مذکورہ بالا سلبی وایجابی علامتوں کو بتانے کے بعد فرماتے ہیں:۔

فهم الطبقة العليا و سادات الطريقة المثلیٰ والمكانة الزلفیٰ، فی العدوة الدنيا والعدوة القصوی ولهم اليد البيضاء فی المواطن اهلها۔ (ص۴۷ ج۳ فتوحات)

(اہل اللہ میں) سب سے اونچا طبقہ ان ہی کا ہے یہی لوگ معیاری طریقہ کے سادات اور سردار ہیں۔ (حق سبحانہ تعالیٰ کے پاس) سب سے زیادہ قریب ہیں، نزدیک کے میدان میں بھی اور اس میدان میں بھی جو دور ہے ہر مقام اور اس کے مقام والوں کے جاننے اور پہچاننے میں بہترین دستگاہ رکھتے ہیں۔

جس کا مطلب یہی ہے کہ رجال اللہ یا مردان خدا کے مذکورہ بالا وطبقات کے بزرگوں کو بھی شیخ رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ مردان خدا ہی میں شمار کرتے ہیں لیکن تیسرے طبقہ کے وہ سب سے زیادہ مداح ہیں مان بھی لیا جائے کہ یہ شیخ کا ذاتی مذاق ہو، لیکن اس سے اتنی بات تو بہرحال ثابت ہو جاتی ہے کہ خود صوفیوں میں بھی ایسے افراد گزرے ہیں جن کے نزدیک دین کے احسانی مقام تک ترقی کر کے پہنچنے کے لیے اس سے زیادہ وقت دینے کی ضرورت نہیں جتنا وقت بہرحال ایک مسلمان کو اپنے دین کے فرائض و واجبات اور سنن کے ادا کرنے کے لیے دینا ضروری ہے شیخ کے ان الفاظ کو پڑھیئے یعنی رجال اللہ کی اسی تیسری قسم کے متعلق انہوں نے لکھا ہے، میں بجنسہ ان کے الفاظ ہی نقل کر دیتا ہوں۔

لایزیدون علی الصلوات الخمس الا الرواتب لا یتمیزون عن المومنین المؤدين فرائض الله بحالة زائدة (ص۴۵ ج۳)

پانچ وقت کی فرض نمازوں پر بجز رواتب (یعنی ہر فرض کے بعد موکدہ سنن نماز جو پڑھی جاتی ہیں) اور کسی قسم کا اضافہ اپنی نمازوں میں نہیں کرتے اور اللہ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) خدا نے جس مقام پر رکھا ہے اور جس چیز کی پیدائش کا ذریعہ اس کو قرار دیا ہے جو اس مقام سے سبب کو اٹھاتا ہے وہ اپنے آپ کو بھی احمق بنا رہا ہے اور حق سبحانہ تعالیٰ کی عظمت قدر میں ناواقفیت کا ثبوت پیش کر رہا ہے موحد اور مشرک میں یہی فرق کیا ہے اسی موقع پر شیخ نے اس کا جواب دیا ہے، من اعتمد علیه فقد اشرك (اسباب ہی پر جس نے بھروسہ کر لیا وہی مشرک ہو گیا) لیس بھروسہ تو خدا ہی پر رکھنا چاہیئے اور خدا نے جس چیز کے لیے جس شئے کو بھی مسبب بنایا ہے اس سے بھی لاپرواہی نہ اختیار کرنی چاہیئے۔ (دیکھو فتوحات ص۱۲ ج۲)

کے عائد کیے ہوئے فرائض و مطالبات کو اسی طرح ادا کرتے ہیں جیسے عام مسلمان ان کو پورا کرتے ہیں ان عام مسلمانوں کے مقابلہ میں کسی قسم کا امتیاز اپنے اندر پیدا نہیں کرتے۔

تو مطلب اس کا آپ ہی بتایئے اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ شیخ کے نزدیک اہل اللہ کے سب سے اونچے طبقے میں بھی شریک ہونے کے لیے چوبیس گھنٹوں میں صرف اسی قدر وقت دینے کی ضرورت ہے جس میں پانچ وقتوں کی نمازیں سنتوں کے ساتھ ادا ہو جائیں۔ گویا چوبیس گھنٹوں میں صرف دو ڈھائی گھنٹے بھی روزانہ مقرر کر لیے جائیں اسی طرح سال بھر میں ایک مہینہ کا روزہ استطاعت ہو تو عمر بھر میں ایک دفعہ حج اور مالی حیثیت اچھی ہو تو غرباء کا جو حق اسلام نے مالداروں کے مال میں قائم کیا ہے حقداروں تک وہ پہنچا دیا جائے! الغرض ایک عامی مسلمان پر جو عبادتیں فرض کی گئی ہیں ان عبادتوں کی پابندی اسی طرح ایک شریف آدمی کو جس قسم کی اخلاقی زندگی گزارنی چاہیئے اخلاقیات کی اسلامی تعلیم کے مطابق اس کی پابندی سے زیادہ تو ظاہری اعمال کے لحاظ سے گویا اور کچھ نہیں کرنا پڑتا الغرض بقول شیخ سلوک کی اس راہ میں شرط اول یہی ہے کہ:-

لیس لہم فی العامۃ حالۃ یتمیزون بہا۔ (ص ۴۶)

عوام کے مقابلہ میں کوئی ایسا طرز عمل اور حال اختیار نہ کیا جائے جو عامیوں کو ان سے جدا کر دے

تو جیسے ایک عامی مسلمان کاروباری زندگی میں انہماک رکھتے ہوئے اپنے آپ کو مسلمان باقی رکھ سکتا ہے اور اسلام کے مطالبات کی تکمیل کرتا ہے تصوف کے اس خاص طریقہ میں بھی داخل ہونے اور سلوک کی اس راہ کے اختیار کرنے میں بھی معاشی اور علمی مشاغل سے کنارہ کشی کی آپ خود سوچیے ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے مقام احسان تک پہنچنے کے لیے خصوصی اعمال و افعال جو کچھ بھی اس راہ میں کیے جاتے ہیں ان کا تعلق ظاہر سے نہیں بلکہ باطن سے ہے یعنی ذہنی اور فکری قوتوں کو خاص مشغلہ میں مصروف رکھنا پڑتا ہے ورنہ ظاہر حالات کے لحاظ سے جیسا کہ شیخ ہی نے اس طبقہ کا ذکر کرتے ہوئے دوسری جگہ لکھا ہے کہ:-

ظاہرہم فی خیمات العادات والعبادات من الاعمال الظاہرۃ والمصابرۃ علی الفرائض

اپنے ظاہر کو عوام کی عادتوں اور عبادتوں کے خیمہ ہی میں بند رکھنا پڑتا ہے اور فرائض یا جو ان کے ساتھ نوافل ہیں

منہاوالنواقل (ص ۲۳۵) ان ہی پر صبر کیے بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔

اس طریق کا امتیاز اس راہ میں نہ کشف ہی کی آرزو پیدا ہوتی اور نہ کرامتوں ہی کے صدور کا ولولہ ان میں پایا جاتا ہے۔

شیخ نے لکھا ہے کہ اسی وجہ سے :-

فلا یعرفون بخرق عادة فلا یعظمون ولا یشار الیہم بالصلاح الذی یخف عن العامہ۔

ان لوگوں کی شہرت خرق عادت یعنی کرامتوں میں بھی نہیں ہوتی اور نہ لوگوں کے قلوب میں ان کی عظمت ہوتی ہے اور عوام کے نزدیک صلاح و پارسائی کا جو عامیانہ معیار ہے اس پر بھی پورے نہیں اترتے اس لیے اس لحاظ سے بھی انگلیاں ان کی طرف نہیں اٹھتیں۔

شیخ نے لکھا ہے کہ "ملامیتہ[1]" کے نام سے درویشوں کو چاہیئے کہ اسی تیسرے طبقہ کو موسوم کیا جائے کیونکہ عبّاد تو اپنی عبادت وزہد کی وجہ سے شہرت وامتیاز حاصل کر لیتے ہیں اور کشف وکرامت کی وجہ سے دوسرا طبقہ عوام میں عظمت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے لیکن رجال اللہ کے اس تیسرے طبقہ کو ان تمام امور سے محرومیوں پر صبر کرتے ہوئے زندگی گزارنی پڑتی ہے ع

آوارۂ مجنوں نے رسوا سر بازار سے

کے صحیح مصداق اگر ہو سکتے ہیں تو یہی لوگ ہو سکتے ہیں۔

بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا اس باب میں ایک شیخ اکبر ہی منفرد نہیں یوں تو دوسرے بزرگوں کی شہادتیں پیش کی جا سکتی تھیں لیکن طول وطویل باتوں سے بچتے ہوئے آخر میں خود اپنے وطن ہندوستان کے اس دینی وعلمی خانوادہ کے ایک رکن رکین کی گواہی کو درج کر کے اس بحث کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ میری مراد

---

[1] صوفیوں میں ملامیتہ کے نام سے ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جو دینی مطالبات نماز وروزہ سے بے تعلق ہو کر خدا اور اس کے رسول کے ساتھ وفاداری کا دم بھرتا تھا لیکن درحقیقت شرعی قوانین سے بغاوت کی یہ ایک شکل تھی۔ شیخ کے ہاں "ملامتیہ" کا اطلاق ان لوگوں پر کیا گیا جن کی دینی زندگی عوام کی نگاہوں میں نظر امتیاز سے نہیں دیکھی جا سکتی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادہ کے مشہور بزرگ اور شاہ صاحب کے منجھلے صاحبزادے حضرت مولینا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہے جس خاندان کی جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ انسانی زندگی کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں کے سنوارنے کی طرف اس خانوادہ میں مساوی توجہ صرف کی جاتی تھی جس شہادت کو آئندہ پیش کر رہا ہوں خود یہی اس دعویٰ کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ ہزارہا ہزار اوراق کے پڑھنے کے بعد بھی منقح نتیجہ تک جس مسئلہ میں لوگ نہیں پہنچ سکتے تھے دیکھئے کیسے دو لوٹک لفظوں میں چند سطروں ہی کے اندر سب کچھ کہہ دیا گیا ہے۔

بیعت کی قسمیں شاہ رفیع الدینؒ کے نقطہ نظر سے

شاہ رفیع الدینؒ جو اپنے ترجمہ قرآن کی وجہ سے بھی پہچانے جاتے ہیں ان ہی کے چند رسائل کا ایک مطبوعہ مجموعہ ہے جس میں "بیعت" کے نام کا بھی ایک رسالہ پایا جاتا ہے۔ ڈیڑھ دو ورق سے زیادہ ضخامت اس رسالہ کی نہیں ہے زبان سیدھی سادی فارسی ہے۔

اسی رسالہ میں اس سوال کا یعنی "بیعت" یا "پیری مریدی" کا جو طریقہ مسلمانوں میں عموماً مروج ہے اس کا فائدہ کیا ہے شاہ صاحب نے اسی سوال کا جواب دینا چاہا ہے۔

بیعت معیشت

انہوں نے دریافت کیا ہے کہ بیعت حاصل کرنے والے کی غرض و غایت کیا ہے؟ پھر خود ہی فرماتے ہیں، ایک مقصد تو اس کا عامیانہ ہے۔ حاصل جس کا شاہ صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ "برائے تحصیل مال وجاہ یا برائے تحصیل حاجات دنیوی" بعض لوگ سلسلہ کے بزرگوں سے ربط ضبط پیدا کرتے ہیں ان کے ہاں آمد و رفت رکھتے ہیں یا مرید بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر غرض ان کی وہی دنیا طلبی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی پیری یا مریدی یا بیعت "فی الحقیقت اعتبارے ندارد"

گویا کہنے کو تو اس قسم کی بیعت پر بھی بیعت ہی کے لفظ کا اطلاق کر دیا جاتا ہے اور اس غرض سے مرید ہونے والے بھی مشہور کرتے پھرتے ہیں کہ ہم فلاں بزرگ کے مرید ہیں لیکن درحقیقت نہ ان کی بیعت ہی بیعت ہے اور نہ مریدی ان کی مریدی ہے [1]

---

[1] شاہ صاحب نے تو کوئی خاص نام اس بیعت کا نہیں رکھا ہے لیکن چاہا جائے تو شاید "بیعت معیشت" اس کا
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بیعت وسیلت

اس کے بعد بیعت کی ایک قسم کا نام بیعت " وسیلت " رکھتے ہوئے شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ :-

رب العزت جل شانہٗ باہر یکے از ائمہ طرق بشارتہا، ووعدہ ہائے برد احسان است۔

یعنی صوفیہ کے مشہور طرق وسلاسل کے ائمہ اور پیشوا بطور احسان کے حق تعالیٰ کی طرف سے بعض بشارتوں اور وعدوں سے سرفراز ہیں۔

بعض لوگوں میں یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ کاش ان بشارتوں اور وعدوں سے استفادہ کا موقع ان کو بھی ملتا۔ پھر ان ہی ائمہ طرق وسلاسل کے جن مشائخ تک پہنچ سکتے ہیں ان کو ان گزرے ہوئے بزرگوں کا نائب اور نمائندہ خیال کرکے لوگ بیعت کی سعادت اس نیت سے حاصل کرتے ہیں کہ شاید ان بشارتوں اور وعدوں سے استفادہ وانتفاع کی کوئی صورت ان کے لیے بھی نکل آئے۔ اس نیت سے بیعت جو کیجاتی ہے اس کو بیعت وسیلت کے نام سے موسوم کرتے ہوئے شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ :-

ثمرۂ آں اتصال باآں بزرگاں ست در قبر د حشر د امداد ایشاں ایں طالب را اوقتاً بعد وقت (ص۲۷)

فائدہ اس بیعت کا یہ ہے کہ (طریقہ کے ائمہ اور بزرگوں) سے قبر اور حشر میں بیعت کرنے والوں کو ایک قسم کا اتصالی رشتہ قائم ہوجاتا ہے اور طالب یعنی مرید کو دفتاً فوقتاً ان بزرگوں سے امداد ملتی رہتی ہے ۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نام رکھ دیا جاسکتا ہے۔ (گیلانی)

پہلے بھی ہوگا مگر آج کل تو یہ حقیقت کھلی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے کہ تجار اور امراء یا پھر افلاس زدہ لوگوں کی بیعت عام طور پر بیعت معیشت ہی ہوتی ہے اور ایسے لوگوں کا رجوع ان بزرگوں کی طرف نہیں ہوتا جہاں کسب معاش کے ذرائع اور صرف دولت ہی کے مدات پر شرعی گرفت کی جاتی ہے اور نفلی اشغال و اوراد سے پہلے فرائض و واجبات کی پابجائی اور منہیات شرعیہ سے عملی توبہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

اسی لیے بزرگان دین نے سچے پیر کی پہچان کے جو معیارات لکھے ہیں ان میں اس معیار کو بھی پوری اہمیت دی ہے کہ اس بات کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے کہ اس پیر کی طرف رجوع کرنے والے اہل علم و اخلاص ہیں یا اہل دنیا اور غرض پرست! اللہ تعالیٰ ایسے پیروں اور ایسی پیری مریدی سے بچائے۔ زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند حق را بسجودے ونبی را بدرودے

(غ.م)

[1] بزرگوں سے لوگوں کو امداد پہنچتی ہے دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ اس قسم کی باتوں کو سن کر خواہ مخواہ بھڑک اٹھتے ہیں ان کو اس قسم کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بہرحال "بیعت وسیلت" شاہ صاحب کے نزدیک پیری مریدی کی ایک ایسی شکل ہے جسے کلیتہً بے فائدہ قرار نہیں دیا جا سکتا جیسے بیعت کی پہلی قسم محض بے معنی ہوتی ہے یہ رنگ "بیعت وسیلت" کا نہیں ہے۔ بلکہ دنیا اور آخرت میں اس بیعت سے بھی بیعت کرنے والوں کو فائدہ پہنچتا ہے ایسا فائدہ جس کی توقع "بیعت" کی سعادت حاصل کیے بغیر نہیں کی جا سکتی۔

بیعت شریعت

اس کے بعد بیعت ہی کی تیسری قسم جس کا نام اصطلاحی شاہ صاحب نے "بیعت شریعت" رکھ دیا ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہوتا یہ ہے کہ:۔

مرد عامی کہ عمر را در غفلت و معصیت گذارد و ہر گاہ بر ایں حال تنبیہ می شود ندامت می کشد، و رجوع بہ تقوی و طاعت می خواہد۔

ایک عام مسلمان آدمی جس کی عمر غفلت اور نافرمانیوں میں گزرتی ہے کبھی اس میں چونک پیدا ہوتی ہے اپنے حال پر نادم ہوتا ہے اس وقت اس کا جی چاہتا ہے کہ پرہیزگاری اور فرمانبرداری میں اپنی زندگی کا باقی حصہ گزار دے۔

مقصد شاہ صاحب کا یہ ہے کہ ندامت اور شرمندگی کے اس حال کے طاری ہونے کے بعد شوق اور ولولہ اس کا پیدا ہوتا ہے کہ شرعی مطالبات کے مطابق اپنی زندگی آدمی گزارے اگرچہ بظاہر یہ خیال گزرتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) خیالات میں مشرکانہ عقائد کے جراثیم نظر آتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ وفات یافتہ بزرگوں کی قبروں کے ساتھ ایسے معاملات جو کیے جاتے ہیں یعنی سجدے تک بھی باوجود مسلمان ہونے کے لوگ ان ہی قبروں کے آگے کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام میں بھی یہ ساری باتیں جائز رکھی گئی ہیں تو غریب مشرکوں کا قصور اس سے زیادہ اور کیا ہے کہ بجائے قبروں کے بتوں کو سجدے کرتے ہیں اپنے معبودوں کو مشرکین بھی عالم کا خالق نہیں سمجھتے بلکہ ان کو مخلوق مانتے ہوئے نفع حاصل کرنے کے لیے ان بتوں کو پوجتے ہیں مگر اسی کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ قرآن ہی سے جب یہ معلوم ہوتا ہے، کہ دنیا اور آخرت میں ملائکہ اہل ایمان کی مدد کرتے ہیں۔ بدر میں مسلمانوں کی اعانت کے لیے ملکوتی روحوں یعنی فرشتوں کا نزول ہوا تھا قرآن میں اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے پس بجائے ملکوتی ارواح کے انسانی روحوں سے بھی اگر سمجھا جائے کہ مدد پہنچتی ہے تو آخر اس کو مشرکانہ عقائد میں ہم کیسے داخل کر سکتے ہیں ہمارا صاف اور واضح مسلک یہ ہے کہ امداد حاصل کرنے کے لیے ملکوتی ارواح ہوں یا انسانی ارواح ہوں، ہر ایک کی عبادت شرک ہے ایسا گناہ جو کبھی بخشا نہیں جا سکتا۔ لیکن خدا جیسے بندوں کی امداد آفتاب کی روشنی، ہوا، پانی وغیرہ مخلوقات سے کراتا ہے اگر فرشتوں یا بزرگوں کی روحوں سے بھی اپنے بندوں کی مدد کرے تو اس شرک سمجھنا غباوت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

کہ شریعت کی کتابیں یعنی قرآن بھی ہے حدیث کی کتابیں، فقہ کی کتابیں موجود ہیں شوق کی تکمیل کے لیے یہ کافی ہے کہ کتابوں میں دیکھ دیکھ کر غیر شرعی کمزوریوں کا ازالہ کر کے مذہب کے مطابق اپنے آپ کو کر لیا جائے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ دیکھنے میں یہ مسئلہ خواہ کتنا ہی آسان نظر آتا ہو لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جیسے طب کی کتابوں کو دیکھ دیکھ کر اور ان سے نسخوں کا انتخاب کر کر کے کوئی اپنا علاج کر نہیں سکتا۔ بلکہ کتابوں کے رہتے ہوئے بھی تجربہ کار طبیب کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ یہی رنگ شرعی مطالبات اور قوانین کے استعمال کا بھی ہے خود ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ:

ایں معنی بدوں تحکیم عالم متقی بر ظاہر و باطن خود منظم نمی تواند شد چہ دیدن کتابہائے شریعت مانند مراجعت کتب طب است بیمار را بدوں حصول ملکہ طب معالجہ بایں قدر اصلاح مزاج و دفع مرض دشوار ست۔

یعنی کسی پرہیزگار عالم کی نگرانی اپنے ظاہر و باطن پر جب تک قائم نہ کر لی جائے اسی کے فیصلوں کا تابع اپنے آپ کو نہ بنا لیا جائے عام حالات کے لحاظ سے شرعی مطالبات کے مطابق اپنے آپ کو کر لینا آسان نہیں ہے۔ شریعت کی کتابوں کو دیکھ کر اپنی اصلاح اس کی مثال وہی ہو گی کہ فن طب میں کمال حاصل کیے بغیر کوئی اپنا علاج طب کی کتابوں کو دیکھ دیکھ کر کرنا شروع کرے۔ ظاہر ہے کہ مزاج کو اپنی اصلی حالت کی طرف لے آنا اور بیماری کا ازالہ جیسے محض طبی کتابوں کی مدد سے دشوار ہے! اسی طرح شریعت کی فقط کتابوں کی مدد سے صحیح دینی زندگی کے حاصل کرنے میں کامیابی آسان نہیں ہے۔

شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ صرف کتابوں سے جیسے کام نہیں چلتا اسی طرح یہ سوچ لینا کہ جس عالم سے بھی موقع ملتا ہے گا مشورہ لیتا رہوں گا۔ یہ بھی کافی نہیں ہے فرماتے ہیں کہ:

ہم چنیں بقول ہر عالمے عمل کردن موجب تحیر است کہ ہر یکے صحیح الفکر و بحواس نمی باشد

جو مولوی یا عالم مل جائے اسی کے قول کے مطابق عمل میں بڑی پریشانیاں پیش آتی ہیں، آدمی حیرانی کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ مولویوں میں بھی ہر شخص ظاہر

نے لکھا ہے کہ جن لوگوں میں ان کمالات کی تحصیل کا ولولہ جوش مارتا ہے تو

کسے را کہ دریں اشغال و اعمال مہارتِ کلی داشتہ باشد و خود مصدر ایں آثار باشد و ایں امور مراد را اسہل الحصول باشد استاذ خود ساختہ حق متابعت آنہا ادا نماید و بہم شرطیکہ قیام فرماید از مجاہدات نفسانی و جسمانی بجا آرد تا دریں کار ماہر گردد و بمقصود خود رسد۔

کسی ایسے آدمی کا انتخاب وہ کرتا ہے جو مذکورہ بالا کمالات سے سرفراز ہو اور خود اسی قسم کے آثار کا ظہور اس شخص کی ذات سے ہو رہا ہو، اور اپنا استاذ یعنی پیر یا شیخ ان ہی کو بنا لینا چاہتا ہے اور اسی کی پیروی کی جاتی ہے۔ اور جن نفسانی و جسمانی مجاہدات کا حکم شیخ کی طرف سے دیا جاتا ہے اسی کی تعمیل کر کے مرید بھی اس راہ کا ماہر ہو جاتا ہے اور اپنے نصب العین کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

"مجاہدات نفسانی و جسمانی" کے حاصل کرنے کی طرف ایک اجمالی اشارہ شاہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

مصفا ساختن وجہ روح، از کدورت جسمانی و منور و مکمل ساختن آں را بانوار روحانی و اسماء ربانی۔

یعنی اس راہ میں روح کو جسمانی آلائشوں سے پاک کرنا اور روحانی انوار اور ربانی اسماء سے اسی روح کو مکمل اور آراستہ کرنا پڑتا ہے۔

مذکورہ بالا کمالات حاصل کرنے کے بعد شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس راہ کے کاملین کی ذات عوام کی مرجع بن جاتی ہے۔

مبدء فیض گشتن برائے بندگان الٰہی و حل مشکلات

اللہ کے بندوں کے لیے فیض کا سرچشمہ اور لوگوں کے مشکلات کے حل کا ذریعہ ان کی ذات بن جاتی ہے۔[1]

"بیعت شریعت" کے بعد ایک قسم بیعت کی شاہ صاحب کے نزدیک یہی "بیعتِ طریقت" ہے۔

---

[1] یعنی ان کے صاحب نسبت قویہ ہونے کی وجہ سے ان کے وابستوں کی روحانی مشکلات فوراً حل ہو جاتی ہیں جو بغیر اس تعلق کے شاید برسوں کی ریاضتوں سے بھی بآسانی حل نہ ہو سکتیں۔ (غ۔م)

بیعت حقیقت

عموماً ملا مزاج طبائع جیسے "بیعت شریعت" ہی کو تصوف کا اول و آخر سب کچھ قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں اسی طرح صوفی نہاد لوگوں میں سمجھا جاتا ہے کہ "بیعت طریقت" اور جو کچھ اس میں کیا جاتا ہے یا جو نتائج بیعت طریقت کے مقرر کردہ اشغال پر مرتب ہوتے ہیں۔ یہی صوفیت کا کمال معراج ہے۔ لیکن شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے "بیعت طریقت" کے بعد ہی کی آخری قسم کو "بیعت حقیقت" کے نام سے موسوم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

بعض افراد نبی نوع انسانی میں پیدا کیے جاتے ہیں جن کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ :۔

حق تعالیٰ ایشاں را برائے مشاہدۂ جمال خود مرآۃ ساختہ و برائے اجرائے مرادات خود آلہٗ جارحہ فرمودہ است۔	حق تعالیٰ اپنے ازلی حسن و جمال کے مشاہدہ کا ان کو آئینہ بناتے ہیں اور اپنے مقاصد کے ظہور کا ذریعہ و آلہ ان کو ٹھہرا لیتے ہیں۔

وہی اس کے بعد یہ بھی ارقام فرماتے ہیں کہ اپنے ساتھ وہ ایک ایسی فطرت لاتے ہیں جس میں

از روز ازل کیش محبت ذاتی در جواہر ارواح انسان نہادہ۔	روز ازل ہی سے حق تعالےٰ ان کی روحوں میں اپنی ذات کی محبت و عشق کا تخم بو دیتے ہیں۔

اس خاکدان ارضی میں پیدا ہونے کے بعد زندگی کی کسی خاص منزل میں شاہ صاحب کا بیان ہے کہ :

بہ تقریبے از تقریبات آن سرمکنوں را از درون شورش می زند، و تعلقات مکنونات را از ضمائر ایشاں بر ہم می باشد۔	کسی نہ کسی وجہ سے خاص موقع پر ایسا ہو جاتا ہے کہ ان کی فطرت میں جو راز چھپا ہوا تھا اندر ہی اندر اس میں شورش اور جوش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور جو باتیں ان کے دلوں میں پوشیدہ ہوتی ہیں اچانک باہر نکل کر بکھر جاتی ہیں۔

اس کے بعد اس قسم کے افراد

مشتاق دوام حضور، بے مزاحمت اکوان و عاشق جمال حضرت ایزدی می شود بدوں آں قرار نمی دارد و فنائے وجود خود بہ لقائے وجود الٰہی از تہ دل می جوید۔	اس بات کے مشتاق ہو جاتے ہیں کہ کائنات کا جو پردہ ان کے اور خدا کے درمیان حائل ہے اس پردہ کی مزاحمت کے بغیر حق تعالیٰ کا دوام حضور ان کو حاصل ہو۔ حضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ کے جمال ازلی کے

یہ عاشق ہوتے ہیں بغیر اس کے ان کو چین نہیں ملتا۔
اپنے وجود کے ساتھ قیام کا خیال ان کے اندر سے
نکل جاتا ہے تہہ دل سے چاہتے ہیں کہ خدا ہی کے
وجود کے ساتھ ان کی بقاء وابستہ ہو جائے۔

حقیقت تک رسائی بلا رہبر کے ممکن نہیں

"بیعت حقیقت" کے اسی نصب العین کو پیش کرنے کے بعد شاہ صاحب نے یہ لکھتے ہوئے کہ:۔

اما جوہر نفس ہر یکے سوائے انبیاء علیہم السلام ازاں قبیل نیست کہ خود بخود دایں مقصد عالی تواند رسید۔

کہ انبیاء علیہم السلام کے سوا ہر شخص کی ذات میں صلاحیت نہیں ہوتی کہ مذکورہ بالا نصب العین تک (بغیر کسی کی راہنمائی و امداد کے) خود بخود پہنچ جائے۔

"بیعت حقیقت" کی ضرورت اس قسم کے نفوس کو اسی لیے ہوتی ہے کہ جس نصب العین کی تڑپ اور جستجو ان میں جوشزن ہوتی ہے، اس نصب العین تک بذات خود فطرت کے عام قانون کے لحاظ سے نہیں پہنچ سکتے، شاہ صاحب نے اس کے بعد جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت کی مذکورہ بالا صورتوں میں تو مریدوں کو خود پیروں کے پاس جانا پڑتا ہے لیکن "بیعت حقیقت" والوں کے ساتھ غالباً کچھ ایسی صورت پیش آتی ہے کہ:۔

برائے تربیت ایشاں وایصال بایں مقصد اعلیٰ یکے از کاملین ہر سر وقت بر ایشاں می گمارند۔

(حق تعالیٰ اس راہ کے ارباب کمال میں سے کسی صاحب کمال کو) ان لوگوں کی تربیت کے لیے اور ان کو ان کے نصب العین تک پہنچانے کے لیے مقرر فرما دیتے ہیں۔

بجائے مرید کے گویا سمجھنا چاہیئے کہ اپنے پیروں کے وہ مراد ہوتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ ان کے نصب العین تک پہنچانے کے لیے تربیت جو ان کی کی جاتی ہے اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟

حضرت گیلانی کا مقصود تصنیف

سچ پوچھیئے تو اپنے موضوع کے لحاظ سے اس کا پیش کرنا میرا اصل مقصود ہے بلکہ پوری کتاب[1] کی جوہری غرض یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ :۔

کائناتی آثار جو خدا اور بندوں کے درمیان حائل ہیں ان کی مزاحمت کیے بغیر حق تعالیٰ کے وجود کا دوام مشاہدہ، اور یہ کہ اپنے وجود کے ساتھ قیام و بقاء کا خیال، غلط خیال جو دلوں میں پایا جاتا ہے چاہتے ہیں کہ اس خیال کو مٹا کر حق تعالیٰ ہی کے وجود کے ساتھ ان کی ذات کی بقاء وابستہ ہو جائے۔ یہی ان کی بیعت کا نصب العین ہوتا ہے۔ کیا اس نصب العین کے حصول کے لیے ان جسمانی و نفسانی ریاضتوں اور مجاہدوں کی ضرورت ہے۔ جن کے بغیر "بیعت طریقت" کے نصب العین کو آدمی حاصل نہیں کر سکتا؟ اگر یہی واقعہ ہوتا تو شاہ صاحب "بیعت حقیقت" کو "بیعت طریقت" کے مقابلہ میں بیعت کی ایک الگ مستقل قسم ہی کیوں قرار دیتے۔ پس حقیقت وہی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ "بیعت حقیقت" والی راہ میں مرید کو پیر کی ضرورت صرف اس لیے ہوتی ہے کہ :

تا باعانت و رہنمائی او حل مشکلات و رفع تردداد کشف شبہات کہ لازم بشریت ست می نمودہ باشد	تاکہ پیر کی امداد اور رہنمائی سے ایسی مشکلات حل ہو جائیں اور تردد و شک و شبہ وغیرہ کی ان کیفیتوں کا ازالہ ہو جائے جو عام بشری فطرت کے لوازم ہیں۔

جس کا حاصل یہی ہوا کہ "بیعت حقیقت" کے نصب العین کے حصول میں جن فکری الجھنوں اور ذہنی ژولیدگیوں سے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے صرف ان ہی کا ازالہ "بیعت حقیقت" کی راہ میں کافی و وافی ہوتا ہے۔ اسی لیے شاہ صاحب نے آخر میں لکھا ہے :۔

باندک تربیت فائدہ بے نہایت می یابد	بہت معمولی تربیت سے مرید کو حد سے زیادہ فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اور یہی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مشغلوں میں جو الجھے ہوئے ہیں ان مسلمانوں کے لیے یہ خیال کر لینا کہ

---

[1] کتاب اب تین مستقل مضامین پر تقسیم ہو چکی ہے جس میں سے "طریق اشتغال مطلقہ" والا مضمون ہی مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس "جوہری غرض" کو پورا کرتا ہے۔ (غ۔م)

مقام احسان تک پہنچنے کا ان کے لیے کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر مراد اس سے یہ ہے کہ "بیعت طریقت والے کمالات چونکہ غیر معمولی جسمانی و نفسانی ریاضتوں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ تو جہاں تک واقع ہے یہ دعویٰ غالباً بے جا نہیں ہے، لیکن "بیعت حقیقت" کی جو غرض و غایت ہے انصاف سے اگر کام لیا جائے تو شاید مقام احسان کا صحیح مصداق ہم اسی کو قرار دے سکتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ بھی ان ہی بزرگوں میں ہیں جن کے نزدیک "بیعت حقیقت" کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے صرف ان چند ذہنی الجھنوں اور فکری مغالطوں کا ازالہ کافی ہے جن کا واقعہ سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ اپنی بشری کمزوریوں کی وجہ سے ان میں لوگ مبتلا رہتے ہیں۔ معمولی صحیح تفہیم سے یہ گرہیں کھل جاتی ہیں چونکہ کلیتہً اس راہ میں جو کچھ بھی کرنا پڑتا ہے اس کا تعلق باطن سے ہوتا ہے اس لیے بیرونی اشغال سے کنارہ کشی کی ضرورت اس راہ میں قطعاً پیش نہیں آتی۔

رئیس الصوفیہ شیخ اکبر کا بھی یہی خیال ہے[1] اسی خیال کی توثیق حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ بھی فرما رہے ہیں[1]

خاص اصطلاح میں فکر و ذہن کے اسی عمل کی تعبیر "اشغال مطلقہ" سے کی جاتی ہے اور سلوک و سیر کی اس باطنی راہ کا نام اسی دائرہ میں **اطلاقی تصوّف** ہے!!

---

[1] حضرت مولانا گیلانی کے آخری فقرہ (پیراگراف) کو اس عاجز نے بار بار غور سے پڑھا مگر اسی سے تشفی نہ پا سکا کیونکہ شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے تو بیعت کی تقسیم کو بہ مدارج بیان کرتے ہوئے "بیعت حقیقت" کو سب سے ارفع اور ضروری حیثیت عطا فرمائی ہے اور ان کا یہ ارشاد بھی نقل ہو چکا ہے کہ "بیعت حقیقت" کی صلاحیت رکھنے والے افراد "مراد" ہوتے ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ ان کی تربیت کے لیے کسی کامل کو متعین فرما دیتا ہے ایسے افراد ظاہر ہے کہ نفس کی آلائشوں سے محفوظ ہوتے ہیں اور ان کی اصلاح کے لیے صرف نوک و پلک کی درستی کافی ہو جاتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ شاہ صاحبؒ کی اصطلاح میں وہ ان مراحل سے گزارنے کے محتاج نہیں ہوتے جن سے ایک عام انسان کو بیعت شریعت اور بیعت طریقت کے تحت گزارا جاتا ہے پس ان کے لیے تو بلا شبہ مجاہدوں اور ریاضتوں کی ضرورت باقی نہ رہتی ہوگی مگر اس خصوصی "بیعت حقیقت" کا عمومی اطلاق جیسا کہ حضرت مولانا کا منشا ہے کم از کم شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کی مراد سے تو الگ بات ہے! (غ م)

(۲)

فہرست مضامین

طریقۂ غزالیہ

تمہید

سوال یہ ہے کہ امام حجۃ الاسلام نے رذائل اخلاق کی تصحیح و اصلاح پر صوفیانہ نصب العین کے حصول کو جو موقوف قرار دیا ہے یا جس کی حیثیت آثار و نتائج کی ہے امام نے اس کو اسبابِ علل کا جو مقام عطا کیا ہے اور اسی بناء پر " اخلاقیات " کے ان مباحث اور مسائل کو ان کے یہاں اتنی اہمیت جو حاصل ہے آخر اس کے وجوہ اور موثرات کیا ہیں ؟

غیب کا علم تو حق سبحانہ تعالیٰ ہی کو ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے بظاہر چند چیزوں کو اگر سامنے رکھ لیا جائے تو شاید اس سوال کا جواب مل سکتا ہے ۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ جس زمانہ میں امام حجۃ الاسلام نے اپنی یہ کتابیں تصنیف کی ہیں دنیائے اسلام اس وقت کس حال میں تھی ؟ اور اسی کے ساتھ خود امام غزالی کی شخصی زندگی کے بعض خصوصیات کا پیش نظر رکھ لینا مفید ہوگا ۔ دو باتیں تو یہ ہیں اور تیسری چیز جس کے متعلق میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ نے " طریقۂ غزالیہ " کا ذکر کرتے ہوئے یہ جو فرمایا تھا کہ " ایں مذہبِ اوائل است " یعنی اسلام کی ابتدائی صدیوں کے لوگوں کی یہی روش تصوف میں تھی ۔" اوائل " کے اس لفظ سے شاہ صاحب کا اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے ؟

امام غزالیؒ کے دور کی سیاسی حالت

پہلی بات یعنی امام غزالیؒ کے عہد میں اسلامی دنیا کس حال میں تھی ؟ میری غرض اس سے یہ ہے کہ

سیاسی قوت واقتدار کے لحاظ سے زمین کے ان حصوں میں جن میں مسلمان آباد تھے یہ دیکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کا کیا مقام تھا؟ اسی سے اس عہد کے عام مسلمانوں کے نفسیات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ امام غزالی کی کتابوں کے سمجھنے کے لیے سب سے پہلی ضرورت ہے کہ اجمالاً ان امور سے کلی واقفیت حاصل کر لی جائے۔

اگرچہ بعض مغربی مورخین کی تقلید میں اردو زبان کے چند اہل قلم نے بھی یہ لکھ دیا ہے کہ عہد غزالی میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار رُو بہ زوال ہو چکا تھا۔ بغداد کی خلافت اپنے سیاسی اقتدار کو کھو کر صرف ایک مذہبی اور دینی قیادت و مرکزیت کی جو شکل اختیار کر چکی تھی اسی کو دلیل میں پیش کر دیا جاتا ہے اور سمجھا دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے زوال کے لیے یہ تاریخی واقعہ کافی ہے۔

لیکن واقعات ہی کی بنیاد پر مجھے اس تاریخی نظریہ سے قطعاً اختلاف ہے۔ سارے اسباب و وجوہ پیش کرنے کا تو یہاں موقع نہیں ہے لیکن اتنی بات سے آگاہی تو عام تاریخوں کے مطالعہ سے بھی ہو سکتی ہے کہ امام حجۃ الاسلام جن کی ولادت ۴۵۰ھ اور وفات ۵۰۵ھ میں ہوئی۔ پچپن سال کا یہ زمانہ ایک طرف امام کے محیر العقول کارنامے کے لحاظ سے جہاں عجیب ہے تو دوسری طرف جس قسم کے اہم واقعات و حوادث تاریخ اسلامی کے ان چند سالوں میں پیش آئے ہیں اپنی خاص خصوصیتوں کی وجہ سے بھی کچھ کم عجیب نہیں ہیں۔ ابھی عہد غزالی کے ان خاص واقعات کو تو جانے دیجئے میں سر دست یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ غزالی کے عہد کو مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے زوال بلکہ اضمحلال کا عہد قرار دینا آخر کس بنیاد پر صحیح ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ امام غزالی کا زمانہ پانچویں صدی ہجری کا زمانہ ہے اسلامی تاریخ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے آپ اس میں پائیں گے کہ پانچویں صدی میں ایک طرف مشرق میں سب سے بڑی سیاسی قوت سلاجقہ یا سلجوقیوں کی نظر آئے گی خصوصاً امام غزالی کے عہد تک سلجوقیوں کی حکومت عروج کے اس نقطہ تک پہنچ چکی تھی جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مورخین لکھتے ہیں[1] یعنی ملک سلجوقی جو امام غزالی کے زمانہ میں سلجوقیوں کا بادشاہ تھا اسی کے ذکر میں اس قسم کے فقرے عام تاریخوں

---

[1] مسلمان بادشاہوں کے متعلق عیوب کے ساتھ افسوس ہے کہ ان کی خوبیوں کے ذکر کو لوگوں نے ترک کر دیا غلط فہمی اب تو اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد سمجھا جاتا ہے کہ اسلامی قانون پر کسی اسلامی حکومت کا عملدرآمد نہ تھا۔ حالانکہ اور کچھ ان بادشاہوں کے عہد میں تھا یا نہ تھا لیکن قانون جہاں تک میں جانتا ہوں ہر زمانہ میں اسلام کے سوا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہیں آپ کو ملیں گے کہ :-

خطب له من اقصی بلاد الترک الی اقصی بلاد الیمن - (المنتظم لابن جوزی ج ۹ ص ۷)

یعنی ترکستان کے دور دست علاقوں میں یمن و جنوبی عرب کے آخری حدود تک اسی بادشاہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مسلمانوں کی کسی حکومت کا کسی ملک میں کوئی قانون نافذ نہ رہا۔ اکبر کا زمانہ ہندوستان میں صرف ایسا گزرا ہے جس میں اسلامی قانون کی جگہ نئے قوانین کے نفاذ کا ارادہ کیا گیا تھا لیکن بظاہر اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی اور کچھ اسی قسم کی صورت علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں پیش آئی۔ مسلمانوں کے ہاتھ میں دنیا کی سیاست کی باگ جب تک رہی اسلامی قانون کے ساتھ اس کی وفاداری مسلسل باقی رہی، یورپ کے تسلط کے بعد جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے یہ قصہ ہی الگ ہے بہر حال مسلمان سلاطین سے شکایت اگر کچھ ہو سکتی ہے تو ان کے ذاتی کردار و اخلاق کی اور اسی وجہ سے مالی معاملات میں بھی ان سے غلطیاں ہوئیں لیکن قانون کی حد تک ہر حکومت مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ اسلام کی حکومت رہی ہے اور ذاتی حیثیت سے بھی ہر حکمران کا حال ایک سا نہیں ہے۔ ان میں جہاں بُرے ہیں کافی تعداد اچھے اور دیندار بادشاہوں کی بھی ہے یہی ملک شاہ سلجوقی ہے حکومت کے مالیہ میں جو کچھ اس نے ترمیم کی وہ الگ داستان ہے بعض ذاتی واقعات اس بادشاہ کے سننے کے قابل ہیں جو ابن جوزی نے منتظم میں لکھا ہے کہ بادشاہ کے کیمپ میں ایک دیہاتی خربوزہ بیچنے آیا تھا کسی فوجی افسر کے غلام نے خربوزے اس سے چھین لیے۔ دیہاتی بیچارہ راستے سے کنارے ہٹ کر رو رہا تھا۔ بادشاہ شکار سے واپس آرہے تھے آدمی کو بھیج کر بلوایا۔ کیوں روتا ہے؟ اس نے حال بیان کیا قصہ طویل ہے حاصل یہ ہے کہ غلام تو گرفتار نہ ہو سکے بھاگ گئے، تب بادشاہ نے فوجی افسر کا ہاتھ پکڑ کر دیہاتی کسان کے حوالے کیا کہ اس کو بیچ کر تو اپنے خربوزوں کے دام وصول کرلے اور اسے قسمیں دیں۔ دیہاتی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا آگے جا کر کئی ہزار پر بات طے ہوئی اور یوں امیر کی رہائی ہوئی دیہاتی نے بادشاہ کو آکر مطلع کیا کہ میرے روپے وصول ہو گئے۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔ ایک دفعہ ایک مظلوم نے بادشاہ کے گھوڑے کی لگام راستہ میں پکڑ لی۔ پوچھا کیا ہے؟ اس نے ظلم کی داستان بیان کی اسی وقت گھوڑے سے ملک شاہ اتر گیا اور مظلوم سے کہا میری آستین پکڑ لے اور اسی طرح گھسیٹتے ہوئے مجھے نظام الملک طوسی وزیر کے پاس لے چل اصرار اتنا بلیغ تھا کہ مظلوم کو یہی کرنا پڑا۔ نظام الملک کو معلوم ہوا کہ بادشاہ اس شکل میں آرہے ہیں ننگے پاؤں دوڑا۔ بادشاہ نے دیکھنے کے ساتھ کہا جس میں نے رعایا کو تمہارے سپرد اسی لیے کیا تھا کہ امراء ان پر ظلم کریں؟ اسی وقت ظلم کا ازالہ نظام الملک نے کیا حالانکہ ظالم ایک مشہور امیر کبیر تھا۔

الیافعی نے اسی اجمال کی تھوڑی جغرافیائی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے کہ :-

ملک من مدینہ کاشغر الترك الی بیت المقدس طولا ومن قسطنطنیۃ وبلاد الجرت الی نہر الھند عرضا۔ (ص ۱۳۹ ج ۳)	ترکوں کے شہر کاشغر سے بیت المقدس تک تو دنیا کے طول میں ملک شاہ کی بادشاہت قائم تھی اور قسطنطنیہ اور ایشیاء کوچک سے نہر ہند (دریائے اٹک) تک عرض میں اس کی حکومت پھیلی ہوئی تھی۔

ان ہی کے الفاظ یہ بھی ہیں :-

ملك ماوراء النهر وبلاد الهياطلة وبلاد الروم والجزيره والشام والعراق وخراسان وغيرذلك۔	یعنی ملک شاہ ماوراء النہر (بخارا سمرقند وغیرہ) اور ترکوں کے علاقوں، روم کے علاقوں، اور جزیرہ (موصل وغیرہ) شام، عراق، خراسان وغیرہ کا تنہا فرمانروا تھا۔

اور یہ حال مسلمانوں کی مشرقی سلطنت کا تھا۔ اسی کے مقابلہ میں مغرب میں دیکھئے۔ یہ صحیح ہے کہ اندلس میں مسلمانوں کی مرکزی قوت کا شیرازہ بکھر چکا تھا لیکن بایں ہمہ امام غزالیؒ جس زمانہ میں موجود تھے یہی وہ زمانہ ہے جب مغرب کی سب سے بڑی سیاسی قوت کا مظہر مراکش کا مشہور بادشاہ امیر المسلمین یوسف بن تاشفین تھا۔ اگرچہ یہ مغربی افریقہ کا مسلمان حکمران تھا لیکن یورپ میں بھی اپنی فوجی قوت کا مظاہرہ جس شان کے ساتھ اس نے امام غزالی کے زمانہ میں کیا تھا جس کا سرسری ذکر آگے بھی آرہا ہے ان ہی چیزوں کو پیش نظر رکھ کر اسلامی مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ :-

كان اكبر ملوك الدنيا فى عصره (الیافعی ص ۱۶۳ ج ۳)	یوسف بن تاشفین اپنے عہد میں دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ جس زمانہ میں مشرق میں ملک شاہ سلجوقی اور مغرب میں یوسف بن تاشفین جیسے اسلامی سلاطین حکمرانی کر رہے تھے۔ اس زمانہ کو مسلمانوں کے سیاسی ضعف یا اضمحلال کا زمانہ قرار دینا آخر کسی حیثیت سے بھی صحیح ہو سکتا ہے! اور یہ تو خیر عہد غزالی کی عام بات ہے اب ذرا ان واقعات کی اجمالی داستان سن لیجیے جو مشرق اور مغرب دونوں علاقوں میں اس وقت پیش آئے ہیں جب امام غزالی زندہ تھے اور اسی سے اندازہ کیجئے کہ عام مسلمانوں کی نفسیات پر ان واقعات کا کیا اثر مرتب ہوا ہوگا یا کیا مرتب ہو سکتا تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ "یورپ اور اسلام" کی سیاسی کشمکش نے آج جس نتیجہ کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے

کہ اس کشمکش اور آویزش کی ابتداء امام غزالی کے زمانہ بلکہ اس زمانہ سے پہلے ہو چکی تھی [1]

---

[1] بلکہ یاجوج و ماجوج کے جس ردم (دو پہاڑیوں کے بیچ کی دیوار) کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اچانک نیند سے بیدار ہو کر رات کے وقت یہ فرمایا تھا کہ یاجوج و ماجوج کے ردم میں اتنا بڑا سوراخ پیدا ہو گیا (اور سوراخ کی مقدار بتاتے ہوئے) آپ نے عقد انامل کی اصطلاح کی طرف اشارہ انگلیوں کو باندھ کر فرمایا جس سے دس کا عدد سمجھا جاتا ہے اور فرماتے تھے کہ ویل للعرب من شر قد اقترب (تباہی ہے کہ عرب کے لیے اس برائی سے جو قریب آگئی۔) یہ روایت صحاح ستہ کی عام کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی روایت کے متعلق جن لوگوں کا خیال حزقیل کی کتاب کے ان فقروں کی بنیاد پر یعنی حزقیل نبی نے کہا۔ خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روس اور مسک اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر اور کہہ کر خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روس اور مسک اور توبال کے سردار میں تیرا مخالف ہوں میں تجھے ہٹا دونگا اور تیرے جبڑوں میں اپنی کنسی مار دونگا (حزقیل باب ۳۸۔ ۲-۳) اور یوحنا کے مکاشفہ کے نام سے عہد جدید کی کتابوں میں ایک کتاب جو پائی جاتی ہے اسی کتاب میں پہلے ایک آنے والے شخص کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ "میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے اس پر ایک سوار ہے جو سچا اور برحق کہلاتا ہے" بعض نسخوں میں برحق کی جگہ امین لفظ ہے۔ بہرالحال الصادق الامین کے بعض خصوصی اوصاف کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے ہزار سال تک کے لیے اس اژدہے پرانے سانپ کو جو ابلیس اور شیطان ہے پکڑ کر اتھاہ گڑھے میں ڈال کر بند کر دیا اور اس پر مہر کر دی تاکہ وہ ہزار سال تک قوموں کو گمراہ نہ کرے اس کے بعد ضرور ہے کہ تھوڑے عرصہ کے لیے وہ کھولا جائے گا۔ اس تھوڑے عرصہ میں جب وہ کھولا جائے گا۔ لکھا ہے کہ جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا اور ان قوموں کو جو زمین کے چاروں طرف ہوں گی یعنی "یاجوج و ماجوج" کو گمراہ کر کے لڑائی کے لیے جمع کرنے کو نکلے گا ان کا شمار سمندر کی ریت کے مانند ہوگا اور وہ تمام زمین پر پھیل جائیں گے اور مقدسوں کی لشکر گاہ اور عزیز شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے پھر آسمان سے آگ نازل ہو کر انہیں کھا جائیگی۔ (مکاشفہ یوحنا باب ۲۰۔ ۴-۸) بہرحال بائیبل کی ان شہادتوں کی بنیاد پر جو یورپ کی قوموں کا یاجوج ماجوج سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کا خیال تو یہی ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں یورپ اٹھنے کی تیاری عہد نبوت ہی میں کرنے لگا تھا تاریخ سے اس کی توثیق بھی ہوتی ہے بعض کہتے ہیں کہ انگلستان میں گوگ ہل (کوہ ماجوج) کے نام کی پہاڑی بھی ہے اور لندن شہر کے مشہور گلڈ ہال پر کہتے ہیں کہ گوگ ماگوگ کے برنجی مجسمے اس وقت تک قائم ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب "آگ" آتشیں اسلحہ جس کی انتہا ایٹم بم پر ہوئی کیا اس کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲

اور یہ بھی درست ہے کہ "جنگ دو سر دارد" کی فارسی ضرب المثل ہے، یا عربی کی ضرب المثل "الحرب سجال" کے عام قاعدے کے مطابق ان آویزشوں میں کبھی مسلمانوں کے ہاتھ اور کبھی یورپ والوں کے ہاتھ میدان رہتا تھا لیکن ٹھیک جس زمانہ میں حضرت امام حجۃ الاسلام دنیا میں رونق افروز تھے " یورپ اسلام کی اسی کش مکش کے سلسلہ میں ایک عجیب و غریب فیصلہ کن معرکہ مشرق میں پیش آیا اور اسی کے کچھ دن بعد اسی کے قریب قریب "مغربی محاذ" پر مسلمانوں کو جو کامیابی نصیب ہوئی ہے، اسلامی تاریخ میں چند ہی واقعات شائد ان کے مماثل مل سکتے ہیں، میں پہلے مشرقی میدان کے قصے کو سناتا ہوں۔

الپ ارسلان کی فتح اور ارمانوس کی شکست

جیسا کہ میں نے عرض کیا امام غزالی کے عہد میں مشرق کی سب سے بڑی سیاسی قوت سلجوقیوں کی تھی ملک شاہ سلجوقی سے پہلے حکومت کا فرماں روا ملک شاہ کا باپ الپ ارسلان تھا، الپ ارسلان اور قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ ارمانوس کے درمیان آویزشوں کا سلسلہ جاری تھا۔ قسطنطنیہ کے اس عیسائی بادشاہ کے ساتھ مسلمانوں کی دلچسپی یا اسلامی حکومت میں جو اس کی اہمیت تھی اس کا اندازہ آپ کو اسی واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ سلجوقیوں کے مشہور وزیر باتدبیر نظام الملک طوسی کے سامنے ایک غلام کی بڑی تعریف فوجی افسر نے کی لیکن غلام نظام الملک کی نگاہ میں کچھ زیادہ نہیں جچا لیکن افسر پھر بھی اس کی خریداری پر اصرار کرتا رہا۔ اس کے اصرار کو دیکھ کر نظام الملک نے تعریضاً کہا:۔

عسى ان یاتینا ملك الروم اسیرا۔ (ج ۱ کامل ابن اثیر ص۲۳)

شائد روم و قسطنطنیہ کے بادشاہ ہی کو یہ غلام قید کر کے لے آئے گا۔

خیر یہ تو ایک ذیلی واقعہ تھا، نظام الملک کی زبان سے ایک تعریضی فقرہ نکلا تھا کون جانتا تھا کہ وہی واقعہ کی شکل اختیار کرنے والا ہے۔

ہوا یہ کہ الپ ارسلان ارمانوس ہی کی فکر میں اپنے پایۂ تخت رے سے نکل کر شام کے علاقوں میں گشت کر رہا تھا اس عرصہ میں ارمانوس اور الپ ارسلان کے درمیان خلیفہ بغداد نے صلح کرانے کی بھی کوشش کی تھی اور صلح نامہ گویا ایک طرح سے طے ہو چکا تھا اس عرصہ میں شدید قسم کا قحط شامی علاقوں میں پھوٹ پڑا۔ الپ ارسلان نے مجبوراً فوجیوں کو خراسان جانے کا حکم دے دیا لیکن خود خاصے کے چار ہزار غلاموں کے ساتھ وہ شامی علاقے ہی میں ٹھہرا رہا۔ اسی حال میں اچانک اس کو خبر ملی کہ سرحد پر ارمانوس نے عظیم الشان

تیاریوں کے ساتھ حملہ کر دیا ہے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ ارمانوس کے ساتھ تین لاکھ آدمی تھے[1] سیکڑوں گاڑیاں تھیں جن پر سامان جنگ لدا ہوا تھا۔ منجنیقوں، عرادوں، دبابوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ بعض بعض منجنیقیں اتنی بڑی تھیں کہ بارہ بارہ سو آدمی مل کر اس کو کھینچتے تھے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ ایک طرف تین لاکھ ٹڈی دل انسانوں کا مجمع ہے اور دوسری طرف مسلمان بادشاہ کے ساتھ صرف چار ہزار غلام ہیں۔ فوج کے اصل سپاہی وطن جا چکے تھے، قدرتاً الپ ارسلان کی سخت آزمائش کا وقت تھا لیکن اس نے اپنے قلب میں قوت محسوس کی، جمعہ کا دن تھا جب دونوں میں مٹھ بھیڑ ہونے والی تھی الپ ارسلان مسجد آیا۔ بیٹھے خوب رویا، چہرے پر خاک ملی اور حق تعالیٰ سے توفیق و نصرت کا طالب ہوا، پھر اس نے ساتھیوں کی طرف خطاب کر کے کہا کہ بادشاہی اور افسری ختم ہو چکی، میری حیثیت اسلام کے ایک ادنیٰ سپاہی سے زیادہ اب نہیں رہی ہے میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اسلام کے اس دشمن کے مقابلہ سے اب پیٹھ نہ پھیروں، خواہ میں مارا ہی کیوں نہ جاؤں یا خدا مجھے کامیابی نصیب کرے۔ آپ لوگوں کو اختیار ہے جس کا جی چاہے اس جہاد میں میری رفاقت کرے اور جس کا جی چاہے چلا جائے۔ لکھا ہے کہ اس نے سر سے کفن باندھا، تیر د کمان اور ترکش سب پھینک کر، گرز بدست گھوڑے پر سوار ارمانوس کی اس ٹڈی دل فوج پر غضبناک شیر کی طرح ٹوٹ پڑا۔ بادشاہ کے اس حال کو دیکھ کر غلاموں کا جو دستہ اس کے ساتھ تھا جان پر کھیل کر دشمن کی فوج میں گھس پڑا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ چند گھڑیاں بھی گزرنے نہ پائی تھیں کہ رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے افرا تفری ان کی فوج میں پھیل گئی۔ بڑی تعداد تو ان لوگوں کی قتل ہو گئی۔ بھاگنے کی راہ جنہیں ملی وہ بھاگ گئے باقی گرفتار ہوئے۔ الپ ارسلان جب اپنے خیمے کی طرف واپس آیا تو وہی فوجی آفیسر جس نے نظام الملک کے سامنے غلام کو پیش کرتے ہوئے مذکورہ بالا تعریضی فقرے کو سنا تھا وہی بادشاہ کے پاس حاضر ہوا اور آکر عرض کرنے لگا کہ میرے غلاموں نے جن قیدیوں کو پکڑا ہے کہتے ہیں کہ ان میں ارمانوس یعنی خود شاہ قسطنطنیہ بھی ہے اور اس کا پکڑنے والا وہی غلام ہے جسے تعریضاً نظام الملک نے کہا تھا کہ "شاہ روم ہی کو تو قید کر کے یہ لے آئے گا"۔ الپ ارسلان کے ساتھ ایسے آدمی موجود تھے جو قسطنطنیہ متعدد سفارتوں میں جا چکے تھے ارمانوس

---

[1] ابن جوزی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک لاکھ آدمی تو صرف نقب لگانے، زمین کھودنے اور راستہ وغیرہ ہموار کرنے کے لیے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ جنگی سپاہیوں کے اس زمانہ میں بھی انجینئری کا کافی عملہ فوجوں کے ساتھ رہتا تھا۔

کو خوب پہچانتے تھے وہی بھیجے گئے تحقیق سے معلوم ہوا کہ واقعہ صحیح ہے۔ الپ ارسلان نے اپنی اس غیر معمولی کامیابی پر سجدہ شکر بجالایا۔ ارمانوس اس کے بعد الپ ارسلان کے سامنے حاضر کیا گیا۔ شرم سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ دونوں میں جو گفتگو ہوئی دلچسپ ہے تاریخوں میں اس کی تفصیل پڑھیئے [۱] خلاصہ یہ ہے کہ

---

[۱] لکھا ہے کہ اس کی تصدیق ہو جانے کے بعد کہ واقعی خود شاہ قسطنطنیہ گرفتار ہو گیا ہے۔ الپ ارسلان نے حکم دیا کہ میرے پاس پا بہ زنجیر جس حال میں ہے حاضر کیا جائے، بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑا ہوا ارمانوس بادشاہ کے سامنے لایا گیا چونکہ حملہ کی خبر سن کر الپ ارسلان نے ارمانوس کے پاس اپنا قاصد بھیجا تھا کہ میرے اور تمہارے درمیان خلیفہ بغداد نے جو صلح کا معاہدہ طے کرا دیا ہے اس کی تم نے خلاف ورزی کی ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ تم واپس ہو جاؤ جواب میں ارمانوس نے کہلا بھیجا کہ میں نے اس مہم کی تیاری میں بہت زیادہ دولت صرف کر دی ہے اور مختلف علاقوں سے جنگی سورماؤں کو جمع کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ کہتے ہیں کہ تیس ہزار چیدہ یورپین سوار اور اسی کے قریب ایشیائی علاقے کے جنگ جو بہادر اس کے ساتھ تھے۔ علاوہ اس کے اس نے پولینڈ، بلقان وغیرہ سے بھی سپاہی فراہم کیے تھے۔ بہر حال آخر میں اس نے لکھا تھا کہ "اب میرے اور تمہارے درمیان معاہدہ رے ہی پہنچکر ہو گا" اس فقرہ نے الپ ارسلان کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ غصہ کی آگ میں جل رہا تھا جونہی کہ ارمانوس اس حال میں اس کے سامنے پیش ہوا۔ بادشاہ کے ہاتھ میں کوڑا تھا کھینچ کر تین تازیانے اس کی پیٹھ پر رسید کیئے۔ ارمانوس سر جھکائے کھڑا تھا کوڑے کھانے کے بعد اس نے الپ ارسلان سے کہا۔

"اے بادشاہ اب سرزنش بیکار ہے میں نے تیاری پوری کی تھی لیکن خدا نے تمہاری مدد کی اب جو جی میں تمہارے آئے فیصلہ کرو۔"

یہ سن کر الپ ارسلان نے کہا کہ "جس حال میں تم ہو اگر تمہارے سامنے میں اسی حال میں پیش کیا جاتا تو بتاؤ تمہارا سلوک میرے ساتھ کیا ہوتا" ارمانوس نے کہا "برے سے برا سلوک جو سوچا جا سکتا ہے وہی میں اختیار کرتا" ارمانوس کی راست بیانی سے الپ ارسلان متاثر ہوا اور چلا کر بولا اگر اس جواب کے سواء کوئی دوسرا جواب دیتا تو یقیناً وہ جھوٹ ہوتا پھر اس نے ارمانوس سے کہا کہ تمہارے ساتھ میں کیا کروں گا؟ کیا تم اس کا اندازہ کر سکتے ہو۔ اس نے کہا تین ہی چیزوں کا تمہیں اختیار ہے۔ چاہے قتل کر دو چاہے اپنے ممالک محروسہ میں مشتہر کر کے مجھے رسوا کرو۔ رہی تیسری بات سو وہ تو ذکر کے قابل بھی نہیں ہے۔ الپ ارسلان نے کہا کہ بتاؤ آخر وہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے قصور کو معاف کر دو اور زر فدیہ لے کر مجھے چھوڑ دو۔ الپ ارسلان نے کہا کہ مگر میں نے اسی تیسری شق کے اختیار کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ پھر الپ ارسلان نے اپنے ہاتھ سے ارمانوس کی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الپ ارسلان نے بجائے سختی کے ارمانوس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا۔ زر فدیہ لے کر اس کو چھوڑ دیا۔ خود تین میل تک اس کو پہنچانے گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ یورپ کے مقابلہ میں اسلام کی اس عجیب و غریب فتح کا جو قصہ پیش آیا تھا اور اس غیر متوقع کامیابی سے مسلمان جتنا متاثر ہوئے تھے اس کا اندازہ ابن جوزی کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے کچھ ہی دن بعد اپنی تاریخ المنتظم میں اس واقعہ کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ :۔

وھذا الفتح فی الاسلام کان عجبا لا نظیرلہ۔ | یہ فتح اسلام کے عجائبات میں شمار ہوتی ہے جس کی مثال نہیں ہے۔

پھر خود ہی لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ :۔

" اس مہم میں دشمن چاروں طرف سے اس لیے سمٹ کر آئے تھے کہ اسلام اور اسلام والوں کی بنیاد ہی نکال کر پھینک دیں گے قسطنطنیہ کا بادشاہ یہ ارادہ کر کے چلا تھا کہ مسلمانوں کے بادشاہ کے لیے اگر رے (سلجوقیوں کے پایۂ تخت) تک جانا پڑا تو بڑھتا چلا جاؤں گا۔ عیسائی سردار مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں کو آپس میں تقسیم کر چکے تھے۔ شاہ قسطنطنیہ نے خصوصیت کے ساتھ اپنے اس سردار کو جس کے حصہ میں بغداد پڑا تھا یہ وصیت کی تھی کہ دیکھنا بغداد کے اس بڈھے کا خیال رکھنا وہ نیک آدمی ہے اور میرا دوست ہے (یعنی خلیفہ) عیسائی سردار جس وقت اپنے ملک سے روانہ ہوئے تھے تو باہم ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ سردیوں کا موسم تو ہم لوگ رے میں گزاریں گے اور گرمی عراق میں۔ واپسی میں شامی علاقوں کا بھی فیصلہ کر لیں گے۔" (ج ۸۔ ص ۲۶۴)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بیڑیاں نکال دیں اور ایک خاص شاہی خیمہ میں اسے ٹھہرایا گیا۔ اس کا تاج اور لباس جو چھینے گئے تھے دوبارہ پہنا دیئے گئے۔ ارمانوس بھی الپ ارسلان کے اس حسن سلوک سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ طے ہوا کہ آئندہ سے قسطنطنیہ میں وہ الپ ارسلان کے نائب ہونے کی حیثیت سے حکومت کریگا اور سالانہ خراج بھی ارسال کرتا رہیگا۔ زر فدیہ میں بیش قرار رقم دینے کا وعدہ کیا بادشاہ نے ارمانوس کیسا اس کے چند سرداروں کو بھی خلاصی بخشی خود تین میل تک ارمانوس کی مشائعت میں گیا۔ لکھا ہے کہ جب الپ ارسلان سے رخصت ہو کر ارمانوس اپنے ملک کی طرف روانہ ہوا تو اس نے دریافت کیا کہ بغداد کس سمت میں واقع ہے جب بتایا گیا تو خلافت اسلامی کے پایۂ تخت اور خلیفہ کی طرف اس نے تعظیماً سر جھکایا اور یوں یہ قصہ ختم ہوا آگے جو واقعات پیش آئے انہیں تاریخ میں پڑھیئے ابن جوزی نے لکھا ہے کہ یہ معرکہ جس جگہ پیش آیا تھا اس کا نام "زہوہ" تھا۔

اور یہ واقعہ تو مشرق میں پیش آیا امام غزالی کی اس وقت عمر تیرہ چودہ سال کے درمیان تھی۔ کم از کم ابن جوزی کے زمانہ تک "اسلامی فتوحات" کے سلسلہ میں اس عجیب و غریب فتح و کامیابی کی نظیر مسلمانوں کی تاریخ میں موجود نہ تھی "اسلامی دنیا" پر اس غیر معمولی کامیابی کا جو اثر مرتب ہوا ہوگا اس کا اندازہ تو اس وقت بھی کیا جا سکتا ہے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ :-

"جب بغداد میں اس فتح کی خبر پہنچی تو ہر ہر گلی کوچے میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے "بیت النوبہ" میں لوگ جمع ہوئے اور فتح کی خوشخبری کے جو خطوط آئے تھے وہ پڑھے گئے۔"

بہر حال یہ قصہ تو اس وقت کا ہے جب امام حجۃ الاسلام طالب علمی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اسی کے کچھ دن بعد جب وہ بغداد کے مدرسہ نظامیہ کی صدارت پر فائز ہو چکے تھے اور اسلامی دنیا کے ممتاز و سربرآوردہ علماء کی صف میں داخل ہو چکے تھے۔ کم و بیش ان کی عمر اس وقت ۲۹ سال کے قریب تھی کہ مغرب میں اسی کے قریب قریب ایک دوسرا فیصلہ کن معرکہ "یورپ اور اسلام" کے درمیان پیش آیا۔

واقعہ زلاقہ

مسلمانوں کی تاریخ میں اس واقعہ کا نام "وقعۃ الزلاقہ" ہے۔ زلاقہ اس میدان کا نام تھا جہاں یہ معرکہ پیش آیا تھا تفصیلات کا مطالعہ تو عام تاریخوں میں کیجئے میں صرف خلاصہ اس کا درج کرتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ پانچویں صدی میں اندلس کے مسلمانوں کی مرکزی سلطنت طوائف الملوکی کی شکل اختیار کر چکی تھی لیکن اندلس کے سامنے مغرب اقصیٰ کا علاقہ افریقیہ میں تھا وہاں مسلمانوں کی ایک عظیم الشان حکومت ان لوگوں کی قائم ہو گئی تھی جن کا نام اسلامی تاریخ میں "ملثمین" یا نقاب پوشوں کی حکومت تھی، امام غزالی کے زمانہ میں اس حکومت کا فرمانروا وہی یوسف بن تاشفین تھا جس کے متعلق الیافعی کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ اپنے وقت میں کرۂ زمین کا سب سے بڑا طاقتور بادشاہ تھا۔

زلاقہ کا واقعہ اسی یوسف بن تاشفین کے ساتھ پیش آیا ہے۔ اس زمانہ میں اندلس کے ایک بڑے حصے میں عیسائیوں کی بھی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ان کا پایہ تخت طلیطلہ تھا۔ طلیطلہ میں اذفونش نامی عیسائی حکمران حکمرانی کر رہا تھا۔ قصہ بہت طویل ہے حاصل یہ ہے کہ اندلس کے ملوک الطوائف جن میں اشبیلیہ کا حکمران معتمد بن عباد سب سے زیادہ سربرآوردہ تھا۔ ان سب کے اشارے سے اذفونش کے مقابلہ کے لیے یوسف بن تاشفین مراکش سے اپنی فوج کے ساتھ اندلس پہنچا۔ اذفونش شاہ طلیطلہ کو جب اس کی خبر ملی تو یوسف

بن تاشفین جو عام طور امیر المسلمین کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ خلافت بغداد سے یہی خطاب ان کو ملا بھی تھا۔ ان کے نام اذفونش نے ایک طویل خط لکھا جس میں امیر المسلمین کو اس نے نصیحت کی تھی کہ میری طاقت و قوت کا چونکہ صحیح اندازہ تم کو نہیں ہے اس لیے بے سوچے سمجھے مسلمانانِ اندلس کے اکسانے پر تم یہاں چلے آئے ہو مناسب یہ ہے کہ خیر و عافیت کے ساتھ اپنے ملک واپس ہو جاؤ بہر حال اسی قسم کے مضامین سے اس کا خط بھرا ہوا تھا۔ امیر المسلمین کے پاس جب یہ خط پہنچا تو اپنے سیکرٹری کو بلا کر جواب لکھنے کا حکم دیا۔ سیکرٹری جب جواب لکھ کر لایا تو سننے کے بعد امیر المسلمین نے کہا کہ یہ تو بڑی طول طویل عبارت ہے پھر خود قلم ہاتھ میں لیا اور اذفونش کے خط کی پشت پر اپنے ہاتھ سے لکھا:۔

الذی ستکون تراہ — جو کچھ ہو کر رہیگا اسے تو خود دیکھ لے گا۔

اس جواب کے بعد اذفونش کے لیے مقابلہ کے سواء دوسرا چارہ کار ہی کیا تھا۔ آخر دونوں طرف سے فوجیں بڑھیں، مسلمانوں نے اپنا کیمپ بطلیوس کے علاقہ میں اس میدان میں قائم کیا تھا جس کا نام "زلاقہ" تھا۔ اسی نام سے اب تک تاریخوں میں یہ جنگ مشہور ہے۔

لکھا ہے کہ اذفونش کے ساتھ پچاس ہزار یورپ کے چیدہ اور جنگ جو سورما تھے انہی پر اس کو ناز تھا۔ ادھر امیر المسلمین کی فوج تھی جو افریقہ سے آئی تھی اور اندلس کے چند ملوک الطوائف کے سپاہی اور رضاکار مسلمان تھے۔ اذفونش نے دھوکہ میں رکھ مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ دونوں طرف سے خوب کشمکش ہوئی لیکن آخر کار نتیجہ یہ نکلا جیسا کہ کامل ابن اثیر میں ہے کہ:۔

ولم یرجع من الفرنج الی بلادھم غیر ثلاثمائۃ فارس (ج ۱۰ ص ۵۳) — یورپین فرنگی سپاہیوں میں سے نہیں واپس ہوئے اپنے ملکوں کی طرف مگر صرف تین سو سوار۔

اور یوں اذفونش کے پچاس ہزار فرنگی نوجوان "زلاقہ" کے میدان میں کھیت ہو کر رہ گئے۔ لکھا ہے کہ:۔

جعل المسلمون من رؤس القتلی کوما کثیرا فکانوا یؤذنون علیھا الی ان جیفت فاحرقوھا (ص ۵۳) — مسلمانوں نے مقتولوں کی لاش کے ڈھیروں سے بکثرت ٹیلے بنائے اور ان ہی ٹیلوں پر چڑھ کر اذان دیتے تھے تا آنکہ لاشیں سڑ گئیں تب جلا دی گئیں۔

ٹھیک جیسے ارمانوس کے مقابلہ میں الپ ارسلان کو کامیابی جمعہ کے دن ہوئی تھی آج بھی اتفاقاً جمعہ

کا دن تھا[1] مشرق و مغرب کی ان دونوں غیر معمولی کامیابیوں میں کل سولہ سال کا فاصلہ تھا۔ یہاں یہ سوچنے کی بات ہے کہ کسی ایک قوم کو ایک ہی سمت میں نہیں بلکہ مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی اپنے سب سے بڑے حریف کے مقابلہ میں اتنے قلیل عرصہ میں یعنی کل سینتیس سولہ سال کے اندر اندر ایسی عظیم الشان کامیابیاں جس وقت میسر آئی ہوں گی اس کا اثر ان کے نفسیات پر قدرتاً کیا پڑ سکتا ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ جس زمانہ میں یہ واقعات پیش آئے ہیں دنیا میں مسلمانوں کو کسی قسم کا خطرہ اگر اس عہد میں کسی سے تھا تو وہ ان ہی عیسائی قوموں سے تھا جو یورپ کے مشرقی اور مغربی حدود میں ان سے پنجہ آزمائی کر رہی تھیں ورنہ مسلمانوں کے سوا مسلمانوں سے ہاتھ ملانے کی جرأت اس زمانے میں دنیا کی کون قوم کر سکتی تھی۔ تاتاریوں کا ظہور تو ساتویں صدی کی ابتداء میں ہوا اور امام غزالی کے سامنے یہ دونوں مشرقی و مغربی فیصلہ کن معرکے پانچویں صدی ہجری میں پیش آئے تھے یقیناً غلامی کے اس عہد میں مسلمانوں کے ان فتوحات اور ان کے نفسیاتی آثار و نتائج کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ قوموں کے مقابلہ میں جب قدرت کسی قوم کو اس قسم کی غیر معمولی فاتحانہ برتری عطا کرتی ہے تو جو نشہ اس کے بعد سوار ہوتا ہے اور اخلاقی بنیادوں میں جو تغیرات شعوری و غیر شعوری طور پر ان حالات میں طبعاً پیدا ہوتے ہیں اس کا مشاہدہ اسی قسم کی کسی قوم کے

---

[1] میں نے جو لکھا تھا کہ اذفونش نے دھوکہ دے کر مسلمانوں پر حملہ کیا تھا اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ لڑائی جمعہ کے دن ہو گئی قصہ یہ ہوا کہ جب دونوں جانب فوجیں اتر گئیں تو اذفونش نے مسلمانوں کے پاس لکھا کہ کل تو جمعہ کا دن ہے جو تمہاری عید کا روز ہے اور اس کے ایک دن بعد اتوار کا دن آتا ہے جو ہماری عید کا روز ہے پس مناسب ہے کہ مقابلہ دوشنبہ کے دن شروع ہو۔ مسلمانوں نے اس کی بات مان لی لیکن اذفونش نے جمعہ کے دن یہ سمجھ کر کہ مسلمان مطمئن ہوں گے حملہ کر دیا مگر اس کے برے کید اور چال کو خدا نے ناکام فرمایا۔ لکھا ہے کہ اذفونش نے اس زمانے میں جب طلیطلہ سے چلا تو خواب دیکھا کہ وہ ہاتھی پر سوار ہے اس کے آگے ایک ڈھول رکھا ہے جس پر وہ ٹھوکریں لگاتا ہے۔ پادریوں سے اس خواب کی تعبیر اس نے پوچھی لیکن انہوں نے معذوری ظاہر کی تب ایک مسلمان عالم کو بلا کر اس نے تعبیر دریافت کی انہوں نے کہا کہ بادشاہ اس خواب کی تعبیر اگر مجھ سے نہ پوچھیں تو بہتر ہے مگر جب مصر ہوا تو انہوں نے سورہ الم ترکیف کا مضمون اسکو سنایا اور کہا کہ آپکو اس جنگ میں ناکامی ہوگی اور ڈھول کے نقر و ٹھونکنے کے متعلق بھی قرآنی آیت فاذا نقر فی الناقور سے استنباط کیا۔ کہ تمہارے لیے یہ دن سخت دشوار ہوگا۔ اذفونش اس تعبیر کو سن کر خاموش ہو گیا جب اپنے فوجی ساز و سامان اور اپنے سورماؤں کو اس نے دیکھا تو اس نے مسلمان عالم کو بلوا کر کہا کہ اس فوج کے ساتھ تو محمدؐ کے خدا سے بھی میں لڑ سکتا ہوں۔

افراد میں ہم کر سکتے ہیں جیسے عالم میں اس قسم کی برتری میسر آئی ہو آخر نفسیات انسانی کے نباض اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خطاب کر کے یہ بلا وجہ نہیں فرمایا تھا۔

واللہ ما الفقر اخشی علیکم و لکن اخشی علیکم ان تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علی من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا وتلھیکم کما الھتھم (رواہ البخاری)

خدا کی قسم محتاجی اور غربت کا تمہارے متعلق اندیشہ نہیں ہے مگر میں جس چیز سے ڈر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ دنیا میں تمہارے وسعت عطا کی جائے گی۔ جیسے گزشتہ قومیں جو تم سے پہلے گزریں ان کی دنیا میں وسعت بخشی گئی تھی پھر جیسے گزشتہ قوموں میں کشمکش پیدا ہوئی تم بھی ایک دوسرے کے مقابلہ میں نفسانیت سے کام لو گے اور جیسے دنیا نے ان کو غافل بنا دیا تمہیں بھی بنا دے گی۔

ہر بدر کے پیچھے احد ہے

یقیناً جو کچھ فرمایا گیا تھا اس کا سامنے آنا ضروری تھا! اور میں تو خیال کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی سیزدہ صد سالہ تاریخ ہر "بدر" کے پیچھے کسی نہ کسی شکل میں "احد" کا نشتر بھی مسلسل عمل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ کوئی اتفاقیہ واقعہ نہیں ہے بلکہ حکیم کی حکمت کا یہ اقتضاء ہے۔

خیر اس مسئلہ کو تو جانے دیجیئے میں تو اس وقت آپ کے سامنے اس سیاسی ماحول کا ایک سرسری خاکہ پیش کرنا چاہتا تھا جس میں امام حجۃ الاسلام پیدا ہوئے اور زندگی گزاری تھی۔

ایک غلط فہمی ازالہ

ایک بڑی غلط فہمی جس میں مسلمانوں کی تاریخ کے عام مطالعہ کرنے والوں کو مبتلا پاتا ہوں یہ ہے کہ مسلمان سلاطین و امراء کی باہمی اندرونی خلفشار کے جن قصوں کا تذکرہ ہماری کتابوں میں کیا گیا ہے سمجھنے والے سمجھ لیتے ہیں کہ شاید ان سے مسلمانوں کے عام طبقات بھی متاثر ہوتے تھے، لیکن میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہی طبقہ جو براہ راست حکومت اور سیاست میں دخیل تھا اس پر تو مسلمان سلاطین اور امراء کی باہمی آویزشوں کے نتائج کا اثر ضرور پڑتا تھا لیکن عوام ہی نہیں بلکہ حکومت کے غیر سیاسی محکموں سے جن لوگوں کا تعلق تھا عموماً گھر کے ان خانگی انقلابات سے وہ بہت کم متاثر ہوتے تھے، مثلاً عدالت کے محکمہ میں قضاۃ میزان عدل وغیرہ کے فرائض جو علماء انجام دیتے تھے یا درس و تدریس کے مشاغل میں جو مصروف رہتے تھے اور حکومت سے جن کو امداد ملتی تھی آپ دیکھیں گے کہ بادشاہوں یا خانوادوں کے بدل جانے کے بعد بھی اپنی خدمات پر عموماً وہ باقی رہتے تھے۔ ان کے احترام و اعزاز، آمدنی یا تنخواہ وغیرہ

پر اس انقلاب کا عموماً کوئی اثر نہیں پڑتا تھا سیاسی دوائر میں خواہ کسی قسم کا طوفان برپا ہو عام حالات میں ان طوفان کے تھپیڑوں سے اس قسم کے طبقات عموماً محفوظ رہتے تھے! امام غزالی کے قلم سے تھوڑی دیر بعد اس قسم کے فقرے بے ساختہ جو احیاء العلوم میں نکلتے گئے ہیں مثلاً پہلی جلد کے ابتدائی اوراق ہی میں اس کی شکایت کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کو علم طب سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے :۔

ان الطب لیس تلبیر الموصول به الی تولی الاوقاف والوصایا وحیازة مال الایتام وتقلد القضاء والحکومة والتقدم به علی الاقران والتسلط به علی الاعداء

کہ طب پڑھ کر اوقاف اور وصیتوں کے متولی ہونے اور یتیموں کے مال کی نگراں کاری اور قاضی بننے اور حکومت میں شریک ہونے ہم چشموں میں برتری حاصل کرنے دشمنوں پر قابو یافتہ ہونے کا موقع لوگوں کو نہیں ملتا۔

اور وہی قرآن وحدیث فقہ واصول فقہ وغیرہ دینی واسلامی علوم جن کے پڑھنے والے آج خال خال نظر آ رہے ہیں ان ہی علوم پر لوگ ٹوٹے پڑتے تھے کہ مذکورہ بالا مقاصد واغراض کے حصول کا واحد ذریعہ اس زمانے میں یہی علوم تھے! ورطب جیسا شریف معاشی فن جس کی ضرورت کسی خاص قوم وامت یا طبقہ یا فرقہ کے ساتھ وابستہ نہیں ہے اسی لیے "معاشی ضمانت" کے لحاظ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ طب سے زیادہ محفوظ پیشہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی، مشرقی ومغربی سب اس کے محتاج ہیں اور ہر زمانہ میں محتاج رہیں گے اس شریف فن کی بھی بے قدری کرتے ہوئے جن علوم میں مسلمان ڈوبے ہوئے تھے یقیناً "اطمینان کی روٹی" اور "اطمینان کی عزت" کے وہ بہترین ذرائع ہوں گے اور اس کی وجہ دہی تھی، خانگی جھگڑوں کی وجہ سے سیاسی انقلابات کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا جو ان علوم کی راہ سے حکومت کے جذبات پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔

اسی عہد میں علوم دینی کی سیاسی و معاشی اہمیت

اور امام غزالیؒ نے جس عہد میں ہوش سنبھالا اور آنکھیں کھولی تھیں اس وقت تو یہ کریلا ایک خاص وجہ سے یوں خیال کیجئے کہ نیم ہی چڑھ گیا تھا عرض کر چکا ہوں کہ مشرق میں یہ سلجوقیوں کی حکومت کا دور تھا اور سلجوقی دربار میں حسن اتفاق سے مدرسہ کے ایک "ملا" کو ایک ایسے غیر معمولی رسوخ ونفوذ کے حاصل کر لینے میں کامیابی ہوئی تھی کہ گویا درحقیقت وہی واقعی حکمراں اور حیز وکل کا مالک تھا، میرا اشارہ سلجوقی دربار کے مشہور وزیر نظام الملک طوسی کی طرف ہے جیسا کہ معلوم ہے نظام الملک کی ابتدائی زندگی ملاؤں کی زندگی تھی اس عہد کے تعلیمی نصاب کی باضابطہ انہوں نے تکمیل کی تھی علما دین کے اعزاز واحترام کا آفتاب نظام الملک طوسی کے عہد میں سمت الراس پر پہنچ کر جو چمک رہا تھا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ خود ان علوم میں ذاتی طور

پر کافی دستگاہ رکھتے تھے [1]

مورخین نے اس عہد کے علماء مثلاً امام الحرمین [2] یا شیخ ابو اسحاق شیرازی وغیرہ حضرات کی جن تکریمی داستانوں

---

[1] اردو زبان میں ایک ضخیم کتاب "نظام الملک طوسی" کے حالات پر شائع ہو چکی ہے اور یوں بھی پڑھے لکھے مسلمان ان کے حالات سے ناواقف نہیں ہیں۔ الیافعی نے لکھا ہے کہ اشتغل فی ابتداء امرہ بالحدیث والفقہ (یعنی اپنی ابتدائی زندگی میں نظام الملک نے حدیث اور فقہ کی تحصیل کی تھی) وکان مجلسہ عامرا بالقراء والفقھاء (ان کی مجلس قراء اور فقہا سے ہمیشہ بھری رہتی تھی) اور ان ہی کے الفاظ میں رغب فی العلم واملاء وحدث (علم کی طرف مائل تھے درس بھی دیا اور حدیث کی روایت بھی کرتے تھے) اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ "نظامیہ" کے نام سے ممالک محروسہ سلجوقیہ میں اسی شخص کی توجہ سے بیسیوں دار العلوم اور مدارس تعمیر ہوئے جن میں نظامیہ بغداد و نیشاپور نے خاصی شہرت حاصل کی، لکھا ہے کہ نظام الملک کے پاس امام الحرمین یا ابو القاسم قشیری ابو علی فارمدی جیسے علماء و صوفیاء جب آتے تھے تو ان کی تعظیم میں حد سے زیادہ مبالغہ سے کام لیتے تھے۔ حتیٰ کہ "خود وزارت کی مسند" سے اٹھ جاتے تھے! اور ان لوگوں کو اپنی جگہ بٹھاتے۔ (دیکھو کتاب مذکور ص ۱۳۷ ج ۳)

[2] امام الحرمین کی عظمت و جلالت کے لیے یہی کیا کم ہے کہ سلجوقیوں کا وزیر نظام الملک ان کے لیے اپنی مسند چھوڑ دیتا تھا۔ تیس سال تک مدرسہ نظامیہ نیشاپور کی صدارت پر فائز اور ایک صدارت درس ہی کیا، لکھا ہے کہ قسلم لہ المحراب والمنبر والخطابۃ والتدریس ومجلس التذکیر لیوم الجمعۃ والمناظرۃ (ص ۱۳۶ ج ۳) (یعنی درس کے سوا نیشاپور کے محراب و منبر پر بھی ان ہی کا قبضہ تھا، وہی امام خطیب تھے اور وعظ و مناظرہ کی مجلس بھی ان ہی کی باقی رہ گئی) ان کی وفات کے دن جو منظر دیکھا گیا، کہا جاتا ہے کہ اس کی نظیر مشکل ہی سے دیکھی گئی ہے۔ شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے اور سال بھر تک لوگ ان کے ماتم میں سر برہنہ رہے۔ جس منبر پر خطبہ دیتے وہ توڑ دیا گیا، طلبہ نے اپنی دواتیں پھوڑ دیں، سال بھر تک درس بند رہا، ان کے تلامذہ شہر بہ شہر ان کی نوحہ خوانی کرتے رہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ امام غزالی کی عمر جیسے (۵۵) سال سے زیادہ نہ ہوئی، اسی طرح ان کے استاذ بھی ساٹھ سے پہلے (۵۹) سال کی عمر میں انتقال کر گئے اور یہ حال تو امام الحرمین کا تھا شیخ ابو اسحاق شیرازی کے متعلق لکھا ہے کہ بغداد سے سفارت پر جب وہ شیراز روانہ ہوئے تو راستہ میں عموماً مسلمانوں کے جن شہروں اور آبادیوں سے ان کا وفد گزرتا تھا لوگ استاذ کے استقبال اور دیدار کے لیے باہر نکل آتے تھے اور ان کی ڈولی پر ہر پیشہ والے اپنے پیشہ کی مناسبت سے چیزیں نچھاور کرتے تھے حتیٰ کہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بجائے خود ان بزرگوں کے غیر معمولی علمی و دینی کمالات کو بھی ان میں دخل تھا لیکن اسی کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عوام کے رجحانات حکومتِ وقت کے طرزِ عمل سے ضرور متاثر تھے۔ آخر نظام الملک سے پہلے بھی تو علماء کے اس طبقہ میں بڑے بڑے صاحبِ کمال موجود تھے لیکن خصوصیت کے ساتھ سلجوقیوں کے عہد کے ان علماء کے ساتھ عوام و خواص کی دلچسپیاں اس حد کو کیوں پہنچ گئی تھیں جن کی نظیر نہ اس عہد سے پہلے ملتی ہے اور اس کے بعد بھی مشکل ہی سے ان کی مثالوں کے تلاش کرنے میں ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔

کوئی شبہ نہیں کہ نظام الملک کی طرف سے یہ جو کچھ ہو رہا تھا اس کی بنیاد ان کی علمی قدر شناسیوں اور ان کے صحیح دینی جذبات پر قائم تھی لیکن جو دنیا کے طالب تھے جب انہوں نے دیکھا کہ دین کی راہ سے بھی وہی دنیا مل سکتی ہے جو امام الحرمین جیسے بزرگوں کو ملی ہوئی تھی تو شاید یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ دینداروں کا گروہ دنیا داری کی طرف چل پڑا بلکہ صحیح تعبیر اصل واقعہ کی یہ ہو سکتی تھی کہ جو دنیادار تھے وہ دین داروں کی بھیڑ میں گھل مل گئے، امام حجۃ الاسلام کی اس قسم کی نوحہ خوانیاں اور ماتم سرائیاں مثلاً احیاء العلوم کے ابتدائی اوراق میں فرماتے ہیں:-

ھیھات ھیھات قد اندرس علم الدین بتلبیس العلماء السوء فالله المستعان والیہ الملاذ فی ان یعیذنا من ھذا الغرور الذی یسخط الرحمٰن ویضحک الشیطان (ص ۱۶ ج ۱)	ہائے ہائے علماء سوء (برے علماء) کی حق پوشیوں کی وجہ سے علم دین مٹ گیا۔ پس اللہ ہی سے امداد اس دشواری میں چاہی جاتی ہے وہی پشت پناہ ہے وہی بچا سکتا ہے اس فریب سے جس سے خدا کا غصہ بھڑکتا ہے اور شیطان بھی جس پر ہنستا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کہ نانبائی روٹیاں نثار کرتے تھے۔ خود خلیفۂ وقت مٹھائیاں لٹاتے تھے۔ پھل والے پھلوں کی بارش کرتے تھے۔ حد یہ ہو گئی کہ کفش دوزوں نے بچوں کے پاؤں کی سینکڑوں ہلکی ہلکی جوتیاں بنائیں اور ان ہی کو شیخ کی سواری پر وہ نثار کرتے تھے۔ خود خلیفۂ وقت تک شیخ کا احترام کرتا تھا اور یہ حالات عام کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ میری غرض ان واقعات کے ذکر سے صرف یہ ہے کہ سلاجقہ کے عہد میں یا بالفاظ دیگر امام غزالی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں علمائے دین کے اقبال و عروج کا کیا حال تھا۔ پڑھنے والوں کو ان مثالوں سے تھوڑا بہت اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اور تو اور خود امام غزالی کے بھی استاذ امام الحرمین کے متعلق تقریباً اکثر تاریخوں میں اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں امام غزالی نے اپنی کتاب "منخول" جب لکھی اور استاذ کے سامنے پیش کی تو بجائے تعریف کرنے اور خوش ہونے کے کہتے ہیں کہ امام الحرمین نے امام غزالی کو مخاطب کر کے کہا :۔

دفنتنی وانا حی ھلا صبرت حتی اموت (منتظم ص ۱۶۹/۹) — تو نے تو مجھے زندہ دفن ہی کر دیا اتنا تو صبر کرتے کہ جب میں مر جاتا۔ (اس کتاب کو لکھتے)

امام غزالی کی کسی اور کتاب کو دیکھ کر امام الحرمین میں اس قسم کے جذبات پیدا ہوتے تو شاید اس پر اتنی حیرت نہ ہوتی۔ یہ "منخول" اس نہج کی کتاب تھی جسے غزالی نے اپنے استاذ ہی کی ایک کتاب "مغیث الخلق" کے نمونے پر لکھی تھی، اور "مغیث الخلق"[1] کس قسم کی کتاب ہے۔ اب میں کیا بتاؤں امام الحرمین بڑے آدمی

---

[1] امام الحرمین نے یہ کتاب امام ابوحنیفہ اور ان کے مذہب کی تنقید پر لکھی ہے۔ تنقید و تحقیق تو علماء کا کام ہی ہے لیکن اس کتاب کے دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی عظیم شخصیت سے بھی تعصب کے بعد کیا کچھ سرزد نہیں ہو جاتا ہے! ابتدا ہی اس کتاب کی ایسے طرز سے ہوئی ہے کہ اسی سے آئندہ جو لکھا جا سکتا ہے اس کا پتہ چل جاتا ہے یعنی پہلی وجہ امام ابوحنیفہ اور ان کے مذہب کے ضعف کی یہ بیان کی ہے کہ ابوحنیفہ نبطی تھے۔ یعنی ایرانی کسان خاندان سے تعلق رکھتے تھے پھر ایسے بے سر و پا واقعات کا تذکرہ کیا ہے کہ جن کو سن کر تاریخ کا معمولی طالب علم بھی شاید ہنس دے۔ مثلاً ہارون الرشید کے دربار میں لکھا ہے کہ امام شافعی بلائے گئے ان کے احترام و اعزاز میں قاضی ابو یوسف اور محمد بن حسن الشیبانی جو دربار میں موجود تھے حسد میں جلنے لگے حالانکہ امام شافعی جس زمانہ میں بغداد پہلی دفعہ آئے تھے قاضی ابو یوسف کا انتقال ہو چکا تھا اور اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر ہے کہ محمود غزنوی کے دربار میں قفال کے متعلق جو مشہور کیا گیا ہے کہ حنفیوں کی مسنون نماز کی شکل بتاتے ہوئے انہوں نے یہ کیا کہ کتے کی کھال اوڑھی اور آدھے جسم پر غلاظت لپیٹی پھر نبیذ سے وضو کیا اور فارسی میں تکبیر کہتے ہوئے ہاتھ باندھ کر "دو برگ سبز" بولے اور زمین پر سے دو ٹھوکریں لگائیں۔ پھر بیٹھ کر تشہد کے بعد زور سے ریاح خارج کی اور سلام پھیرے بغیر سلطان سے کہا کہ حنفیوں کی مسنون نماز ادا ہو گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض مسخروں نے اس لطیفے کو ضرور مشہور کیا ہے لیکن امام الحرمین جیسے امام علامہ سے یقیناً اس کی توقع نہ تھی کہ اس قسم کی بازاری گپ کا تذکرہ اپنی کتاب میں کریں گے۔ مگر جس عصبیت بیجا کا اظہار اپنی اس کتاب میں انہوں نے کیا ہے اس کو سامنے رکھ لینے کے بعد تعجب کا ازالہ ہو جاتا ہے بیچارے امام غزالی نے بھی اپنی جوانی میں اس کو علمی کمال خیال کر کے "منخول" نامی کتاب لکھی تھی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہیں ادب مانع ہے ورنہ شاید یہ کہہ سکتا تھا کہ احیاء العلوم میں اس قسم کے اشارے جو پائے جاتے ہیں مثلاً اپنے عہد کے علماء سو کی ایک عام عادت یہ بتاتے ہیں۔

انہم مبالغون فی التعصب و ینظرون الی المخالفین بعین الازدراع والاستحقار

حق کی حمایت ہیں بے جا تعصب سے کام لیتے ہیں۔ اس میں حد سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں اور اپنے مخالفوں کو حقارت و ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

پھر چند ناصحانہ کلمات کے بعد فرماتے ہیں،

ولکن لما کان الجاہ لایقوم الا بالاستتباع ولا یستمیل الاتباع مثل التعصب واللعن والشتم وللخصوم اتخذوا التعصب عادتہم والتہم وسموہ ذباعن الدین ونضالاعن المسلمین وفیہ علی التحقیق ھلاک الخلق
(صنہ ۳ ج ۱)

اور جاہ و عزت کے حاصل ہونے کی صورت یہی ہے کہ بہت سے لوگ پیرو بن جائیں اور لوگوں کو اپنی پیروی کی طرف مائل کرنے کا قاعدہ یہی ہے کہ تعصب سے کام لیا جائے مخالفوں پر لعنت و ملامت اور سب و شتم کیا جائے اسی لیے ان لوگوں نے تعصب کو اپنی عادت بنا لیا ہے مگر منہ سے کہتے ہیں کہ ہم دین کی طرف سے جواب دیتے ہیں اور مدافعت کا فرض ادا کرتے ہیں اور مسلمانوں کی طرف سے مقابلہ کرتے ہیں حالانکہ خدا کی مخلوق کی اس میں بربادی ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ "شنیدہ" سے زیادہ "خود دیدہ مشاہدات" ہی نے اس قسم کی باتوں کے لکھنے پر امام کو مجبور نہیں کیا تھا۔

علماء کے ناموں کیساتھ القاب کی بھرمار

اور سچی بات تو یہ ہے کہ خود "امام الحرمین" کے اس لقب خاص کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) آخر میں جاہلی عصبیت کی اپنی کتابوں میں انہوں نے خود مذمت کی ہے لیکن حنفیوں میں ایک قسم کی گرانی اس کتاب کی وجہ سے امام غزالی کے متعلق اب بھی پائی جاتی ہے۔

متعلق تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا[1] لیکن خصوصیت کے ساتھ اسی زمانہ میں اسی کے قریب قریب ایسے القاب و آداب مثلاً قاضی الخافقین[2] یا "ذوالشرفین" "فقیہ العراقین" وغیرہ کی بھرمار علماء کے اسمائے گرامی کے ساتھ جو نظر آتی ہے یہ بلا وجہ نہیں ہے۔ امام غزالی کا تاثر اور امام حجۃ الاسلام علماء کے جن حالات سے متاثر تھے ان کی غمازی خود یہ الفاظ بھی کسی نہ کسی حد تک ضرور کر رہے ہیں۔ بلکہ چاہا جائے تو یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ "شنیدہ" اور "دیدہ" سے بھی آگے بڑھ کر ان چیزوں کی حیثیت امام حجۃ الاسلام کے لیے تو "چشیدہ" کی تھی دوسروں کی شہادت سے نہیں، بلکہ خود امام کے ذاتی اعترافات ہی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ علماء

---

[1] امام الحرمین کی کتاب "مغیث الخلق" کو علامہ الکوثری الحنفی نے اپنے جوابی نوٹوں کے ساتھ حال ہی میں جو شائع کیا ہے اسی میں وہ لکھتے ہیں کہ ایک خاص حادثہ کی وجہ سے کچھ دن کے لیے امام الحرمین اپنے وطن نیشاپور سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے۔ اسی زمانہ میں کچھ دن ان کا قیام مکہ میں اور کچھ دن مدینہ میں رہا جہاں رہتے تھے وہاں نمازوں میں عالم ہونے کی وجہ سے امامت کا موقع ملتا رہا اسی لیے "امام الحرمین" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ (دیکھو کوثری کی کتاب احقاق الحق بابطال الباطل فی مغیث الخلق ص۱۔

[2] قاضی الخافقین کے متعلق لکھا ہے کہ بہت بڑا علاقہ ان کی قضا سے چونکہ تعلق رکھتا تھا اس لیے اس لقب سے مشہور تھے (دیکھو الیافعی ص ۱۵ ج ۳) ذوالشرفین کا نام سید مرتضیٰ تھا اپنے وقت کے بہت بڑے محدث بھی تھے اور دولتمند بھی دس ہزار سالانہ اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتے تھے۔ الیافعی ص ۱۳۳ ج ۱۔ ۴۸۰ھ میں وفات ہوئی اسی طرح فقیہ العراقین ابن صباغ کا لقب تھا، یہ وہی صاحب ہیں جنھوں نے استاذ ابواسحاق شیرازی کے روپوش ہو جانے کی وجہ سے مدرسہ نظامیہ کی صدارت کا عہدہ قبول کیا تھا ۴۷۷ھ میں وفات ہوئی۔ الغرض زیادہ تر اس قسم کے القاب کی کثرت سلجوقیوں ہی کے زمانہ میں ہوئی بلکہ مشرق کے عام مسلمانوں میں "الدین" کی اضافت والے ناموں کی کثرت جو نظر آتی ہے الیافعی نے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ اس کی ابتداء بھی اسی زمانہ میں ہوئی ان کا بیان ہے کہ سب سے پہلے نظام الملک طوسی کے نام کے ساتھ "قوام الدین" کے لقب کے اسلامی تاریخ میں پاتا ہوں ورنہ اس سے پہلے "الدولہ" یا "الملک" کی اضافت کا خطابوں میں رواج تھا۔ پچھلے زمانہ میں اس "الدین" والے ناموں کا جو طوفان مسلمانوں میں برپا ہوا ہے اس پر الیافعی بہت بگڑتے ہیں کہ آج ہر فاسق تاجر شمس الدین نو بنا ہوا ہے پھر ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ ان سارے ناموں میں میرے نزدیک صرف صارم الدین ہی کا نام صحیح ہے یعنی دین کے کاٹنے والے ورنہ اس کے سوا عموماً برعکس نہند نام زنگی کافور کی مثل صادق آتی ہے۔ (دیکھو مرآۃ الجنان ص ۱۳۵ ج ۱)

کی عصبی جاہلیت کا ذکر کرتے ہوئے اور اس سلسلہ میں جدلیات و خلافیات کے نام سے فتنوں کی جو آگ مسلمانوں کے درمیان ان ہی مولویوں نے بھڑکا رکھی تھی امام ہی کے حوالہ سے گزر چکا کہ بظاہر گو انہوں نے یہی باور کرایا تھا کہ مقصود ان کوششوں سے دین کی حمایت اور مسلمانوں کی نصرت اور پشت پناہی ہے۔ لیکن امام نے فرمایا تھا کہ :-

ففیہ علی التحقیق ھلاک الخلق — درحقیقت اسی میں خلقت کی تباہی اور بربادی ہے۔

بہرحال احیاء العلوم میں اسی موقع پر اس نصیحت کے بعد

فایاک وان تحوم حولها واجتنبها اجتناب سم القاتل فانها الداء العضال وهو الذی رد الفقهاء کلهم الی طلب المنافة والمباهاة (ص ۳۱، ج ۱)

خبردار! جو اس طریقہ کے تم قریب بھی جاؤ اس سے پرہیز کرتے رہنا۔ ایسا پرہیز جیسے زہر قاتل سے آدمی پرہیز کرتا ہے کیوں کہ یہی ناقابل علاج مرض ہے اور اسی چیز نے سارے فقہاء (مولویوں) کو نفسانیت اور ناز و نخوت میں مبتلا کر دیا۔

امام نے لکھا ہے کہ ممکن ہے میرے اس بیان کو سن کر

یقال الناس اعداء لما جھلوا۔

کہا جائے کہ لوگ جس چیز سے ناواقف ہوتے ہیں اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ (یہ عربی زبان کی ایک ضرب المثل ہے)

اسی کا جواب ان الفاظ میں دیتے ہیں کہ :

فلا تسمع ذلک فعلی الخبیر سقطت

تم ہرگز اس کی نہ سنو! کیونکہ کسی ناواقف کے پاس تم نہیں ہو بلکہ ایک بڑے واقف کار کے پاس تم پہنچ گئے ہو۔

"الخبیر" یا "بڑے واقف کار" سے اشارہ امام نے خود اپنی طرف کیا ہے اور اسی کے بعد اپنے "چشیدہ" حالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

فاقبل هذه النصیحة ممن ضیع العمر فیه زمانا وزاد علی الاولین تصنیفا وتحقیقا و

تم کو چاہیے اس شخص کی بات مانو جس نے اپنی عمر کا ایک حصہ اسی قصہ میں برباد کیا ہے اور پہلوں کے

جدلا وبیانا۔

مقابلہ میں اس نے اس راہ میں زیادہ کام کیا ہے۔
کتابیں لکھیں، تحقیق کی بھی داد دی، لڑا جھگڑا بھی
اور خوب کھول کر چیزوں کو اس نے بیان کیا۔

جہاں تک میرا خیال ہے ان کا ایما اپنے اسی کام کی طرف ہے جس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں یعنی اپنے استاذ امام الحرمین کے نقش قدم پر "المنخول" نامی کتاب جو انہوں نے لکھی تھی۔ اور امام الحرمین نے ان کی کتاب کو دیکھ کر جب یہ کہا تھا کہ کاش تم میرے مرنے کا انتظار کرتے غالباً اسی کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے کہ پہلوں سے میرا کام ترقی یافتہ تھا، بہرحال آخر میں لکھتے ہیں :۔

ثم الهمه الله رشده واطلعه علی عیبه فهجره واشتغل بنفسه (ص۳۱)

پھر خدا نے اس شخص کو اپنی سوجھ بوجھ عطا کی اور غیب سے وہ آگاہ ہوا۔ پس اس مشغلہ کو اس نے چھوڑ دیا اور اپنی نبیڑنے میں مشغول ہو گیا۔

امام کی شخصی زندگی کی بعض خصوصیات

ابتدائی ماحول

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "المنخول" یا اسی قسم کے جو کارنامے علم کی خدمت کے نام سے امام نے اس زمانے میں کیے تھے ان کو زندگی کے دوسرے دور میں پسند نہیں فرماتے تھے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے جدلیاتی کاروبار کی تصحیح میں امام الحرمین سے جو باتیں امام نے سنی تھیں آگے انہیں کا جواب دیتے چلے گئے ہیں ان کے نام کی صراحت انہوں نے کی ہے، احیاء العلوم میں یہ مقام خاص طور پر قابل توجہ ہے خیر یہ الگ مسئلہ ہے میری غرض تو ان الفاظ کے نقل کرنے سے یہ تھی کہ مسلمانوں میں عموماً اور طبقۂ علماء میں خصوصاً جن عیوب کا امام کو احساس ہوا تھا تو دوسروں کے ساتھ اس کا بھی اقرار انہوں نے کیا ہے کہ ان عیوب میں زمانے تک وہ خود بھی مبتلا تھے اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ امام کے متعلق مختلف مورخین نے اس قسم کی باتیں لکھی ہیں مثلاً مشہور محدث و مورخ امام جلیل عبدالغافر الفارسی جو جامعہ نیشاپور کے خطیب اعظم تھے ان کے حوالہ سے الیافعی نے ان کی چشم دید تجربی شہادت

جونقل کی ہے یعنی " الفارسی " نے یہ لکھ کر کہ لقد نزرته مرارا (غزالی سے کئی بار میں مل چکا ہوں) آگے لکھا ہے کہ

وما كنت احدث في نفسي مما عهدته في سالف الزمان عليه من الزعارة وايحاش الناس والنظر اليهم بعين الازدراء والاستحقار كبرا وخيلاء واغترارا بما رزق من البسطة في النطق والخاطر والعبارة وطلب الجاه والعلو في المنزلة وكنت اظن انه متلفع بجلباب التكلف والتيمن بما صار اليه فتحققت بعد التروي والتنقير ان الامر على خلاف المظنون وان الرجل افاق بعد الجنون (ص ۱۸۴ ج-۳)

اس شخص کو پہلے جس حال میں پایا تھا میں ان باتوں کو سوچا کرتا تھا، ان کی تنک مزاجی، تندخوئی، لوگوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دینا اور ان کو حقارت کی نظر سے صرف اس لیے دیکھنا کہ خدا نے گویائی کا جو کمال ان کو عطا کیا تھا اور ذہنی انتقال میں جو کشادگی تھی ہر مطلب کی تعبیر کی قدرت جو ان میں پائی جاتی تھی ان ہی چیزوں پر ان کو ناز تھا اسی طرح جاہ و عزت کی جستجو کا جو جذبہ اس شخص میں پایا جاتا ہے (ان ہی گزشتہ باتوں کو سوچ کر) میں بھی خیال کرتا رہا کہ صرف تکلف کی چادر اس شخص نے اوڑھ لی ہے اور زبردستی اچھے لوگوں میں شریک ہونے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جب زیادہ کیچ کاؤ اور تحقیق سے میں نے کام لیا تو یہ ماننا پڑا کہ میرا خیال صحیح نہیں ہے اور جنوں کی اس قدیم بیماری سے واقعتہً یہ شخص صحت یاب ہو چکا ہے ۔

یا اسی کے قریب قریب ابن جوزی نے خلافت عباسیہ کے ایک وزیر انوشروان نامی کے حوالہ سے یہ قصہ " المنتظم " میں جو نقل کیا ہے یعنی انوشروان کا بیان تھا کہ میں امام غزالی سے ملاقات کرنے ان کے پاس گیا ہوا تھا انہوں نے مجھے یہ نصیحت شروع کی کہ دیکھئے آپ کی زندگی کا جو زمانہ ہے اس کے ایک ایک لمحہ کا حساب آپ سے لیا جائے گا اور آپ کی مثال اس شخص کی ہے جسے مزدوری اور اجرت پر کام کرنے کے لیے کسی نے مقرر کیا ہو۔ پس اپنی آمدنی کے اضافہ میں جہانتک ممکن ہو کوشش کرنا یہ میری ملاقات سے تمہارے لیے

کہیں بہتر ہے۔
انوشرواں ان کی اس نصیحت کو سن کر جب باہر نکلا تو لوگوں سے کہنے لگا کہ

لا الٰہ الا اللہ ھذا الذی کان فی اول عمرہ یستزید نی فضل لقب فی القابہ کان یلبس الذھب والحریر فآل امرہ الیٰ ھذا الحال (صفحہ ۱۷ ج ۹)

خدا کی شان ہے اس آدمی کا حال زندگی کی ابتدائی دنوں میں یہ تھا کہ اپنے القاب میں مجھ سے خواہش رکھتا تھا کہ مزید اضافہ کردوں سونا اور حریر استعمال کرتا تھا اور آج اس کا حال یہ ہے۔

الغرض یہ یا اسی قسم کی دوسری شہادتیں امام غزالی کی زندگی کے ابتدائی دور کے متعلق جو ملتی ہیں ان کو خواہ مخواہ مشکوک قرار دینے کی بظاہر مجھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی بلکہ اسے بلا وجہ بدگمانی اگر نہ ٹھہرایا جائے تو اس خیال کی تردید کی بھی ضرورت معلوم نہیں ہوتی یعنی وطنی تعلقات کی بنیاد پر اگر یہ سمجھا جائے کہ نظام الملک طوسی کا زمانہ امام غزالی کی ابتدائی زندگی میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ تو شاید یہ محض ایک بے بنیاد سوئے ظن نہیں ہو سکتا بلکہ فطرت انسانی کے عام اقتضاء کے مطابق امام غزالی نے طوس کے علاقہ میں جب آنکھیں کھولیں تو یقیناً طوس اپنے اس با اقبال و سعادتمند، فرزند طالع ارجمند کے چرچوں سے گونج رہا ہوگا جس نے فقر و فاقہ کی خاندانی[1] زندگی سے ترقی کر کے اس دولت قاہرہ کی مسند وزارت کبریٰ تک پہنچ جانے میں کامیابی حاصل کی تھی جو اس زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی حکومت تھی! امام حجۃ الاسلام کے گھر

---

[1] میں نے عرض کیا خواجہ نظام الملک طوسی کی طویل و ضخیم سوانح عمری مولفہ مولوی عبدالرزاق صاحب مصنف البرامکہ کے قلم سے مدت ہوئی شائع ہو چکی ہے اردو خوانوں کے عام افراد اب نظام الملک سے نامانوس نہیں ہیں! ان کے والد جن کا نام علی بن اسحاق تھا حکومت کے محکمے کے معمولی صیغہ دار تھے۔ اس پر کھانے کھلانے کا شوق مفرط ان پر مسلط تھا لکھا ہے کہ اسی وجہ سے ہمیشہ تنگ دست رہتے تھے۔ نظام الملک جن کا اصلی نام حسن تھا جب پیدا ہوئے تو باوجود تنگدستی کے ان کے والد نے تعلیم پر خاص توجہ کی۔ شروع میں قرآن یاد کرایا پھر باضابطہ اسلامی علوم کی تکمیل کر کے آبائی پیشہ یعنی صیغہ داری کی نوکری اختیار کی۔ آخر میں بلخ کے حاکم ابن شاداں عمید کے دربار کے میر منشی ہو گئے لیکن ابن شاداں سے بھی نہ بنی بالآخر الپ ارسلان کے باپ چغر بیگ تک ان کی رسائی ہوئی الپ ارسلان ابھی ولیعہد ہی تھا چغر بیگ نے الپ ارسلان کا سکریٹری مقرر کر دیا یہیں سے ان کی غیر معمولی ترقی کا بن گیا الپ ارسلان نے بادشاہ ہونے کے بعد وزارت خواجہ کے سپرد کی۔ گو سلجوقیہ حکومت کی ارداری اسی زمانہ میں انکی ذات میں مرتکز ہو چکی تھی لیکن الپ ارسلان کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ سلجوقی

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں جب یہ مثال موجود تھی تو اپنی قدرتی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ اسی کوہ طور کی سیر کا شوق ان میں بھی نہ پیدا ہوا ہوگا یا نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔

دولت سلجوقیہ کے دربار میں رسائی

بہرحال کوئی تصریحی شہادت تو اس کی میرے پاس نہیں ہے لیکن ان کے سوانح نگاروں نے اتنا تو لکھا ہے کہ امام الحرمین کی درس گاہ سے الگ ہونے کے بعد معاشی زندگی میں شریک ہونے کے لیے امام حجۃ الاسلام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) چونکہ محض خواجہ ہی کی کوشش سے بادشاہ ہونے میں کامیاب ہوا تھا اس لیے ملک شاہی دور میں حکومتِ سلجوقیہ کے واقعی فرمانروا خواجہ نظام الملک طوسی ہی تھے۔ ملک شاہ نے عام اعلان کر دیا تھا کہ "تخت اور شکار کے سوا..... حکومت کے کسی شعبہ سے مجھے کوئی تعلق نہیں" "سب کچھ خواجہ حسن ہیں۔" بیس سال تک اس شان کی وزارت تو ملک شاہ کے زمانہ میں ان کے قبضہ میں رہی اور دس سال الپ ارسلان کی وزارت کی تھی۔ یوں (۲۹) سالہ دورِ وزارت میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچے۔ ان کی دولت وحشمت اور اسی کے ساتھ ان کی بے مثال فیاضیوں کی داستان طویل ہے۔ خصوصاً علم دوستی ہنرنوازی اور علماء کی قدر افزائیوں میں شاید ان کے عہد کی نظیر اسلامی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ کبھی کبھی نظام الملک اپنے ایام عروج واقبال میں زندگی کے ان دنوں کو یاد کر لیا کرتے تھے جن سے انہیں گزرنا پڑا تھا۔ روضۃ الصفا میں لکھا ہے کہ کسی علاقہ سے خبر آئی کہ ان کی کوہستانی چراگاہ سے پانسو گھوڑے جو خالص عربی النسل تھے اڑنے والے پرندوں سے بھڑک کر نیچے دریا میں گر پڑے کچھ ڈوب گئے کچھ بے کار ہو گئے ہڈیاں ان کی ٹوٹ گئیں۔ خواجہ کو دیکھا گیا کہ اس خط کو پڑھ کر آبدیدہ ہوئے پھر رونے لگے اور خوب روئے، لوگوں کو تعجب ہوا تب خود بولے کہ میں گھوڑوں کے مرجانے کی وجہ سے نہیں رو رہا ہوں خدا کے فضل سے پانسو گھوڑوں کی اس وقت میری نگاہ میں کیا قیمت ہو سکتی ہے لیکن اپنی ابتدائی زندگی کا وہ قصہ یاد آگیا جب میں غزنی سے خراسان آرہا تھا میرے پاس بمشکل تین اشرفیاں تھیں۔ ایک صاحب سے دو اشرفیاں قرض لے کر پانچ اشرفیوں میں میں نے سفر خراسان کے لیے ایک ٹٹو خریدا لیکن روانگی کا بھی موقع نہ ملا کہ "ہماں روز آں اسپ بچراگاہ آخرت رفت" (صفحہ ۲۷۱ ج ۴ روضہ)۔ اس ٹٹو کے مرنے کا اس وقت جو غم ہوا تھا اسی غم کا اس وقت خیال آگیا۔ کہ ایک دن مجھ پر وہ بھی گزرا ہے کہ ایک معمولی ٹٹو کے لیے میں رو رہا تھا۔ اس قسم کے بیسیوں قصے کتابوں میں ان کے متعلق ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی زندگی خواجہ کی عسرت اور تنگی سے شروع ہوئی تھی۔

ابتداءً جس شخص کے دربار میں حاضر ہوئے وہ ان کا ہی ہموطن وزیر دولت سلجوقیہ تھا۔ الیافعی نے لکھا ہے :۔

"جب امام الحرمین کی وفات ہوئی تو امام غزالی نے دالعسکر (شاہی کیمپ) کی طرف رخ کیا اور وزیر نظام الملک سے ملے۔ وزیر نے امام کا اکرام کیا اور غیر معمولی طور پر ان کی طرف متوجہ ہوا"

(صفحہ ۱۷۸ ج : ۳)

الفارسی ابن جوزی الغرض امام کے اکثر سوانح نگاروں نے اس واقعہ کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کیا ہے نظام الملک کے اس کیمپ میں پہنچ کر امام حجۃ الاسلام کو کن تجربات سے گزرنا پڑا، میرا تو خیال ہے کہ احیاء العلوم وغیرہ بلیسیوں کتابوں کے نظریات اور فیصلے ان کے ان ہی تجربات پر مبنی ہیں۔ علماء کے باہمی علمی مناظروں کی خرابیاں کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے اس قسم کی باتیں جو لکھی ہیں کہ سارے ذلیل جذبات میں تلاطم ان ہی سے پیدا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں کہ :۔

"سارے برے اخلاق جن کا شیطان مداح ہے اور خدا جن سے ناخوش ہوتا ہے وہ ان مناظروں سے ابھر جاتے ہیں۔"

پھر مثال دیتے ہوئے انہوں نے بیان کیا ہے کہ :۔

"اپنے ہم چشموں پر برتری حاصل کرنے کی خواہش ان مناظروں سے قدرتاً آدمی پر مسلط ہو جاتی ہے چاہتا ہے کہ اپنی حیثیت سے زیادہ اس کی آؤ بھگت کی جائے۔ بلکہ بسا اوقات یہ مناظرہ کرنے والے لوگ اس پر لڑ بیٹھتے ہیں کہ مجلس میں سب سے ممتاز جگہ ان ہی کو کیوں نہ ملی۔ صدر مجلس سے قریب بیٹھنے کا موقع اسے کیوں نہ دیا گیا۔ یا چلتے ہوئے تنگ راستہ اگر سامنے آجائے تو چاہتے ہیں کہ ان ہی سے آگے بڑھنے کی درخواست کی جائے۔"

یہ اور اسی قسم کے امور کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں :۔

"ان میں بعض غبی لوگ، لیکن چالباز ہوتے ہیں وہ اپنے دل میں اس قسم کی باتیں بناتے ہیں کہ ان مطالبات سے مقصود علم اور دین کے احترام کی حفاظت ہے یا اپنی خودداری کے بچانے کی یہ کوشش ہے۔ مومن کے لیے مذہب نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔"

پھر غصہ سے بیتاب ہو کر ان مولویانہ تاویلوں پر جتنی لعنت و ملامت وہ کر سکتے تھے کرتے چلے گئے ہیں انہوں نے اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ مناظرہ کرنے والوں کے قلوب میں ہر اس شخص کی جانب سے

عداوت پیدا ہوجاتی ہے جو ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا یا ان کی ہمنوائی سے لاپرواہی اختیار کرتا ہے۔ فریق مقابل کی توہین و تحقیر اور مختلف پیرایوں میں اپنے علم و فضل، کثرت مطالعہ، وسعت نظر وغیرہ کا اظہار اور اس قسم کے دعوے کہ بھلا ایسی باتیں مجھ سے مخفی رہ سکتی ہیں میں نے کس علم کی کتابیں نہیں کھنگالی ہیں۔ کن اصولی باتوں پر میں نے غور نہیں کیا ہے حتیٰ کہ اسی مناظرہ کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ:۔

"اپنے حریف کے متعلق بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ اس کی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی جستجو میں بھی لوگ مشغول ہوجاتے ہیں۔ کسی مناظرہ کرنے والے عالم کے متعلق خبر ملتی ہے کہ ان کے شہر میں آیا ہوا ہے تو مختلف ذرائع سے اس کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں لوگ لگ جاتے ہیں اور معلومات کے ان ذخیروں کو اس کے لیے محفوظ کرتے چلے جاتے ہیں کہ مقابلے کے وقت اس شخص کو زک دینے اور عام مجمع میں ذلیل و رسوا کرنے میں ان ہی معلومات سے کام لیا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس غریب نو وارد عالم کے بچپن کے قصے اور سرگزشتوں تک کا پتہ چلایا جاتا ہے یا کسی جسمانی عیب میں اتفاقاً بے چارہ اگر مبتلا ہے تو دلچسپی سے اس کا بھی سراغ لگایا جاتا ہے اور موقع پر ان حربوں سے کام نکالا جاتا ہے۔ (ص۳۵ ج۔۱)

دور تک وہ ان تجربات کو نقل کرتے چلے گئے ہیں اور یہ لکھ کر کہ یہ حال تو ان کا ہے جو اپنے آپ کو لیے دیئے رہتے ہیں اور علمی وقار و وزن کا خیال رکھتے ہیں ورنہ مناظروں میں جو آپے سے باہر ہوجاتے ہیں ان کو تو دیکھا گیا ہے کہ جوتے لات تک نوبت پہنچا دیتے ہیں باہم ایک، دوسرے کے اساتذہ اور والدین کو گالیاں دیتے ہیں۔ امام نے لکھا ہے کہ یہ لوگ تو خیر کسی شمار و قطار میں نہیں ہیں بلکہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں یہ حال ان لوگوں کا ہے جن کی سنجیدگی اور متانت، بڑائی اور دانشمندی دنیا میں مسلم ہے لیکن جب مناظرے کی راہ وہ اختیار کرتے ہیں تو مذکورہ بالا عیوب کے سوا عام حالات میں یہ ساری باتیں ان میں پیدا ہوجاتی ہیں۔ یعنی

"غرور، بدنفسی، کینہ، حرص، مال و جاہ کی خواہش، دوسروں کو مغلوب کرنے کی کوشش اپنی برتری کا ان کے مقابلہ میں اظہار، کبر و ناز امیروں اور دولت مندوں، سلاطین اور بادشاہوں کا تقرب ان کے درباروں میں آمد و رفت کے پیدا کرنے کی راہوں کی تلاش سواری لباس وغیرہ کے ذریعہ سے اپنی شان و شوکت کی نمائش عوام الناس کی تحقیر ان کے میل جول سے احتراز، بے نتیجہ کاموں میں مشغولیت بکواس، اور (آخر میں تو) ان کے قلوب سے خدا کا خوف نکل جاتا ہے۔

دل میں نرمی باقی نہیں رہتی۔ غفلت ان پر چھا جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ان میں جو نماز کے عادی ہوتے ہیں ان کو قطعاً اس سے سروکار باقی نہیں رہتا، کہ آخر وہ کیا پڑھتے ہیں۔ کس سے نماز میں ان کی گفتگو ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کا سارا وقت) ان ہی معلومات کے حاصل کرنے میں صرف ہوتا ہے جن سے مناظرہ کی مجلسوں میں مدد مل سکتی ہو۔" (ص ۳۶ ج ۱)

میں ان چیزوں کو کہاں تک نقل کروں، مقصد کے لیے یہی بہت زیادہ ہے کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ ان چیزوں کو اپنے سامنے رکھ لیجئے اور اس کے بعد مورخین کی ان شہادتوں کو پڑھیئے مثلاً علامہ عبدالغافر الفارسی جو امام کے ملنے والوں میں ہیں فرماتے ہیں:۔

" نظام الملک طوسی کا دربار اس زمانہ میں علماء کا دنگل تھا۔ دنیا کے مقررین خطباء کی آماجگاہ بنا ہوا تھا (امام غزالی جب اس دربار میں پہنچے) تو اس عہد کے بڑے بڑے سربرآوردہ لوگوں سے ٹکر لینے کا ان کو خوب موقع ملا، اس زمانہ میں جن کا شمار فحول (نر) علماء میں تھا۔ ان میں اور غزالی میں خوب خوب مقابلے ہوئے۔ اس وقت کی اونچی کی اونچی ہستیوں پر غزالی نے تنقیدیں کیں۔ (مرآۃ الجنان ص ۱۷۸ ج ۳)

الیافعی نے لکھا ہے:۔

" وزیر کے دربار میں ارباب فضل وعلم کا جو گروہ تھا ان میں اور امام غزالی میں مناظروں اور مقابلوں کا سلسلہ جاری رہا۔ وزیر کے سامنے متعدد مجلسوں میں بڑے بڑے علمی معرکے پیش آئے جن میں امام غزالی بازی لے گئے۔"

نظامیہ بغداد کی صدارت

لکھا ہے کہ امام کی ان غیر معمولی کامیابیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ملک ان کے علم وفضل کے چرچوں سے گونج اٹھا چند ہی دنوں کے بعد ممالک سلجوقیہ کے سب سے بڑے دارالعلوم یعنی نظامیہ بغداد کی صدارت امام کے سپرد ہو گئی جس وقت وہ صدارت کا جائزہ لینے کے لیے بغداد پہنچے ہیں، ابن جوزی نے ابو منصور الرزاز الفقیہ کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ:۔

" ابو حامد جس وقت بغداد شہر میں داخل ہوتے تو ہم لوگوں نے تخمینہ کیا تھا کہ ان کا لباس اور ان کی سواری پانسو اشرفیوں سے کم قیمت کی نہ تھی۔" (ص ۱۷۰ ج ۱۔ منتظم)

نظامیہ کی صدارت نے تو ان کی عظمت میں اور چار چاند لگا دیئے، بقول الفارسی پہلے تو صرف خراسان

ہی کے امام تھے اب خراسان کے ساتھ عراق کی امامت کے مرکز بھی وہی بن گئے۔ بغداد جو صدیوں سے اسلامی علوم وفنون کا سب سے بڑا مرکز تھا، وہاں پہنچ کر جب یہ دیکھا گیا ابن جوزی نے لکھا ہے کہ:۔

حضرہ الائمہ الکبار کابن عقیل[1] وابی الخطاب[2] وتعجبوا من کلامہ واعتقدوہ ونقلوا کلامہ فی مصنفاتہم (ص ۱۱۹)

امام کی مجلس میں جس وقت بڑے بڑے ائمہ آکر شریک ہونے لگے مثلاً ابن عقیل، ابی الخطاب اور ان کے کلام سے ان کو حیرت ہوتی تھی آخر ان کے یہ لوگ معتقد ہو گئے! ور امام غزالی کی باتوں کو اپنی تصنیفات میں نقل کرنے لگتے۔

امام کا سیاسی رسوخ واثر اور ان شہادتوں کے ساتھ عبدالغافر الفارسی اور انوشروان وزیر خلافت عباسیہ کے ان اقوال کو بھی ملا لیجیے جنہیں پہلے نقل کر چکا ہوں کیا ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس خیال کی تردید کی

---

[1] حنبلی مذہب کے ابن عقیل فحول علماء میں شمار ہوتے ہیں بلکہ اپنی محققانہ کتابوں کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان کا وجود سرمایہ ناز ہے ابن جوزی نے منتظم میں ان کے خود نوشت حالات نقل کیے ہیں جو پڑھنے کے لائق ہیں خود ان کا بیان ہے کہ بارہ سال کی عمر میں بالغ ہوا اور اس وقت اسی سال کا ہوں لیکن اپنی فکری و ذہنی قوتوں کو بلکہ بینائی، شنوائی وغیرہ حواس کسی میں کسی قسم کا فرق محسوس نہیں کرتا، اس وقت بھی باریک سے باریک ہلال کو دیکھ لیتا ہوں البتہ جوانی کی تروتازگی اور شادابی باقی نہیں رہی ہے وجہ اس کی یہ تھی: جیسا کہ خود لکھا ہے کہ ساری زندگی عفت و پارسائی کے ساتھ گزارنے کا موقع ان کو ملا۔ اپنے علمی شوق کو بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ آج اسی سال کی عمر میں مطالعہ اور کتابوں کے پڑھنے کا شوق مجھ میں اس وقت سے زیادہ ہے جب بیس سال کا تھا تقریباً بیاسی سال کی عمر پائی آخر میں کہتے تھے کہ اچھا ہوا کہ میرے سارے دوست میرے سامنے چلے گئے اب دنیا سے مجھے کچھ دلچسپی باقی نہ رہی۔ نزع کا حال طاری تھا گھر کی عورتیں رونے لگیں۔ بولے چپ رہو۔ پچاس سال سے جس کی ملاقات کی آرزو میں تھا مجھے چھوڑ دو تاکہ میں اس کا استقبال کروں اور خوش آمدید کہوں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ تین لاکھ سے کم آدمی ان کے جنازہ میں نہ تھے۔ ۴۳۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۱۳ھ میں وفات پائی۔

[2] بڑے خاندانی رئیس گھرانے کے آدمی تھے۔ قرأۃ میں تکملہ اور بعدہ دو مشہور کتابوں کے مصنف ہیں ۴۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۹۷ھ میں وفات پائی۔

کوئی وجہ ہوسکتی ہے کہ مناظرہ اور مجادلہ کی جن آفات کا ذکر امام نے اپنی کتابوں میں کیا ہے ان میں خود ان کے ذاتی تجربات کو دخل نہیں ہے خصوصاً جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بغداد پہنچنے کے بعد بھی زمانہ تک جن مشاغل میں وہ مصروف رہے ان کا نتیجہ جیسا کہ ان کے دوست علامہ عبدالغافر الفارسی نے لکھا ہے کہ :۔

علت حشمته ودرجته فی بغداد حتی کادت تغلب حشمته الاکابر و امراء دار الخلافة (مرآۃ ص۱۸۲ ج-۳)	ان کے جاہ وجلال میں بغداد پہنچکر اور اضافہ ہوا اور عروج کے اس نقطہ تک پہنچ گئے کہ پایہ تخت خلافت کے اکابر وامراء سب پر قریب تھا کہ ان کی عظمت وسطوت غالب آجائے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء اور فقہاء کے دائرے ہی تک ان کی عظمت وجلال کی بلندیاں محدود نہ رہی تھیں بلکہ پایہ تخت خلافت کے " الاکابر والامراء " کا جو میدان تھا اس میدان میں بھی وہ اپنے کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوچکے تھے یا قریب تھا کہ کامیاب ہوجاتے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس راہ میں ان کی رفتار کچھ اور دن جاری رہتی تو اپنے ہم وطن وزیر کے مقام تک پہنچنے سے وہ روکے جاسکتے تھے۔ بلکہ ایک واقعہ جس کی طرف بعض مؤرخین نے اجمالی اشارے کیئے ہیں یعنی ابن کثیر وغیرہ نے جو لکھا ہے کہ بغداد پہنچنے کے بعد درمیان میں امام غزالی نے مصر اور سکندریہ کا سفر کیا اور سکندریہ سے چاہا تھا کہ :۔

الرکوب فی البحر الی بلاد المغرب علی عزم الاجتماع بالامیر یوسف بن تاشفین صاحب مراکش (مرآۃ ص۱۸۸ ج ۳)	جہاز میں سوار ہوکر مراکش کے بادشاہ یوسف بن تاشفین سے ملنے کے لیے مغرب روانہ ہوں

یا موحدین کی مغربی حکومت کے بانی محمد بن تومرت جو مہدی کے نام سے بھی مشہور تھا اور موحدین کی اس نئی حکومت کے قائم کرنے میں کامیاب ہوا تھا اسی کے حال میں ابن خلدون نے لکھا ہے کہ محمد بن تومرت مغرب سے سفر کرتا ہوا جب مشرقی ممالک میں پہنچا تو

"لوگوں کا خیال ہے کہ وہ امام سے بھی ملا تھا اور اپنے پروگرام کو اس نے امام کے آگے بھی پیش کیا تھا" (ص۲۲۶ ج-۶)

ابن خلدون نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام غزالی نے محمد بن تومرت کی ہمت افزائی کی اور ایک ایسی حکومت قائم کرنے کی تجویزیں بتائیں جس کی مدد سے اسلام کا شیرازہ منتشر ہونے سے محفوظ

ہو جائے۔[1]

بہر حال امام حجۃ الاسلام کی مفصل سوانح عمری میں نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ ان کی زندگی کے ان جستہ جستہ واقعات اور گوشوں کو سامنے لانے کی غرض صرف یہ ہے کہ آخرت کی زندگی اور اس کی اہمیت کا احساس دلوں میں جب دھیما پڑ جاتا ہے تو اس کے بعد ساری توانائیوں اور مساعی کا رخ صرف شکم مادر اور شکم قبر کے درمیانی زندگی ہی کی طرف پھر جاتا ہے۔

امام نے اصلاح باطن کی جو تفصیلات مدون کیں ان میں ذاتی تجربات کو بڑا دخل ہے

اس وقت جس جس قسم کے چھوٹے بڑے گھاؤ، پھوڑے اور پھنسیوں سے اپنے باطن کو آدمی معمور پاتا ہے۔ ایک زخم اگر اچھا ہوتا ہے تو اپنی جگہ بیسیوں جراحتوں کو چھوڑ جاتا ہے! امام حجۃ الاسلام نے اپنی کتابوں میں ان ہی باطنی زخموں اور ان کی ٹیک اور کسک کی جو تفصیل فرمائی ہے جہاں تک میرا خیال ہے اور جن واقعات کی طرف میں نے اجمالی اشارے کیئے ہیں جس کی بھی ان پر نظر ہوگی وہ شائد میرے اس خیال سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ

---

[1] بعض لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ محمد بن تومرت بانی دولت موحدین نے امام غزالی سے تعلیم بھی حاصل کی تھی بہر حال مغربی افریقہ کی ان حکومتوں سے یعنی مرابطین سے جن کا بادشاہ یوسف بن تاشفین تھا۔ موحدین سے جن کا بانی محمد بن تومرت تھا امام غزالی کا کوئی تعلق تھا یا نہیں اور تھا بھی تو اس کی کیا نوعیت تھی۔ افسوس ہے کہ اس کی طرف ان کے سوانح نگاروں نے توجہ نہیں کی بلکہ الیافعی جیسے حضرات نے یہ خیال کر کے کہ اس سے امام کی دینی زندگی چونکہ متاثر ہوتی ہے اس لیے انہوں نے سرے سے اس واقعہ ہی کو غلط قرار دیا ہے کہ امام غزالی نے ابن تاشفین شاہ مراکش سے ملنے کا ارادہ کیا تھا پھر ابن تاشفین کے مرنے کے بعد محمد بن تومرت کا مشرقی ممالک کی طرف آنا اور امام غزالی سے مل کر اپنے وطن واپس جانا، وہاں ایک خالص مذہبی اور دینی حکومت قائم کرنے کی کوشش میں کامیاب ہونا اکثروں نے تو اس کا ذکر ہی غیر ضروری سمجھا اور جنھوں نے ذکر کیا ہے انہوں نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ میرے نزدیک یہ دونوں چیزیں تحقیق و تلاش کی محتاج ہیں۔ امام غزالی کی زندگی کا ایک نیا پہلو ان لوگوں کے سامنے آجائے گا۔ ان لوگوں کے لیے جو آئندہ امام غزالی پر کام کرنا چاہتے ہیں میں نے یہ چند اشارات کر دیئے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مرابطین کے بادشاہ یعنی یوسف بن تاشفین کے بیٹے علی بن یوسف کے متعلق کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ امام غزالی کی تصنیفات میں اس نے آگ لگانے کا حکم دیا تھا اور اس کے حکم سے امام کی کتابیں جلائی گئیں اس واقعہ کا مذہب کے ساتھ ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سیاست کا تعلق نہ تھا۔

اس روئداد کی تیاری میں دوسروں سے زیادہ شاید امام کو اپنے ذاتی تجربات سے مدد ملی ہے۔ غزالی بھی اگر غزالی نہیں، بلکہ حسن طوسی جیسا دل و دماغ رکھتے تو بالکل ممکن تھا کہ سلجوقیوں یا امر الطین وغیرہ جیسی حکومتوں کے ممتاز وزراء میں سے ایک وزیر بن کر رہ جاتے لیکن قدرت نے اسلام اور مسلمانوں کے لیے جسے حجت بنا کر پیدا کیا تھا اس کی عقابی نگاہوں پر چند ابتدائی پروازوں ہی کے بعد

ولم یرد الا الحیٰوۃ الدنیا۔۔۔ ذالک مبلغہم من العلم (النجم)

اور بجز دنیاوی زندگی کے اور کچھ نہ چاہا۔ یہ ہے ان کے علم کی رسائی کا انتہائی مقام۔

کا راز کھل گیا اور ان کی ابتدائی زندگی کے ان ہی تجربات نے "دینی زندگی" کے لیے ایک ایسے نظام کے پیش کرنے کے قابل ان کو بنا دیا جس سے خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے ڈوبتوں کو ابھرنے کا موقع امام کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد بھی سیکڑوں سال سے مل رہا ہے۔

امام غزالی اگر فطرۃً سیدھے سادے آدمی ہوتے اور دیکھنے والوں نے بغداد ہی کی گلیوں میں اس حال میں جوان کو دیکھا تھا، ابن جوزی نے ان الفاظ میں جسے ادا کیا ہے۔

فلما تزھد عاد الیٰ بغداد فقومنا ملبوسہ خمسۃ عشر قیراطا۔

جب دنیا سے وہ الگ ہوئے اور دوبارہ بغداد پہنچے تو ہم نے ان کے لباس کی قیمت کا اندازہ یہ لگایا کہ پندرہ قیراط سے زیادہ نہیں ہے۔

اس حال کی طرف واپسی اگر اس کیفیت کے بعد نہ ہوتی جب ان ہی کے لباس اور سواری کی قیمت کا اندازہ پانسو اشرفیوں سے کیا گیا تھا تو یقین مانیے کہ آپ کے ان کی کتابوں میں بھی شاید وہ چیزیں نہ ملتیں جن کی تفصیل پر ان تجربات سے گزرنے کے بعد وہ قادر ہوئے۔ کچھ بھی ہو میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ سارا زور جو ان کی کتابوں میں نظر آتا ہے "کردہ گزشت" ہی کا نظر آتا ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے کسی بیرونی آئینے میں نظر ڈالنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ نظام الملک طوسی کے دربار میں محمد بن محمد الغزالی کے نام سے جو نوجوان عالم داخل ہوا تھا اور نظامیہ بغداد کا صدر بن کر بغداد پہنچا تھا یہی ایک آئینہ ان کے پاس موجود تھا جس میں اس عہد کے مسلمانوں کے دینی اور دنیوی پیشواؤں اور سرداروں کے ایک ایک خط و خال کو وہ دیکھ سکتے تھے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہی انہوں نے کیا بھی ہے۔ بلکہ جس درجہ ان حالات سے وہ متاثر نظر آتے ہیں زیادہ دخل اس میں اس کا بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود ان حالات سے گزرے ہوئے تھے۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ باہر سے مسلمانوں کا حال جس حد تک اطمینان بخش نظر آرہا ہو لیکن ان کی باطنی زندگی میں باہر کے اسی فردوسی اطمینان نے انتشار کی جس جہنم کو بھڑکا دیا ہے اگر اس کے سجھانے میں پیش قدمی سے کام نہ لیا گیا تو "اندر" کی یہی آگ بالآخر "باہر" کو بھی بھسم کر کے رہے گی دینی پیشواؤں کے طبقہ میں تو وہ براہ راست خود شریک ہی تھے اور دنیا میں بھی جس حد تک آگے بڑھنے کا موقع ان کو مل چکا تھا مسلمانوں کے دنیوی سرداروں کے حالات کے لیے اتنا تجربہ ان کے لیے کافی تھا [1]

امام کی بازگشت کے وجوہ

یہ مسئلہ کہ امام حجۃ الاسلام کی بازگشت یا اس سمت کی طرف جدھر اپنی فطری کسبی صلاحیتوں کی مدد سے وہ آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ اچانک اس رخ سے جو وہ پلٹ پڑے اس کے واقعی اسباب کیا تھے۔ اس سوال کا

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے لیکن مثالاً چند چیزوں کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے جن میں ایک کا تعلق مشرق سے اور دوسرے کا مغرب کے مسلمانوں کی زندگی سے ہے دیکھئے یہ بغداد ہے امام غزالی بغداد ہی میں غالباً موجود ہیں مسلمانوں کی ایک برات کا نقشہ مورخین نے کھینچا ہے۔

"ایک سو تیس اونٹوں پر دلہن کے جہیز کا سامان جا رہا تھا۔ ہر اونٹ پر رومی دیبا اور حریر کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں اونٹوں پر جو سامان لدا ہوا تھا زیادہ تر اس میں طلائی اور نقرئی چیزیں تھیں تین عماریاں تھیں ستر خچر تھے جن پر شاہانہ جھولیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہر خچر کی گردن میں سونے اور چاندی کی گھنٹیاں لٹک رہی تھیں۔ چھ خچر ان میں وہ بھی تھے جن کی پشت پر ادھر ادھر دو دو صندوق رکھے ہوئے تھے۔ یہ صندوق خالص چاندی کے تھے۔ ان بارہ صندوقوں میں جواہرات کے جڑاؤ طلائی زیورات بھرے ہوئے تھے جن کی قیمت کا اندازہ دشوار ہے۔ ان خچروں کے آگے (۳۳) بہترین قسم کے منتخب گھوڑے تھے جن پر زین لگام اور دوسرے ساز و سامان سب سونے چاندی اور جواہرات سے پٹے ہوئے تھے۔"

اس کے بعد دلہن کی سواری کیسی تھی؟

"دلہن کے آگے آگے سارے وزراء امراء کی بیویاں محفوں میں سوار تھیں۔ ہر ایک کے ساتھ سوار بھی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جواب ان کے سوانح نگاروں کے فرائض میں ہے۔ ان کی فکری اور ذہنی رفتار جب ارتیاب اور شک کی منزل پر پہنچ گئی وہاں سے پلٹے؟ اپنی بعض کتابوں میں امام نے کچھ اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں یا خشیت الٰہی اور خوف

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

تھے اور شمع بردار بھی جن کی تعداد ہر ایک کی حیثیت کے مطابق تھی اور آخر میں دلہن کا محفہ (پینس) تھی جس پر زرتار پردہ پڑا ہوا تھا اور جواہرات سے جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ دلہن کی پینس کے چاروں طرف دو سو ترک لونڈیاں گھوڑوں پر سوار زرق برق لباس میں تھیں۔"

اس شان سے دلہن کا داخلہ دولھے کے گھر ہوا۔ صبح کو ولیمہ کی دعوت ہوئی اس میں چالیس ہزار من صرف شکر خرچ ہوئی تھی۔ دعوت میں شریک ہونے والوں کو کھانے کے سوا ایک ایک جوڑا بھی حسب حیثیت تقسیم کیا گیا ہر جوڑا کافی قیمتی تھا۔ (ج ۱۰ ص ۵۵ کامل ابن اثیر)

اس میں شک نہیں کہ یہ کسی معمولی آدمی کی برات نہ تھی یعنی خود خلیفہ بغداد مقتدر باللہ کی برات تھی اور دلہن بھی ملکشاہ سلجوقی کی لڑکی تھی۔ مگر الناس علی دین ملوکہم (عوام اپنے بادشاہوں کے طریقوں کو اختیار کرتے ہیں) اس قاعدہ کی بناء پر کیا ہم خود بغداد کے مسلمانوں کی زندگی کا اندازہ نہیں کر سکتے؟ آخر غزالی ہی کے زمانہ میں تو دیار بکر کا وہ امیر بھی تھا جس کا نام احمد بن مروان اور لقب القادر نصر الدولہ تھا۔ ابن جوزی کا بیان ہے کہ اس کے پاس پانچ سو جواری (ہم بستری کرنے کے لیے چھوکریاں تھیں۔ اور پانچ سو خدام تھے) لکھا ہے کہ ان چھوکریوں میں بعضوں کو اس نے پانچ ہزار اشرفیوں سے چودہ ہزار اشرفیوں تک خریدا تھا۔ (ج ۸ ص ۲۲۲ المنتظم)۔ اسی کتاب میں ابن جوزی نے ایک امیر سیف الدولہ نامی کا ذکر کیا ہے امام غزالی بغداد ہی میں موجود تھے۔ بغداد کے مشرقی سمت میں جو نیستان تھا اس میں یہ دعوت ہوئی تھی۔ اس دعوت میں ایک ہزار مینڈھے اور گائے اونٹ ایک سو گوشت کے لیے ذبح ہوئے تھے اور دس ہزار من شکر سے مٹھائیاں ڈھالی گئی تھیں۔ جن میں ایک حصہ سے طرح طرح کے وحشی جانور شیر، ریچھ، بھیڑیے اور قسم قسم کے پرندوں کی شکل کی مٹھائیاں ڈھالی گئی تھیں۔ شرکاء دعوت اسے توڑ توڑ کر کھاتے جاتے تھے۔ آگے دسترخوان خاصہ کا جہاں بچھا تھا اس کی تصویر ابن جوزی نے یہ کھینچی ہے کہ دیبا کے خیمے نصب کیے گئے تھے جس میں دیبا ہی کے پردے لٹکے ہوئے تھے اور خاصہ کے اس دسترخوان پر پانچ سو ظروف نقرئی چنے گئے تھے! ادھر ادھر موقع موقع سے کافور، عنبر، مشک وغیرہ سے مجسمے جانوروں پرندوں وغیرہ کے بنا بنا کر جما دیئے گئے تھے۔ (ج ۱۰ ص ۳ المنتظم)۔ یہ بغداد کی ایک دعوت کا ذکر ہے جو بادشاہ کی طرف سے منسوب نہیں کی گئی تھی بلکہ حکومت کے ایک عہدیدار کی طرف سے ہوئی تھی! اور یہ حال تو مشرق کا تھا اسی زمانہ میں مغرب کے مسلمانوں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے کسی غیر معمولی واردکا ان کے قلب پر حملہ ہوا، الفارسی نے ان کی براہ راست گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے اسی کو ان کی حرکت بازگشت کا سبب قرار دیا ہے اور بعضوں نے اس قسم کے اشارے جو کیے ہیں یعنی ابتدائی زندگی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کی زندگی تعیش بے جا کے کس نقطہ تک پہنچی ہوئی تھی اس کو بھی سن لیجئے۔ ذکر کر چکا ہوں کہ غزالی کے زمانہ میں اندلس کی مرکزی حکومت ختم ہو چکی تھی، طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی تقریباً ہر ضلع کا حاکم وہاں کا بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ ان ہی ملوک الطوائف میں ایک مشہور اندلسی امیر معتمد بھی ہے جس کا پایہ تخت قرطبہ تھا۔ یوسف بن تاشقین کی جنگ اذفونش سے ہوئی تھی اس میں شریک تھا بلکہ اسی کا بڑا حصہ تھا۔ بہر حال اس معتمد کی ایک معشوق بیوی تھی جس کا نام اعتماد تھا لکھا ہے کہ اعتماد کی ذرا سی ناگواری معتمد کے لیے ناقابل برداشت بن جاتی تھی۔ ایک دن جھروکے سے باہر کے میدانوں کا نظارہ اعتماد کر رہی تھی معتمد بھی بیٹھا تھا، اس وقت اتفاقاً برف گر رہی تھی۔ اندلس میں یہ صورت کم پیش آتی ہے۔ برف باری کا یہ نظارہ اعتماد کو اتنا پسند آیا کہ اچانک اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے معتمد نے آنسوؤں کو دیکھ کر گھبرا کر پوچھا کہ تم رو کیوں رہی ہو اس نے کہا کہ کیوں نہ روؤں تمہیں دنیا کے جھگڑوں سے فرصت ہی نہیں ہوتی ورنہ موسم سرما میں ہر سال جی چاہتا ہے کہ کسی ایسی جگہ جا کر ٹھہروں جہاں برف باری کا یہ نظارہ میرے سامنے پیش ہوتا ہے، سفید سفید برف کی پھواریں کتنی خوبصورت ہیں۔ معتمد نے سن کر اسی وقت باغوں کے داروغہ کو بلا کر حکم دیا کہ محل کے چاروں طرف جو میدان ہے اس میں بادام کے درخت اس ترکیب سے نصب کیے جائیں کہ آئندہ موسم سرما میں ان کے سفید سفید پھول اسی طرح کا نظارہ پیش کریں جو اس وقت نظر آ رہا ہے۔ حکم کی تعمیل کی گئی، اعتماد خوش ہو گئی۔ اس سے بھی دلچسپ قصہ اسی اعتماد کا یہ ہے کہ معتمد نے ایک دن پھر اس کو کچھ غمزدہ سا پایا۔ وجہ پوچھی تو بولی، تمہارے محلوں میں آ کر میری زندگی اکارت گئی۔ آج میں آ رہی تھی راستہ میں چند مزدورنیوں کو دیکھا کہ کیچڑ میں وہ کام کر رہی تھیں اور گاتی جاتی تھیں۔ ہا کیا زندگی ہے، میرے لیے بس یہی قیدو بند کی زندگی مقدر تھی۔ سننے کے ساتھ معتمد نے حکم دیا کہ مشک و عنبر اور دوسری خوشبودار چیزوں کی ڈھیر لگا دی جائے اور بجائے پانی کے عرق گلاب سے اسے تر کیا جائے۔ یہی کیا گیا۔ اس نے اعتماد سے کہا کہ جاؤ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اسی کیچڑ کو روندو۔ وہ اتری اور سہیلیوں کے ساتھ اسی مشکین و عنبریں کیچڑ کو روندتے ہوئے گاتی جاتی تھی۔ لکھا ہے کہ بعد کو اعتماد کبھی معتمد سے ناقدری کی شکایت کرتی تو کہتا۔ کیا کیچڑ والے دن بھی میں نے تمہاری ناقدری کی؟ (ملوک الطوائف ص ۲۰۶) الیافعی نے اسی معتمد کے متعلق لکھا ہے کہ آٹھ سو خواصیں چھوڑ کر مرا جن سے کہتے ہیں کہ (۱۷۳) اولاد معتمد کے ہوئی تھی (واللہ اعلم بالصواب)

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے نصب العین تک پہنچنے میں بعض مزاحمتوں سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔ ان ہی ناکامیوں میں ان کی ساری کامیابیوں کا راز پوشیدہ تھا۔ بہرحال میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ مذکورہ بالا اسباب میں سے کون سی صورت پیش آئی تھی یا تھوڑا بہت دخل ان کی واپسی میں ان سارے اسباب کو تھا۔ واللہ اعلم بالصواب[1]۔ سچ پوچھیے تو اس قسم کی لاحاصل سراغرسانیوں کا نطاہر اب کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ بس اجمالاً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ازل میں جو سعادت کا حصہ ان کے لیے مقدر ہو چکا تھا اسی ازلی تقدیر کا ظہور تدبیر کی کسی تشکل اور بھیس میں ہوا۔ خود ان ہی کا بیان ہے کہ ابتدا میں سیدنا ابوعلی فارمدی[2] رحمۃ اللہ علیہ سے اس راہ میں وہ مستفید ہوئے۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ ہے کہ:۔

"عبادات واذکار کے جن طریقوں کی فارمدی نے مجھے تلقین کی، ان میں مشغول ہوا اور راہ کی گھاٹیوں کو میں نے طے کیا تاآنکہ جس چیز کی مجھے تلاش تھی وہ مل گئی۔"

ابن جوزی کی روایت ہے کہ اس انقلاب کے بعد

ترک التدریس والریاسۃ و	پڑھنا پڑھانا غزالی نے چھوڑ دیا اور صدارت
ولبس الخام الغلیظ ولازم الصوم	درس کے جس منصب پر مامور تھے اس سے
وکان لا یاکل الا من اجرۃ النسخ	دست کش ہو گئے۔ کھادی کا لباس اختیار فرمالیا
(ص ۱۶۹ ج ۹ منتظم)	روزے کو لازم کر لیا اور کتابت کی مزدوری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ روزانہ باورچی خانے میں معتمد کے صرف گوشت جو پکتا تھا اس کی مقدار بقول الیافعی آٹھ سو رطل تھی۔ (مرآۃ الجنان ص ۱۴۷ ج ۳)

[1] امام نے اپنی خود نوشت سوانح "المنقذ عن الضلال" میں باطن کی طرف رجوع کی تفصیل خود ہی لکھ دی ہے۔ اسی کتاب کا ایک جملہ مولانا نے آگے نقل بھی کیا ہے۔ اس کے باوجود ان اسباب کی مزید تلاش جو امام کے مسند علمی کو چھوڑ کر راہِ فقر اختیار کی طرف آنے کے محرک بنے ہوں گے، ان کے معلوم کرنے کی تشنگی کا مولانا کی طرف سے اظہار سمجھ میں نہیں آیا۔ (ع۔م)

[2] ان کا نام فضل بن محمد تھا، ابوعلی کنیت تھی۔ شیخ ابوالقاسم القشیری جن کا رسالہ تصوف کی اساسی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے ان ہی کی صحبت میں سلوک کی راہ فارمدی نے طے کی تقریر وخطابت میں عبدالغافر فارسی نے لکھا ہے کہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ نظام الملک طوسی ان کی غیر معمولی عزت کرتا تھا۔ ستر سال کی عمر پاکر ۴۷۸ھ میں وفات پائی۔

سے جو مل جاتا اس کے سوا ان کے خورد و نوش
کا اور کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا

پھر انہوں نے کچھ دن حج اور مختلف مشاہد و مقابر کی زیارتوں میں گزارے اور کرتے رہے۔ جو کچھ کرتے رہے مجھے اس وقت بحث ان کے "طریقہ غزالیہ" سے ہے جسے بازگشت کی اس حرکت کے بعد اپنی کتابوں خصوصاً احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت وغیرہ میں امام نے پیش کیا ہے اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ تصوف یا صوفیوں کے جس مسلک اور مشرب کی ترجمانی ان کتابوں میں کی گئی ہے ان کے اس "طریقہ خاص" کی واقعی نوعیت کیا ہے؟ امام نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا اور بے ہوشی کے بعد پھر نیا ہوش جب ان میں پیدا ہوا۔ اب دیکھ چکے کہ یہ وقت تھا جس میں مسلمان دنیا کی سب سے بڑی سیاسی و اقتداری قوت کی حیثیت کرۂ زمین پر حاصل کیئے ہوئے تھے اور غزالی کے زمانہ میں تو ان کا یہ اقتدار ارتقاء و عروج کے آخری نقطہ تک مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی پہنچا ہوا تھا مسلمانوں کی اس میں کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ انسانی فطرت کا یہ عام قانون ہے کہ مسابقت اور منافست کی بساط اس کے بعد بچھ جاتی ہے پھر اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے اس کا ایک سرسری خاکہ آپ کے سامنے گزر چکا

امام کے مخاطب خاص علماء ہی ہیں

مذکورہ حالات میں .... امام نے اپنے آپ کو خود مبتلا پایا تھا۔ خدا نے ان کو جب صحت عطا کی تو جہاں تک میرا خیال ہے اسی صحت کے شکریہ میں عام مسلمانوں کے لیئے امام کے نزدیک اپنے تجربات کی بناء پر جس "لائحہ عمل" کے پیش کرنے کی ضرورت تھی درحقیقت اپنی ان کتابوں کی تصنیف سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کی یہی غرض تھی اور اس سلسلہ میں انہوں نے ان سارے علوم سے مدد لی ہے جن کے وہ عالم تھے اور عام مسلمانوں میں بھی زیادہ قریبی تعلق ان کا چونکہ علماء کی جماعت سے تھا اس لیئے زیادہ رخ ان کی گفتگو کا قدرتاً علماء ہی کی طرف جھکا ہوا رہا۔

احیاء العلوم کے دیباچہ کے آغاز میں عام مسلمانوں کی باطنی زندگی کی تباہی و بربادی کا ماتم کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں :-

راہ کے راہبر تو علماء ہیں پیغمبروں کے بھی جانشین اور وارث ہیں لیکن زمانہ ان سے خالی ہو چکا

اب تو صرف لکیروں کے پیٹنے والے فقیر ہی رہ گئے ہیں۔ جن میں اکثروں پر شیطان چڑھا ہوا ہے اور ان کی سرکشی نے سیدھی راہ سے انہیں بھٹکا دیا ہے ان میں ہر ایک اسی موجودہ زندگی کے عشق میں سرشار ہو چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بھلائیاں برائیاں اور برائیاں بھلائیاں نظر آتی ہیں۔ دین کا علم مٹ گیا، ہدایت کے بنیادوں کی روشنی بجھ گئی اب تو ان مولویوں نے دنیا کو یہ باور کرا رکھا ہے کہ شریعت کے صرف وہی معلومات جن سے حکومت قانون کا کام لیتی ہے اور عدالتوں کے مقدمات کا جن کی روشنی میں کام کیا جاتا ہے۔ ان کے سوا علم دین اور کچھ نہیں ہے۔ یا باہمی مقابلہ کی گرم بازاری میں جن معلومات سے کام نکلتا ہو ان کو یہ یاد کرتے ہیں یا عوام کے دلوں کو قابو میں لانے کے لیے جن چیزوں سے مدد ملتی ہو۔"

آخر میں ان کے ان الفاظ سے

لم يروا ما سوى هذه الثلاثة مصيدة للحرام وشبكة للحطام (ص۱)	ان امور کے سوا وہ دیکھتے ہیں کہ حرام لقموں کے شکار کرنے اور دنیا کی نعمتوں کے پھنسانے کا جال اور کچھ نہیں ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی برادری اور ہم پیشہ جماعت سے ان کے دل میں کتنی گرانیاں تھیں ——— اس لیے گو ابتداء میں ہر باب میں ان کے خطاب کا رنگ عام ہوتا ہے مگر جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولویوں کے سوا ان کے سامنے اب کوئی نہیں ہے خصوصاً مولویوں کے جن عوارض میں وہ ایک زمانہ تک مبتلا رہے تھے ان کے ذکر پر پہنچنے کے ساتھ ہی ٹھیک وہی بات جیسا کہ انہوں نے بھی لکھا ہے علی الخبیر سقطت (واقف کار کے پاس تم پہنچ گئے) کا سماں نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے صحتیاب ہونے کے بعد اپنی بیماری کے ایک ایک پہلو کو آدمی جس ذوق و شوق سے بیان کرتا ہے امام پر ان مقامات پر وہی حالت طاری ہو جاتی ہے مثلاً کبر، فخر، ریا وغیرہ کے امراض کی تشریح و تفصیل میں ان کا یہی حال ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جس کی تعبیر "الاخلاق الدلیقۃ" سے فرمائی ہے ان مسائل میں تو بال کی کھال نکالتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً احیاء العلوم میں ایک ہی صفحہ پر اس نکتہ نوازی کی بڑی داد دیتے ہیں کہ قدر ضرورت سے زیادہ مکانوں کی تعمیر پر صرف کرنا ہی اسراف اور فضول خرچی نہیں ہے بلکہ راہ چلتے ہوئے اونچے مکانوں کو سر اٹھا اٹھا کر جو دیکھتے ہیں اسراف کے اس گناہ میں ان کا بھی حصہ ہے اس لیے کہ ان ہی دیکھنے

کی کتابیں لکھی جاتی ہیں یعنی اس میں جدولیں اور طرح طرح کے خانے بنائے۔ ان خانوں اور جدولوں پر نظر سے لگائے۔ الغرض دیکھنے والوں کی نظر جب اس کتاب پر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ علم نجوم کی کتاب ہے حالانکہ مضامین سب اس میں علم طب کے درج تھے۔ نام بھی اس کتاب کا طبیب نے "تقویم الصحۃ" رکھا تھا۔ امام نے لکھا ہے کہ میں نے بھی اپنی اس کتاب میں کچھ اسی قسم کے طرز عمل کو اختیار کیا ہے۔

تلطفافی استدراج القلوب (ص ۱) نرمی کے ساتھ دلوں کو (اس کتاب کے مضامین کی طرف) مائل کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔

احیاء کے مضامین کی دو قسمیں

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے زمانہ کے عام مسلمانوں کے لیے عموماً اور علم دین کے جو نمائندے اس عہد میں تھے ان کے لیے خصوصاً جس اصلاحی لائحہ عمل کو وہ پیش کرنا چاہتے تھے، تاثیر بخشی میں زیادہ سے زیادہ کارگر بنانے کے لیے جن جن علوم و فنون اور ان کے مسائل سے استفادہ امام نے ضروری خیال کیا، سب ہی کا ذکر مناسب مقامات پر وہ کرتے چلے گئے ہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس راہ میں اسلامی علوم ہی کی حد تک امام نے اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ طبیعیات، ہیئت، طب وغیرہ کے مسائل سے بھی انہوں نے مختلف مقامات پر مدد لی ہے خصوصاً چوتھی جلد میں "مصنوعات الٰہی میں غور" کا جو باب قائم کیا ہے اس باب میں تو علم تشریح الابدان (اناٹومی) علم معدنیات وغیرہ کے مسائل اور معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے اسی لیے احیاء العلوم وغیرہ امام کی کتابوں کے مضامین کی میرے نزدیک مستقل دو قسمیں ہیں یعنی تائیدی حیثیت سے امام نے جن چیزوں سے استفادہ کیا ہے ان کی حیثیت ان امور سے مختلف ہے جو ان کے پیش کردہ لائحہ عمل کے حقیقی عناصر ہیں! امام کی امامت اور عبقریت ثانی الذکر امور میں نمایاں ہوتی ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ان کی کتاب کا یہ حصہ مجتہدانہ کارنامہ ہے۔ کافی غور و خوض محنت اور توجہ سے اس میں کام لیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اوّل الذکر نوعیت کی چیزوں کی طرف امام نے صرف یہ کیا ہے کہ ان امور سے متعلق چند خاص کتابوں کا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کام نکالنے کے لیے انہوں نے انتخاب کر لیا ہے اور جہاں جس چیز کی ضرورت پیش آتی ہے ان ہی کتابوں سے اخذ کر کے اپنی کتاب میں ان معلومات کو شریک کرتے چلے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے ممکن ہے کہ دوسروں کو اس سے اتفاق نہ ہو کہ تصوّف کے جن مسائل کا تذکرہ امام نے کیا ہے ان کے اصلی لائحہ عمل کے مضامین کے حساب سے ان مسائل کی حیثیت بھی تائیدی مضامین ہی کی ہے جیسے بیسیوں علوم کے مسائل کا تذکرہ اسی حیثیت سے ان کتابوں میں کیا گیا

ہے البتہ اتنی بات صحیح ہے کہ تصوف کی کتابوں کے مضامین سے انہوں نے زیادہ نفع چونکہ اٹھایا ہے اس لیے تصوف کا عنصر ان کی کتابوں میں زیادہ غالب نظر آتا ہے اور یہی منشاء ہے اس عام غلط فہمی کا جو ابتداء ہی سے ان خاص کتابوں یعنی احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت وغیرہ کے متعلق لوگوں میں پائی جاتی ہے یعنی یہ کتابیں خاص طور پر تصوف میں ان لوگوں کے لیے لکھی گئی ہیں جو صوفیوں کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں۔ امام نے تو اس کی تصریح جہاں تک میں جانتا ہوں نہیں کی ہے کہ تصوف کے جن مضامین کو اپنی کتابوں میں انہوں نے شریک کیا ہے ان کا ماخذ کون کون سی کتابیں ہیں، بظاہر چند خاص کتابوں کو ان کا ماخذ قرار دینا صحیح بھی نہیں ہے۔

"قوت القلوب" سے امام کا شغف

لیکن جن لوگوں نے ابوطالب مکی کی کتاب "قوت القلوب" کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ زیادہ تر اس سلسلہ میں امام نے اسی کتاب کو اور اس کے مضامین کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ ابن جوزی جنہوں نے احیاء العلوم کا مطالعہ تنقیدی نقطہ نظر سے کیا ہے بلکہ ایک مستقل کتاب ہی لکھی ہے جس میں احیاء العلوم کے مضامین پر ابن جوزی نے تنقید کی ہے "اعلام الاحیاء باغلاط الاحیاء" خود ہی اس کا نام بتایا ہے۔ بہر حال ان کی رائے بھی یہی ہے، یہ لکھ کر کہ:۔

نظر فی کتاب ابو طالب المکی وکلام المتصوفۃ القدماء (ص ۱۶۹ ج ۹ منتظم)

امام غزالی نے ابوطالب مکی کی کتاب کا اور قدیم صوفیہ کے کلام کا مطالعہ کیا۔

اپنی یہ رائے ابن جوزی نے ظاہر کی ہے کہ احیاء العلوم میں زیادہ تر ایسی حدیثیں اور آثار جو پائے جاتے ہیں جو محدثین کے نزدیک صحیح نہیں ہیں، اس کی ذمہ داری امام پر نہیں بلکہ ابوطالب مکی ہی پر عائد ہوتی ہے۔ خود ابوطالب مکی کے تذکرہ میں بھی ابن جوزی نے یہی لکھا ہے کہ:۔

صنف کتابا سماہ قوت القلوب وذکر فیہ احادیث لا اصل لھا۔ (ص ۱۸۹ ج ۷ منتظم)

ابوطالب مکی نے قوت القلوب نامی کتاب لکھی اور اس کتاب میں ایسی حدیثیں درج کیں جن کی کچھ اصلیت نہ تھی۔

غلبہ تصوف کی وجہ سے امام سے تحقیقِ روایت رخصت ہوگئی تھی!

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کا تذکرہ

اپنی کتاب میں امام نے تائیدی حیثیت سے کیا ہے ان کا کسی کتاب سے نقل کر دینا بس اسی کو انہوں نے کافی خیال فرمایا ہے۔ ابوطالب مکی صوفی ہونے کی حیثیت سے خواہ جتنے بڑے آدمی ہوں لیکن ظاہر ہے کہ وہ بیچارے ایک واعظ صوفی تھے محدث تو نہیں تھے مگر خدا ہی جانتا ہے کہ ان کی نقل کردہ حدیثوں پر امام نے اتنا اعتماد کیوں فرمایا جس کی وجہ سے حقیقت یہ ہے کہ ان کے کام کی قیمت بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ واللہ اعلم جس زمانے میں ان کتابوں کو وہ لکھ رہے تھے ان پر کسی قسم کا حال طاری تھا، یا ایک زمانہ وہ تھا کہ بڑے سے بڑے آدمی پر سخت سے سخت تنقید کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ یا ان ہی کی حالت یہ تھی کہ کسی صوفی کی کتاب میں غالباً یہ قصہ ان کی نظر سے گذرا تھا کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز میں جو خوبیاں پائی جاتی تھیں ان کی وجہ یہ تھی کہ سلیمان بن عبدالملک نے اپنے زمانہ کے ایک بزرگ ابوحازم کو کہلا بھیجا کہ اپنی افطاری کا اُکش مجھے بھیج دیجیے۔ ابوحازم نے تھوڑا سا ستو سلیمان کے پاس بھیج دیا۔ سلیمان نے مسلسل تین دن کا روزہ رکھا یعنی بیچ میں افطار نہیں کیا۔ اور تیسرے دن اسی ستو سے روزہ کھولا۔

وجامع زوجته فجاءت بعبدالعزیز — اور اسی کے بعد اپنی بیوی سے ہم بستر ہوئے

منتظم ابن جوزی ص۱ ج-۹ — جس سے عبدالعزیز یعنی عمر بن عبدالعزیز کے والد پیدا ہوئے۔

ابن جوزی نے لکھا ہے کہ اپنی کتاب "مستظہری" میں "مواعظ الخلفا" کا عنوان قائم کرکے بجنسہ بغیر کسی اعتراض و تنقید کے امام غزالی نے اس عجیب و غریب قصہ کو نقل کر دیا ہے جس کے یہ معنی ہوئے کہ عمر بن عبدالعزیز گویا سلیمان بن عبدالملک کے پوتے تھے حالانکہ اسلامی تاریخ کا ابتدائی طالب علم بھی شاید یہ سن کر اپنی ہنسی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ امام کے دوست علامہ عبدالغافر الفارسی المحدث نے لکھا ہے:۔

اس شخص نے اپنے نفس کی اصلاح میں مجاہدات شروع کیے اور غیر معمولی جدوجہد سے اس راہ میں کام لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رعونت کا شیطان اور سرداری و قیادت کے شوق کا کتا جو ان کے پیچھے لگ گیا تھا بھاگ گیا، باطن کی شورش ختم ہوگئی ہر قسم کے رسمی وضع و قطع کو ترک کر دیا۔

اسی قسم کی باتوں کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:۔

آخر میں اس شخص کی حالت یہ ہو گئی کہ جس کسی میں ہلکی سی چمک معرفت کی ان کو محسوس ہوتی اور خیال گزرتا کہ مشاہدہ سے کچھ بھی اس کا تعلق ہے اس کے سامنے جھک جاتے۔

اور وہی غزالی جو کبھی اپنی ناک پر مکھی بھی بیٹھنے نہیں دیتے تھے الفارسی نے ان ہی کو اس حال میں پایا کہ

"لوگ ان کے خلاف مختلف طریقوں سے فتنے اٹھاتے ان کے کلام پر اعتراض کر کے ہر جگہ اپنے اعتراضات کو پھیلاتے پھرتے تھے۔ حکومت میں بھی ان کی شکایتیں پہنچائی جاتی تھیں لیکن اللہ کا یہ بندہ سکون اور خاموشی کے ساتھ ساری باتوں کو برداشت کرتا اور کسی چیز سے متاثر نہ ہوتا اعتراض کرنے والوں کے جواب کی طرف بھی توجہ نہیں کی۔" ص۱۸۴

بہر حال میں تو خیال کرتا ہوں کہ اس قسم کی معصومانہ غلطیاں امام کی کتابوں میں اگر رہ گئی ہیں تو ان کی زیادہ وجہ غالباً ان کا یہی حال ہے۔

امام کا "قدیم متصوفہ" کے مضامین سے تاثر

نہ صرف ابوطالب مکی بلکہ ابن جوزی نے "قدیم متصوفہ" کے نام سے اور شاہ ولی اللہ نے "اوائل" کے لفظ سے اسلام کی ابتدائی صدیوں کے جس طبقہ کی تعبیر کی ہے اور لکھا ہے کہ امام غزالی نے ان لوگوں کی کتابوں کے مضامین سے بھی استفادہ کیا ہے میں نے عرض کیا تھا کہ "اوائل" یا "قدیم متصوفہ" کے الفاظ بھی مستحق توجہ ہیں اور اب میں اسی کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

"قدیم متصوفہ"؟

کچھ تصوف ہی میں نہیں بلکہ دینی علوم کے دیگر شعبوں میں "سلف" کے لفظ کو استعمال کر کے ایک عام رواج ہے جس سے بیچارے عام مسلمانوں کو متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے گویا یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جو رائیں قائم کی گئی ہیں یا اسلامی حقائق کے متعلق جو فیصلے کیے گئے وہ پچھلی صدی کے مسلمانوں کے فیصلوں کے مقابلہ میں مذہب کی اصلی روح سے زیادہ قریب ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے اسی تصوف کے قصہ میں اوائل کے طریقہ کار کا ذکر کر کے "متاخرین" کے طرز عمل کو جو سراہا ہے تو جن کی نظر واقعات پر نہیں ہے وہ کچھ جز بز سے ہوتے ہیں، اور اس کا منشا یہی خیال ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں کے متعلق یہ باور کر لیا گیا ہے کہ مذہب کے جس شعبہ میں جو فیصلے اس زمانہ کے ہیں وہ اسلام کی صحیح تعلیم پر زیادہ منطبق ہیں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اس مسئلہ میں لوگ ایک خاص واقعہ سے نہ معلوم کیوں لاپروائی اختیار کیے

ہوئے ہیں ؟

میرا مطلب یہ ہے کہ اسلامی دین کے دائرے میں دوسرے ادیان و مذاہب کے ماننے والے ظاہر ہے کہ زیادہ تر اسلام کی ابتدائی صدیوں ہیں ہی داخل ہوئے ہیں ان نومسلموں میں جو افواجاً کی شکل میں "دین اللہ" کے اندر داخل ہوتے چلے جارہے تھے عام غیر کتابی بت پرستوں اور وثنیوں کے سوا، کافی تعداد عیسائیوں، یہودیوں، مجوسیوں، صابیوں وغیرہ کی تھی۔ ان اقوام کا داخلہ کن مؤثرات و محرکات کے تحت ہوا، اس کا قصہ طویل ہے لیکن اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جن میں اپنے موروثی و آبائی عقائد و خیالات، اور دینی زندگی کے طریقوں سے جو انس تھا اس کا بالکلیہ ازالہ نہیں ہوا تھا اور عام حالات میں یہ واقعہ بھی ہے اس کی توقع انسانی فطرت سے کچھ بعید بھی ہے، شعوری طور پر نہ سہی لیکن غیر شعوری دباؤ کے نیچے صدیوں کے پرورش یافتہ جراثیم کا انجباک کلی استیصال آسان بھی نہیں ہے۔

اسی لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ سلف یا قدماء یا عصر اول وغیرہ کے الفاظ کے استعمال کے وقت مذکورہ بالا حقیقت کو چاہیئے کہ لوگ اپنی نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہونے نہ دیں۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں فرقہ بندیوں کی کثرت کا سبب

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ قلوب میں آخر یہ سوال پیدا کیوں نہیں ہوتا کہ عقائد و اعمال کے لحاظ سے فرقہ بندیوں کی جتنی کثرت اسلام کی ابتدائی صدیوں میں نظر آتی ہے ان کی یہی کثرت پچھلے قرون میں کیوں باقی نہ رہی۔ کاش سوچنے والے اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اگر سوچتے تو سلف اور قدماء وغیرہ کے الفاظ کا وزن جتنا محسوس کیا جاتا ہے یا دوسروں کو محسوس کرانے کی کوشش کی جاتی ہے اتنا وزن ان الفاظ میں باقی نہ رہتا۔

یہ مسئلہ ایک مستقل "علمی مہم" کا طالب ہے۔ کام کرنے والوں کے لیے بہت بڑا میدان ہے۔ ہزارہا اغلاط کا ازالہ اس راہ کی تحقیق سے انشاء اللہ ممکن ہو جائیگا۔ میرے لیے اتنے اہم مسئلہ کی تفصیل کا تو موقعہ نہیں ہے البتہ بطور مثال کے ایک چیز کا تذکرہ کرتا ہوں۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں اعتقادی اختلافات کی ابتداء مسئلہ قدر تقدیر سے شروع ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی دنیا میں موجود ہی تھے کہ بعض لوگوں نے اس

مسئلہ کو اہمیت دینی شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی دن بعد "معتزلہ" یا قدریہ کے نام سے اسلام میں ایک مستقل فرقہ کی بنیاد پڑ گئی۔ صحیح مسلم میں پہلی روایت امام مسلم نے جو درج کی ہے اسی میں ان الفاظ کے بعد

اول من قال فی القدر بالبصرۃ معبد الجہنی۔ (صفحہ ۱۶ ج ۱)	مسئلہ قدر کا سب سے پہلے جس نے ذکر بصرہ میں چھیڑا وہ معبد جہنی نامی آدمی تھا۔

لکھا ہے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عبداللہ بن عمر کے پاس اس کی شکایت کرتے ہوئے بھی پہنچے تھے۔

اس وقت اس روایت سے مجھے بحث نہیں ہے بلکہ بتانا چاہتا ہوں کہ عہد صحابہؓ ہی میں فرقہ بندی کی یہ بنیاد پڑ گئی تھی اس کی ابتداء کن لوگوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ مسلم کی مذکورہ بالا روایت کا میں نے جو حوالہ دیا ہے اس میں "معبد الجہنی" کا نام جو لیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خود معبد بھی اس مسئلہ کا حقیقی بانی نہیں ہے۔ المقریزی نے لکھا ہے کہ

اخذ معبد ہذا الرائے من رجل من الاساورۃ یقال لہ ابو یونس سنسویہ ولیعرف بالاسواری۔ صفحہ ۱۸۱ ج ۴ مقریزی	معبد نے یہ رائے ایک اور آدمی سے اخذ کی تھی جو "الاساورہ" کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا جس کی کنیت ابو یونس اور نام سنسویہ تھا۔ الاسواری کے نام سے مشہور تھا۔

سمجھا آپ نے کیا مطلب؟ "الاساورہ" اور "الاسواری" کے لفظ کا اطلاق کن لوگوں پر کیا جاتا تھا۔ البلاذری نے فتوح البلدان میں اس کے متعلق کافی معلومات جمع کر دیئے ہیں۔ میں اس کا حاصل درج کرتا ہوں، لکھا ہے کہ:۔

"یزدگرد شاہنشاہ ایران کے مقدمۃ الجیش کا کمانڈر یا سپہ سالار ایک شخص سیاہ نامی تھا جو سیاہ الاسواری کے نام سے مشہور تھا۔ یزدجرد جب اپنے پایہ تخت مدائن سے بھاگ کر اصفہان پہنچا تو اس نے اپنی منتشر فوج کے سپاہیوں کی جستجو شروع کی خاص کر کے اس نے اسی سیاہ الاسواری کو ڈھونڈ کر اصفہان بلایا اور تین سو چیدہ سواروں کے ساتھ اس نے اصطخر کی حفاظت کے لیے اس کو مقرر کیا۔ ان تین سو سواروں میں ستر آدمی ایسے تھے جو ایران کے عظماء اور بڑے لوگوں میں شمار ہوتے

تھے۔ یزدگرد نے سیاہ اسواری کو اس کا حکم بھی دیا تھا کہ ملک میں جہاں کہیں ایسے لوگ ملیں جن کو اپنی فوج میں وہ شریک کرنا چاہتا ہو، ان کو بھی ساتھ لے لے۔ سیاہ اسواری کو روانہ کر کے خود یزدگرد بھی اس کے بعد اصطخر کی طرف روانہ ہوا، اصطخر پہنچ کر سیاہ اسواری کو یزدگرد نے ابوموسیٰ اشعری صحابی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں سوس بھیج دیا۔ یہاں یہ لوگ ابوموسیٰ کے مقابلہ میں پڑے ہوئے تھے کہ اچانک ان کو یزدگرد کی فاش شکست اور فرار کی خبر ملی تب ان اسواریوں نے طے کیا کہ ابوموسیٰؓ سے صلح کر لیں۔ صلح ہو گئی اس عرصہ میں یزدگرد کے اور بہت سے رفقاء اصفہان سے چل کر سیاہ سے آملے۔ ان لوگوں کے سامنے سیاہ اسواری نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمانوں سے مقابلہ کا جو انجام ہوا وہ تم لوگ دیکھ چکے تم لوگ سنتے چلے آرہے تھے کہ اصطخر کے ایوان[1] میں مسلمانوں کے گھوڑے لید کریں گے اس کا تماشا بھی تمہارے سامنے پیش ہو چکا پس یہ سوچنے کی بات ہے کہ ہم لوگ اب کیا کریں بادشاہ تو بھاگ گیا۔ اسی کے بعد سیاہ نے تجویز پیش کی کہ اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے دین میں ہم لوگ داخل ہو جائیں۔ اسی پر سارے اسواریوں کا اتفاق ہو گیا اور شیرویہ نامی سردار کو رئیس وفد بنا کر دس آدمیوں کا ایک وفد حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی خدمت میں اس تجویز کو لے کر حاضر ہوا۔ اسواریوں کی طرف سے جو شروط پیش ہوئے تھے وہ یہ تھے کہ:-

---

[1] اصطخر قدیم ایرانی سلاطین کے زمانہ میں ایران کا سب سے بڑا اور اہم مرکزی شہر تھا۔ یونانی اسی کو پرسی پولس کہتے تھے، ہخمنشی سلاطین کے زمانہ کے ایوان اور سنگین قلعوں کے آثار اب بھی اس مقام پر کھنڈر کی شکل میں موجود ہیں۔ ان محلات کی عظمت اور مہیب شکلوں کو دیکھ کر مسلمانوں میں مشہور تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں سے اس شہر کی تعمیر میں کام لیا تھا۔
کرسٹن کی کتاب تاریخ آل ساسان میں اس شہر کے ان ایوانات کا حال پڑھنے کے قابل ہے۔
ابن حزم نے ملل ونحل میں لکھا ہے کہ یہ پارسی مذہب کی کتاب جسے وہ اپنی آسمانی کتاب سمجھتے تھے اور "خدا نامہ" اس کو کہتے تھے۔ اس کتاب کے پڑھانے کی اجازت ایک زمانہ تک اصطخر کے موبدین (علمائے دین مجوس) کو تھی (ص ۱۳ ج ۱) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصطخر کی حیثیت کسی زمانہ میں ایران میں وہی تھی جو مدت تک ہندوستان میں بنارس کو حاصل تھی ۱۲۰۔

(۱) تمہارے دین میں داخل ہو کر ایرانیوں کے مقابلہ میں ہم لڑیں گے۔
(۲) لیکن خود عرب میں جب لڑائی ہوگی تو اس میں ہم شریک نہ ہوں گے۔
(۳) عرب اگر ہم پر چڑھائی کریں تو آپ لوگ ہماری مدد کریں گے۔
(۴) ہمیں اختیار ہوگا کہ مسلمانوں کے علاقہ میں جو جگہ بھی ہمیں پسند آجائے وہیں ہم آباد ہو جائیں اور جس عربی قبیلہ سے خلافت کا معاہدہ ہم چاہیں کرلیں۔
(۵) فوجی خدمت کے صلہ میں خزانہ سے جیسے سب کو تنخواہ ملتی ہے ہم لوگوں کو بھی ملے گی۔
(۶) جو معاہدے ہمارے اور تمہارے درمیان طے ہوں اس کی توثیق تمہارے امیر (خلیفہ) کو کرنی پڑے گی۔

بڑے رد و کد کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے "اسواریوں" کے سارے شرائط مان لیے گئے اور یوں "اسواریوں" یا "الاسادرہ" کا یہ ایرانی گروہ مسلمانوں میں شریک ہو گیا۔ بصرہ میں ان لوگوں نے قیام اختیار کیا ان کا اپنا ایک خاص محلہ بھی "بنی تمیم" کے قبیلہ میں تھا۔ اور ایک نہر خاص ان لوگوں نے اپنے لیے کھودی تھی جس کا نام "نہر الاسادرہ" تھا۔ (دیکھو البلاذری صد ۳۸۱)

دیکھا آپ نے مسلمانوں کے فرقہ "قدریہ" یا "معتزلہ" کی تان کہاں جا کر ٹوٹی یزدگرد کے خاص فوجیوں کے آدمی میں اس عقیدہ کی بنیاد کا پتہ چلا۔ خود ان اسادرہ کے سردار سیاہ کے حوالہ سے البلاذری نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ

انا دخلنا فی ھذا الدین فی بدء امرنا تعوذا وان کان اللہ قد رزق خیرا کثیرا۔ (صد ۳۸۱)	ہم لوگ یہ واقعہ ہے کہ ابتداءً محض جان بچانے اور پناہ لینے کے لیے اس دین اسلام میں داخل ہوئے تھے اگرچہ اس کی بدولت ہمیں بہت سی بھلائیاں میسر آئیں۔

اور یہ ابو یونس الاسواری جس سے معبد جہنی نے اس عقیدہ کو حاصل کیا تھا اسی سیاہ الاسواری کی جماعت کا آدمی تھا۔ ابو یونس کنیت تو مسلمان ہونے کے بعد اس نے اپنی رکھ لی تھی، ورنہ اس کا اصلی نام سنسویہ تھا۔ جیسا کہ مقریزی نے لکھا ہے اس کا اصلی نام سیبویہ یا سوسن تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ظاہر ہے کہ ایرانی مجوسیوں کا یہ آبائی عقیدہ کہ خدا خالق شر نہیں ہے اسی کا شاخسانہ تو قدریہ

کا یہ مسئلہ ہے یعنی انسان کے بُرے بھلے افعال کا خالق خدا نہیں بلکہ خود بندہ ہے۔
اور ایک یہی مسئلہ کیا؟ اس زمانہ میں یہودیوں، عیسائیوں اور ایران ہندوستان چین وغیرہ ممالک کے باشندوں میں جس قسم کے اعتقادی جھگڑے چھڑے ہوئے تھے تحقیق کرنے والوں کو نظر آئے گا کہ الفاظ اور تعبیر وغیرہ کے معمولی تفاوت سے ان ہی اقوام و ممالک کے لوگوں نے مسلمان بن بن کر اسلام میں بھی کسی نہ کسی شکل میں ان جھگڑوں کو داخل کر دیا تھا۔ ہندوستان ہی میں اس وقت یعنی چھٹی صدی عیسوی اور اس کے بعد کے زمانہ میں کرم کانڈ اور گیان کانڈ کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا، میمانسا والوں اور ویدانت والوں میں بڑے بڑے مناظرے ہو رہے تھے۔ ان اصطلاحات سے جو واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مرجیہ اور معتزلہ کے درمیان ایمان و عمل کے متعلق جو جھگڑا تھا کہ نجات کی بنیاد ایمان پر ہے یا عمل پر ہے۔ یہ وہی کرم کانڈ اور گیان کانڈ ہی کے قصوں کا عربی ترجمہ تھا۔[1] اور یہ عجیب بات ہے کہ ان فتنوں کی زیادہ تر ابتدا بصرہ سے ہی ہوئی تھی۔ جہاں بحری راستوں سے مشرقی اور مغربی ممالک کے باشندوں کی آمد و رفت کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہندوستان کے ساتھ بصرہ کے تعلق کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ جہاں پر یہ شہر آباد ہوا تھا اس کا نام پہلے ارض الہند تھا اور جیسے ان نومسلموں کی راہ سے اس قسم کے قصے مسلمانوں میں داخل ہوئے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذہبی زندگی کا اعلیٰ معیار کیا ہونا چاہیے۔ اس سوال کے متعلق جو عملی مثالیں ان ہی ابتدائی صدیوں میں بعض افراد کی طرف سے پیش ہوتی ہیں یا اس سوال کے جواب میں جو کتابیں اس زمانہ میں لکھی گئی

---

[1] کرم کے معنی عمل کے ہیں۔ کرم کانڈ والے کہتے تھے کہ صرف عمل اور قانون کی پابندی پر نجات کا دار و مدار ہے اور گیان جس کے معنی معرفت کے ہیں اور در اصل یہ وہی ایمان کے لفظ کی تعبیر ہے اس گیان کانڈ والے ایمان ہی کو مدارِ نجات ٹھہراتے تھے۔ کرم کانڈ والوں کا قانون اور عمل پر اتنا زور تھا کہ ان کا ایک مکتب خیال جسے پورب میں میمانسا کہتے ہیں، اس خیال والے کہتے تھے کہ خدا پر ایمان لانا کیا معنی نجات کے لیے خود خدا کے ماننے کی ضرورت نہیں وہ عمل کے قانون اور جن الفاظ میں اس کی تعبیر کی گئی ہے اس کو قدیم مانتے تھے۔ ان کا مشہور عقیدہ یہ تھا کہ شبد (کلام) قدیم ہے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں کلام کے قدیم و حادث ہونے کا فتنہ جو اٹھا تھا کون کہہ سکتا ہے کہ غیر ادیان کے نومسلموں کی طرف سے یہ چیزیں اسلام میں داخل نہیں ہوئی تھیں۔ ۱۲۔

ہیں۔ ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان جدید الاسلام لوگوں کے آبائی اور موروثی رجحانات ان میں قطعاً شریک نہیں ہوئے تھے۔

ان رجحانات کا پتہ عہد نبوت ہی میں چلتا ہے

اور تو اور آپ کو صحیح حدیثوں سے معلوم ہو گا کہ خود عہد نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس قسم کے متعدد واقعات پیش آئے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی زندگی کے مقابلہ میں بعض لوگوں نے ایسے معیار پیش کرنے کا ارادہ کیا جس سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ شائد پیغمبر کی زندگی بھی ان کے مفروضہ بلند معیار کے مطابق نہیں ہے، بخاری و مسلم میں آپ کو ایسی روایتیں مل جائیں گی جن سے میرے اس بیان کی توثیق ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ جب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ نے ان لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا[۱]

جب عہد نبوت میں ہی ایسے رجحانات کا پتہ چلتا ہے تو نبوت کے بعد اس راہ میں افراط و تفریط کی طرف بعض لوگوں کا مائل ہو جانا یقیناً محل تعجب نہیں ہو سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حالانکہ فرما بھی دیا تھا کہ دینی زندگی کا وہ معیار جسے تم

---

[۱] مثلاً بخاری کے ابتدائی اوراق میں آپ کو وہ روایت مل جائے گی جس میں ہے کہ تین آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض بیویوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے شب و روز کے مشاغل دریافت کیے۔ راوی کا بیان ہے کہ ان سے جب آنحضرت صلعم کے مشاغل بیان کیے گئے تو سن کر انہوں نے اس کو کم خیال کیا۔ راوی کے الفاظ ہیں کانھم تقالوھا گویا دینی زندگی کے بلند ترین معیار کا جو خاکہ ان کے دماغوں میں تھا اس پر آنحضرت صلعم کی زندگی بھی ان کے نزدیک منطبق نہ تھی مگر نبوت کا احترام بہرحال ان کے قلب میں چونکہ تھا اس لیے تاویل کے نیچے انہوں نے پناہ لی کہ "پیغمبر کا کیا وہ تو مغفور ہیں" پھر ایک نے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ رات بھر نمازیں پڑھتا رہے گا۔ دوسرے نے کہا کہ صائم الدہر بن جاؤں گا تیسرے نے کہا کہ جیتے جی عورت کا منہ نہ دیکھوں گا جب رسول اللہ صلعم کو اس کی خبر ہوئی تو دیکھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے مبارک پر غصہ کے آثار ہیں اور فرما رہے ہیں تم سب سے زیادہ خدا کی معرفت اور خدا کا خوف مجھ میں ہے اور اعلان فرما دیا کہ میری راہ کو چھوڑ کر جو چلے گا وہ مجھ سے نہیں ہے اور یہ ایک ہی واقعہ نہیں ہے ایسی متعدد مثالیں عہد نبوت میں ملتی ہیں۔ ۱۲۔

ستجدون بقایاھم فی الصوامع والدیارات (جمع الفوائد بحوالہ ابوداؤد) | پاؤ گے تم ان کی بچی کھچی مثالیں عیسائیوں کی خانقاہوں اور دیروں میں۔

یہ قابل رشک معیار نہیں ہے بلکہ "رہبانیت" کے نام سے تو خود قرآن نے اس زندگی پر تنقید کی تھی اور اسے عیسائیوں کا ایک خود تراشیدہ مسلک اور ایسا مسلک قرآن نے قرار دیا ہے جس کا نباہ آسان نہیں ہے۔ مگر پشتہا پشت سے "صوامع و دیارات" کی زندگی کا وزن جن لوگوں کے قلوب میں جاگزیں تھا اچانک مسلمان ہو جانے کے بعد اس کا ازالہ آسان نہ تھا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے آبائی دین کے اثرات میں اور اسلامی تعلیم کے نتائج میں تطبیق کی راہ اس قسم کے لوگ نکال لیتے تھے۔

امام کا دنیا گریز رجحانِ تصوف اسلامی کے دائرے کے باہر کا اثر ہے

خیر یہ قصہ طویل ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امام غزالی نے جن "قدماء متصوفہ" کی کتابوں کے مضامین سے نفع اٹھایا تھا ان کے متعلق یہ خیال کر لینا شاید صحیح نہ ہوگا کہ قدیم ہونے کی وجہ سے ان بزرگوں کی کتابوں کے سارے مضامین افراط و تفریط کے ان اثرات سے محفوظ تھے جو مسلمانوں میں داخل ہونے والی نسلوں کی راہ سے پھیل گئے تھے۔

آخر خود سوچئے کہ جس قرآن کی تعلیم

خلق لکم ما فی الارض جمیعا (البقر) | زمین میں جو کچھ ہے تمہارے ہی لیے پیدا کیا ہے۔

سخر لکم ما فی السمٰوات والارض جمیعا منہ | تمہارے قابو میں کر دیا ان سب چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں سب کو۔

کے محور پر گھومتی ہو بار بار تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف پیرایۂ بیان میں تفصیلاً و اجمالاً اسی مضمون کو مسلسل اس کتاب میں دہرایا گیا ہو۔ اسی کتاب کی آیت

انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا لنبلوھم ایھم احسن عملا (کہف) | زمین پر جو کچھ ہے اس کو ہم نے زمین کا سنگار بنایا تاکہ ہم جانچیں کہ کون ہے اچھا عمل کے حساب سے۔

درج کر کے اس کی تفسیر میں یہ قول جو امام غزالی نے نقل کیا ہے کہ

ایھم ازھد فیھا (احیاء العلوم ج ۴ ص ۱۷۵) | یعنی زمین کا یہ سارا بناؤ سنگار زیب و زینت کا

تماشا اس لیے کھڑا کیا گیا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے
کہ ان کے چھوڑنے اور ان سے بھاگنے میں سب
سے آگے کون ہوتا ہے۔

اور جس تصوف کے نظام کو اپنی کتاب میں انہوں نے پیش کیا ہے اس نظام کا اہم ترین جُز اسی اصول کو انہوں نے قرار دیا ہے۔ اس دنیا گریز رجحان کے متعلق اس کے سوا، اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی دائرے کے باہر ہی سے یہ اثر ان مسلمانوں میں داخل ہوا تھا اگر واقعی قرآن کی آیت کا یہی مطلب ہے کہ قدرتی پیداواروں کے پیدا کرنے سے پیدا کرنے والے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی ضرورتوں میں ان کو استعمال کریں بلکہ وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ بھاگنے والے ان چیزوں سے بچنے اور بھاگنے میں کہاں تک ترقی کر سکتے ہیں۔ اور اسی راہ گریخت کی رفتار کی تیزی و سستی میں انسانیت کی بلندی و پستی کا راز پوشیدہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ قرآن کی تعلیم بھی اگر یہی ہے تو جس "دینی زندگی" کی تعلیم یہ کی گئی ہے کہ اس کا پابند

غذا کو بھی بلا کسی رغبت کے اسی طرح کھاتا ہے جس طرح ایک شخص جنگل سے گزر رہا ہو اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے بچے کا گوشت کھا رہا ہو[1] (ص۱۵۲ ج۔۱)

ہندی فلسفہ گیتا۔

تو اس میں اور قرآن کی پیش کردہ زندگی میں تعبیری یا لفظی فرق کے سوا خود ہی سوچا جائے کہ اور کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ حضرت امام نے اسی موقع پر جہاں انہوں نے قرانی آیت کی مذکورہ بالا الفاظ میں تفسیر درج کی ہے یہ بھی لکھا ہے کہ محظورات (یعنی شریعت نے جن چیزوں کے استعمال کو ممنوع ٹھہرایا ہے) ان کا چھوڑ دینا یہ وہ معیاری زندگی نہیں ہے جس پر زہد کا اطلاق کیا جائے بلکہ

ترک المباحات التی حظ النفس (احیاء ص۱۵۵ ج۔۴)

جن چیزوں کو خدا نے مباح کر دیا ہے یعنی جن کا استعمال جائز ہے ان کو چھوڑنا یہ زہد ہے کہ نفس

---

[1] یہ ہندوستان کے مسلہ (جوگیت) کی تعبیر ہے جس کے معنی یہی ہوئے کہ اپنے بچے کا گوشت کھانا اور قدرتی پیداواروں کا زندگی کی ضرورتوں میں استعمال کرنا اس مسلک کی رو سے برابر ہے۔ ۱۲۔

کا حصہ وہی ہے۔

مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا نے جن چیزوں کے استعمال کو منع کیا ہے ان کی تعمیل تو خدا کی مرضی کی تعمیل ہے اور خدا کی مرضی کی تعمیل کرنے والے خدا کے پاس اجر و ثواب کی اُمید اگر لگائیں تو اس کی اُمید ان کو کرنی چاہیئے لیکن خدا نے جن چیزوں کے چھوڑنے اور ترک کرنے کا مطالبہ نہیں کیا ہے ان کا ترک ظاہر ہے کہ خدا کی مرضی کی نہیں بلکہ یقیناً خود اپنے نفس کی خواہش کی پیروی ہے پھر ایسے عمل پر خدا کی مرضی کی نہیں بلکہ یقیناً خود اپنے نفس کی خواہش کی پیروی ہے پھر ایسے عمل پر خدا کے پاس اجر کی توقع آخر کس بنیاد پر قائم کی جائے گی۔ انہوں نے ایک مثال سے بھی سمجھانا چاہا ہے کہ مباحات کو جو موجودہ زندگی میں ترک کرتا ہے یعنی جن چیزوں کے استعمال سے خدا نے منع نہیں کیا ہے ان کے استعمال کو ترک کرنے والا زیادہ سے زیادہ ایک ایسی چیز سے دست بردار ہو رہا ہے جس کی حیثیت برف کے ٹکڑے جیسی ہے کہ زمانہ جیسے جیسے اس پر گزرتا جائے گا فنا ہوتا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں جو اجر آخرت میں اس کو ملیگا چونکہ وہ خیر و ابقیٰ ہے یعنی بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی ہے۔ اس سے سمجھنا چاہیئے کہ برف کے ٹکڑے کو بیچ کر یا دے کر الماس اور یاقوت کے ٹکڑے خرید رہا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ع عمر برف است آفتاب تموز دنیا کی نعمتوں کی بہت اچھی مثال ہے مگر ان نعمتوں کو خدا کی مرضی اور خدا کے حکم سے جو نہیں چھوڑتا ہے بلکہ جن کے استعمال کی اجازت خدا کی طرف سے ہے ان کو جو بھی چھوڑتا ہے اپنی مرضی سے اور اپنی خواہش سے چھوڑتا ہے مان لیا جائے کہ اس نے برف ہی کے ٹکڑوں کو چھوڑا لیکن ان کے معاوضہ میں خدا کے پاس جواہر (الماس و یاقوت) کے پانے کی امید آخر کس بنیاد پر کرتا ہے۔ جس نے خدا کی نہیں بلکہ اپنی مرضی کی پابندی کی ہے اسے چاہیئے کہ خود اپنے آپ سے اجرت طلب کرے نہ کہ خدا سے جس کی مرضی کی تعمیل میں اس نے ان مباحات کو قطعاً نہیں چھوڑا ہے۔

امام کے نظریات کے متعلق شاہ ولی اللہ نے جو یہ لکھا ہے پہلے بھی نقل کر چکا ہوں

از قبیل قضایا شعریہ وعظیہ تمسک می نمایند۔ تائید میں شاعرانہ مقدمات جو وعظوں میں استعمال ہوتے ہیں ان ہی کو پیش کرتے ہیں۔

غالباً ان کا اشارہ اسی قسم کی تمثیلی دلیلوں کی طرف ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کے

دلائل کا بہت بڑا ذخیرہ ان کی کتابوں میں جمع ہو گیا ہے بہ ظاہر یہ چیزیں بھی ان ہی کتابوں سے ماخوذ ہیں جن کے مضامین سے اپنے لائحہ عمل کے آگے بڑھانے میں امام نے کام لیا ہے۔

امام کا بڑا کارنامہ نظام اخلاق کی تباہی کو محسوس کرنا اور اس کے استحکام کی سعی بلیغ ہے۔

بہر حال میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ اپنے زمانہ کے حالات کا اندازہ کرنے کے بعد امام پر واضح ہوا کہ وہی دولت و امارت جس کے چبوترے پر مسلمان دنیا کے سامنے کھڑے تھے اس چبوترے کے باہر کچھ ہی نظر آتا ہو لیکن اس کے اندر بتدریج ایسے آتش فشاں مواد کی پیدائش کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے کہ اس چبوترے پر کھڑے ہونے والے کو اگر نہ چونکایا گیا تو وہ خود اور وہ ساری چیزیں جس سے یہ بلندی ان کو حاصل ہوئی ہے اچانک اڑ جائیں گی۔ میرا اشارہ مسلمانوں کے اخلاقی نظام کی غیر محسوس تباہی کی طرف ہے جس کی وجہ سے اندر ہی اندر ان کی اجتماعی زندگی کھوکھلی ہوتی جا رہی تھی وہ باہر سے جتنے بھی قوی دکھائی دے رہے ہوں لیکن حکیمانہ بصیرت کی روشنی سے جو سرفراز کیا گیا تھا اسی قوت میں ان کمزوریوں کی ساری پرچھائیاں جھانکتی نظر آ رہی ہیں جن سے عام مسلمان اس زمانہ میں غافل تھے یا ان سے وہ غافل رہنا چاہتے تھے۔ امام نے ان کو جھنجھوڑنے کا ارادہ فرمایا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طاقت سے انہوں نے اس کام کو انجام دیا وہ اپنی آپ نظیر ہے کہ آج سات آٹھ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اس چیخ اور پکار کی آواز بازگشت سے اسلامی دنیا گونج رہی ہے۔ جو امام حجۃ الاسلام کے سینے سے بلند ہوئی تھی ان کا حقیقی مقصد جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں یہی تھا۔ اسی لیئے ان کی ساری توجہ اسی مسئلہ پر مرکوز نظر آتی ہے جھنجھوڑنے اور چونکانے کی اس مہم میں وہ کن کن چیزوں سے کام لے رہے ہیں جہاں تک میں سمجھتا ہوں شاید ان کی نظر میں ان کی چنداں اہمیت نہیں تھی جگا دینا چاہیئے، ان کے دل میں اسی آرزو کی آگ بھڑک اٹھی تھی اس آرزو کی تکمیل میں جس چیز سے مدد مل سکتی تھی اس سے نفع اٹھانے کی امام نے کوشش کی لوگوں کو نکتہ چینی کا موقع اسی لیئے مل گیا، حالانکہ آپ دیکھ چکے عموماً کوتاہیاں ان لوگوں کی ہیں جن کی کتابوں سے امام نے استفادہ کیا۔ سب سے زیادہ حدیثوں کے باب میں ان کی کتابیں بدنام ہیں لیکن یہ ان کا نہیں ابو طالب مکی کا قصور ہے "قوت القلوب" میں جن رطب ویابس روایتوں کو اس شخص نے استعمال کیا تھا آنکھیں بند کر کے امام ان کو نقل کرتے چلے گئے۔ نیز ارباب صلاح و تقویٰ کے ساتھ جس قسم کا غیر معمولی حسن ظن زندگی

کے آخری دنوں میں امام کے اندر پیدا ہو گیا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں بہت کچھ دخل اس طرز میں ان کے اس حسن ظن کو بھی ہے۔

اخلاق کی تصحیح میں امام ارسطو کے قاعدۂ توسط سے متاثر ہیں

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود "اخلاقیات" کے ابواب جن کا نام امام نے "مہلکات" رکھا ہے یعنی مسلمانوں کی ہلاکت کا راز ان اخلاقی ابواب میں ان کو نظر آ رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بظاہر ان اخلاقی ابواب میں انہوں نے قرآنی آیات واحادیث وآثار سے بھی کافی استفادہ فرمایا ہے لیکن اخلاق وغرائز کی تصحیح میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے بجائے ازالہ کی لاحاصل کوشش کے امالہ[1] کی راہ اس سلسلہ میں جو اختیار کی ہے اس اصول سے انہوں نے بہت کم کام لیا ہے یا کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ

---

[1] کہنا یہ ہے کہ فضائل ہوں یا رذائل تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ عموماً یہ جبلی ہوتے ہیں فطرۃً بعض لوگ بخل وحسد کبر ونخوت کے صفات کو لے کر پیدا ہوتے ہیں اور جیسے رذائل کا یہ حال ہے یہی حال فضائل مثلاً شجاعت، سخاوت، ہمدردی مواساۃ جیسی اخلاقی خوبیوں کا بھی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جبلی صفات کا ازالہ اسی طرح ناممکن ہے جیسے خلقی شکل وصورت کا بدلنا آسان نہیں ہے جو چھوٹی چھوٹی آنکھیں لے کر پیدا ہوا ہے یا گربہ چشم پیدا ہوا ہے کیا اس کی آنکھوں کو کوئی بڑی بنا دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ یا نرگسی آنکھوں کو سیاہ آنکھوں سے کوئی بدل سکتا ہے۔ الغرض جو حال جسد کے بیرونی اوصاف وخصوصیات کا ہے قریب قریب وہی حالت خلق کی بھی ہے اسی لیے ان جبلی اوصاف کے ازالہ کی جگہ اسلام نے یہ راہ اختیار کی ہے کہ صحیح مصرف کی طرف ان صفات کا رخ پھیر دیا جائے جن کا شمار رذائل کے ذیل میں کیا جاتا ہے۔ قرآنی آیات مثلاً اشداء علی الکفار رحماء بینھم (کافروں پر تو وہ سخت ہیں اور باہم آپس میں ایک دوسرے پر مہربان) یا اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین (ایمان والوں کے آگے جھکے ہوئے — اور کافروں کے سامنے اونچے ہیں) وغیرہ میں اسی اصول کی طرف راہ نمائی کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں انسانی فطرت کے سالنے ایسے صفات جن میں سختی اور شدت پائی جاتی ہے کسقدر قیمتی بن جاتے ہیں گویا خس وخاشاک کے صاف کرنے کے لیے قدرت نے ان صفات کو آدمی میں پیدا کیا ہے۔ الغرض رذائل کا صحیح استعمال پیدا کرنا اسی تدبیر کا نام امالہ ہے۔ عداوت ایک بدترین رذیلہ سمجھا جاتا ہے لیکن قرآن نے الشیطان کی طرف اس عزیزۂ انسانی کا رخ پھیر کر ان الشیطان لکم عدو فاتخذوہ عدوا کا حکم دے کر اسی عداوت کو جنت کی کلید کی شکل میں بدل دیا، وقس علی ہذا۔ اسی طرح فضائل

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیا ہی نہیں ہے اور سارا زور انہوں نے یونانیوں کی اتھکس (اخلاقیات) کے اس عام اور مشہور قاعدے کے انطباق پر خرچ کر دیا ہے جس میں ہر انسانی خُلق میں اعلیٰ ادنیٰ اوسط تین مدارج پیدا کر کے بتایا جاتا ہے کہ ہر خلق کا وسطانی درجہ ہی مطلوب ہے اور اعلیٰ وادنیٰ کے حدود پر پہنچ کر سارے انسانی اخلاق غلط بن جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ توسط کا قاعدہ اخلاقیات میں ارسطو کا نکالا ہوا ہے۔

یہ نہیں ہے کہ حجۃ الاسلام کی حکیمانہ نظر سے اس راہ کے حقائق اور واقعات پوشیدہ ہیں رذائل ہوں یا فضائل عموماً یہ فطری ہوتے ہیں جن کے ازالہ کی کوشش لاحاصل کوشش ہے احیاء العلوم میں ہندوستان کے بعض لوگوں کے اس مسلک کا ذکر فرمانے کے بعد کہ ان میں بعض لوگ موجودہ زندگی ہی کو ساری مصیبتوں اور تباہیوں کا سرچشمہ خیال کرتے ہیں اسی لیے اس مصیبت سے نجات کی راہ ان کے نزدیک خودکشی ہے ان میں بعض لوگ اپنے آپ کو آگ میں جلا ڈالتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ مصائب سے ان کو نجات مل گئی پھر غالباً بدھ مذہب کے طریقۂ عمل کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں کہ " ان میں بعض خودکشی کا تو انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں اصل ضرورت ہے کہ ان بشری صفات کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سے بعض افراد اگر خالی ہوں تو ان کو اسلام ناکارہ نہیں ٹھہراتا بلکہ یہ تلاش کرتا ہے کہ اس قسم کے افراد سے جو کام بھی لیا جا سکتا ہے وہی لیا جائے۔ حضرت حسان بن ثابت صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فطرۃً جنگ کے مرد میدان نہ تھے ان میں شجاعت کی فضیلت نہیں پائی جاتی تھی جس کا وہ خود اقرار کرتے تھے۔ جنگ کے زمانہ میں ان کو عورتوں کے ساتھ پناہ گاہوں میں چھپنے کی اجازت دے دی جاتی تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس فطری کوتاہی کی وجہ سے ان کو ناکارہ ٹھہرا کر چھوڑ نہیں دیا بلکہ ان میں شاعری کا جو فطری کمال تھا اس کمال سے کفر کے مقابلہ میں کام لیا جاتا تھا۔ آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ حسان کے شعر تمہارے تیروں سے زیادہ کفار کے قلوب پر اثر ڈالتے ہیں (اوکما قال) ان کے لیے مسجد نبوی میں کرسی بچھائی جاتی جس پر بیٹھ کر وہ اشعار سناتے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بیچ بیچ میں دعائیں دیتے جاتے کہ اے خدا روح القدس سے اس شخص کی مدد کر الغرض جو پیدا ہوا ہے ناممکن ہے کہ کسی کمالی وجود سے خالی ہو اگر وہ دماغ نہیں بن سکتا تو انگلیوں کا کام تو کر سکتا ہے تو استعمال لینے والے کے سلیقہ کی بات ہے کہ ہر پرزہ کو ٹھیک اس جگہ بٹھا دے جہاں پر بیٹھ کر مشینری کا وہ کوئی کارآمد صحیح جز بن جائے۔ ۱۲۔

مار ڈالا جائے جن سے دنیا میں فساد پیدا ہوتا ہے اور نفس سے بالکلیہ ان کا ازالہ کر دیا جائے ان کا خیال ہے کہ خواہش اور غصہ سے پاک ہو جانا بس اسی میں سعادت انسانی کی ضمانت ہے۔"

اس کے بعد لکھا ہے کہ :-

" پھر وہ ان صفات کے ازالہ کی کوشش میں مشغول ہوتے ہیں۔ اور جہاں تک اپنے اوپر سختی کر سکتے ہیں کیے چلے جاتے ہیں۔ بسا اوقات ان سختیوں کی بدولت دیکھا گیا ہے کہ لوگ مر گئے ہیں بعض کی عقل میں خلل پیدا ہو گیا، بعض پاگل ہو گئے یا کسی ہولناک بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ (صـ۱۵۹ ج-۳)

اور یہ دعوی کر کے کہ ان صفات کا ازالہ ناممکن ہے آگے بڑھ کر ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

" مثلاً خواہش کا جذبہ آدمی میں بیکار نہیں پیدا کیا گیا ہے آخر بھوک ہی کی خواہش اور تقاضا جو آدمی میں پیدا کیا گیا ہے اگر اس کو مٹا دیا جائے تو کیا آدمی زندہ رہ سکتا ہے یا ہم بستری کی خواہش اگر غائب ہو جائے تو نسل انسانی کیا معدوم نہیں ہو جائے گی یہی حال غصہ کی صفت کا ہے آدمی میں اگر غصہ کا جذبہ نہ ہو تو ان دشمنوں کا مقابلہ کیا آدمی کر سکتا ہے جو اس کی ہلاکت یا اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوں۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ :-

" اور جب تک ان خواہشوں اور آرزوؤں میں آدمی مبتلا ہے گا ان کی تکمیل کے لیے اسے مال و زر کی بھی ضرورت ہو گی اور یوں مال کی محبت بھی آدمی سے نکل نہیں سکتی۔" (صـ۱۶۰ ج-۳)

یہ اور اس قسم کی باتوں سے ان کی کتاب حالانکہ بھری ہوئی ہے مگر بایں ہمہ ہر پھر کر جب اخلاق انسانی کے معالجہ کی بحث شروع ہوتی ہے تو اس ارسطاطالیسی اصول کو عموماً پیش فرما دیتے ہیں یعنی

ولیس المطلوب اماطة ذالک بالکلیة بل المطلوب ردها الی الاعتدال الذی هو وسط بین الافراط والتفریط (صـ۱۶۱ ج-۳)	ان صفات کا کلی ازالہ واستیصال یہ مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ افراط و تفریط کے درمیان نقطۂ اعتدال پر ان لوگوں کو لانے کی کوشش کی جائے۔

پھر ہر ہر خلق کے تینوں مدارج کی تفصیل کر کے ہر ایک کی کمالی صورت کو آثار و علائم اور مثالوں

سے سمجھانے کی امام نے بلیغ کوشش کی ہے اگرچہ سب کچھ کہنے کے بعد آخر میں ان کو خود ہی یہ اقرار کرنا پڑا ہے۔

الوسط الحقیقی بین الطرفین فی غایۃ الغموض بل ھو ادق من الشعر واحد من السیف۔ (ص۴۷ ج-۳)	لیکن (ان صفات کے اعلیٰ و ادنیٰ مدارج کے بیچ میں) اس نقطہ کو معین کرنا جو ٹھیک وسط میں ہو حد سے زیادہ باریک مسئلہ ہے بال سے بھی زیادہ باریک اور تلوار سے بھی زیادہ تیز۔

ظاہر ہے کہ اصلاح کا ایک ایسا اجتماعی لائحہ عمل جس کا رُخ قوم کے ہر عام و خاص آدمی کی طرف ہو، اسی کو ایسی دقیق بنیاد پر قائم کرنا جس کا پتہ چلانا آسان نہ ہو بلکہ بال سے بھی جو زیادہ باریک اور تلوار سے بھی زیادہ تیز ہو کیا عملی نتیجہ کے پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے فلسفہ تو اس قسم کی باتوں کا بڑا خوشگوار اور ذہین آدمیوں کے لیے حد سے زیادہ لذیذ تیار ہو سکتا ہے لیکن بے چارے عوام سے اس کی توقع کہ ان فلسفیانہ الجھنوں کے لیے وقت بھی دے سکیں گے اور دیں بھی تو ان کے سلجھانے میں کامیاب بھی ہو سکتے ہیں کیا کسی حیثیت سے بھی بجا توقع ہو سکتی ہے؟ لیکن بات وہی ہے کہ نصب العین کو طے کر لینے کے بعد جس قسم کی کتابوں کے مضامین سے انہوں نے دیکھا کہ مدد مل سکتی ہے ان کو وہ نقل کرتے چلے گئے ہیں۔ جب "اخلاقیات" کی بحث کی نوبت آئی تو اس زمانہ میں ارسطا طالیسی اخلاقیات کے اصول پر لکھی ہوئی کتابیں عام طور پر دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں امام نے بھی ان ہی مضامین سے کام لیا، مواد تو ان کتابوں سے لیتے ہیں اور پھر ان کی تشریح و تفصیل میں ان کی خداداد فطری قابلیت نے ایک ایسا نور پیدا کر دیا کہ پڑھنے والا جب پڑھتا ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ وہ اس باب میں ان آیتوں اور حدیثوں کو بھی نقل کرتے ہیں جن میں "امالہ" والی تدبیر کی طرف راہ نمائی کی گئی ہے لیکن نتیجہ ان سے بھی وہی نکالنا چاہتے ہیں جس سے توسط والے فلسفہ کی تائید ہوتی ہو، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:۔

الشجاعۃ التی ترجع الی استعمال قوۃ الغضب علی شرط العقل وحد الاعتدال	شجاعت (جو بزدلی اور تہور کے درمیان کا اعتدالی نقطہ ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل کے مشورے سے اعتدال کے نقطہ پر غضب اور غصہ

کی قوت کو لانے کی کوشش کی جائے۔

اسی کی تائید میں قرآن سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

فقد وصف اللہ تعالیٰ الصحابۃ فقال اشداء علی الکفار رحماء بینھم۔	اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی تعریف کی اور فرمایا کہ کافروں پر وہ سخت ہیں اور باہم ایک دوسرے پر مہربان۔

ظاہر ہے کہ اس قرآنی آیت میں "شدت" اور "رحمت" کے صفات کے صحیح محل استعمال ہی کو صرف بتایا گیا ہے، جو امالہ کی تدبیر کا حاصل ہے۔ اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ شدت کے صفات میں نقطۂ وسط یا رحمت کی صفت کو نقطۂ اعتدال پر لانے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن امام نے اسی کو پیش کیا ہے، اسی "نقطۂ اعتدال" والی تدبیر کی تائید میں حالانکہ خود ہی اس آیت کو نقل کرنے کے بعد یہ بھی فرماتے ہیں کہ :-

اشارۃ الی ان للشدۃ موضعا وللرحمۃ موضعا فلیس الکمال فی الشدۃ بکل حال ولا فی الرحمۃ بکل حال۔ (صفحہ ج-۲)	اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ سختی کے استعمال کی جگہ ہے اور رحمت و مہربانی کی بھی خاص جگہ ہے پس نہ سختی ہر حال میں کمال ہے اور نہ رحمت و مہربانی ہر حال میں کمال ہے۔

جو بالکلیہ طریقۂ امالہ ہی کی واضح تعبیر ہے لیکن اب اس کو کیا کہا جائے کہ ان کے نزدیک اس سے بھی اسی "نقطۂ اعتدال" کی تلاش کا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

امام کی تصنیفات میں سختی کا سبب

امام کا خیال تھا جس کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ :-

وھذا الزمان زمان لا ینبغی ان یستعمل فیہ مع الخلق اسباب الرجائل المبالغۃ فی التخویف ایضاً تکادات لاتردھم الی جادۃ الحق وسنن الصواب (صفحہ ۱)	یہ ایسا زمانہ ہے جس میں یہ مناسب نہ ہوگا کہ لوگوں کے سامنے امید ہی کے اسباب بیان کیے جائیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ دھمکانے اور ڈرانے میں جب مبالغہ کیا جاتا ہے جب بھی یہ دھمکیاں لوگوں کو صحیح راہ کی طرف واپس لانے میں ناکافی ثابت ہوتی ہیں۔

بظاہر ان کی کتاب میں بعضوں کو جو سختیاں نظر آتی ہیں، اس کی ایک وجہ ان کا یہ احساس بھی ہے۔ اس احساس کی شدت ہی کا شاید یہ نتیجہ ہے کہ خود وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک نمونہ کو پیش کرتے ہیں اور مسلمانوں کو اس کی اتباع کی طرف توجہ دلاتے ہیں لیکن دوسرے مقام پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو پیغمبر کے اس نمونہ کا علم بھی نہ تھا، مثلاً خلاف دستور "صحیحین" کے نام کی تصریح کرتے ہوئے اس حدیث کو درج کرتے ہیں جس میں ہے کہ حبشیوں کی جماعت حراب (خنجر) کے ساتھ کھیلتی ہوئی عید کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بلا کر ان کا تماشہ دکھایا تھا اور فرماتے جاتے تھے۔

دونکم نبی ارفدۃ۔ لینا ہے ارفدہ کے بچے۔

امام نے اس روایت کو درج کر کے حسب ذیل نتائج خود پیدا کیے ہیں۔

(۱) کھیل کود کی اجازت ہے۔

(۲) بلکہ کھیلنے والوں کی ہمت افزائی کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

اور آخر میں فرماتے ہیں:۔

فنیه دلیل علی حسن الخلق فی تطییب قلوب النساء والصبیان بمشاهدة اللعب احسن من خشونة الزهد (ص۱۸۹ ج)	یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ عورتوں اور بچوں کے دلوں کو خوش کرنے کے لیے کھیل کود کا تماشا دکھانا یہ بھی حسن خلق ہے اور زہد کی سختی سے یہ کہیں بہتر ہے۔

مگر وہی غزالی جو یہاں اتنے نرم نظر آتے ہیں تقریبات اور ضیافتوں کی خرابیوں کو گنواتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

منها اجتماع النساء علی السطوح للنظر الی الرجال۔ (ص۲۳۶)	ان خرابیوں میں سے ایک خرابی یہ بھی ہے کہ جو کوٹھوں پر عورتیں مردوں کو دیکھنے کے لیے جمع ہوتی ہیں۔

اور اس کے بعد دوسری چیزوں کے ساتھ اس فعل کے متعلق یہ فتویٰ صادر فرماتے ہیں کہ:۔

کل ذلك محظور منکر یجب تغییره	یہ ساری چیزیں ناجائز ہیں، بری ہیں جن کا بدلنا واجب ہے۔

حالانکہ شادی بیاہ کے موقع پر بیچاری عورتیں اس سے زیادہ اور کیا کرتی ہیں جیسے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھایا تھا۔ آخر وہ کھیلنے والے حبشی مرد نہیں تھے تو کیا یہ عورتوں کا مجمع تھا۔

پس واقعہ وہی ہے کہ اپنے زمانہ کے حالات سے وہ اتنا زیادہ متاثر ہیں کہ بسا اوقات اس قسم کی چیزوں کا خیال بھی ان کو نہیں رہتا اور ان کی کتابوں میں ان مثالوں کی کمی نہیں ہے۔

ایک اور نکتہ اس بحث کو ختم کرتے ہوئے آخر میں ایک اور نکتہ کا بھی ذکر غالباً امام غزالی کے مسلک کے سمجھنے میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ میں نے کسی موقع پر ذکر کیا تھا کہ اس قسم کی غیر ضروری باتیں کہ دھوبی کے دھوئے ہوئے کپڑوں کو پھر دھویا جانا امام نے بھی ان امور کو "احتمالات دقیقہ" میں شمار کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ایک دلچسپ نکتہ کا بھی ذکر کرتے چلے گئے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض لوگ جن کا نام انہوں نے "بطالین" رکھا ہے یعنی بے کار وقت ضائع کرنے والے لوگ، ان کا ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ اس طرح کے لوگوں کو اگر اسی قسم کے "احتمالات دقیقہ" میں مبتلا پایا جائے تو ان کو لوٹکنے کی ضرورت نہیں فرماتے ہیں کہ:۔

لولم یشتغلوا بصرف الاوقات	اگر ان غیر ضروری تدقیقات میں مشغول نہ رہیں گے
فیہ لاشتغلوا بنوم او حدیث	تو پھر یا یہ سو کر وقت گنوائیں گے یا بے نتیجہ لاحاصل
فیما لا یعنی (ص۹۵)	گپ شپ میں وقت صرف کریں گے۔

اس قسم کے بطالین کے متعلق امام کی رائے ہے کہ مذکورہ بالا دینی تدقیقات ہی میں ان کو الجھا رہنے دیا جائے کیوں کہ اس قسم کے دینی مشاغل (خواہ وہ غیر ضروری ہی کیوں نہ ہوں) ان سے اتنا تو ہوگا کہ اللہ کی یاد ان کے دل میں تازہ ہوتی رہے گی اور نماز وغیرہ کی طرف ان کا دھیان بٹا رہے گا۔ (ص۹۵ ج ۳)

ذرائع جو بھی اختیار کیے ہوں امام کا اخلاص بے نظیر ہے کچھ بھی ہو حجۃ الاسلام غزالی نے ذرائع جو بھی اور جس قسم کے اختیار کیے ہوں لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو اٹھایا تھا اسی سچے اور صادق و محکم اخلاص نے جس کی جڑوں کا تعلق باہر سے نہیں بلکہ ان کی روح کی گہرائیوں سے تھا اسی لیے دوسروں کو مخاطب بنانے سے پہلے خود اپنی ذات اور اپنی زندگی ہی کو انہوں نے اپنا پہلا مخاطب بنایا، اُف صحرائے شام کا وہ منظر کتنا دردناک اور اثر آفرین تھا جس کی طرف شائد میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے اور اس وقت خود ان ہی کے تلمیذ رشید

علامہ ابوبکر بن العربی الاندلسی صاحب احکام القرآن کی چشم دید شہادات ان ہی کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں
علامہ ابن العربی اپنی کتاب زاد السالکین میں لکھتے ہیں۔ (ترجمہ ان کے عربی الفاظ کا یہ ہے)

" میں نے امام غزالی کو صحرا کے ریگستان بیابان میں دیکھا ان کے ہاتھ میں ایک شام لگی ہوئی لٹھیا تھی۔ بدن پر ایک پیوند دوز گودڑ تھا۔ مونڈھے پر ایک تام لوٹے، حالانکہ اسی امام کو خود میں نے بغداد میں دیکھا تھا کہ چار چار سو علماء ان کے حلقہ درس میں زانوئے تلمذ تہہ کیے ہوئے بیٹھے ہیں، ان میں ہر ایک عالم کے سر پر عمامہ ہوتا تھا اور ان کا شمار ممتاز اور بڑے لوگوں میں ہوتا تھا ہر ایک اپنے فن کا فاضل سمجھا جاتا تھا۔

ان الفاظ کے بعد علامہ ابوبکر فرماتے ہیں کہ :۔

امام کو اس حال میں پاکر میں ان کے قریب گیا اور سلام عرض کیا پھر میں نے کہا کہ بغداد کے درس کا حلقہ کیا آپ کے اس حال سے بہتر نہ تھا۔

علامہ کہتے ہیں کہ

" میرے ان الفاظ کو سن کر میں نے دیکھا کہ امام نے بڑی تیز و تند نگاہ مجھ پر ڈالی اور اس کے بعد فرمانے لگے سعادت کی چودھویں رات کا چاند جب ارادت کے آسمان پر جلوہ گر ہوگیا اور وصال کا آفتاب اصول کے افق کے قریب غروب ہونے کے لیے جھک پڑا تو پھر...."

ابوبکر بن العربی فرماتے ہیں امام نے چند اشعار عربی زبان کے اس کے بعد دہرائے ۔ (جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

لیلیٰ اور سُعدی کی محبت سے میں دست بردار ہوکر کنارہ کش ہوگیا۔ اور پہلی منزل کے درست کرنے کی طرف میں متوجہ ہوگیا۔

پھر شوق کے جذبات نے پکارنا شروع کیا کہ ذرا ٹھہر جا جسے تو چاہتا ہے اس کی راہ کی منزلیں یہی ہیں، تو ذرا تھم جا! اور اتر پڑ،

ہم نے ان لوگوں کے لیے ایسا تاگا کاتنا شروع کیا تھا جو بہت مہین اور باریک تھا مگر اپنے اسی کتے ہوئے تاگے کا بننے والا کوئی نظر نہیں آیا،

بس اپنے چرخے کو میں نے توڑ دیا [1]

---

[1] شذرات الذہب لابن عماد صہ ۱۳ ج ۵۔

دراصل اسی دل سے نکلی ہوئی چیخ پکار کی صدائے بازگشت ہے جو صدیوں گزر جانے کے بعد بھی اسلامی دنیا میں آج تک گونج رہی ہے اور کہنے والے خواہ کچھ بھی کہتے رہیں لیکن صادق کی صادق آواز کی لہروں اور ان کی ارتعاشی تموجات کو کوئی روک نہیں سکتا جو قلب کی گہرائیوں سے ابھری تھیں۔ تصنیف و تالیف کی دنیا میں شاذ ایسے خوش قسمت مصنفین انگلیوں پر ہی گنے جاتے ہیں جن کی کتابوں کے مطالعہ پر پہرے بٹھائے گئے ہوں، بقول شخصے

شہپر و زاغ و زغن زیبائے صید و قید نیست ۔۔۔ کایں کرامت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

یہ غزالی الامام کے کلام کی تاثیری قوت ہی کا تو نتیجہ ہے کہ ایک طرف مغرب اقصیٰ کی حکومت (جو ملثمین اور مرابطین کی حکومت کہلاتی تھی) اگر یہ فرمان نافذ کرتی ہے کہ غزالی کی جو کتاب بھی اس کے ممالک محروسہ میں پائی جائے اسے نذر آتش کر دیا جائے[1] تو دوسری طرف اندلس کے شہر غرناطہ کے مشہور عالم قاضی عیاض جو اپنی کتاب شفاء کی وجہ سے ہر خاص و عام میں پہچانے جاتے ہیں۔ امام غزالی کی کتابوں کے متعلق یہی فتویٰ صادر فرماتے ہیں۔ ابن عماد نے قاضی عیاض کے تذکرہ میں نقل کیا ہے۔

امر باحراق کتب الغزالی (ص ۱۳۹ ج ۴) ۔۔۔ قاضی عیاض نے امام غزالی کی کتابوں کے جلانے کا حکم صادر کیا۔

امام غزالی کی کتابوں کے ساتھ اس قسم کے اور واقعات کا ذکر بھی لوگوں نے کیا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے لیے یہ سلوک باعث گرانی ہو لیکن میں نے تو ہمیشہ ان واقعات کو امام کی کتابوں کے نفوذ و تاثیر کی شہادت اور زندہ وثائق ہی کی حیثیت سے پڑھا، ذرا خیال تو کیجیے عجم بلکہ فردوسی کے وطن طوس کے ایک باشندے کو جس کی مادری زبان عربی نہ تھی اس نے اپنی کل کتابیں مشرق ہی میں بیٹھ کر لکھیں لیکن امام کی وفات پر تیس[2] سال سے زیادہ زمانہ بھی نہ گزرا تھا کہ ہم افریقہ کے مغربی گوشہ

---

[1] شذور ص ۱۱۵ تا ص ۱۲۴

[2] ضمناً اس سے اس عہد میں علم کی اشاعت اور دائرے کی عمومیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کتابیں مشرق کے ایک گوشہ میں لکھی جاتی تھیں اور آناً فاناً اسلامی ممالک کے آخری گوشوں تک حتیٰ کہ اسلام کے یورپی علاقہ اندلس تک پھیل جاتی تھیں۔ امام کی کتابوں کے جلانے کا واقعہ مغرب اقصیٰ اور اندلس میں امام کی وفات کے تیس چالیس سال کے اندر پیش آیا

کی حکومت کو پتا ہے ہیں کہ امام کی کتابوں کو جلوانے کا انتظام کر رہی ہے۔ مرابطین کی اس حکومت کے اس طرزِ عمل کی ممکن ہے کہ کوئی سیاسی توجیہہ بھی کی جائے جس کی طرف میں نے پہلے بھی ایما کیا ہے لیکن قاضی عیاض کے فتوے کے متعلق اس توجیہہ کی گنجائش بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے امام کے قلم کا زور تھا جس کے آثار و نتائج کا مقابلہ ان لوگوں کے نزدیک آگ کے سوا اور کسی ذریعہ سے ممکن نظر نہ آیا حیرت ہوتی ہے کہ عربی ادب و انشاء کی امام نے چنداں مشق بھی نہیں کی تھی بلکہ ان پر اعتراض کرنے والے طبقات کا منجملہ دوسری حرف گیریوں کے ایک اعتراض عربی ادب کی کمزوری کا بھی ہے جو ان لوگوں نے امام کی کتابوں میں دکھائی ہے لیکن بایں ہمہ خالص عربی بولنے والے ممالک اور قبائل کو امام کی گرفت سے محفوظ رکھنے کی صورت اس کے سوا اور کوئی نظر نہ آئی کہ ملک سے ان کی کتابوں کو معدوم کر دیا جائے۔

امام کی کتابوں کے انقلابی اثرات سچ پوچھیے تو امام کی کتابوں خصوصاً احیاء العلوم کے حسن قبول اور اثر و نفوذ ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ خود حجۃ الاسلام کے حقیقی بھائی شیخ ابو الفتوح احمد الغزالی الواعظ کو احیاء العلوم کا ایک خلاصہ "لباب الاحیاء" کے نام سے تیار کرنا پڑا۔ (شذرات ص ۱۰ ج ۵) اور یہ تو خیر ان کے بھائی تھے باوجود حنبلی ہونے کے اسی صدی کے ایک دوسرے عالم ابوالخیر العمرانی باشندہ یمن نے بھی احیاء العلوم کی تلخیص کا کام انجام دیا حالانکہ عقیدۃً ان میں اور امام غزالی میں بہت زیادہ فرق تھا۔ غزالی اشعری عقائد کے قائل تھے اور عمرانی نے اپنی کتاب الانتصار میں جیسا کہ ابن عماد نے لکھا ہے۔

متحامل فیہ علی الاشاعرۃ — اشاعرہ پر اس کتاب میں عمرانی نے حملے کیے ہیں۔ (ص ۱۸۶ ج ۵)

لیکن باوجود اختلاف عقیدہ کے غزالی کی کتاب ان کو اتنی پسند آئی کہ عوام تک اس کے مضامین کو پہنچانے کے لیے یہ خلاصہ لکھا تھا۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری شہادتوں اور قرائن و حالات نے مجھے اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ مسلمانوں کی جس اجتماعی زندگی کے باطنی اضمحلال کا اندازہ کر کے امام نے جو تصنیفی خدمات انجام دیں اور جو سو رہے تھے ان کو جگانے کے لیے انہوں نے جو صور پھونکا تھا اس کی آواز بالکلیہ صدا بصحرا ثابت نہ ہوئی۔

خلفاء، سلاطین اور وزراء پر انقلابی اثرات

خلفائے عباسیہ کی حالت میں انقلاب

معنوی حیثیت خلافت عباسیہ بغداد کی تاریخ کے اس دور میں کچھ ہی ہو گئی ہو لیکن عمومی طور پر پھر بھی بلندی کا آخری نقطہ ساری دنیائے اسلام میں اس وقت تک خلافت کا وہی طرہ تھا جو خلفائے عباسیہ کی دستار پر لہرا رہا تھا۔ شمار کرنے کے وقت مسلمانوں میں سب سے پہلا نام خلیفۂ بغداد ہی کا لیا جاتا تھا [۱]۔

---

[۱] خلافت عباسیہ کا جو وقار اس وقت تک قلوب میں تھا اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ مستظہر باللہ جو امام غزالی کے زمانہ میں بغداد کا خلیفہ تھا۔ اسی کے جانشین اور بیٹے المسترشد باللہ خلیفہ بغداد سلجوقی بادشاہ مسعود بن محمد بن ملک شاہ میں جب جھگڑا ہوا اور شکست کھانے کے بعد مسترشد مسعود سلجوقی کے ہاتھ گرفتار ہو گیا۔ مسعود مسترشد کو قید کر کے اپنے ساتھ مراغہ لے گیا تو قطع نظر اس عام واویلا کے جو بغداد والوں میں برپا تھا۔ ابن جوزی جیسے ثقہ مورخ کا بیان ہے کہ خلیفہ کی گرفتاری کے بعد بغداد میں مسلسل زلزلوں کے جھٹکے لگنے شروع ہوئے۔ ایک ایک دن میں پانچ پانچ جھٹکے لگتے تھے۔ دنیا حیران تھی آخر بغداد کے ان عجیب و غریب حوادث کی خبر مسعود سلجوقی کے چچا سلطان سنجر شاہ خراسان تک جب پہنچی تو اس نے مسعود کے پاس فوراً اپنے آدمی ایک خط کے ساتھ روانہ کیئے۔ خط میں سلطان سنجر نے بھتیجے کو لکھا تھا کہ جس وقت یہ خط تم کو ملے بغیر کسی تاخیر کے چاہیئے کہ تم فوراً امیر المؤمنین (یعنی قیدی مسترشد) کی خدمت میں اپنے آپ کو حاضر کرو اور جس طرح بھی ممکن ہو ان سے اپنی کوتاہیوں کی معافی چاہو۔ سنجر نے اس کے بعد لکھا تھا کہ مسلسل آسمانی اور زمینی نشانیاں کچھ اس طرح رونما ہو رہی ہیں کہ ان کے سننے کی تاب اپنے اندر میں نہیں پاتا۔ بکثرت آندھیاں چلنے لگی ہیں۔ برق و رعد کی گرج اور کڑک سے لوگوں کے قلوب دہلے جاتے ہیں۔ زلزلوں پہ زلزلے ہو رہے ہیں۔ بغداد میں بیس دن تک یہی حال رہا۔ عام فوجیوں میں ہراسانی پھیل گئی ہے۔ ملک سخت اضطراب کی حالت میں ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

اور لیگاڑ کے جس اثر سے مسلمان بتدریج متاثر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس سے مسلمانوں کی یہ بڑی شخصیت بھی محفوظ نہ تھی جس کا اندازہ آپ کو عہدِ غزالی یا اس سے کچھ پہلے چند جو خلفاء گزرے ہیں۔ ان کے عام حالات ان کی دولت و ثروت شان و اُبہت سے ہو سکتا ہے جن کے تذکروں سے ہماری تاریخیں معمور ہیں[1] مگر حافظہ کے نقوش کو تازہ کرنے کے لیے ایک ہلکی سی جھلک عباسی دربار کے شان و شوکت کی اس وقت بھی پیش کر دی جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ یہ اسی صدی کا واقعہ ہے جس میں امام غزالی پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی ۴۵۰ھ میں قسطنطنیہ سے رومیوں کی جو سفارت قیدیوں کے تبادلے اور صلح کی گفتگو کے لیے خلیفہ مقتدر باللہ العباسی کے زمانہ میں بغداد آئی تھی۔ مقتدر سے ملنے کے لیے جب دار الخلافہ کی طرف یہ سفارت روانہ ہوئی تو ملاحظہ کیجیے عباسیوں کے تزک و احتشام اور ساز و سامان کو ابن جوزی محدث کے الفاظ کا اردو ترجمہ یہ ہے :۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ان آسمانی اور الٰہی نشانیوں کی خبروں سے میرا زہرہ آب ہوا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے مسجدوں میں جانا ترک کر دیا ہے۔ خطباء خطبوں سے دست کش ہو گئے۔ پھر سمجھاتے ہوئے اپنے بھتیجے کو آخر میں اس نے حکم دیا تھا کہ "اللہ اللہ امیر المومنین کے حق میں جو واقعہ پیش آیا ہے کسی نہ کسی شکل میں اس کی تلافی ہونی چاہیئے۔ تلافی کی شکل یہی ہے کہ تم فوراً امیر المومنین کو ان کے دار الخلافہ واپس کرنے کا سامان کرو اور ہمارے باپ دادوں کی قدیم رسم جو یہ چلی آتی ہے کہ غاشیہ (شامیانہ) اٹھائے ہوئے امیر المومنین کے آگے آگے چلتے تھے تم بھی اپنی اسی آبائی رسم کو زندہ کرو۔ لکھا ہے کہ مسعود بھی اپنے چچا کے اس خط سے ہیبت زدہ ہو کر رہ گیا اور حسب الحکم مسترشد کے سامنے حاضر ہو کر زمیں بوس ہوا اور ممکنہ لجاجت سے اپنے قصور کی معافی چاہی (منتظم شذورج ۵) ممکن ہے کہ زلزلے یا آندھیاں گرج اور کڑک کا تعلق عام حوادث سے ہو لیکن خلافت بغداد کا جو وقار قلوب میں اس وقت تک قائم تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ضرور ہوتا ہے۔ ۱۲۔

[1] امام غزالی سے کچھ ہی دن پہلے مقتدر باللہ عباسی کے حالات میں ابن جوزی نے لکھا ہے کہ ایک ماما جو مقتدر کی ماں کی قہرمانہ (داروغن) تھی۔ اس نے جس شخص کو دودھ پلایا تھا اس کے لڑکے کی ختنہ کی تقریب میں جو دعوتیں اسی ماما کی طرف سے ہوئی تھیں ان کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ صرف چند کمروں میں مٹھائیاں اور چند کمروں میں میوہ جات اور پھل پھلاری بھرے گئے تھے۔ اور ہزار ہا اشرفیاں ان پر خرچ ہوئیں، مقتدر کی ماں (باقی اگلے صفحہ پر)

"فوج کو مسلح ہو کر پریڈ کا حکم دیا گیا جس کی تعداد ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ ان میں سوار بھی تھے اور پیادے بھی فوج کے بعد دار الخلافہ کے خاص خدام اور غلاموں کی صفیں تھیں جو زرق برق لباسوں اور طلائی و نقرئی زیوروں سے جگ مگ کر رہے تھے۔ ان خدام اور غلاموں کی تعداد سات ہزار تھی جن میں چار گورے رنگ کے غلام اور تین ہزار حبشی سیاہ تھے۔ پھر حجاب کی صفیں تھیں شمار میں سات سو تھے۔ سامنے دجلہ میں بے شمار کشتیاں مختلف قسموں کی آراستہ و پیراستہ ہو کر دور تک پھیلی ہوئی تھیں جنہیں طیارات زبازب اور سمیریات وغیرہ ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سفرا روم اپنی فرودگاہ سے روانہ ہو کر پہلے اس حاجب (عرض بگی) کے محل کے سامنے پہنچے جس کا نام نصر القشوری تھا۔ حاجب کے محل کی شان و شوکت دیکھ کر سفرا کچھ اس درجہ مبہوت ہوئے کہ اسی محل کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نے بطور تحفے اور تقریب میں امداد کرنے کے شاہانہ فرش فروش، ظروف طلائی و نقرئی اور قیمتی کپڑے بھیجے تھے۔ (دیکھو صلا ج ۱۶ - ابن جوزی) اسی موقعہ پر مقتدر ہی کے زمانہ میں ایک اور لطیفہ کا ذکر ابن جوزی نے کیا ہے کہ بغیر کسی اطلاع کے ایک دن مقتدر مشہور شاہی باغ "زبیدہ کی طرف نکل پڑا باڈی گارڈ کے کچھ لوگ ساتھ تھے اور مطبخ سے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔" باغ زبیدہ" جانے کے لیے دجلہ کو عبور کرنے کی ضرورت تھی، مقتدر کشتی میں سوار ہو گیا اور سوار ہونے کے بعد اس نے ناشتہ طلب کیا۔ مطبخ والی کشتی ابھی نہیں پہنچی تھی لیکن اس نے تقاضا شروع کیا لوگ حیران تھے کشتی کا ملاح جس کا نام جعفر تھا اس نے عرض کیا کہ فقیر کا ماحضر کشتی میں موجود ہے حکم ہو تو وہی پیش کر دیا جائے۔ مقتدر نے حکم دیا کہ لایا جائے کھانا اگرچہ سادہ تھا لیکن لطافت کے ساتھ پکا ہوا تھا صاف میدے کی روٹیاں تھیں اور حلوان کے گوشت کا ٹھنڈا کباب کچھ اچار اور سرکہ کی چیزیں تھیں مقتدر نے رغبت کے ساتھ جعفر ملاح کے ماحضر کو تناول کیا اس کے بعد حکم دیا کہ شاہی باورچی خانہ سے روزانہ ایک خوان کم از کم دس اشرفیوں کے خرچ سے جعفر ملاح کی کشتی میں روانہ کیا جائے تا کہ اسی طرح اتفاقاً میں کبھی نکل آؤں تو دشواری پیش نہ آئے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ مقتدر کو دوبارہ پھر اس کشتی میں سوار ہونے کا موقع نہ ملا۔ لیکن دس اشرفیوں والا یہ خوان جعفر ملاح کی کشتی میں پہنچتا رہا۔ اگر کبھی نہ پہنچتا تو جعفر دام شاہی مطبخ سے وصول کر لیا کرتا تھا۔

انہوں نے سمجھا کہ خلیفہ کا مکان ہے۔ ان کی غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا۔ وہ آگے بڑھے
سامنے وزیر کا قصر نظر آیا۔ ان کو پھر یہی خیال ہوا کہ وہ نہیں تو ضرور یہی خلیفہ کا
مستقر ہے مگر کہا گیا کہ یہ وزیر کا گھر ہے۔ وہ آگے روانہ ہوئے۔ ان لوگوں کو
اس طرح سے دارالخلافہ میں داخل کیا گیا کہ چاروں طرف پہلے وہ گھوم لیں۔ حالت
یہ تھی کہ دارالخلافہ کے اطراف و جوانب اس کے مختلف ابواب اور مقامات پر ۳۸ ہزار
پردے پڑے ہوئے تھے۔ جن میں بارہ ہزار پانچسو پردے تو خالص سنر اکش،
دیبا اور حریر کے تھے، درمیان میں جو فرش فروش بچھائے گئے تھے ان کی
تعداد بائیس ہزار تھی۔ دارالخلافہ کے احاطہ میں (جو خود ایک مستقل دنیا کی
حیثیت رکھتا تھا) مختلف مقامات میں جنگلی جانوروں کی قطاریں بکھری ہوئی
تھیں جو لوگوں سے مانوس تھے اور ان کو جو کھلاتا اس ہاتھ سے کھاتے اسی
احاطہ میں مختلف قسم کے درندے (شیر، بھیڑیا وغیرہ) بھی زنجیروں میں
بندھے ہوئے اپنے نگہبانوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ سفارت کو پھر اسی
کوٹھی میں لے جایا گیا جس کا نام "دارالشجرہ" (درخت والا محل) تھا۔ اس
کے احاطہ میں ایک طویل و عریض تالاب تھا جس میں صاف و شفاف پانی
ہر وقت چھلکتا رہتا تھا۔ تالاب کے ٹھیک وسط میں ایک چبوترے پر ایک
درخت تھا۔ یہ مصنوعی درخت تھا جس میں بڑی بڑی بارہ ڈالیاں اور ہر ڈالی
میں بے شمار شاخیں اور ٹہنیاں تھیں۔ ان شاخوں پر مختلف اقسام کے پرندے
اور چڑیاں طلا اور نقرہ یعنی سونے چاندی سے ڈھال ڈھال کر بنائی گئی
تھیں اور یہی حال اس درخت کی شاخوں اور ٹہنیوں کا تھا۔ یعنی ان میں
بعض سونے سے بنائی گئی تھیں اور بعض چاندی سے، پتّے اس درخت
کے بوقلموں رنگوں سے رنگین تھے۔ بنانے والوں نے ان مصنوعی چڑیوں کو
اس طرح بنایا تھا کہ مسلسل چہچہانے کی آواز ان سے نکلتی رہتی تھی۔
"دارالشجرہ" کے بعد سفیروں کو اس محل میں لوگوں نے پہنچایا جس کا

نام "الفردوس" تھا۔ اس قصر میں فرش فروش اور ظروف و آلات کی جو کثرت تھی ان کا شمار مشکل ہے۔ صرف اس کی دہلیزوں پر طلائی کڑیوں سے بنی ہوئی دس ہزار زرہیں لٹکی ہی تھیں۔ اس کے بعد آبنوسی جڑاؤ تخت پر سفراء نے مقتدر باللہ کو جلوہ افروز پایا جس پر زرین جھالروں کی کارچوبی مخملی مسند پڑی ہوئی تھی۔ تخت کے داہنے جانب بھی اور بائیں جانب بھی خاص سلیقہ سے مختلف جواہر کے بنے ہوئے جالے کے نو نو عدد لٹکے ہوئے تھے جن کی جگمگاہٹ سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ دن کی روشنی کو بھی ان کی روشنی مات کر رہی تھی۔[1] (ص ۱۴۴ ج ۶ المنتظم لابن جوزی)

خلیفہ مقتفی باللہ پر تعلیمات غزالیہ کا اثر

بہرحال یہ تو ایک ذیلی تذکرہ تھا میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ امام غزالی کی وفات کے کچھ دن بعد تک خلافت عباسیہ سلجوقی سلاطین کی باہمی کش مکش سے مختلف فتنوں کی آماجگاہ بنی رہی لیکن امام کی وفات پر پچیس سال سے بھی زیادہ زمانہ نہ گزرنے پایا تھا کہ ہم عباسی خلافت کی اسی گدی پر ایک ایسے خلیفہ کو پاتے ہیں جس کے متعلق مورخین کا بیان ہے کہ

> "خلیفہ منتخب ہونے سے پہلے اس کا زیادہ وقت دینی مشاغل میں صرف ہوتا تھا، دینی علوم کی کتابیں لکھتا رہتا تھا یا قرآن کی تلاوت کرتا پھر جب خلیفہ منتخب ہوا تو زہد و عبادت تقویٰ و طہارت کی خصوصیتوں میں اس کے کسی

---

[1] ابن جوزی نے اسی کتاب میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ کسریٰ ایران اور اس کے سوا دوسرے سلاطین کے خزانوں کے جواہر پہلے تو بنی امیہ کے قبضہ میں آئے اور ان سے منتقل ہو کر یہ ذخیرہ عباسیوں کے جواہر خانہ میں داخل ہوا بعد کو وقتاً فوقتاً مختلف عباسی خلفاء نے اس ذخیرہ میں اضافے جو کیے ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ مہدی عباسی نے "الجبل" نامی پتھر تین لاکھ اشرفیوں میں خریدا تھا اور ہارون نے دس لاکھ پونڈ تک میں ایک جوہر مول لیا تھا اسی عباسی جواہر خانے میں ایک دُرِّ یتیم تھا جس کا وزن کہا جاتا ہے تین مثقال تھا، اگرچہ مقتدر اور القاہر و الراضی کے زمانہ میں بڑا ذخیرہ ان موروثی جواہر کا ضائع ہو گیا لیکن پھر بھی عباسیوں کا ہی خزانہ تھا۔ ۱۲

قسم کی کمی نہ ہوئی امارت اور خلافت کے سارے آثار اور نشانات نے نئے
سرے سے اس کے زمانہ میں تر و تازگی حاصل کی حکومت کے کاروبار کو
براہ راست وہ خود انجام دیتا تھا بہ نفس نفیس جنگوں میں متعدد بار شریک
ہوا عدل و انصاف کے چمن میں پھر بہار اس کے عہد میں آئی، نیکی کے ابواب
پھر کھل پڑے۔

یہ الفاظ تاریخ کی کتابوں میں خلیفہ مقتفی باللہ کے متعلق نقل کیے گئے ہیں جو ۵۳۰ھ میں مسند آرائے خلافت ہوا، اور مسلسل ۲۵ سال تک حکمرانی کا موقع اس کو ملا۔ ابن جوزی کا بیان ہے کہ:۔

مقتفی کے زمانہ میں بغداد اور عراق پھر خلیفہ کے قبضۂ اقتدار میں واپس
ہوا۔ ورنہ مقتدر باللہ کے زمانہ سے صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ خلیفہ کا صرف
نام تھا اور حکومت ان سلاطین اور ملوک کی قائم تھی جنہوں نے جبراً خلفاء
کو اپنا تابع فرمان بنالیا تھا۔

یہ بھی لکھا ہے کہ

سیر چشمی، رعایا پروری، رحم گستری کے ساتھ عباسیوں میں مقتفی ہی وہ حکمران
گزرا ہے جس کی نظیر دلیری اور شجاعت میں معتصم باللہ کے سوا کسی دوسرے
عباسی خلیفہ میں نہیں ملتی۔

اور یہ سب چیزیں تو خیر بجائے خود ہیں سب سے عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ جس دار الخلافہ کا ایک منظر آپ کے سامنے ابھی گزرا ہے اب اسی کے بالمقابل سنیئے بیان کیا جاتا ہے کہ مقتفی نے اسی دار الخلافت میں خلافت کی باگ ڈور جب اپنے ہاتھ میں لی تو

دار الخلافہ بغداد اپنے سارے اثاثے فرش و فروش خیمہ و خرگاہ پردے
سرا پردے دواب چوپائے اور دوسرے جانوروں سے بالکلیہ تخلیہ ہوگیا صرف
چار گھوڑے اور دار الخلافت میں پانی پہنچانے کے لئے کل آٹھ خچر اصطبل
میں باقی تھے۔

دار الخلافت عباسیہ کے اس عجیب و غریب تاریخی تخلیہ کا ذکر سب ہی نے کیا ہے لیکن یہ صورت

کیوں پیش آئی، اس سوال کے جواب میں لوگ مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ سلجوقی بادشاہ مسعود نے جبراً خلیفہ کو اس تخلیہ پر مجبور کیا لیکن اسی کے مقابلہ میں بعضوں کا بیان ہے کہ مقتفی کا انتخاب ہی اسی شرط کے ساتھ مشروط تھا۔ اسی لیے خلیفہ ہونے کے بعد مقتفی نے خود اپنے عہد کو اس شکل میں پورا کیا۔ (واللہ اعلم واقعی اسباب تخلیہ کے اس عجیب و غریب عمل کے کیا تھے۔ ان ہی مورخین نے ایک اور بات بھی لکھی ہے جو صرف ان ہی کی خبر نہیں ہے بلکہ خود مقتفی نے خلیفہ ہونے کے بعد مقتفی کا جو لقب اختیار کیا اس سے بھی اس خبر کی تصدیق ہوتی ہے، لکھا ہے کہ خلیفہ منتخب ہونے سے چھ دن پہلے مقتفی کو ایک عام رویا ہوئی۔ خواب میں جمالِ جہاں آرا و رسالت پناہی صلاۃ اللہ علیہ سے سرفرازی نصیب ہوئی۔ مقتفی جس کا اصلی نام محمد تھا اسی کو خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ

سیصل ھذا الامر الیک فاقتف بی (شذور ص۱۲۳ ج ۵) — قریب ہے کہ یہ چیز (یعنی خلافت) تجھ تک پہنچے۔ جب ایسا ہو تو میرے نقش قدم کی پیروی کرنا۔

کہتے ہیں کہ اسی "رویاء صادقہ" جس کی تعبیر چھٹے دن عالم بیداری میں اس کے سامنے آگئی۔ اس نے اپنا لقب المقتفی[۱] رکھا۔ ایسی صورت میں اگر یہ سمجھا جائے کہ تخلیہ کا یہ عمل اسی ارشاد نبوی میں مقتفی سے ظاہر ہوا تو اس پر کم از کم مجھے تو تعجب کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی آخر سلجوقی سلاطین کے زیر اثر تو عباسی خلفاء ایک زمانہ سے تھے لیکن اس قسم کی جسارت جب ان کے بڑوں سے نہ ہو سکی جو کفر سے زیادہ قریب تھے تو مسعود سے اس کی توقع کیوں کی جائے خصوصاً سلجوقی سلاطین کا بغداد کی خلافت کے ساتھ جو نفسیاتی تعلق تھا اس کا ذکر ابھی مجھ سے آپ سن چکے کہ سنجر تک ان تکوینی آثار کی خبر سن کر گھبرا اٹھا جن کا ظہور مسترشد کی گرفتاری کے بعد دار الخلافت میں شروع ہو گیا تھا اور مسعود[۲] کے عام حالات کتابوں میں

---

[۱] اسم فاعل کا صیغہ اقتفاء سے بنا ہوا ہے جس کے معنی نقشِ قدم کی پیروی کرنا ہے۔ ۱۲۔

[۲] ابن اثیر نے تو مسعود کو سلجوقی خاندان کا آخری چراغ قرار دیا ہے لکھا ہے کہ سارا سلجوقی اقبال مسعود کی وفات پر ختم ہو گیا۔ پھر اس کی خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے ابن اثیر ہی نے نقل کیا ہے کہ بڑا فیاض سیر چشم بادشاہ تھا۔ اور رعایا کے مال کے متعلق بہت محتاط تھا، ابن اثیر کے الفاظ میں وکان احسن السلاطین فیھم سیرۃ
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جو ملتے ہیں ان سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی۔ سارے سلجوقی سلاطین میں رعایا کے مال کے متعلق جب مورخین اس کو محتاط ترین بادشاہ قرار دیتے ہیں تو عباسی خلیفہ کے اموال کے سلسلہ میں اس کو اتنا ظالم د لئیم آخر کیوں قرار دیا جائے۔

بہرحال مجھے تو دارالخلافت بغداد کے اس تاریخی تخلیہ میں اقتفائی تعمیل ہی کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے کیونکہ جہاں تک مقتفی کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا ہوں باوجودیکہ مسلسل پچیس سال اور وہ بھی کافی اقتدار و اختیار کے ساتھ حکمرانی کا موقع اس کو ملا لیکن بجز ایک واقعہ کے عموماً اپنے سچے خواب کی تعبیر میں وہ کوشاں نظر آتا ہے حالانکہ اس کے پیش رو عباسی خلفاء نے جن روایات کا سلسلہ قائم کر دیا تھا ان کے ہوتے ہوئے اتنی وفاداری کے ساتھ اس تعبیر کی تکمیل اس ماحول میں بظاہر آسان نہ تھی اور وہ واقعہ بھی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا لکھا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مسعود کے مزاج میں ظرافت بھی تھی، مشہور قاضی کمال الدین شہر زوری کے متعلق لکھا ہے کہ مسعود کے کیمپ میں کسی ضرورت سے حاضر ہوئے مغرب کا وقت آگیا قریب ہی ایک خیمہ میں دیکھا کہ کوئی نماز پڑھ رہا ہے قاضی صاحب اسی خیمہ میں داخل ہو گئے اور نماز میں اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔ نماز کے بعد پوچھا کہ آپ کون ہیں۔ جواب میں کہا گیا کہ فلاں شہر کا قاضی ہوں شہر زوری نے کہا کہ تین قسم کے قاضی ہوتے ہیں جن میں دو جہنم میں اور ایک جنت میں جائیں گے جہنم میں جانے والے ہم تم دونوں قاضی ہیں۔ جو ان سلاطین کے آستانوں پر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور جنتی قاضی وہ ہے جس کی صورت نہ ان سلاطین نے دیکھی اور نہ اس نے ان سلاطین کی صورت دیکھی۔ دراصل یہ خود سلطان مسعود تھا۔ صبح کو قاضی شہر زوری جب سلطان کے سامنے پیش ہوئے تو ہنستے ہوئے مسعود نے کہا کہ فرمائیے قاضی صاحب تین قاضیوں کا وہ کیا قصہ ہے۔ شہر زور سمجھ گئے کہ خود سلطان سے مغرب کے وقت وہ گفتگو میں نے کی تھی، بولے جی ہاں واقعہ تو وہی ہے جو میں نے عرض کیا تھا سلطان نے کہا کہ سچ فرماتے ہیں آپ بلاشبہ وہ نیک بخت سعید آدمی ہے جس نے نہ ہماری صورت دیکھی اور نہ ہم نے اس کی صورت دیکھی ایک لطیفہ اس کا یہ بھی ہے کہ بغداد کی کسی سڑک سے گزر رہا تھا ایک عورت نے دوسری عورت سے جو ذرا دور تھی کہا کہ جلد آؤ! سلطان کو دیکھو! مسعود کے کان میں بھی اس کی آواز پڑ گئی ٹھہر گیا اور بولا کہ وہ بی بی آلیں تب چلونگا۔ (صہ ۲ ج ۱۰ کامل)

دنوں میں مقتفی نے خالص عقیق سے اپنے لیے ایک تابوت تیار کیا تھا اور عقیق کے اسی تابوت میں وہ دفن کیا گیا تھا۔ عقیق کا شمار قیمتی پتھروں کی صف میں نہ ہوتا ہو لیکن پھر بھی ایک مسلم تابوت کے لیے عقیق جیسے پتھر کی جو مقدار مہیا کی گئی ہوگی اس پر یقیناً غیر معمولی مصارف عائد ہوئے ہوں گے اس لحاظ سے مقتفی کا یہ طرز عمل قابل تنقید ہے مگر مقتفی سے پہلے عباسی خلفاء کا جو حال ہو گیا تھا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجھے تو اس میں بھی دینی تاثر ہی کا کچھ نہ کچھ عکس نظر آتا ہے جن حکمرانوں کے دربار میں موت کا خیال بھی بدتر از خیال قرار دے دیا گیا تھا[1]۔ اسی دربار میں تابوت کی تیاری اور یہ تصور کرتے ہوئے کہ تابوت مقتفی کی لاش کے برابر ہو یقیناً پیمائش وغیرہ کا کام بھی انجام دیا گیا ہوگا بلکہ تیار ہونے کے

---

[1] سلاطین وملوک کے درباروں میں موت اور موت کا ذکر ایک مدت تک لطیفہ بنا ہوا تھا مرنے والوں کی اطلاع کے لیے عجیب وغریب تعبیریں تراشی گئی تھیں جن کی تفصیل ایک مستقل مقالہ کی طالب ہے۔ دور کیوں جائیے ان ہی عباسی خلفاء میں واثق باللہ خلیفہ کا جو قصہ کتابوں میں نقل کیا گیا ہے ——— وہ کیا کچھ کم عبرت انگیز ہے۔ الذہبی نے مختصر دول الاسلام میں نقل کیا ہے کہ الواثق باللہ کا خادم خاص جو الواثقی کے نام سے مشہور تھا اسی کا بیان ہے کہ واثق جب بیمار ہوا تو اس کی تیمارداری مجھ ہی سے متعلق تھی۔ حالت واثق کی جب خراب ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اس پر غشی طاری ہو گئی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ختم ہو گیا۔ پاس میں جو لوگ تھے ان کو بلایا اور ایک نے دوسرے سے اشارہ کیا کہ واثق کے قریب جا کر واقعی دیکھیے کہ روح پرواز کر چکی یا کچھ رمق باقی ہے لیکن کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر میں ہی دل کو مضبوط کر کے آگے بڑھا میں نے آہستہ سے اس کی ناک پر سانس کا پتہ چلانے کے لیے انگلی رکھی کہ اچانک واثق نے آنکھیں کھول دیں، الواثقی کہتا ہے کہ نہ پوچھو کہ اس واقعہ کا مجھ پر کیا اثر مرتب ہوا اس کے الفاظ میں فکدت ان اموت (اتنا گھبرایا کہ قریب تھا کہ میں خود مر جاتا) گھبراہٹ اس کی تھی کہ موت کے انتساب کو واثق کی زندگی ہی میں گویا ممکن قرار دیا۔ بازپرس کے خوف نے اس پر یہ ہیبت طاری کی لیکن خیر گزری کہ واثق کی آنکھیں آخری دفعہ کھلی تھیں اور پھر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔ الواثقی کہتا ہے کہ ڈر کے مارے میں گر پڑا تھا تلوار تک ٹوٹ گئی۔ اور میرے بدن میں کچھ گھس بھی گئی۔ بہرحال الواثق واقعی اسی کے بعد مر گیا تب واثقی نے یہ یقین کر لینے کے بعد کہ درحقیقت اب خلیفہ کی روح پرواز کر چکی ہے لاش پر چادر ڈال دی۔ اس عرصہ میں واثقی کو محسوس ہوا کہ آنکھوں کے سامنے کوئی چیز حرکت کر رہی ہے وہ پھر گھبرایا چادر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک چوہا واثق کی آنکھیں نکالے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بعد کیا تعجب ہے کہ اپنے اس تابوت میں خود مقتفی کسی وقت لیٹا بھی ہو اگر اس نقطۂ نظر سے سوچیئے تو یہی غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑے واعظ کے وعظ کے لیے مقتفی نے اپنے کانوں میں انگلیاں نہیں ٹھونسی تھیں بلکہ عقیق ہی کی شکل میں سہی اس واعظ کو اپنے سامنے کھڑا کر کے اس وعظ کو سننا چاہتا تھا جس کے بعد شاید کسی دوسرے وعظ کے سننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آخر جب الذہبی کے خشک قلم سے بھی جس خلیفہ کے ذکر میں یہ الفاظ پائے جاتے ہوں۔

کان سیدا دیناً مھیبا شجاعًا	وہ سردار تھا بڑا دیندار تھا ہیبت وجلال
عدیم النظیر وعظیم المملکۃ بیدہٖ	والا تھا بے نظیر تھا بڑی مملکت کا مالک تھا
ازمۃ الامور۔	اور حکومت کے سارے معاملات کو اپنے قبضہ
(صفہ ۵ ج ۲ مختصر دول اسلام)	اقتدار میں لیے ہوئے تھا۔

میرے نزدیک تو مقتفی کی دینداری اور حکمرانی کی ذمہ داریوں کے صادق احساس کی یہ کافی سند ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا خواب جو اس نے دیکھا تھا اسی کی تعبیر وفاداری کے ساتھ پوری کرنے کی کوشش کا نتیجہ ہم اسے قرار بھی دیں جب بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خواب تو خواب ان ہی خلفاء میں بیسیوں گزرے تھے جن کے سامنے الکتاب ذوالسنہ کی شکل میں بیداری کا پیام اسی پیغمبر کا موجود تھا جس کو مقتفی نے خواب میں دیکھا تھا اثر پذیری کی یہ غیر معمولی کیفیت مقتفی میں جو محسوس ہوتی ہے اس کو کس چیز کا نتیجہ ٹھیرایا جائے؟

اور بات صرف مقتفی ہی کی حد تک اگر محدود ہوتی تو استثنا اور شذوذ کے دعوے کی گنجائش بھی پیدا ہو سکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ امام غزالی کے بعد پے در پے پچاس ساٹھ برس کا زمانہ بغداد کی خلافت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بھاگا جاتا ہے۔ بے ساختہ زبان پر الواثقی کے جاری ہو گیا۔ لا اِلٰہ اِلّا اللہ۔ یہی آنکھ تھی جس کی معمولی حرکت سے کچھ دیر پہلے میں مرنے کے قریب ہو گیا تھا گر پڑا تلوار ٹوٹی اور چند لمحوں کے بعد اسی آنکھ کو ایک چوہا نکال کر لے بھاگا۔ ۱۲ (مختصر دول الاسلام ذہبی مطبوعہ دائرۃ المعارف ج ۱ صفہ ۱۰۹)

لہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ کی انگوٹھی پر یہ فقرہ کھدا ہوا تھا یعنی کفیٰ المرء بالموت واعظا (آدمی کے لیے موت کافی واعظ ہے) میں نے اسی فقرہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ۱۲

پر ایسا گزرا ہے کہ اسی خلافت کی گدی پر بیٹھنے والوں کے پہلوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان پچھلوں میں غیر معمولی انقلابی رنگ کیسے پیدا ہو گیا تھا، مقتفی کا حال تو آپ پڑھ ہی چکے مقتفی کے بعد اسی کا بیٹا یوسف مستنجد باللہ کے نام سے تخت خلافت پر امام غزالی کی وفات کے ٹھیک پچاس سال بعد متمکن ہوا، سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ

" مستنجد عدل اور نرم مزاجی کی خصوصیتوں سے موصوف تھا، سارے عراق سے ناجائز محصولوں کو اس نے اٹھا دیا تھا۔"

مگر باوجود اس نرم مزاجی کے سیوطی کا بیان ہے

" شر پسند مفسد عناصر کے قلع قمع میں مستنجد بہت سخت تھا۔"

علاوہ مذہبی علوم کے لکھا ہے کہ

" علم ہیئت سے خاص دلچسپی رکھتا تھا اور اس فن کے متعلقہ آلات، اسطرلاب وغیرہ کے بنانے میں بڑا ماہر تھا۔" (شذور ص ۲۱۹ ج ۴)

ابن اثیر کا فیصلہ تو اسی مستنجد کے متعلق یہ ہے کہ

کان احسن الخلفاء سیرۃ مع الرعیہ (ص ۱۳۵ ج ۱۱) — عباسی خلفاء میں رعیت کے ساتھ بہترین سلوک کرنے میں مستنجد بہت اچھا خلیفہ تھا۔

مستنجد کے بعد اس کا بیٹا حسن المستضئ باللہ کے نام سے سریر آرائے خلافت ہوا اس سے بڑھ کر المستضئ کے متعلق شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ابن جوزی جیسے بگڑے دل آدمی جو دوسروں پر جرح و تنقید کرنے میں تاریخی شہرت کے مالک ہیں، بخاری تک کے رواۃ پر نکتہ چینی سے ابن جوزی نہیں چوکتے مستضئ کو انہوں نے خود دیکھا تھا اور بہت قریب سے دیکھا تھا ان کی مجلس وعظ میں اکثر شریک بھی ہوتا تھا بہر حال مستظم میں اپنی چشم دید گواہی ابن جوزی ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

اظہر من العدل والکرم مالم نرہ فی اعمارنا (ص ۲۵۰ ج ۴) — عدل و کرم کا اظہار المستضئ نے جس پیمانے پر کیا ہم لوگوں نے ساری زندگی میں اس کی نظیر نہیں دیکھی۔

ابن اثیر نے بھی لکھا ہے :۔

" مستکفی کے عہد میں عام خلق اللہ کی زندگی بڑے امن و راحت میں گزری لوگوں نے
اس جیسا حکمراں نہیں دیکھا بڑا حلیم اور بردبار آدمی تھا۔"

آخر میں مشہور عربی فقرہ

فعاش حمیداً ومات سعیداً رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ص۱۷۳ ج-۱۱)	پس بڑی ہر دلعزیزی کے ساتھ اس نے زندگی بھی گزاری اور وفات بھی اس کی سعادت کے حالات کے ساتھ ہوئی۔

ایک عربی شعر بھی ابن اثیر نے مستکفی کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے درج کیا ہے۔

کان ایامہ من حسن سیرتہ　　　مواسم الحج والاعیاد والجمع

یعنی اپنی سیرۃ و کردار سے مستکفی نے ایک ایسا حال پیدا کر دیا تھا کہ اس کی حکومت کا زمانہ گویا حج اور عید اور جمعہ کے دن تھے یعنی ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات کی کیفیت تھی)

حالانکہ یہی بغداد تھا، ذرا غزالی سے پہلے بلکہ خود ان کے حالات کتابوں میں پڑھیئے عیاروں اور طراروں، لصوص یعنی چوروں بٹ ماروں کے دھاوے صبح و شام ہوتے رہتے تھے۔ دینی اور آئینی زندگی سے گریز کا رجحان روز بروز عباسی خلفاء میں بڑھتا چلا جا رہا تھا یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا جیسا کہ میں نے لکھا بھی ہے۔ اور لوگوں کو معلوم بھی ہے کہ ممالک عباسیہ کے مختلف جہات و اقطار میں ملوک و سلاطین زور آور بننے میں خلفاء کی ان ہی کمزوریوں نے مدد بہم پہنچائی۔ لیکن اچانک غزالی کے بعد ذمہ داریوں کا یہ احساس ان ہی خلفاء میں کیسے بیدار ہو گیا۔ اور امن و امان کا جو قصہ بغداد کی سرزمین کے لیے افسانہ بن چکا تھا۔ اسی بغداد کو عید کے ان دنوں اور شب برات کی ان راتوں میں سانس لینے کا موقع جو ملا تو لوگوں نے اس انقلاب کے سبب کو کیوں تلاش نہ کیا ؟

سچی بات تو یہ ہے کہ یہی ملوک و سلاطین جن کو عباسی خلفاء کی کمزوریوں نے زور حاصل کرنے کا موقع عطا کیا تھا خود ان کی حالت بھی غزالی کے بعد اور غزالی سے پہلے اتنی مختلف ہو گئی ہے کہ اس اختلاف کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

میرا یہ مطلب ہے کہ دولت و ثروت کے جو لازمی نتائج ہیں ان میں تو خیر ہر زمانہ کے امراء کسی نہ کسی حیثیت سے مبتلا ہی نظر آتے ہیں۔ ہارون الرشید ہی کے زمانہ میں عباسی دربار کے امراء تکلف کے

اس مقام تک چڑھ کر پہنچ چکے تھے جس کا اندازہ آپ کو ایک عباسی امیر کے اس قصہ سے ہوسکتا ہے جس کا نام ابراہیم تھا اور ابن شکلہ کے نام سے مشہور تھا۔ دمشق کی گورنری زمانہ تک اسی سے متعلق تھی۔ ہارون الرشید ایک دفعہ اس کا مہمان ہوا۔ اصل دسترخوان سے پہلے بطور نقلہ کے کچھ چیزیں ہارون کے سامنے بڑھائی گئیں جن میں ایک پیالہ تھا۔ کہا گیا کہ قرش[1] نامی مچھلی خاص طور پر پکائی گئی ہے۔ ہارون نے دیکھا کہ پیالے میں بہت ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں۔ ابراہیم سے پوچھا کہ تمہارے باورچی نے اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیوں بنائے ہیں۔ ابراہیم نے جواب میں عرض کیا کہ مچھلی کے گوشت کے یہ ٹکڑے نہیں ہیں بلکہ صرف اس کی زبان ہے۔ ہارون کو سن کر تعجب ہوا اور بولا کہ کتنی مچھلیوں کی یہ زبانیں ہوں گی سو سے کیا کم ہوں گی۔ ابراہیم کا داروغہ مطبخ مراقب نامی بھی سامنے کھڑا تھا اس نے کہا کہ جی نہیں سو سے بھی زیادہ مچھلیوں کی زبانیں نکالی گئی ہیں۔ داروغہ سے ہارون نے پوچھا کہ ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ ان مچھلیوں کی قیمت کیا تھی جن کی زبانوں سے پیالہ تیار ہوا ہے، بولا کہ "ہزار[2] درم" سنا آپ نے بطور نقلہ اور نمک چشی کے جو کھانا پیش ہوا تھا اس کے ایک پیالہ کی قیمت ایک ہزار درم تھی، خود سوچئے تو اصل دسترخوان جب بچھا ہوگا اور جو کھانے اس پر چنے جاتے ہوں گے ان کی قیمت کیا ہوتی

---

[1] شیخ محی الدین ابن عربی رح نے فتوحات مکیہ میں لکھا ہے کہ قرش ایک بحری جانور ہے میں نے اس کو خود دیکھا ہے اس کا بدن باہم ایک دوسرے کے ساتھ بہت زیادہ گتھا ہوا تھا۔ ان ہی کا بیان ہے کہ اہل مکہ نے اپنی اجتماعی زندگی کی جو تنظیم کی تھی اس لیے اس کا نام قرش تھا یعنی سمٹ کر ایک نقطہ پر جمع ہو گئے تھے۔ (فتوحات ج ۳ صفحہ ۱۰۶)

[2] مشہور محدث ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اس قصے کو نقل کیا ہے دیکھو ج ۲ صفحہ ۲۷۹ لیکن اس وقت تک ہارون جیسے خلفاء عباسی خلافت کی گدی پر بیٹھ رہے تھے اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک ہزار درہم کو سن کر ہارون کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ پہلے تو اس نے ابراہیم کو مجبور کیا کہ ایک ہزار اشرفیاں غرباء میں تقسیم کرے تاکہ اس کا کفارہ ادا ہو پھر اس پیالے کو جس میں مچھلی کی زبانیں تھیں اور جس کی قیمت (۲۷۰) اشرفیاں تھیں۔ ہارون نے حکم دیا کہ راستہ میں جو پہلا فقیر ملے اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ یہی کیا گیا۔ ابراہیم نے فقیر سے دو سو دینار دے کر اس جام کو پھر خرید لیا۔ ۱۲

ہو گی۔ اور جب ہارونی عہد میں امراء و ملوک اسراف و تبذیر میں یہاں تک پہنچ چکے تھے تو ہارون کے بعد جو کچھ ہوا اس پر حیرت نہ ہونی چاہیئے، آپ مجھ ہی سے مسلمان امراء کی چونچلوں کی مختصر داستان کچھ دیر پہلے سن چکے ہیں، ایک ایک محبوبہ کو خوش کرنے کے لیے مسلمان امیر مشک کے ڈھیر پر کیوڑے اور گلاب کے عرق کو انڈیل کر مصنوعی کیچڑ پیدا کرتا تھا اور اس سلسلہ میں اسلامی ملوک امراء نے جو نزیادتیاں کی ہیں یقیناً موجودہ نسلوں کے لیے سرمایہ ندامت و شرمندگی بنی ہوئی ہیں میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ کیا حال تھا غزالی سے کچھ ہی دن پہلے اسی صدی میں جس میں امام حجۃ الاسلام کی ولادت ہوئی مشہور دیلمی بادشاہ عضد الدولہ کے محل کے متعلق المقدسی نے یہ لکھ کر کہ

طفت فی ھذہ الدار کلھا سفلھا وعلوھا (ص۴۵۱ احسن التقاسیم)

میں اس محل میں خوب گھوما ہوں اس کے بالائی اور نیچے کی منزلوں سب ہی کو دیکھا ہے۔

پھر جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا اس کی تفصیل پورے ایک صفحہ میں کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ :-

"اس محل میں عضد الدولہ نے تین سو ساٹھ قصور یا کوٹھیاں تعمیر کی تھیں سال کا ایک ایک دن ہر قصر میں گزارتا تھا۔ حال یہ تھا کہ بالائی منزلوں میں ایک نہر چھ میل سے کاٹ کر لائی گئی تھی اور اس کے نیچے جو مکانات بنے ہوئے تھے خس پوش تھے، ادھر سے پانی مسلسل ان خس پوش مکانوں کی چھپروں پر بارش کی شکل میں برستا رہتا تھا اسی لیے ہمیشہ یہ حصے مکانوں کے تر رہتے اور یہی پانی بالائی منزلوں کے مختلف اردگرد بہتا بھی رہتا تھا۔ اس نہر کے سوا ایک دوسری نہر بھی اسی محل میں ایک میل کے فاصلہ کو قطع کر کے آئی تھی اور ان باغوں، خیابانوں، چمنستانوں کو سیراب کرتی تھی جن کا سلسلہ چاروں طرف اس محل میں پھیلا ہوا تھا اور جس سے یہ سارا علاقہ ڈھکا ہوا تھا دنیا جہان کے پھل اور پھول کے پودے اس میں لگائے گئے تھے یہ تین سو ساٹھ قصور جو بنے ہوئے تھے ان میں ہر ایک کا رنگ بھی مختلف تھا کسی پر چینی کے برتن جیسا رنگ تھا کسی پر سنگی رنگ کی قلعی چڑھی ہوئی تھی، کسی کا

رنگ بالکل سنہرا تھا۔ ان میں طرح طرح کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ سارے محلات
پر بڑے بڑے قبے بنے ہوئے تھے۔

اور میں کہاں تک تفصیل کروں المقدسی کے تاثرات کا اندازہ اسی سے کیجیے جس کا اظہار اس نے
ان الفاظ میں کیا ہے :۔

"اس محل میں عامی آدمی اگر پہنچتا ہے تو بڑی سخت ایمانی آزمائش میں مبتلا
ہوجاتا ہے اور عارف اس کو دیکھ کر ان نعمتوں کو یاد کرتا ہے جن کا وعدہ جنت
میں نیک لوگوں کے لیے کیا گیا ہے۔"

آخر میں تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ :۔

اظنہ بناھا علی ما سمع من اخبار الجنۃ۔ (ص۴۵۱ مقدسی)	میں خیال کرتا ہوں کہ جنت کی خبروں کو سن کر عضدالدولہ نے یہ محل تیار کیا ہے۔

ابن جوزی نے لکھا ہے کہ عضدالدولہ آخر وقت تک اپنی آمدنی کی توفیر میں مشغول رہتا تھا۔ اس نے
اعلان کر رکھا تھا کہ :۔

"اس وقت تک میری تشفی نہ ہوگی جب تک روزانہ میرے خزانہ کی آمدنی
ایک ملین (دس لاکھ درہم) تک نہ پہنچ جائے۔" [۱]

لیکن یہی بغداد کی خلافت سے اور اس خلافت سے بظاہر اپنے آپ کو وابستہ بنانے والے سلاطین و

---

[۱] تقریباً اس عزم میں بھی وہ کامیاب ہوا۔ اس نے اپنے عزم کا نام ہی "عزم عضدیہ" رکھ چھوڑا تھا اس کا مشہور عربی شعر ہے۔ لاکبن عزیمہ عضدیہ تدع الانوف من الزمان رواغما۔ (یعنی میں عضدی عزم کی پشت پر سوار ہو جاؤں گا اور اونچی اونچی ناکوں کو ہمیشہ کے لیے گرد آلود بنا کر چھوڑ دونگا) تاہم (۴۷) سال کی عمر میں مرگی کے مسلسل حملوں سے آغوش مرگ میں جا سویا لکھا ہے کہ جب زندگی سے مایوس ہو گیا تو قاسم بن عبیداللہ کا قصیدہ اس کی زبان پر جاری ہوا جس کا حاصل یہ تھا کہ میں نے اپنے وقت کے بادشاہوں کو پچھاڑ پچھاڑ کر گرایا۔ ان کو پورب پچھم جدھر بھی وہ بھاگ سکے بھگا کر بکھیر دیا لیکن میرے اقبال کا ستارہ عروج کے آخری نقطہ تک جب پہنچ گیا تو اچانک زمانہ کے تیر سے میں گھائل ہو کر گر پڑا۔ اب میں ہوں اور قبر کا گڑھا میرے سامنے ہے آج مجھ سے زیادہ بدبخت
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ملوک میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک بادشاہ کے شحؔ[1] نفس کا یہ حال ہے۔ زندگی کے کسی شعبہ میں کسی حد پر ٹھہرنا نہیں چاہتا، صرف مکان کے مسئلہ میں گرما و سرما کی موسمی مکانوں کے حدود سے بڑھ کر سال کے ہر دن کے لیے مستقل بنگلے اور کوٹھی کی ضرورت کے اسی "شح" نے اس کے لیے پیدا کی تھی۔ ایک ایک دن میں لاکھ دو لاکھ کی آمدنی بھی اس کے لیے کافی نہیں تھی۔ چاہتا تھا کہ روزانہ کم از کم دس لاکھ درم تو اس کی جیب تک پہنچ جائیں۔

نورالدین زنگی پر ان تعلیمات کا اثر

مگر غزالی الامام کی وفات پر ابھی پورے چالیس سال بھی نہیں گزرے ہیں یعنی کل ۳۶ سال اسی بغدادی خلافت کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور کون ہوگا جس کی دنیا بھی برباد ہوئی اور اپنی حماقت سے اپنے دین کو بھی کھو بیٹھا، کہتے ہیں کہ سکرات میں جب مبتلا ہوا تو قرآنی آیت ما اغنی عنی مالیہ ھلک عنی سلطانیہ (میرا مال مجھے کام نہ آیا میری حکومت اور میرا غلبہ ختم ہوگیا) وہ بہت بڑا سیاس تھا۔ تمام سیاسی و جنگی تدبیروں کے سوا بعض چالیں جو اس کی طرف منسوب ہیں وہ عجیب ہیں۔ روضۃ الصفا میں آل بویہ کی تاریخ سے بعض چیزیں نقل بھی کی ہیں۔ تفصیل تو روضہ میں دیکھیے مثلاً قسطنطنیہ کے رومی بادشاہ جو عیسائی تھا اس بےچارہ پر عضدالدولہ نے لکھا ہے کہ اس تدبیر سے اثر قائم کیا یعنی کسی طریقہ سے قسطنطنیہ کے قریب کسی کھنڈر میں لوہے کا ایک صندوق عضدالدولہ نے گڑوا دیا جس میں قدیم یونانی حروف میں کچھ پیشین گوئیاں لکھوا کر رکھ دی گئی تھیں۔ یہی صندوق شاہ قسطنطنیہ تک پہنچا، کاغذات پڑھوائے گئے تو اس میں یہ لکھا ہوا بھی ملا کہ "فلاں زمانے میں عضدالدولہ نامی بادشاہ دیلم سے سر نکالے گا۔ دنیا کے سلاطین اس کے سامنے جھک جائیں گے اور اطاعت سے جو انکار کرے گا تباہ ہو جائے گا۔" شاہ قسطنطنیہ اس مغالطہ کا شکار ہوگیا، عضدالدولہ کے پاس سفارت بھیجنے کی تیاری کی۔ سفرا روم سے جب آئے تو ایک تالاب کے کنارے خیمہ میں عضدالدولہ رات کو ان سے ملا، مینڈک شور کر رہے تھے عضدالدولہ نے اپنے آدمی سے کہا کہ مینڈکوں سے جاکر کہہ دو کہ آج بادشاہ سلامت آئے ہوئے ہیں شور نہ کریں، مینڈک واقعی اس پیام کو سن کر چپ ہو گئے۔ لکھا ہے کہ مینڈکوں کو چپ کرنے کے لیے پانی میں ایک خاص قسم کی چیز ڈال دی تھی لیکن رومی سفیروں نے خیال کیا کہ یہ تو سلیمان وقت ہے۔ ۱۲

[1] المفلحون یعنی بامراد بننے کے لیے قرآن نے وصیت کی ہے کہ نفس کے شح یعنی لالچ سے بچایا جائے۔ ۱۲۔

ایک متوسل سلطان کو ہم "نورالدین زنگی" رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے پاتے ہیں۔ عضدالدولہ سے بھی زیادہ طویل و عریض زرخیز و زرریز علاقوں پر قابض ہے یعنی شام الجزیرہ مصر اس کے ممالک محروسہ کے اجزا تھے حرمین اور یمن تک میں اس کا نام خلیفہ بغداد کے نام کے ساتھ خطبوں میں پڑھا جاتا تھا۔ مگر جانتے ہو اور تو اور اپنی ملکہ تک کے مصارف کے لیے اس نے جو نظم کیا تھا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ :۔

" شام کے شہر حمص میں تین دوکانیں تھیں (جنہیں نورالدین زنگی نے مال غنیمت کے حصّہ سے خریدا تھا) ان ہی تین دوکانوں کے کرایہ کی آمدنی ملکہ کے لیے نورالدین نے مختص کردی تھی سالانہ کل بیس دینار اس ذریعہ سے ملکہ کو ملتے تھے "

سال کے بارہ مہینے کے خرچ کے لیے کل بیس اشرفیاں ؟ ایک معمولی غریب آدمی کے لیے بھی اس کا سوچنا دشوار ہے۔ ابن اثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملکہ نے نورالدین سے تنگی اور ضیق معیشت کی شکایت کرتے ہوئے چاہا کہ اس کی تنخواہ میں کچھ اضافہ منظور کیا جائے۔ جواب میں نورالدین نے کہا کہ :۔

ليس لى الاهذا وجميع ما فى يدى انا فيه خازن للمسلمين لا اخونهم فيه ولا اخوض نار جهنم لاجلك (ص۱۵۱ ج ۱۱ ۵ کامل)	میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ باقی میرے قبضہ میں (حکومت کی جو آمدنی ہے) سو اس میں مسلمانوں کا میں صرف خزانچی ہوں میں اس مال میں خیانت کرکے جہنم کی آگ میں تمہارے لیے گھس نہیں سکتا۔

اور جب اسی سلطان نورالدین انار اللہ برہانہ کی وفات ہوئی تو ابن اثیر سے خود اس طبیب نے بیان کیا تھا جو بادشاہ کا معالج تھا کہ خناق کے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد دوسرے اطباء کے ساتھ قلعہ دمشق میں مجھے بھی طلب کیا گیا جب میں پہنچا تو میں نے اس بادشاہ کو دیکھا کہ :۔

هو فى بيت صغير	ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں پڑا ہوا ہے۔

طبیب کا بیان ہے کہ :۔

كان يخلو فيه للتعبد	اسی کوٹھڑی میں سب سے الگ ہو کر تنہائی میں بادشاہ عبادت کیا کرتے تھے۔

اسی میں بیمار ہوئے اور مرض بڑھتا گیا لیکن اس کوٹھڑی سے وہ منتقل نہ ہوئے اطباء نے بالاتفاق

فیصلہ کیا کہ:۔

"سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ اس تنگ و تاریک حجرے سے آپ منتقل ہو کر کسی ہوادار روشن مکان میں قیام اختیار کیجیے کیوں کہ اس مرض میں خصوصیت کے ساتھ مکان کی تنگی اور تاریکی کو بہت دخل ہوتا ہے۔"

اس وقت مرض کی شدت اس نوبت کو پہنچ چکی تھی کہ بادشاہ اپنی آواز دوسروں تک نہیں پہنچا سکتا تھا، آخر اسی مرض میں وفات ہوئی [1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ

شاہزادہ اسماعیل پر اثر

اور ایک نورالدین ہی کیا اسی کا شاہزادہ اسماعیل جو باپ کے بعد حلب کا حکمران تھا کل (۱۹) سال کی عمر میں اس بےچارہ کی قولنج کے مرض سے وفات ہوئی میں تو دنگ ہو کر رہ گیا جب مورخین کی کتابوں میں یہ واقعہ پڑھا کہ عین ریعان شباب میں حکومت کی باگ حالانکہ اس کے ہاتھ میں آئی تھی لیکن وہی شراب جس کے ملوک و سلاطین امراء و اعیان تو خیر سچی بات تو یہ ہے کہ متوکل جیسے متعصب دیندار بادشاہ تک کی مجلس نشاط جس کے دور سے خالی نہ ہوتی تھی لیکن شاہزادہ اسماعیل جب قولنج میں مبتلا ہوا تو اطباء نے یہ طبی تجویز پیش کی کہ تھوڑی سی شراب استعمال کیجیے مرض کا ازالہ ہو جائے گا، اطباء اصرار کر رہے تھے مگر نوجوان شاہ زادے نے کہا۔

---

[1] سلطان نورالدین جن کا نام محمود تھا ان اسلامی سلاطین میں ہیں جن سے بہ نسبت مشرق کے مغرب زیادہ واقف ہے ان کی عمر کا بیشتر حصہ یورپ کے عیسائیوں کی صلیبی لڑائیوں میں بسر ہوا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے قلعے عیسائیوں سے چھین کر مسلمانوں کے سپرد کیے۔ میدان جنگ میں سپاہیوں کے ساتھ بھی شریک ہوتے تھے۔ دو دو کمانیں اور دو دو ترکش اپنے ساتھ رکھتے تھے ایک عالم قطب المنادی نے ایک دفعہ نورالدین سے کہا کہ خدا کے لیے مسلمانوں پر آپ رحم کیجیے خود میدانِ جنگ میں جایا کیجیے خدانخواستہ آپ کام آگئے تو مسلمانوں کا کیا انجام ہوگا۔ نورالدین نے قطب المنادی کے یہ الفاظ سن کر کہا کہ لاحول و لا قوۃ محمود کون ہے جس کے متعلق آپ یہ فرماتے ہیں، اسلامی بلاد اور مسلمانوں کی حفاظت محمود سے پہلے جو کرتا چلا آیا ہے۔ وہی قادر مقتدر اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ نورالدین علم و عمل میں اپنے زمانہ میں اپنی آپ نظیر تھا۔ مورخین اسلام بالاتفاق اس کی سوانح عمری میں اس شعر کو ضرور نقل کرتے ہیں۔

جمع الشجاعۃ والخشوع لربہ   ما احسن المحراب فی المحراب

یعنی راتیں شب بیداری اور مالک سے مناجات میں ان کی گزرتی تھیں اور دن میدان جہاد میں، محراب (میدان جنگ)

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لا افعل حتیٰ اسأل الفقہاء   میں فقہاء سے جب تک نہ پوچھ لوں گا یہ نہ کروں گا۔

آخر فقہاء بلائے گئے۔ شافعی مذہب کے علماء نے بالاتفاق جواز کا فتویٰ دیا۔ اس نے حنفی فقہاء کو خطاب کیا آپ لوگ کیا فرماتے ہیں۔ لکھا ہے کہ صاحب بدائع علامہ ابوبکر کاسانی مشہور حنفی امام نے بھی کہا کہ جس حال میں آپ ہیں شرعاً

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کو محراب (عبادت کی کمان) کے ساتھ یوں اس شخص نے جمع کیا تھا۔ فقہ خصوصاً حنفی فقہ کے مستند عالم تھے لیکن بے تعصبی کا یہ عالم تھا کہ علاوہ حنفی فقہ کے مدارس کے بیسیوں مدارس شافعی علماء کے لیے جاری کیے۔ موصل کی جامع مسجد تعمیر کرائی۔ ایک بزرگ الملا نامی کے سپرد تعمیر کا کام تھا، ملا جب حساب کا دفتر لے کر بادشاہ کے سامنے آئے تو کہا کہ اس دفتر کو دجلہ کے حوالے کیجیے حساب تو یوم الحساب کے دن پیش ہوگا۔ کتابوں میں جو یہ واقعہ ان کے متعلق نقل کیا جاتا ہے یعنی یورپ کے کسی بادشاہ نے دو عیسائیوں کو مدینہ اس لیے بھیجا تھا کہ کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد انور تک رسائی حاصل کر کے حضور کے جسد مبارک کو نکال لائیں ان عیسائیوں نے مسلمانوں کا بھیس بدل کر مدینہ میں قیام کیا اور ایک کمرہ سے جس میں رہتے تھے سرنگ لگانی شروع کی۔ نورالدین اس زمانہ میں دمشق میں تھے خواب میں سرور کائنات صلعم کی زیارت کی دیکھا کہ ان ہی دونوں کو پکڑے ہوئے آپ فرما رہے ہیں کہ ان دونوں سے مجھے بچاؤ نورالدین بیدار ہو کر مدینہ منورہ پہنچا تحقیقات کے بعد ان عیسائیوں کو پکڑ لیا۔ جرم کا دونوں نے اقرار کیا۔ صلا ۲۳ شذور۔ بعض کتابوں میں ہے کہ واقعہ کی تحقیق کے بعد نورالدین پر رقت طاری ہوئی۔ مدینہ منورہ کی گلیوں میں روتے ہوئے گھومتا تھا اور کہتا تھا غلام کا انتخاب سرکار نے فرمایا اللھم صل علیہ وسلم نورالدین نے پھر سیسے کی دیوار زیر زمین چاروں طرف سے قائم کردی۔ بہر حال اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو ان کی ولایت میں کیا شبہ ہے۔ ۱۲۔

لہ اصل یہ ہے کہ جیت تک بدل مل سکتا ہے امام ابوحنیفہ شرعی محرمات کا دواءً استعمال بھی جائز نہیں سمجھتے مگر ان کے سوا عام ائمہ فقہا حتیٰ کہ خود امام صاحب کے تلامذہ بھی دواءً استعمال کی اجازت دیتے ہیں خواہ بدل سے علاج ممکن ہو یا نہ ہو۔ اسی لیے شاہزادے نے امام ابوحنیفہ کی فقہ کے عالم ابوبکر کاسانی سے فتویٰ طلب کیا۔ غالباً علاج کی آخری شکل اطباء نے یہی قرار دی ہوگی یا کاسانی نے امام کے تلامذہ کے مسلک کے مطابق فتویٰ دیا ہو۔ ابوبکر کاسانی ان ائمہ میں سے ہیں جن کی بیوی بھی بہت بڑی عالمہ تھیں۔ لکھا ہے کہ ہر فتوے پر علامہ کی دستخط کے ساتھ ان کی بیوی بھی دستخط ثبت کرتی تھیں۔ خود بہت بڑے عالم کی صاحبزادی تھیں۔ تفصیلات دوسری کتابوں میں پڑھیے۔ ۱۲۔

شراب کا استعمال آپ کے لیے جائز ہے۔ مگر پوچھ گچھ کے بعد جو بجائے خود اس عہد کے ایک شہزادے اور وہ بھی نوجوان شہزادے سے کچھ کم اعجوبہ خیز نہیں ہے سننے کی بات یہ ہے کہ شافعی و حنفی علماء کے ان فتووں کے باوجود شاہزادے نے پوچھا کہ "میری موت کی مقررہ مدت اگر آچکی ہے تو شراب پینے سے کیا وہ ٹل جائے گی؟" اس کا جواب جو ہو سکتا ہے وہی دیا گیا یعنی قرآن جس چیز کو مؤجل قرار دے چکا ہے جس میں گھڑی بھر کے لیے بھی تقدیم و تاخیر کا کسی کو اختیار نہیں دیا گیا ہے بھلا دوا اور علاج سے کون اس کو ٹال سکتا ہے۔

شاہزادے نے اس جواب کو سن کر جو کہا حوصلہ کی بلندی ایمانی بردوسکینت کی یہ کتنی اثر انگیز و عجیب و غریب مثال ہے۔ اس نے علماء کو خطاب کرتے ہوئے اپنے دل کی بات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:۔

"ایسی چیز جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے استعمال کر کے خدا کی قسم میں اللہ سے ملاقات نہیں کرونگا"۔ (شذرات ج ۴ صفحہ ۲۵۸)

مورخین نے لکھا ہے

ومات ولم یشربہ رحمہ اللہ تعالٰی۔	شاہ زادہ اسمٰعیل مرگیا اور شراب نہیں استعمال کی، خدا کی رحمت ان پر نازل ہو۔

آپ ہی بتائیے کہ آخر مسلسل پیش آنے والے ان واقعات کی جو غزالی کے بعد اسلامی تاریخ میں ملتے ہیں میں کیا توجیہہ کروں؟

سلطان صلاح الدین ایوبی پر اثر نور الدین زنگی کے بعد صلیبی حروب کی قیادت جس عالمگیر شہرت رکھنے والے بادشاہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھ آئی خود اسی کے حالات کیا کچھ حیرت انگیز نہیں؟

امام غزالی کی وفات کے ستائیس سال بعد امام صلاح الدین کی ولادت ہوئی ان کی مجاہدانہ زندگی سے تو خیر دنیا واقف ہے میں اس وقت یہ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی عظیم سلطنت کے تاجدار ہونے کے باوجود ذاتی حال اس سلطان کا یہ تھا جیسا کہ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ وفات کے بعد ان کے ذاتی خزانہ کا جب جائزہ لیا گیا تو:۔

ماخرج غیر دینار واحد صوری واربعین درھما ناصریۃ۔	ایک صوری اشرفی اور چالیس ناصریہ درم کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔

ج ۱۲ صفحہ ۲۵

حالانکہ اسی سلطان کے بھائی قرات گیں جو یمن کا حکمراں تھا اسی کے متعلق لکھا ہے کہ سونے

کو چکیوں کے پاٹ کی شکل میں ڈھلوا کر اس نے رکھ چھوڑا تھا[1]۔ ایک طرف عضد الدولہ چاہتا تھا کہ روزانہ اس کے خزانہ میں دس لاکھ درہم جب تک داخل نہ ہونے لگیں گے دم نہ لوں گا۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ باوجود اتنی کثیر دولت و ثروت کے عضد الدولہ ایک ایک پیسہ پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ دوسری طرف صلاح الدین کا یہ حال ہے کہ اپنے خزانہ میں کچھ نہ چھوڑوں گا حالانکہ بقول ابن اثیر فاطمیوں کے مصری خزانہ کا صلاح الدین تنہا وارث ہوا تھا مگر ان ہی کی شہادت ہے اور ان سے بڑھ کر اس خاندان کے متعلق اور کس کی شہادت قابل قبول ہو سکتی ہے۔ کامل میں مصری خزائن کا ذکر کر کے وہی لکھتے ہیں۔

نفرقه جمیعه (ص ۳۹ ج ۱۲) سلطان نے سارے خزانہ کو تقسیم کر دیا۔

یا ایک کیفیت وہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ممبر پر چڑھنے والے خطباء اور علماء تک بھی غیر شرعی لباس سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔ علماء دین کے خچروں تک کے گلے میں طلائی طوق پڑے رہتے تھے۔ اور ایک حال صلاح الدین کا یہ ہے کہ

لم یلبس شیئًا مما ینکرہ الشرع — خود ایسی کوئی چیز استعمال نہ کی نہ پہنی جسے شریعت نے ناجائز ٹھیرایا ہو۔

یوسف بن عبدالمومن کا حال

آخر آپ ہی بتائیے کہ اتفاق و بخت کے نیچے آدمی کہاں تک پناہ ڈھونڈھے۔ لوگوں کو کیا کہئے امام غزالی کے بعد اسلام کے مغربی علاقے (مغرب اقصیٰ وغیرہ) میں موحدین کی جو حکومت دینی جاہ و جلال کے ساتھ قائم ہوئی اور کیا جاہ و جلال ؟ کہ موحدین کا دوسرا بادشاہ یوسف بن عبدالمومن کے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ "صحیح بخاری" اس کو زبانی یاد تھی۔ جہاد کی حدیثیں خود املا کراتا تھا۔ ساری زندگی یورپ کے عیسائی سلاطین سے اسلامی علاقوں کے واپس لینے میں اس کی گزری۔ یوسف کے بعد اس کا بیٹا یعقوب جانشین ہوا۔ الیافعی کے الفاظ یعقوب کے متعلق یہ ہیں جن کا ترجمہ ہے۔

" لوگوں کو اس نے شریعت کے قانون کی طرف واپس کیا، حدود قائم کیے،

---

[1] شذور ۵ : "سبله وجعله مثل الطواحین"

سلطان صلاح الدین اپنی مستقل سوانح عمری رکھتے ہیں، اردو زبان میں بھی غالباً چند کتابیں ترجمہ و تالیف

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس باب میں اس نے اپنے قبیلہ اور اپنے خانوادے کے افراد کو عام لوگوں کے برابر کر دیا۔"

آگے لکھا ہے

"شریعت کو پوری طاقت سے اس نے پکڑا تھا معروف کا حکم دیتا تھا منکرات کو اس نے روک دیا۔ اس معاملے میں بڑا دلیر تھا کسی جھجک کے بغیر وہ ان امور کو انجام دیتا تھا۔"

حالانکہ مغربی افریقہ کے سوا اس نے اندلس پر بھی دوبارہ اسلامی اقتدار قائم کر دیا تھا، یورپ کے سلاطین سے بڑی بڑی جہادی مہمیں اسے لڑنی پڑیں۔ بے تھاہ دولت کا مالک تھا مگر بایں ہمہ بالاتفاق

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی شکل میں ان کے متعلق پائی جاتی ہیں اس موقع کی مناسبت سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ابن اثیر نے تو صرف درم و دینار کے متعلق لکھا ہے! ابوالفداء جو اسی خاندان سے نسبی تعلق رکھتے ہیں ان کا بیان ہے کہ نہ مخلف عقار او لا دا ما ولا ملکا (سلطان نے کوئی غیر منقولہ جائداد زمین وغیرہ کی شکل میں چھوڑی نہ کوئی ذاتی مکان چھوڑا) صفحہ ۸۶ ج ۳ - وفات کا حال بھی ابوالفداء نے تفصیل کیسا تھ لکھا ہے جس کا یہ جز کتنا دردانگیز ہے۔ لکھا ہے کہ آخری دفعہ سلطان شہر سے اس قافلہ کے استقبال کے لیئے نکلے جو حج کر کے واپس آرہا تھا، جب حجاج سے ملاقات ہوئی تو دیکھا گیا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، حج کی سعادت سے محرومی کے احساس نے اس کیفیت کو پیدا کیا تھا۔ واپسی پر بیمار ہوئے اور چند دن بعد وفات ہو گئی۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ صلاح الدین کی وفات پر گریہ و بکا کا جو ہنگامہ برپا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا دمشق ایک شخص بن کر رو رہا ہے۔ سلطان خود عالم تھے حدیثوں کے سننے کا خاص شوق تھا، ابوالفداء کا بیان ہے کہ کل (۵۷) سال کی عمر ہوئی لیکن نماز ہمیشہ وقت پر جماعت ہی کے ساتھ ادا کرتے رہے۔ بندگی اور تواضع کا یہ حال تھا کہ دستخط کے لیئے غلام نے کاغذات پیش کیے۔ سلطان فرش پر بیٹھے ہوئے تھے ہاتھ ان کا پھیلا ہوا تھا ان کے ہاتھ پر غلام کا پاؤں پڑ گیا اور انہیں خبر نہ ہوئی۔ وہ دستخط پر اصرار کر رہا تھا تب سلطان نے کہا کہ پہلے میرے ہاتھ کو تو آزادی عطا کرو۔ بے چارہ شرم سے عرق عرق ہو گیا۔ اس قسم کے بیسیوں قصے کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں۔ حلقہ حدیث کے ساتھ سلطان حلقہ سماع میں بھی کبھی کبھی ارباب تصوف کے ساتھ شریک ہوتے اور کسی صوفی پر جب حال آتا تو لوگ جیسا کہ رسم سے کھڑے ہو جاتے تو سلطان بھی اس کے ساتھ اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک صاحب حال کا ازالہ نہ ہوتا۔ ۱۲

مورخین کا بیان ہے کہ :-

کان یلبس الصوف ویقف للمرأة والضعیف فیاخذ لهم حقهم من کل ظالم عنیف (ص۴۸۲ ج ۳ الیافعی)	بال کے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتا (یعنی کمبل پوش تھا) معمولی عورت اور کسی کمزور غریب کے لیے بھی کھڑا ہو جاتا اور بڑے سے بڑی ہیکڑی دکھانے والے ظالموں سے حق دلا کر رہتا۔

اور سب سے عجیب و غریب بات جو اس کے متعلق لوگ روایت کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ زندگی کے آخری دنوں میں کہتے ہیں کہ حکومت سے دست بردار ہو کر فقیری اختیار کر لی تھی مغرب سے مشرق چلا آیا اور مشرق میں بحالت گمنامی وفات ہوئی۔[1]

محمد بن تومرت کا تاثر بہر حال موحدین کی حکومت کے ان حکمرانوں کے متعلق تو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ محمد بن تومرت جو اس حکومت کا حقیقی بانی تھا امام غزالی سے براہ راست متاثر ہو کر اس قسم کی دینی حکومت کے قائم کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ محمد ابن تومرت[2] نے امام غزالی سے کہتے ہیں کہ ملاقات کی اور

فاوضه بذات صدره بذلك فاراده علیه لما کان فیه الاسلام	دونوں میں تبادلہ آراء ہوا امام ہی نے اس کو آمادہ کیا کیونکہ ساری دنیا میں حکومت

---

[1] بعض کہتے ہیں کہ بحر محیط کے کنارے مغربی افریقہ کے آخری حدود پر سلا نامی مقام کے سامنے ٹھیک اسکندریہ کے نقشہ پر اس نے بڑا شہر آباد کیا جس کی سڑکیں بڑی وسیع اور کشادہ تھیں، بڑا پرفضا مقام تھا، پھر وہ مراکش واپس ہوا اور مراکش ہی میں انتقال ہوا اس نے وصیت کی تھی کہ کسی عام گزرگاہ پر اسے دفن کر دیا جائے شاید کسی راہ گیر کو رحم آجائے اور میرے لیے دعا کرے۔ (الیافعی ص۴۸۲ ج ۳)

[2] موحدین کی حکومت کے ساتھ امام غزالی کے تعلق کی طرف میں نے پہلے ہی اشارہ کیا ہے۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیانی واسطہ اس سیاسی انقلاب کا یہی محمد بن تومرت نامی شخص تھا۔ مورخین نے بڑی تفصیل سے اس کے حالات لکھے ہیں۔ الذہبی کا بیان ہے کہ اس کا سر بہت بڑا تھا۔ رنگ گندمی نظر میں بلا کی تیزی تھی، چہرہ پرجلال وہیبت انگیز تھا، بہت خاموش رہتا تھا اور چال ڈھال، رنگ ڈھنگ سے عاجزی انکساری کی شعاعیں ہر وقت پھوٹتی رہتی تھیں۔ سیاسی اقتدار کے حاصل کرنے میں کامیاب ہونے کے بعد اس کی زندگی فقیرانہ ہی رہی۔ امام غزالی سے اس نے تعلیم بھی حاصل کی تھی ان سے رخصت ہو کر مکہ پھر مصر اور مصر (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

يومئذٍ باقطار الارض من اختلال الدولة و تقويض اركان السلطان الجامع للامة المقيم للملة بعد ان سأله عمن له العصابة والقبائل التي يكون بها الاعتزاز والمنعة ونشاء بها (ص۲۲۶ ج ۶)

کی کمزوریوں کی وجہ سے اسلامی نظام درہم وبرہم ہوتا چلا جارہا تھا کوئی ایسی مرکزی طاقت باقی نہ رہی تھی جس پر سارے جہان کے مسلمان جمع ہو سکتے ہوں اور ملت کو استواری حاصل ہو سکتی ہو امام غزالی نے محمد بن تومرت سے یہ دریافت کیا کہ کس قبیلہ سے اس کا تعلق ہے اور ان کی مدد سے وہ کیا کچھ کر سکتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے،

مغرب جو امام غزالی کے وطن سے ہزارہا میل دور تھا۔ جب وہاں کے انقلاب میں لوگوں کو امام غزالی کا ہاتھ نظر آتا ہے تو آخر میرے پاس اس تاثر کو بے بنیاد ٹھہرانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ کہ جب مشرق کے ان خلفاء و سلاطین و ملوک کے ان حالات میں مجھے غزالی کی روح کارفرما محسوس ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ غزالی کے بعد خلفاء ملوک و سلاطین کے ان طبقات میں غیر معمولی انقلاب کی جن موجوں کو ہم متلاطم پاتے ہیں۔ ان کے متعلق اس کا ثابت کرنا تو مشکل ہے کہ براہ راست امام کے کارندوں نے ان لوگوں کو متاثر کیا تھا بلکہ محمد بن تومرت کے ساتھ بھی امام غزالی کے جن تعلقات کا لوگ تاریخوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سے براہ سمندر وہ مغرب اقصیٰ کے شہروں میں گھومتا ہوا آخر مراکش پہنچا۔ لوگ اس کے معتقد ہوئے حتیٰ کہ مرابطین کا بادشاہ بھی جس کا نام علی بن یوسف بن تاشفین تھا، پھر بڑے قصے پیش آئے۔ بالآخر تینمل نامی پہاڑ میں اپنے رفقاء کے ساتھ مقیم ہو گیا اور وہیں سے جہاد کی تیاری شروع کی۔ عبدالمؤمن کو اس نے امام و امیر بنایا اور مرابطون کی حکومت پر اس کی جماعت غالب آئی حکومت موحدین کے نام سے محمد بن تومرت کی جماعت کی حکومت قائم ہوئی۔ یوسف یعقوب اسی حکومت کے دیندار سلاطین تھے۔ کہتے ہیں کہ کام چلانے کے لئے ابن تومرت نے اپنے آپ کو مہدی کے نام سے بھی مشہور کیا تھا۔ موحدین کی حکومت کا دینی غلو اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ یعقوب نے اپنے زمانہ میں حکم دیدیا تھا کہ عدالت کے سارے فیصلے براہ راست قرآن و حدیث کی روشنی میں کیے جائیں۔ تقلید سے اس نے حکماً علماء کو روک دیا تھا اسی زمانہ میں بعض ظاہری علماء پیدا ہوئے۔ شیخ محی الدین بن عربی بھی فروعاً ظاہری تھے اور یعقوب ہی کے زمانہ میں تھے ۱۲۔

ہیں تذکرہ جن الفاظ میں کرتے ہیں ان سے عام تاریخی یقین کا پیدا ہونا بھی دشوار ہے اور ذکر بھی اس واقعہ کا اتنا سرسری طور پر دوسرے واقعات کے تذکرہ کے ضمن میں کر دیا گیا ہے کہ عوام ہی نہیں خواص تک کو بھی اس کی خبر نہ پہنچ سکی، امام غزالی کے مستقل سوانح نگاروں کی بھی توجہ جب اس کی طرف نہ ہوئی تو عوام بیچاروں کی رسائی وہاں تک کیسے ہو سکتی ہے۔

اسی لیے میرا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ امام کی عملاً ارادی کوششوں سے ان نتیجوں کو میں وابستہ کرتا ہوں بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ غزالی کے دل سے ایک آواز نکلی تھی ان کے سامنے یہ قطعاً نہ تھا کہ کس کو سنا رہے ہیں خلفاء کو، یا سلاطین کو، امراء کو یا وزراء کو، عوام کو یا خواص کو بس وہ صرف سنانا چاہتے تھے اور امید قائم کی ہوگی کہ سننے کی جس میں صلاحیت ہوگی اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس کو سنے گا۔ اور فائدہ اٹھائے گا اور یہی واقعہ پیش بھی آیا۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ غزالی کے بعد ایک بڑا طبقہ ملوک و امراء بلکہ علماء و فقہاء تک میں ایسا بھی پایا گیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کی تلقین ان کے لیے مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی۔ کتابوں کی آواز بازگشت یقیناً ان کے کانوں میں بھی گونجی ہوگی جیسے دوسروں کے کانوں سے وہ ٹکرائی مگر بجائے دل کے ان سینوں میں پتھر تھے جو کچھ اس سے ٹکراتا تھا واپس ہو جاتا تھا۔

وزیر ابن ہبیرہ کے اقوال عالیہ

مگر اسی کے مقابلہ میں اثر پذیر قلوب بھی تھے۔ آپ کے سامنے اب تک تو صرف ان خلفاء اور ملوک ہی کی مثالیں گزری ہیں جو یکے بعد دیگرے مشرق و مغرب میں غزالی کے بعد نمایاں ہوتے رہے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا غزالی کے سامنے کوئی خاص طبقہ نہ تھا۔ سارے مسلمانوں کے لیے ان کا خطاب عام تھا۔ ذرا خلافت و سلطنت کے بلند زینوں سے نیچے اتر کر دیکھیے یہ اسی مقتفی باللہ کے وزیر ابن ہبیرہ ہیں۔ امام غزالی کی وفات کے کل (۴۰) سال بعد خلافت عباسیہ کے وزیر مطلق کے عہدے پر سرفراز ہوتے ہیں۔ نام تو ان کا یحییٰ تھا، ہبیرہ جو ان کے دادا تھے ان ہی کی طرف منسوب ہو کر ابن ہبیرہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ بارگاہ خلافت سے جیسا کہ اس زمانہ میں عام دستور ہو گیا تھا طویل عریض القاب ارکان حکومت کے نام کے آگے پیچھے لگائے جاتے تھے ابن ہبیرہ کو بھی وزیر العالم، العادل، عون الدین، جلال الاسلام، صفی الامام، شرف الانام، معز الدولہ، عماد الامۃ، مصطفی الخلافت، تاج الملوک والسلاطین صدر الشرق والغرب، سید الوزراء کا لمبا چوڑا خطاب ملا تھا، مگر جو حالات کتابوں میں ان کے ملتے ہیں ان کو دیکھ کر یہی خیال

گزرتا ہے کہ خود ابن ہبیرہ کے قلب میں نہ ان الفاظ کا کوئی وزن تھا اور نہ اس عہدے پر سرفرازی کے بعد آدمی جس جاہی، و مالی اقتدار کا مالک ہو جاتا تھا۔ اس اقتدار کی وقعت و قیمت بھی ان کی نگاہ میں پر پشہ سے زیادہ نہ تھی۔

ابن جوزی ابن ہبیرہ کے صرف دیکھنے والے ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے حلقۂ درس حدیث میں بیٹھنے والوں میں سے ایک ہیں۔ بڑی تفصیل سے عباسی خلافت کی اس عجیب و غریب شخصیت کا انہوں نے تذکرہ کیا ہے[۱] حالت یہ تھی کہ وزارت پر سرفراز ہونے کے بعد "الافصاح" نامی کتاب جو خود ابن ہبیرہ کی تصنیف ہے اور صحاح ستہ کی حدیثوں کی شرح انتہائی تدقیق و تحقیق سے اس میں کی گئی ہے اسی کا درس ایک دن ابن ہبیرہ دے رہے تھے، ایک مالکی مذہب کے فقیہہ نے خواہ مخواہ ایک مسئلہ میں الجھنا شروع کیا، علماء کا حلقہ تھا، ہر ایک فقیہہ کو سمجھاتا تھا فن کی معتبر کتابیں لا لا کر دکھلائی جا رہی تھیں مگر مرغی کی ایک ٹانگ پر ملا

---

[۱] ابن ہبیرہ مستحق ہیں کہ ان کی مستقل سوانح عمری مرتب کی جائے۔ عراق کے دیہاتی علاقے کے باشندے تھے۔ ابتدا جوانی میں بغداد چلے آئے اور طلب علم میں مشغول ہوئے۔ یہ زمانہ بڑی تکلیف میں گزرا۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ وزارت عظمیٰ کے اس عہدے پر پہنچنے کے بعد بھی غربت کے ایام کے قصے سنایا کرتے تھے۔ شروع میں کافی مجاہدہ اور ریاضت میں بھی مشغول رہے۔ الزبیدی ان کے پیر تھے اونٹ پر بیٹھ کر شہر کا دورہ کرتے اور شتربانوں کی طرح ابن ہبیرہ ان کے اونٹ کی نکیل پکڑے پکڑے آگے آگے چلتے جہاں اترنا ہوتا ابن ہبیرہ زور سے لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ یحییٰ و یمیت وھو حی لا یموت بیدہ الخیر وھو علیٰ کل شیٔ قدیر پڑھتے۔ پھر حکومت کی ملازمت میں شریک ہوئے۔ خزانہ کی افسری تک ترقی کرنے کے بعد دیوان خاص کی ولایت سپرد ہوئی بالآخر مقتفی نے وزیر اعظم اپنا بنالیا اس کے بعد بھی آخر دم تک اس عہدہ پر قائم رہے۔ یہ قصہ بھی ابن جوزی نے براہ راست ابن ہبیرہ سے نقل کیا ہے حلقۂ درس میں ایک دن کہنے لگے کہ وزارت کے اس عہدے پر اپنے آپ کو پاکر تعجب کر رہا ہوں اور افسوس ہوتا ہے کہ کس حال سے منتقل ہو کر میں کہاں چلا آیا۔ کہتے تھے کہ میرے گاؤں کی مسجد میں کھجور کا بڑا تناور درخت تھا، سالانہ اس میں پانسو سیر سے کم کھجور حاصل نہیں ہوتے تھے، ہم اپنے بھائی محب الدین سے کہتے تھے کہ بس اسی مسجد میں ہم دونوں قیام کریں! اور ساری زندگی یاد خدا میں گزار دیں۔ اس درخت کا پھل سالانہ خوراک کے لیے ہم دونوں کے واسطے کافی ہو گا۔ اور آج یہ حال ہے کہ میرے لیے وزارت کی آمدنی بھی کافی نہیں۔ یہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ زکوٰۃ وزیر پر کبھی فرض نہیں ہوئی سب خرچ ہو جاتی تھی۔ بلودگی کا یہ حال تھا کہ درس کی بھری مجلس میں اعتراف کر لیتے کہ فلاں لفظ یا عبارت کا مطلب مجھے نہیں معلوم ہے اور دلچسپ حالات کا لوگوں نے ذکر کیا ہے۔ (منتظم ابن جوزی ج ۱۰ ص ۲۱۶)

کا اصرار برابر جاری رہا۔ قدرتاً ابن ہبیرہ کو اس اصرار بے جا پر غصہ آگیا اور زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل گیا۔

بھیمۃ انت اما تسمع ھولاء	تم جانور ہو، کیا نہیں سن رہے ہو یہ لوگ
لیشھدون والکتب المصنفۃ	کس بات کی شہادت دے رہے ہیں اور کتابوں
وانت تنازع و تفرق المجلس	سے کیا معلوم ہوتا ہے مگر تم ہو کہ جھگڑتے
(صلا ۱۹۳ شذدرج ۴)	ہی چلے جاتے ہو۔ اور مجلس میں گڑبڑ پیدا کر رہے ہو۔

کہنے کو تو ابن ہبیرہ نے اس وقت ان کو بہیمہ (جانور) کہہ دیا لیکن اس کے بعد ان کے شریف نفس میں ذمہ داری کا احساس جب بیدار ہوا تو پھر کس حال میں وہ مبتلا ہوئے یہی سننے کی بات ہے۔ لکھا ہے کہ اس دن کی مجلس تو ختم ہوگئی دوسری مجلس میں جب لوگ جمع ہوئے اور قاری نے قرأت کرنی چاہی تو ابن ہبیرہ نے اس کو روک دیا اور مالکی فقیہہ کی طرف خطاب کر کے کہنا شروع کیا کل آپ کے اصرار بے جا نے خواہ مخواہ ایک ایسے لفظ کو میری زبان پر جاری کر دیا کہ جب تک اسی لفظ سے آپ مجھے مخاطب نہ کر لیں گے سبق شروع نہیں ہو سکتا، کہہ رہے تھے " آخر آپ کو بہیمہ کہنے کا مجھے کیا حق حاصل تھا؟ میں اپنے اندر کوئی ترجیحی وجہ نہیں پاتا۔ مجلس سناٹے میں آگئی خلافت عباسیہ کا وزیر اعظم الحاح و زاری کے ساتھ معمولی مولوی کے سامنے قصور کا اعتراف کر کے یہ استدعا کر رہا ہے کہ مجھے "بہیمہ" یعنی جانور آپ جب تک نہ کہہ لیں گے میرے دل کو اطمینان نہیں ہوگا، بیان کیا گیا ہے کہ اہل مجلس پر رقت طاری ہوگئی لوگ رونے لگے مالکی فقیہہ بھی حد سے زیادہ شرمندہ تھا وزیر سے کہہ رہا تھا کہ قصور تو میرا تھا مجھے معذرت پیش کرنی چاہیئے مگر ابن ہبیرہ چلا چلا کر القصاص القصاص بدلہ بدلہ کے لفظ دہراتے چلے جاتے تھے آخر چند لوگ آگے بڑھے اور عرض کیا کہ ہم لوگوں کی رائے ہے کہ مالکی فقیہہ کو آپ مالی شکل میں کچھ معاوضہ ادا کر دیں مگر فقیہہ کو اس سے بھی انکار تھا، لوگوں کے سمجھانے بجھانے سے سو اشرفیوں کے لینے پر بیچارہ آمادہ ہوگیا، اور یوں بات رفع دفع ہوئی۔ پورے قصے کا ذکر ابن عماد نے شذرات میں کیا ہے[1] اسی میں یہ بھی ہے کہ دعوتوں کا ابن ہبیرہ کو خاص ذوق تھا جن میں زیادہ تر فقراء اور معذور

---

[1] ابن جوزی نے اس قصے کو نقل کرتے ہوئے بجائے "بہیمہ" کے لکھا ہے کہ مالکی فقیہہ کو ابن ہبیرہ نے "حمار" گدھا کہہ دیا تھا اسی لیے اقرار کرتے تھے کہ جب تک بھری مجلس میں مجھے بھی تم "گدھا" نہ کہہ لوگے میرے دل کی بے کلی نہ مٹے گی۔ ۱۲

لوگ مثلاً اندھے لنگڑے لولے طلب کیے جاتے تھے، وزیر سب کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھتا اور کھانا کھاتا، ایک دن یہ لطیفہ پیش آیا کہ مہمانوں میں ایک اندھا کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چیخنے لگا کہ میرا سب کچھ چلا گیا اب کہاں سے لاؤں گا پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس کا جوتا چوری گیا، ابن ہبیرہ چپ چاپ اس کے پاس آئے اور اپنی جوتیوں کو اندھے کے پاؤں کے پاس رکھ کر کہا کہ دیکھو یہ تمہارا جوتا ہے؟ پہنا ل! ال کر بولا ہاں معلوم ہوتا ہے کہ وہی ہے۔ وزیر نے کہا کہ اب مت چلاؤ شور نہ کرو، تمہارا جوتا مل گیا۔ بیچارہ خوش خوش روانہ ہو گیا جب چلا گیا تب وزیر نے اہل مجلس سے کہا کہ

"میں ڈر رہا تھا کہ بڑے میاں کہیں مجھے ہی چور قرار نہ دے بیٹھیں۔ غنیمت ہے کہ اس کا خیال ان کو نہ آیا۔" (شذور ص ۱۹۶)

حدیث نبوی کے احترام کے سلسلے میں لوگوں نے لکھا ہے کہ افصاح پڑھا رہے تھے کہ وزیر کے زنانخانے سے گریہ و بکا کی آواز بلند ہوئی کتاب بند کر کے اندر گئے تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور حکم دیا کہ درس جاری رہے۔ جب درس ختم ہوا تو لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا قصہ تھا تب انہوں نے خبر دی میرے ایک بچے کا انتقال ہو گیا۔ یہ شور و ہنگامہ اسی لیے برپا ہوا تھا۔ آخر میں مجلس سے وہ کہہ رہے تھے:۔

لولا تعین الامر علیّ بالمعروف فی الانکار علیھم ذلك الصیاح لما قمت عن مجلس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔	عورتوں کی چیخ پکار کا روکنا اگر میرے فرائض میں نہ ہوتا تو میں رسول اللہ کی مجلس سے اٹھ کر میں کبھی اندر نہ جاتا۔

(شذور ص ۱۵۵ ج ۴)

طالب العلمی کے زمانہ میں کسی سپاہی نے جب سڑک پر جا رہے تھے پھل کے ایک ٹوکرے کے اٹھانے کا حکم دیا تھا انکار کرنے پر بیچارے کو مارا اور ایک تھپڑ اس زور سے رسید کیا کہ ابن ہبیرہ کی داہنی آنکھ کی روشنی جاتی رہی لیکن زندگی بھر اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا، اتفاقاً وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں بجرم قتل وہی شخص گرفتار ہو کر ابن ہبیرہ کے سامنے لایا گیا۔ انہوں نے خون بہا ادا کر کے خون کے مدعیوں کو روانہ کر دیا اور اس کو بھی پچاس اشرفیاں دے کر رخصت کیا۔ لوگوں نے اس غیر معمولی سلوک کی وجہ پوچھی تب کہا کہ میری داہنی آنکھ کی روشنی غائب ہے غالباً اس کا علم آپ لوگوں کو نہ ہوگا، قتل کے اسی مجرم کی کرتوت کا نتیجہ ہے پھر قصہ سنایا۔ آخر میں بولے کہ بدی کا بدلہ نیکی سے دینا چاہیئے اس پر عمل کرنے

کے بیئے دل بے چین ہو گیا۔ اسی لیے اس کے ساتھ ہیں نے یہ خصوصی برتاؤ کیا (ص۱۹۴) میں کہاں تک بیان کروں نمونے کے لیے یہی چند واقعات کافی ہیں۔

قاضی فاضل کے احوال

غزالی کے بعد وزراء کے طبقہ میں بھی ابن ہبیرہ تنہا نظر نہیں آتے بلکہ ان کی کافی تعداد پائی جاتی ہے کم از کم سلطان صلاح الدین کے وزیر باتدبیر قاضی فاضل سے کون ناواقف ہے۔ ابن عماد نے شذورہ میں لکھا ہے کہ وہ قرآن کے حافظ تھے اور سارے علوم میں دستگاہ رکھتے تھے آخر میں اس کے الفاظ یہ ہیں کہ:۔

کان نزھا عفیفا نظیفا قلیل الذات کثیر الحسنات دائم التھجد ملازم القران والاشتغال لعلوم الادب (ص۳۲۵ ج ۴)	بڑے پاکباز، پارسا، باصفا بزرگ تھے، لذتوں کا حصہ ان کی زندگی میں بہت کم تھا، نیکیوں اور بھلائیوں کی ان کے یاں کثرت تھی، تہجد کے پابند تھے اور قرآن کے ساتھ لزومی وابستگی رکھتے تھے نیز ادبی علوم میں مشغول رہتے۔

ذرا خیال تو کیجیے جس شخص کی مالی حالت یہ ہو کہ علاوہ وزارت عظمیٰ کی تنخواہ کے ہندوستان[1] و مغرب میں وسیع پیمانہ پر تجارتی کاروبار اس کے پھیلے ہوئے ہوں جاگیروں کا حال یہ تھا کہ صرف ایک گاؤں ترنجہ

---

[1] ابن عماد نے لکھا ہے کہ "التجارات بین الہند والمغرب" ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا اپنے وقت کے زبردست منشی تھے صلاح الدین کے زمانہ میں اور اس کے بعد ان کے مراسلات جو عربی زبان میں تھے ان کی ضخامت سو جلدوں تک پہنچ گئی تھی کتابوں سے عشق تھا۔ عبداللطیف بغدادی ان کا معاصر مورخ ہے ان کے کتب خانہ کے ملازم کی زبانی یہ روایت درج کی ہے کہ دو لاکھ چودہ ہزار تک کتابوں کی تعداد پہنچ گئی تھی۔ ایک ایک کتاب کے متعدد نسخے مختلف خصوصیتوں کی وجہ سے خریدا کرتے۔ حماسہ پڑھنے کے لیے ان کے صاحبزادے کو ضرورت ہوئی کتب خانہ سے ۳۵ نسخے نکال کر قاضی کے سامنے پیش ہوتے ہر ایک کو دیکھتے جاتے اور کہتے جاتے کہ یہ فلاں خطاط کا خط ہے بچوں کے مناسب نہیں۔ آخر حکم دیا کہ بازار سے نیا نسخہ خرید کر دیا جائے ان کے حالات پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے ان کا اصلی نام عبدالرحیم تھا بیسان سے وطنی تعلق تھا لکھا ہے کہ یہ تین بھائی تھے جن میں دو صاحب یعنی قاضی فاضل اور دوسرے بھائی کو کتابوں کی "ہوبی" (یعنی شغل) تھی اور میرے بھائی کو مٹی کے برتنوں چٹائیوں کی مختلف قسموں کے جمع کرنے کا خبط تھا۔ قاضی فاضل ذرا کم رو آدمی تھے اور کوزہ پشتی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نامی سے ابن عماد نے لکھا ہے کہ

نعیل اثنی عشر الف دینار (ص۔ج ۴) بارہ ہزار اشرفیاں آمدنی ہوتی تھیں۔

مگر اس ساری آمدنی میں قاضی فاضل کا ذاتی حصہ کتنا تھا لکھا ہے :۔

کان لباسہ لا یساوی دینارین دو اشرفی سے زیادہ قیمت اس لباس کی نہ ہوتی تھی جو قاضی پہنتے تھے۔

سواری جب نکلتی تو ایک غلام کے سوا کوئی ساتھ نہ ہوتا :

کان یکثر زیارۃ القبور و لیتیع الجنائز و لیعود المرضی و کان لہ صدقات و معروف کثیر فی الباطن (ص ۳۲۵) قبروں کی زیارت کا خاص شوق تھا اور جنازے کے ساتھ جانے کا، بیماروں کی عیادت کا، نیز پوشیدہ طور پر بکثرت خیر و خیرات کیا کرتے تھے

کیسی عجیب بات ہے جس زمانہ کے علماء دین بھی موکب میں نکلتے تھے آگے آگے ان کے غاشیہ بردار چلتے تھے نقیب کڑکتا جاتا تھا کہ ہٹ جاؤ ملک العلماء یعنی علماء کے بادشاہ کی سواری آرہی ہے۔ نحویوں کے بادشاہ یعنی ملک النحاۃ کے لفظ سے جو خطاب نہ کرتا جس زمانہ کے مولوی اس سے بگڑ جاتے تھے اسی میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ابن ہبیرہ ایک معمولی مالکی فقیہہ سے کہہ رہا ہے۔

لست بخیر منکم ولا انا الا کاحدکم (شذور ص ۱۹۳ ج ۴) تم میں کسی سے میں زیادہ اچھا نہیں ہوں، میں تم ہی لوگوں میں سے ایک معمولی آدمی ہوں۔

یا قاضی فاضل ایک غلام کے سوا باہر نکلنے میں کسی کو اپنے آگے پیچھے نہیں رکھتے تھے۔ علماء تک کا حال جس زمانہ میں یہ تھا کہ بڑے بڑے قاضی اور مفتی ریشمین لباس سے پرہیز نہیں کرتے تھے لیکن اسی زمانہ میں ابن ہبیرہ مقتفی کے سامنے یہ درخواست کرتے ہیں کہ :۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کا عیب ان میں پایا جاتا تھا لیکن صلاح الدین نہ صرف ان کے علم بلکہ للہیت کا معتقد تھا ایک دن غسل خانے میں گرم پانی رکھنے کا حکم دیا۔ ان کی صاحبزادی خبر دینے گئی کہ پانی تیار ہے قاضی صاحب کو دیکھا کہ خاموش بیٹھے ہیں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی دیکھا کہ ختم ہو چکے ہیں۔ (ص ۳۲۶ شذور)

"میں حریر کا لباس استعمال نہیں کروں گا۔"

لکھا ہے کہ خلیفہ کو بالکلیہ مایوس کر دینے کے لیے

حلف ان لا یلبسها (شذرات صفحہ ۱۹۱ ج ۴) ابن ہبیرہ نے قسم کھائی تھی کہ میں اس کپڑے کو ہرگز نہ پہنوں گا۔

یا قاضی فاضل جیسا کہ لکھا ہے :۔

ثیابہ البیاض سفید سوتی کپڑے ہی ان کا لباس تھا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ جب ان کے سلطان صلاح الدین نے ہی ریشم اور غیر شرعی لباس کو ہاتھ نہ لگایا تو قاضی فاضل کے اس طرز عمل پر کیوں تعجب کیجئے۔

علمائے دین پر انقلابی اثرات

اور اس میں شک نہیں کہ علمائے دین میں اب بھی ایسی ہستیاں پائی جاتی تھیں جن کی زندگی شرعی حدود سے ہٹی ہوئی تھی۔ لیکن جیسے آپ خلفاء و ملوک امراء و وزراء میں امام غزالی کے بعد ایک غیر معمولی انقلاب کو پاتے ہیں دینی نمائندوں کا طبقہ بھی اس انقلاب سے کافی متاثر نظر آتا ہے۔

عبدالرحمن بن ابی الفتح

یا ایک زمانہ تھا کہ علوم سے فارغ ہونے کے بعد عام دستور تھا کہ سلاطین اور امراء و وزراء کی دربار داریوں میں مولویوں کا عام وقت صرف ہوتا تھا تا آنیکہ قضا احتساب افتاء یا اسی قسم کے خدمات کے حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہو جاتے تھے یا ہم غزالی کے بعد پاتے ہیں کہ بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں سرکاری خدمات سے سخت کارہ اور متنفر ہیں ایک بڑا گروہ ان ہی کا اپنی پیشانی کے پسینے سے روٹی کمانے کی کوششوں میں مشغول ہے۔ علامہ عبدالرحمن بن ابی الفتح جن کی وفات غزالی کی وفات سے چالیس سال بعد ہوئی ہے قرآن مجید کی تفسیر الکتالیین جلدوں میں ان کی تالیف ہے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ معاش کے لیے

کان یتجر فی الخل ویقتنع بہ (شذور ص۱۴۲ ج ۴) سرکہ کی تجارت کرتے تھے اور اسی تجارت کی آمدنی پر قانع تھے۔

حکیم النہروانی

ان ہی کے ہم عصر ابوحکیم النہروانی ہیں بڑے زبردست مدرس تھے۔ بغداد کے باب الازج میں ان کا ذاتی مدرسہ تھا، اسی سے ان کے علم و فضل کا اندازہ کیجئے کہ ابن جوزی جیسے حضرات ان کے شاگردوں میں ہیں۔ ابن جوزی کا بیان ہے:۔

قرأت علیہ القرآن والمذھب والفرائض (ص۱۷۶ ج ۴ شذور) میں نے ابوحکیم نہروانی سے قرآن اور مذہب کی کتابیں اور علم فرائض کی تعلیم حاصل کی۔

مگر بایں ہمہ ابن جوزی ہی کا بیان ہے کہ ان کی آمدنی کا ذریعہ خیاطی تھا۔ اور کیسی خیاطی، ابن جوزی

کے الفاظ ہیں کہ:۔

كان يكسب بيده واذا اخاط ثوبا فاعطى الاجرة مثلاً قيراطا اخذ منه حبة ونصفا ورد الباقي وقال خياطتي لا تساوي اكثر من هذه ولا يقبل من احد شيئًا (ص۱۲۶)	اپنے ہاتھ سے کماتے تھے قاعدہ تھا کہ جب کوئی کپڑا سیتے اور اس کی اجرت مثلاً ایک قیراط دینے والا دیتا تو اس سے ایک پیسہ اور نصف لے لیتے پھر کہتے کہ میری سلائی کی اجرت اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کسی سے کچھ نہیں لیتے۔

شیخ محمد بن عبدویہ بڑی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ابن رجب نے لکھا ہے کہ نو جلدوں میں ہدایہ کی شرح لکھی جو پوری کتاب کی شرح نہیں ہے البتہ حکومت کی دست نگری ایسا معلوم ہوتا ہے ایک بڑے طبقہ کی نظر میں عار بن گئی تھی۔ اور بجائے اس کے دستکاری صنعت وحرفت تجارت وغیرہ معاشی ذرائع کی طرف لوگوں کی زیادہ توجہ ہو گئی تھی اسی سلسلہ میں بعضوں کی تجارت نے تو غیر معمولی فروغ حاصل کیا تھا، امام غزالی کی وفات کے کل دس سال بعد جزیرہ کمران میں شیخ محمد بن عبدویہ کی وفات ہوئی۔ بغداد سے شیخ ابواسحاق شیرازی کی مشہور کتاب مہذب یمن میں پہلی دفعہ یہی صاحب لے گئے۔ بہرحال معاشی زندگی کے لیے کہنا یہ ہے کہ شیخ محمدؒ نے تجارت کا کاروبار شروع کیا لکھا ہے کہ آخر زمانہ میں

كان عبيده يسافرون الى الحبشة والهند ومكة وعدن للتجارة فاخلفه الله مالا (شذور ص۱۶ ج۴)	ان کے غلام حبشہ، ہندوستان، مکہ، عدن وغیرہ کے سفر میں گھومتے رہتے تھے کافی مال اس راہ سے ان کے پاس جمع ہوا۔

لیکن پھر ساری دولت جیسا کہ ابن عماد نے نقل کیا ہے ان طلباء پر خرچ ہوتی تھی جو دور دور سے ان کے پاس پڑھنے کے لیے آتے تھے اور خود ان کی غذا یہ تھی کہ

لاياكل الا الرز يأتي من بلاد الهند[1] (ص۱۶)	نہیں کھاتے تھے مگر ایک خاص قسم کا چاول جو ہندوستان سے برآمد ہوتا تھا۔

---

[1] جزیرہ کامران میں کہتے ہیں کہ شیخ کا مزار اس وقت تک زیارت گاہِ عوام ہے علاوہ علوم ظاہری کے باطنی دولت (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

محمد بن عبدالباقی

اس سلسلہ میں علماء دین ہی کے طبقہ کے ایک بزرگ کی بیدار ضمیری کا واقعہ عجیب وغریب ہے۔ ان کی وفات امام غزالی کی وفات سے تیس سال بعد ہوئی ہے۔ ابن عماد نے مشہور ثقہ وامام علامہ ابن رجب حنبلی کے حوالہ سے یہ واقعہ اگر نقل نہ کیا ہوتا تو میرے لیے سچی بات یہ ہے کہ واقعہ کا باور کرنا آسان نہ تھا۔

یہ ایک حنبلی امام کا واقعہ ہے جن کا نام محمد بن عبدالباقی تھا البزاز کے نام سے مشہور تھے۔ غالباً کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ اسی لیے یہ خطاب ان کا مشہور ہوا اپنے وقت کے مستند علماء میں ان کا شمار تھا۔ مسند العراق سمجھے جاتے تھے۔ بڑے بڑے اساتذہ مثلاً قاضی ابو یعلیٰ علامہ ابوالطیب الطبری، ابو محمد الجوہری وغیرہ کے مختلف علوم وفنون میں شاگرد تھے۔ دینی علوم فقہ وحدیث وتفسیر کے سوا ہندسہ وحساب جبر ومقابلہ میں بھی کمال تھا۔ علمی شوق ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک دفعہ رومیوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ ڈیڑھ سال جیل خانہ میں رہنا پڑا خود ہی فرمایا کرتے تھے کہ:۔

> "جیل میں ایک معلم بھی آیا کرتا تھا (غالباً محافظین جیل کے بچوں کو پڑھایا کرتا تھا اور رومی حروف بھی سکھاتا تھا میں نے اس موقعہ کو غنیمت خیال کرکے اسی سے رومی خط سیکھ لیا۔"

بہر حال اسلام کی علمی ودینی تاریخ میں ان کا نام نمایاں ہے۔ ابن جوزی نے منتظم میں ان کا حال تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور ذکر کیا ہے کہ میں نے بھی ان سے استفادہ کیا۔

بہر حال میری غرض یہاں اس قصہ کا تذکرہ ہے جس کا ذکر ابن رجب نے اپنے طبقات میں کیا ہے۔ قصہ کو خود ان ہی علامہ محمد بن عبدالباقی البزاز سے ابن ابی الفوارس نے سنا تھا کہتے تھے کہ میں مکہ میں مجاور تھا اتفاقاً ایک دن یہ صورت پیش آئی کہ کھانے کے لیے میرے پاس کچھ نہ تھا بھوک سے حالت بہت زیادہ نڈھال ہوتی چلی جا رہی تھی، اسی حال میں جا رہا تھا کہ سامنے ایک بٹوہ جو راستہ میں پڑا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سے حصہ وافر ان کو ملا تھا آخر عمر میں موتیا بند کی وجہ سے بینائی جاتی رہی۔ لوگوں نے قدح کا مشورہ دیا جواب میں چند اشعار سنائے جن کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جس حال میں رکھا ہے اسی کے ساتھ راضی رہنا زیادہ بہتر ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ چند دن بعد خود بخود روشنی آ گئی۔ (ص۷۶ ج۴)

تھا اس پر میری نظر پڑی میں نے اُسے اٹھا لیا۔ یہ ریشم کا بٹوہ تھا اور ریشم ہی کی ڈور سے بندھا ہوا تھا گھر لاکر میں نے جب اس کو کھولا تو دیکھا کہ موتیوں کا ایک مالا اس میں رکھا ہوا تھا۔ یہ ایسے موتی تھے کہ کم از کم میں نے زندگی بھر ان جیسے موتی نہ دیکھے تھے۔ میں نے اسی حال میں اس کو رکھ دیا اور گھر سے باہر نکلا سامنے دیکھا کہ ایک شخص پکار رہا ہے، ہاتھ میں اس کے رومال تھا جس میں کچھ بندھا ہوا تھا کہہ رہا تھا کہ میرا بٹوہ جس میں موتیوں کا ہار تھا گم ہو گیا ہے جو صاحب اس کا پتہ دیں گے ان کو یہ پانسو اشرفیاں جو تھیلی میں بندھی ہوئی ہیں اسی وقت انعام میں دوں گا۔ یہ دیکھ کر میں نے بڑے میاں کو بلایا اور ساتھ لے کر گھر پہنچا، بٹوہ کے ڈورے اور کپڑے کی حالت موتیوں کی تعداد وغیرہ دریافت کی اس نے جو کچھ بتایا اسی بٹوے اور ہار میں ساری علامتیں پائی جاتی تھیں۔ تب میں نے نکال کر اس کے حوالے کیا۔ بڑا ممنون ہوا اور حسب وعدہ پانچ سو اشرفیاں مجھے دینے لگا، اس وقت بڑی کم ہمتی سی معلوم ہوئی کہ اس عمل کا اس سے معاوضہ لوں میں نے شکریہ کے ساتھ اشرفیاں واپس کر دیں مگر وہ اصرار کرنے لگا بات بہت دیر تک ہوتی رہی، آخر بے چارہ تنگ آکر چلا گیا میں نے اس سے کچھ نہ لیا۔

یہاں تک تو خیر معمولی قصہ ہے شیخ کا بیان ہے کہ پھر کچھ دن گزرے میں مکہ سے روانہ ہوا جہاز میں سوار ہو کر سفر کر رہا تھا کہ اچانک طوفانی ہوا کا زور بندھا جہاز کے ٹکڑے اڑ گئے، مسافر سب ڈوب مرے صرف کسی تختہ پر بیٹھ کر میں سمندر کے کنارے قریب کے ایک جزیرے کے ساحل تک پہنچ گیا۔

اب یہیں سے اصل عبرت انگیز داستان شروع ہوتی ہے قدرت کی کارفرمائیوں پر تعجب ہوتا ہے شیخ نے دیانت و امانت کے حقوق ادا کیے تھے چاہتے تو موتیوں کے اس ہار کو دبا بیٹھتے سیکڑوں فقہی حیلوں سے اسے جائز بھی ٹھہرا سکتے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عمل حق تعالیٰ کو بہت پسند آیا اور گو دنیا دارالجزا نہیں ہے لیکن اہل ایمان کی تسلی واطمینان کے لیے کبھی کبھی اسی زندگی میں بھی اعمال کی جزائی شکلوں کا ظہور ہو جاتا ہے[1]۔ یہی صورت شیخ کے ساتھ پیش آئی ہے کہتے تھے کہ اس جزیرے میں لوگ آباد تھے ان

---

[1] شیخ کے سامنے تو ان کی نیکی جو صرف خدا کی نگرانی کے زندہ احساس ہی سے پیدا ہو سکتی تھی جس کی شکل سامنے آئی اس کا حال تو آپ آگے پڑھیں گے لیکن اس کے بالمقابل برائی نے برائی کرنے والے کا گلا اسی زندگی میں اسی وقت بلکہ لیا جس وقت اس کا ظہور ہوا تھا۔ اس کی ایک مثال کا ذکر ہمارے حبِ صمیم حضرت امجد حیدرآبادی حکیم الشعراء نے اپنی سوانحِ عمری
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہی کے پاس چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ سب مسلمان ہیں ایک مسجد پر نظر پڑی وہیں جاکر ٹھہر گیا۔ نمازی نماز کے لیے آئے تو مجھ سے حال دریافت کیا جو گزری تھی بیان کیا، لوگ مجھ سے مانوس ہو گئے ان پر جب یہ واضح ہوا کہ میں قرآن پڑھا ہوا ہوں اور پڑھا سکتا ہوں تو لوگ مجھ سے قرآن پڑھنے کے لیے آنے لگے۔ اسی عرصہ میں ان کو معلوم ہوا کہ پڑھنے کے سوا قرآن لکھ بھی سکتا ہوں تب تو وہ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور اپنے اپنے بچوں کو لے کر میرے پاس آئے کہ ان کو لکھنا پڑھنا سکھا دو۔ لڑکوں کے ساتھ نوجوان بھی مجھ سے پڑھنے لگے اور اب میں ہی ان لوگوں کا مرجع وہادی بن گیا۔ کافی مالی امداد بھی ان لوگوں سے مجھے ملتی رہی۔ آخر میں ان کی دلچسپیاں میرے ساتھ اس درجہ بڑھ گئیں کہ مجھے متاہل کر کے اپنے ہی پاس رکھ لینے کا فیصلہ ان لوگوں نے کیا۔ میرے پاس آئے اور کہا کہ ہمارے یہاں ایک مالدار یتیم لڑکی ہے جس کا عقد ہم کسی اچھے آدمی سے کرنا چاہتے ہیں تم سے بہتر شوہر اس لڑکی کے لیے کون ہو سکتا ہے اس لیے ہم سب کی متفقہ رائے ہے کہ اس لڑکی سے تم نکاح کرلو۔ ردوکد کے بعد شیخ کو بالآخر لوگوں کی اس درخواست کو قبول کر لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ عقد ہو گیا جب خلوت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میں کیا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ والد کے سائے سے محروم ہونے کے بعد اپنی اکیلی ماں کے ساتھ جس زمانہ میں یتیمی کے دن اسی حیدرآباد میں گزار رہے تھے عمر آٹھ نو سال کی ہو گی پانی برسا اور ان کی ماں کا کچا مکان اس سے متاثر ہوا۔ سامنے ایک امیر کی حویلی تھی، حویلی کے احاطہ کے قریب جو میدان تھا اس سے چند دفعہ کیچڑ اٹھا کر اپنے مکان کی کچی دیوار پر تھوپا اس عرصہ میں امیر کے کسی ملازم کی نظر پڑی مٹی اٹھانے سے روک بھی دیا اور اپنے آقا سے جاکر شکایت بھی کی اسی وقت امیر نے امجد صاحب کو بلا بھیجا اور بلا کر سخت وسست الفاظ جو کچھ کہہ سکتا تھا کہتا رہا، امجد صاحب کا بیان ہے کہ اپنی یتیمی بےکسی اور اس کے جبر وتکبر کا مجھ پر غیر معمولی اثر پڑا لیکن مجبور تھا اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ سامنے کی مسجد میں گھس گیا، وضو کر کے دوگانہ ادا کیا اور خوب ڈھاڑیں مار مار کر خدا کے سامنے رویا۔ دل رونے سے ٹھنڈا ہو گیا، گھر چلا آیا، شام ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہی امیر اس وقت تک بڑبڑا رہا ہے اور مجھے صلواتیں سنا رہا ہے۔ رات گئی صبح ہوئی خبر ملی امیر کی بڑبڑاہٹ اسی طرح جاری ہے۔ واقعہ پیش یہ آیا کہ اس پر جنون کا دورہ پڑ گیا۔ غالباً اسی حال میں کچھ دن بعد وہ مرگیا۔ جمال سلمیٰ نامی کتاب مصنفہ حضرت امجد صاحب میں اصل قصہ پڑھیے۔ میں نے اپنے حافظہ سے مدد لے کر جو کچھ یاد رہ گیا لکھ دیا۔ ۱۲

ہیں شیخ اپنی بیوی کے ساتھ ہوتے تو اچانک ان کی نظر ایک ایسی چیز پر پڑی کہ جسے دیکھ کر ان کی آنکھ پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ موتیوں کا وہی ہار جو موتے ہیں بمقام مکہ راستہ پر پڑا ان کو ملا تھا بجنسہٖ وہی ہار اس لڑکی کے گلے میں پڑا ہوا ہے جو ان کی دلہن بن کر اس وقت ان کے سامنے بیٹھی ہے دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ تھا۔ یہ لڑکی اسی حاجی کی تھی جسے شیخ نے محض اللہ کے لئے ہار کو واپس کر دیا تھا۔ لوگوں نے بیان کیا کہ لڑکی کا باپ حج سے جب اپنے جزیرے میں واپس ہوا تو ہار کے گم ہونے اور پھر جس طرح وہ ملا اس کا ذکر کر کے کہا کرتا تھا کہ

ما وجدت فی الدنیا کالذی الذی رد علی ھذا العقد۔

جس شخص سے یہ ہار مجھے واپس ملا ایسا مسلمان آدمی میں نے دُنیا میں نہیں دیکھا۔

لوگ یہ بھی روایت کرتے تھے کہ یہ دعا بھی کیا کرتے تھے کہ :-

”کاش اس شخص سے میری دوبارہ ملاقات ہوتی تو اپنی لڑکی سے اس کا عقد کر دیتا“

مگر اسی عرصہ میں ان کی حیات پوری ہو گئی اس لڑکی کے سوا کوئی دوسری اولاد نہ تھی۔ دوسری چیزوں کے ساتھ اس ہار کی بھی تنہا وارث ہوئی۔ شیخ بیان کرتے ہیں کہ اس بیوی سے چند اولاد بھی خدا نے مجھے عطا فرمائی پھر بے چاری کا انتقال ہو گیا۔ اس ہار کے وارث میرے بچے ہوئے کچھ دن بعد بچے بھی وفات پا گئے۔ اور یوں گھوم گھما کر یہ ہار میرے قبضہ میں آیا جسے میں نے ایک لاکھ اشرفیوں میں فروخت کیا۔ ابن رجب نے لکھا ہے کہ شاگردوں سے شیخ کہا کرتے تھے کہ میرے پاس مال و منال جو کچھ تم دیکھتے ہو یہ اسی ایک لاکھ دینار کے سرمایہ سے حاصل ہوا ہے۔ (شذور ص۱۱ج ۴)

بہر حال یہ تو شیخ کا وہ عجیب و غریب قصہ ہے جو اپنے آخری جز کے اعتبار سے یقیناً حیرت انگیز طلسمی کرشمہ ہے، میں نے جیسا کہ عرض کیا ابن رجب جیسے محدث اپنی کتاب میں اس قصے کو اگر جگہ نہ دیتے تو شائد میں نقل بھی نہ کرتا اور میرے مقصود کا سچ پوچھئے تو اس جز سے چنداں تعلق بھی نہیں ہے میں تو قصے کے پہلے حصہ کو پیش کر کے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ شدت فاقہ اور شدید ضرورت کے باوجود امانت و دیانت کے احساس میں اتنی ذکاوت شیخ میں جو پیدا ہو گئی تھی کہ ہار تو ہار اس انعام کے لینے پر بھی وہ آمادہ نہیں ہوئے جو ہار کا مالک بخوشی ان کو دے رہا تھا۔

جس زمانہ کا یہ قصہ ہے اس کے لحاظ سے یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دینی بیداری کی پیدائش کے اسباب کیا تھے[1]

---

[1] شیخ نے انعام کا لینا کیوں پسند نہ کیا، ابن حماد نے اس سوال کو فقہی نقطہ نظر سے اٹھایا ہے۔ پھر خود جواب دیا ہے کہ شیخ مسلکاً حنبلی تھے اور امام احمدؒ کا فتویٰ ہے کہ گم شدہ چیز کے پانے والوں کے لیے معاوضہ لینا اس وقت درست نہ ہوگا جب معاوضہ کی نیت سے گم شدہ چیز کو اس نے اٹھایا ہو، ظاہر ہے کہ تقویٰ کا یہ مقام جو اس فتویٰ پر عمل کرنے پر آدمی کو آمادہ کرے ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ ۱۲

سارے سلاسل تصوّف کے بانی امام غزالی کے بعد ہیں اور تعلیماتِ غزالیہ سے متاثر بھی!

ممکن ہے کہ شذرذ واستثنا، ذاتی رجحان اور اس قسم کی بار دتا دیلوں سے لوگ دل کی تسلّی حاصل کریں مگر میں تو اسی سوال کو ذرا اور زیادہ آگے بڑھا کر یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ حجۃ الاسلام غزالی کی مذکورہ بالا صدی کی ان انقلابی مثالوں پر آپ شخصی واستثنائی کا پردہ اُڑھا دیجیئے لیکن سوچنے والوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ شخصی نہیں بلکہ مسلمان عالم میں صدہا سال سے صوفیہ کے وہ سارے سلاسل اور طرق جو مختلف خانوادوں کے نام سے اسلامی ممالک میں مروج ہیں مثلاً قادریہ، رفاعیہ، بدویہ، سہروردیہ، شاذلیہ، نقشبندیہ اور چشتیہ وغیرہ ان تمام طریقوں کی مرکزی ہستیاں یعنی جن اسمارِ گرامی کی طرف یہ طریقے منسوب ہیں کیا ان میں کوئی بھی ایسی ہستی ہے جو امام غزالی سے پہلے پیدا ہوئی ہو؟ اور پہلے کیا معنی؟ سہروردیہ طریقہ کے بانی و مؤسس یعنی حضرت شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر السہروردی کے متعلق تو لوگوں نے لکھا بھی ہے۔

صحب الشیخ حماد الدباس واحمد الغزالی (ص۲۰۹ ج ۴ شذرر)

شیخ حماد دباس اور احمد غزالی کی صحبت میں رہے۔

رزق حلال کی تلاش میں شیخ حماد دباس کے جس جہد بلیغ کا میں نے ذکر کیا ہے غزالی کی تلقین سے اس کو غیر متعلق قرار دینے پر کوئی اصرار کرے تو کر سکتا ہے لیکن احمد غزالی تو امام غزالی کے بھائی ہیں وہی بھائی جنہوں نے احیاء العلوم کے افادے کو عام کرنے کے لیئے اس کا خلاصہ تیار کیا تھا اور لوگوں کو شاید اس کا علم یا شعور نہیں ہے کہ ساحلِ دجلہ سے علم وعرفان کا نہ ڈوبنے والا آفتاب غوثیت وقطبیت کے آسمان[1]

---

[1] اشارہ قصیدۂ غوثیہ کے اس مشہور شعر کی طرف ہے یعنی ؎ افلت شموس الاولین وشمسنا ابدا علی فلک العلی لا تغرب

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پرچمکا، اور اس وقت تک جو چکے رہا ہے صدیاں گزر گئیں حکومتیں الٹتی پلٹتی رہیں، نہ عباسی رہے اور نہ دیالمہ نہ سلاجقہ رہے نہ سلاجقہ کے جانشین زنگیوں اور ایوبیوں کا خاندان اور نہ آل عثمان اور نہ ان کا جبروت وجلال، خود لاکھوں لاکھ کی آبادی رکھنے والا مدینۃ الاسلام بغداد ایک معمولی قصبہ کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ یہ سب کچھ ہے لیکن لاہوتی گرج اور کڑک کے ساتھ اسلامی ایمانیات کا گھنگھور بادل اسی بغداد کے باب الازج سے اٹھ کر مراکش سے چین تک کو سیراب کرتا رہا۔ اور آج تک کر رہا ہے۔ میرا اشارہ خود سیدنا الجیلی الامام قدس اللہ سرہٗ العزیز کی ذات قطبی[1] صفات، غوثی سمات کی طرف ہے۔ عوام نہیں تو خواص بھی کیا اس سے ناواقف ہیں کہ معارف وحقائق کے اس سیل جرار کی ابتدا امام غزالی کی وفات کے کل پندرہ سال بعد شیخ ابوسعد المبارک المخرمی کے مدرسہ سے ہوئی تھی۔ محدث جلیل حافظ ابن رجب لکھتے ہیں کہ :۔

ظهر الشيخ عبد القادر للناس وجلس للوعظ بعد العشرين وخمس مائة	ظاہر ہوئے شیخ عبد القادر عام لوگوں کے سامنے اور وعظ کے لیے بیٹھے ۵۲۰ھ کے بعد۔

(شذورص ۴۰ج ۴)

امام غزالی کی وفات جیسا کہ معلوم ہے ۵۰۵ھ میں ہوئی۔

اور تقریباً یہی حال سلسلہ رفاعیہ کے بانی حضرت سید احمد الکبیر الرفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے! امام غزالی کی وفات سے پانچ سال پہلے ۵۰۰ھ میں حضرت کی ولادت عراق ہی کے ایک گاؤں ام عبیدہ میں ہوئی۔ جو واسط اور بطائح کے درمیان دجلہ کا ایک جزیرہ تھا۔ رفاعیہ فقراء کا آج کچھ بھی حال ہو لیکن علم ظاہر کے ساتھ آپ کے باطنی کمالات نے مسلمانوں کے قلوب میں غیر معمولی کشش آپ کی طرف جو پیدا کر دی تھی! اس کا اندازہ امام سبط[2] جوزی کی اس چشم دید گواہی سے ہو سکتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) (پہلوں کے آفتاب ڈوب گئے اور میرا آفتاب عزت وبلندی کے آسمان پر ہمیشہ کے لیے ہے جو کبھی غروب نہ ہوگا۔ [1] حضرت غوث اعظم کے وعظ کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں غیر معمولی کڑک اور گرج کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ شیخ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ درکلام آنحضرت نوع سرعت وجہد بود (یعنی حضرت والا کے کلام میں ایک قسم کی تیزی اور روانی بلند آواز کے ساتھ پائی جاتی تھی۔) تاثیر کا یہ حال تھا کہ مسلمان تو مسلمان

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت عندہ لیلۃ نصف شعبان وعندہ مائۃ الف انسان۔ (صلا۲۶ ج ۴ شذرات)

شعبان کی پندرھویں رات کو میں سید رفاعی کے پاس حاضر ہوا ایک لاکھ آدمی ان کے پاس جمع تھے۔

غالباً بعد کو رفاعی سلسلہ میں یہ طریقہ جو جاری رہا جیسا کہ ابن خلکان نے لکھا ہے :۔

لھم مواسم یجتمع عندھم من الفقراء عالم لا یعدّ ولا یحصیٰ یقومون بکفایۃ الکل [1] (نقلاً عن الیافعی صلا۴۱۱ ج ۳)

ان کے میلے کے موسم مقرر ہیں جن میں بیشمار فقراء جمع ہوتے ہیں خود بھی لوگ ان کے طعام وقیام کا نظم کرتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یہود ونصاریٰ کی کافی تعداد صرف آپ کے مواعظ سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئی۔

[2] یہ مشہور ابن جوزی کے پوتے ہیں۔ جمال الدین لقب یوسف نام ابوالمظفر کنیت تھی اگرچہ خود اپنے دادا ابن جوزی سے بھی تعلیم پائی تھی لیکن ان کے حنبلی مسلک کو ترک کر کے حنفی ہو گئے تھے۔ چالیس جلدوں میں مرآۃ الزمان نامی تاریخ ان کی دنیا کی غیر معمولی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ طرب قبو (قسطنطنیہ) میں یہ کتاب موجود ہے انیس جلدوں میں تفسیر بھی ہے۔ بہرحال اسی موقع پر انہوں نے لکھا ہے کہ شیخ رفاعی کے پاس ایک لاکھ کے اس مجمع کو جب میں نے تعجب سے دیکھا تو شیخ نے مجھ سے خطاب کر کے فرمایا کہ میرا حشر ہامان جیسا ہو اگر لمحہ بھر کے لیے دل میں اس کا خطرہ آیا ہو کہ میں ان لوگوں کا پیشوا ہوں اور یہی چیز ان سارے بزرگوں کی زندگی کی روح تھی تم خالق کے لیے ہو جاؤ اپنی ساری خلقت کو خالق تمہارے لیے کر دے گا یہی نکتہ ارباب شرک سے اوجھل تھا وہ خدا کی کسی مخلوق مثلاً ملائکہ آفتاب ماہتاب سے نفع اٹھانا چاہتے تو خود ان ہی مخلوقات کے آگے جھک جاتے لیکن نبوت کی توحیدی راہ پر چلنے والوں نے اس راز کو واضح کیا کہ ملائکہ تک کو جو قابو میں لانا چاہتا ہے اس کو چاہیئے کہ ربنا اللہ (اللہ ہی ہمارا رب ہے) پر ڈٹ جائے ان الذین قالو ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ قرآنی آیت کا یہی مطلب ہے۔ سید رفاعی کی سب سے بڑی خصوصیت حق کے سامنے ان کی رلودگی تھی۔ عربی کی ایک توحیدی غزل پر لوگوں نے لکھا ہے کہ حضرت کی وفات ہوئی۔ ۱۲-

[1] تاریخ بغداد کے مصنف ابن نجار کے حوالہ سے لوگوں نے سیدنا الامام الجیلی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کھانا کھلانے سے بہتر کام مجھے کوئی دوسرا نظر نہیں آتا میرا دل چاہتا ہے کہ دنیا کی دولت میرے ہاتھ میں ہوتی تو بھوکوں کے کھلانے پر سب کو صرف کر دیتا۔ صلا۲۰۰ ج ۴

میں نے اپنی کتاب نظام تعلیم وتربیت میں ایک مستقل باب ہی میں اس مسئلہ پر بحث کی ہے علاوہ دوسرے اغراض کے صوفیوں کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ حضرت ہی کے اس اسوہ کی تقلید تھی، باقی رفاعیہ جو کسی زمانہ میں احمدیہ اور بطائحیہ فقرا بھی کہلاتے تھے اور تاتاریوں نے اسلامی ممالک کو جب پامال کرکے اپنے مقبوضات میں شامل کرلیا تو اس وقت ان ہی فقیروں کے متعلق دیکھا جاتا تھا کہ کبھی زندہ سانپوں کو نگل رہے ہیں، دہکتے ہوئے تنوریں کود پڑتے تھے۔ یا حماموں کے آتش خانوں میں گھس جاتے۔ اسی طرح دھمال کھیلنے کا طریقہ شاید اب بھی ان میں پایا جاتا ہے۔ یعنی ابن خلکان نے جس کے متعلق لکھا ہے :۔

توقد لهم النار العظيم ويقام السماع فيرقصون عليها الى ان تنطفي النار۔ (تنذور صلا ج ۴)	بڑا الاؤ ان کے لئے جوڑا جاتا پھر یہ اسی آگ پر ناچتے ہیں تا اینکہ آگ بجھ جاتی ہے۔

واللہ اعلم بالصواب اس کی اصل کیا ہے ذہبی وغیرہ نے تو حسب عادت سخت کرخت الفاظ میں رفاعی فقیروں کے اس طرز عمل پر تنقید کی ہے لیکن قطع نظر اس سے یہ تحقیق طلب ہے کہ آخر اس خاص طریقہ کے فقیروں میں یہ باتیں کس راستہ سے آئیں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان اس سلسلہ میں آگے آرہا ہے ممکن ہے کہ اس سے اس مسئلہ پر کوئی روشنی پڑے۔

اس وقت تو میری غرض فقط اتنی ہے کہ امام غزالی کے طریقہ خاص کی سب سے بڑی نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ دماغی بیداری کے ساتھ قلبی بیداری کے مسئلہ کو بھی انہوں نے شریک کردیا تھا، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے مدرسہ کے ساتھ خانقاہ یا خانقاہ کے ساتھ مدرسہ کو جھوڑنے کا کام جہاں تک میں جانتا ہوں سب سے پہلے امام غزالی ہی نے شروع کیا۔ جس کی تفصیلی بحث گزر چکی اور بجنسہ یہی خصوصیت سہروردیہ قادریہ رفاعیہ سلسلہ کے ان تینوں معماروں کی تعلیم و تربیت میں پائی جاتی ہے تینوں حضرات نے علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد باطنی اصلاح کی طرف توجہ کی اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف حضرت شیخ ابو النجیب سہروردی بانی سلسلہ سہروردیہ کے متعلق مورخین اگر یہ لکھتے ہیں کہ :۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) خانقاہی نظام کی ایک بڑی غرض یہی معلوم ہوتی ہے کہ غربا تک ان نعمتوں کو پہنچایا جائے جن پر امیروں نے خصوصی اقتدار جما رکھا ہے۔ بیسیوں تاریخی مثالیں اس سلسلہ میں میں نے پیش کی ہیں۔ سید رفاعی کبیر کے متعلق بھی لوگوں نے لکھا ہے کہ نذور و فتوحات وغیرہ ذرائع سے جو آمدنی بھی ہوتی تھی سب غربا کو کھلا پلا دیا کرتے۔ ۱۲

جس کھنڈر میں ایام سلوک کو حضرت نے گزارا تھا اسی میں آپ نے ایک جانب تو رباط (خانقاہ) بنوائی جن میں آپ کے برگزیدہ صالح اصحاب قیام کرتے تھے اور دوسری جانب اسی میں آپ نے مدرسہ تعمیر کیا تھا۔

(صفحہ ۲۰۹ ج ۴ شذور)

کہتے ہیں کہ اسی جامعیت کی وجہ سے عام طور پر آپ کو لوگ ——

مفتی العراقین وقدوۃ الفریقین (ص)	دونوں عراق، عراق عرب عراق عجم کے مفتی اور دونوں فریق (علماء و صوفیہ) کے پیشوا

کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اور بجنسہ یہی حال ہم سیدنا الامام جیلی القطب کا پاتے ہیں۔ معارف و حقائق کے سوا جن کے متعلق ظاہر ہے کہ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں شیخ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں کہ:۔

"آپ کے مدرسہ میں لوگ آپ سے دن کے اگلے پچھلے حصہ میں تفسیر اور علوم حدیث اخلاقیات اصول اور نحو کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ نیز تمام قرأۃ متواترہ کے ساتھ قرآن ظہر کے بعد خود بہ نفس نفیس لوگوں کو پڑھایا کرتے تھے علاوہ اس کے امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کی فقہ کی بنیاد پر استفتاؤں کا جواب بھی دیا کرتے تھے۔ (ط ۱۲۶ اطبقات صوفیہ)

اسی کا نتیجہ تھا جیسا کہ ابن عماد نے لکھا ہے:۔

لقب مجمع الفریقین وموضح الطریقین وکریم الجدین ومعلم العراقین وتلمذ لہ اکثر الفقہاء فی زمنہ ولبس منہ الخرقۃ المشائخ الکبار۔ (شذور صہ ۱۹۹ ج ۴)	لوگوں نے دونوں فریق (علماء و صوفیہ) کے جمع کرنے والے اور دونوں راستوں کے شارح کریم الجدین (یعنی دادیہال اور نانیہال ہر طرف سے شریف النسب سید) دونوں عراق کے استاذ و معلم کا خطاب آپ کو دے رکھا تھا فقہا علماء ظاہر کی اکثریت آپ کی شاگرد تھی اور بڑے سے صوفیوں نے آپ سے خرقہ درویشی حاصل کیا۔

اور حضرت سید احمد کبیر الرفاعیؒ کے متعلق اس کا ذکر تو کسی نے نہیں کیا ہے کہ علاوہ باطنی و اخلاقی

تربیت وسلوک کے رسمی علوم کی بھی تعلیم آپ کے یہاں دی جاتی تھی لیکن اسی کے ساتھ بالاتفاق لوگوں نے لکھا ہے کہ آپ نے باضابطہ فقہ شافعی کی تعلیم پائی تھی۔ ابن قاضی شہبہ کے الفاظ ابن عماد نے نقل کیے ہیں۔

کان فقیہاً شافعیاً قرأ التنبیۃ وله شعر حسن (صـ۲۶۰ ج۴ شذور)	سید احمد کبیر رفاعی شافعی فقیہہ تھے۔ التنبیہ کتاب خصوصیت سے پڑھی وہ اچھے اشعار بھی کہتے تھے،

اور سچ تو یہ ہے خود سید احمد کبیر سے جب یہ منقول ہے کہ ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ

سلکت کل الطرق الموصلۃ فما رأیت اقرب ولا اسهل ولا اصلح من الافتقار والذل والانکسار۔	ان ساری راہوں پر میں چلا ہوں جو خدا تک پہنچاتی ہیں مگر سب سے آسان اور مناسب ترین راہ مجھے محتاجی ونیازمندی اور شکستگی سے زیادہ کوئی نظر نہ آئی۔

پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ اس محتاجی ونیازمندی وشکستگی کے حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے فرمایا اور اسی کو میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

تعظم امر الله وتشفق علی خلق الله وتقتدی بسنۃ رسول الله (صـ۲۶۰ ج)	خدا کے حکم کا احترام کرو اور خدا کی مخلوق کے ساتھ شفقت مہربانی کے ساتھ پیش آؤ اور رسول اللہ (صلعم) کی سُنّت یعنی طریقہ کی پیروی کرو۔

ظاہر ہے کہ امر اللہ یعنی حق تعالیٰ کے حکم کے احترام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کی شکل ظاہری علوم قرآن وحدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کیے بغیر یقیناً ناممکن ہے اور خلق اللہ کے ساتھ شفقت ومہربانی بھی ان قوانین کے علم ہی پر تو موقوف ہے جو مخلوقات کے باہمی تعلقات کے متعلق خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں [۱]

---

[۱] سید کبیر کا حال اس باب میں عجیب وغریب تھا، بچوں، بوڑھوں معذوروں کی خدمت ان کی زندگی کا سب سے بڑا محبوب مشغلہ تھا اور آپ کی مہربانیاں انسانوں سے متجاوز ہو کر جانوروں تک کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے تھیں، باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

بہر حال اسلام کی چھٹی صدی جسے میں امام غزالی کی صدی کہتا ہوں مسلمانوں میں ہر طبقہ میں عوام ہوں کہ خواص ہوں، خلفاء ہوں یا سلاطین وزراء ہوں یا امراء، علماء ہوں یا صوفیاء ہر طبقہ میں ایسی ہستیاں نمایاں نظر آتی ہیں جن کو دیکھ کر اوروں کو نظر آتا ہو نہ آتا ہو لیکن اضطراراً میرا ذہن امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی مخلصانہ کوششوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ نتائج تلقین غزالی سے کسی نہ کسی حیثیت سے متاثر ہیں۔

اس تصوف و سلوک کے طریقہ کو دیکھیے، پانسو سال کے اس طویل عرصے میں مختلف بزرگوں کی طرف سے یہ راہ بھی مسلمانوں کے سامنے مختلف خصوصیات کے رنگ میں رنگین ہو کر پیش ہوتی رہی لیکن علوم ظاہری و رسمی تعلیم کے ساتھ باطنی سلوک و تربیت کے دامن کو باندھ کر چلنا امام غزالی کو یہ راہ اسی شکل میں ملی۔ وہ پہلے وقت کے سب سے بڑے عالم کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ پھر جیسا کہ آپ دیکھ چکے حقیقت و صداقت کی تلاش کا جذبہ ان پر مسلط ہوا۔ اپنی تلاش میں کامیاب ہونے کے بعد دوسروں کے سامنے بھی آپ نے اسی راہ کو پیش کیا۔ اور یوں طریقہ غزالیہ کی ابتدا ہوئی پھر ان کے بعد اسی صدی میں جس میں وہ اس دنیا سے تشریف لے گئے ظاہر و باطن کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے والے بزرگوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جس میں سیدنا الامام الجیلی اور شیخ سہروردی سید کبیر رفاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اسی بغداد اور اس کے اطراف و نواحی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ مشہور ہے کہ بلی ایک دفعہ اسی کپڑے پر سو گئی جو آپ پہنے ہوئے تھے نماز کا وقت آگیا بجائے بلی کے جگانے کے آپ نے کپڑے کو قینچی سے تراش نماز سے فارغ ہو کر جب آئے بلی اٹھ چکی تھی بطور پیوند کے پھر اس کو سلوا لیا گیا۔ آپ کے گاؤں کے باہر ایک کتا بیمار زخموں سے چور پڑا ہوا تھا خبر ملی وہیں تشریف لے گئے کتے پر خیمہ نصب ہوا اس کو غسل دیا جاتا تھا تیل کی مالش ہوتی تھی، آخر میں مر گیا تو بڑے دھوم دھام سے دفن کیا گیا۔ اسی سلسلہ کا مشہور لطیفہ آپ کا بھی ہے۔ خواب میں ایک صاحب نے حضرت والا کو مقعد صدق، جو قرب کے قرآنی مقام کی تعبیر ہے دیکھا آکر مرید ہوا اچانک ایک دن اس نے دیکھا کہ آپ کی بیوی صاحبہ آنچ دینے کی لکڑی زنان خانے میں تڑاتڑ مار رہی ہیں سید صاحب خاموش پٹ رہے ہیں۔ مرید کو بڑا طیش آیا، پھر دریافت کر کے رقم کے ساتھ حاضر ہوا کہ ایسی عورت کو الگ کر دیجیے فرمایا کہ مقعد صدق میں مجھے تم ہرگز نہ پاتے اگر ان کے سلوک پر صبر سے کام نہ لیتا۔

(شذور ص۲۶ ج۴)

ہیں اسی اجتماعی طریقہ کے احیاء و اشاعت میں منہمک نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان بزرگوں کے دیکھنے والوں کے سامنے امام غزالی اور ان کی خانقاہ و مدرسہ اور ان کی کتابیں احیاء العلوم و کیمیائے سعادت جھلکنے لگیں تو اس پر تعجب کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

ہوا یہی کہ سلوک و معرفت کے اور طریقے جو امام غزالی سے پہلے مروج تھے گو کسی نہ کسی شکل میں وہ آئندہ بھی رواج پذیر رہے۔ لیکن غزالی کے طریقہ خاص کو اجاگر کرنے والی ہستیاں پے در پے مسلمانوں میں جو جلوہ گر ہوتی رہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثریت کا رجحان اس سلسلہ میں اسی طریقہ کی طرف ہو گیا۔ سب سے بڑا فائدہ اس کا یہ ہوا کہ علماء صوفیاء یا رسمی علوم کے نمائندے ملا اور مذہب کی روح کو زندہ کر کے قدم بڑھانے والے فقراء میں اب تک ایک قسم کی دوئی جو نظر آتی تھی اس خاص طریقہ کی ترویج عام نے اس خلیج کو بڑی حد تک پاٹ دیا۔ ابھی آپ نے سیدنا الامام الجیلی اور شیخ الوالنجیب سہروردی کے متعلق مسلمانوں کے تاثرات کی تاریخی تعبیر کو قدوۃ الفریقین موضح الطریقین مجمع الفریقین وغیرہ الفاظ کی شکل میں جو پایا تو دراصل یہ اسی تاریخی مصالحت کا اجتماعی اعتراف ہے۔

طریقۂ غزالیہ کے حسنِ قبول کی وجوہ

قلب و قالب کی وابستگی

بہرحال ذکر حجۃ الاسلام امام غزالی اور ان کے طریقۂ خاص کے نتائج کا ہو رہا تھا، کہہ یہ رہا تھا کہ اس وقت مسلمانوں میں جن طرق و سلاسل کو عام حسن قبول حاصل ہے اور مختلف بزرگوں کے اسمائے گرامی کی طرف وہ منسوب ہیں، میرا خیال ہے کہ ان کی عام مقبولیت کی وجہ یہی ہوئی ہے کہ اسلام کے جسم اور روح یا قالب قلب دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پوری قوت کے ساتھ پیوستہ اور وابستہ رکھنے کی کوشش ان عام طریقوں میں چونکہ کی گئی ہے شعوری اور غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی عمومیت کا یہی مطالبہ بھی تھا اسی لیے ان ہی طریقوں کو حسن قبول بھی حاصل ہوا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ ان سارے طرق اور سلاسل کے مرکزی اکابر امام غزالی کی صدی یا اس صدی کے بعد ہی پیدا ہوئے ہیں پھر کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ امام غزالی کے مساعی کو اس میں دخیل نہ سمجھا جائے، اور یہ بڑا کام تھا جو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ قدرت کی طرف سے لیا گیا۔ مدرسہ اور خانقاہ میں اسی کے بعد چولی دامن کا ساتھ ہو گیا۔ عام طور پر مسلمانوں میں واقعی صاحب کمال وہی سمجھے جانے لگے جو دماغ کے ساتھ دل کو اور دل کے ساتھ دماغ کو بیدار رکھنے میں کامیاب نظر آتے تھے۔ علماء اور صوفیہ میں امام غزالیؒ سے پہلے چند صدیوں سے ایک قسم کی خلیج حائل ہو گئی تھی جس کا زبانی چرچا مختلف لطیفوں کی شکل میں گو بعد کو بھی باقی رہا بلکہ اب بھی باقی ہے، اس قسم کے فقرے کہ ایں قال است ترا ازیں خبرے نیست یا اس کے برعکس ایں است کہ ترا ازیں خبرے نیست[1] یا جیسا کہ خود امام غزالی

---

[1] مولینا رومؒ اور پیر شمس تبریزی کی ابتدائی ملاقات کے وقت کہتے ہیں کہ دونوں کا یہ مکالمہ اس وقت ہوا تھا جب شمس تبریز نے مولینا کی قلمی کتابوں کو حوض میں ڈال کر جوں کی توں نکال کر دکھایا تھا کہ کتابیں پانی سے قطعاً تر نہ ہوئی تھیں۔

ہی کے متعلق خود ان کے بھائی احمد غزالی کا یہ لطیفہ کتابوں میں جو نقل کیا جاتا ہے کہ :۔

کسے از حال برادرش حجۃ الاسلام پرسیدہ کہ کجاست، گفت در خون نشستہ، چوں تفتیش کردند در فکر مسئلہ حیض بود۔
(صفحہ ۳۸۰ لطائف اشرفی)

کسی نے (احمد غزالی) سے ان کے بھائی امام حجۃ الاسلام کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہیں بولے خون میں بیٹھے ہیں جب دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ حیض کے مسئلہ میں غور و فکر کر رہے ہیں۔

ملائیت و صوفیت میں اتحاد

بہرحال اس واقعہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی کے اندر علماء اور صوفیہ کے نام سے دو طبقے خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہو گئے تھے۔ اور باہم ان دونوں طبقوں میں ایک خاص قسم کا تعلق پیدا ہو گیا تھا علماء کے طبقے سے تعلق رکھنے والے حضرات میں صوفیوں کی جانب سے گونہ گرانی پائی جاتی تھی اور یہی حال صوفیوں کا بھی تھا، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی تعلیمات نے ان دونوں طبقوں کو ملا دیا۔

قبلِ امام دور میں صوفی و مُلّا کی آویزش کے دو تاریخی واقعے

(۱) صوفی بہ تعاقب مُلّا

پہلا واقعہ ایک صوفی کا ہے جس کی طرف سے ایک عالم کی گرفت کی گئی دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی ہجری کی ابتدائی سالوں کے ایک مشہور بزرگ حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ شیخ سعدی نے بوستاں میں ان کے اصم (بہرے) کے نام سے مشہور ہونے کی وجہ[1] بیان کر کے عوام میں بھی ان کی شہرت کو عام کر دیا ہے، خلیفہ ہارون الرشید اور اس کے بعد بھی بہت سے خلفاء عباسی کا زمانہ انہوں نے پایا ہے بہرحال جس واقعہ کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ

---

[1] اس قصہ کا ذکر خطیب نے بھی اپنی تاریخ بغداد میں کیا ہے۔ ابوالحسن بن علی الدقاق اس کے راوی ہیں، کہتے تھے کہ حاتم سے کوئی عورت کوئی مسئلہ پوچھ رہی تھی اسی حال میں اس سے باد مخالف کا صدور ہو گیا عورت بیچاری شرما گئی حاتم نے اسی وقت اپنے اوپر ایسا حال طاری کیا کہ گویا وہ اونچا سنتے ہیں، اور مسئلہ کو اس طرح دریافت کرنے لگے جیسے کوئی ثقل سماعت میں مبتلا دریافت کرتا ہو۔ عورت یہ خیال کر کے کہ ان کو خبر نہ ہوئی اطمینان کیا اس کے بعد میں کہتے ہیں کہ حاتم جب تک زندہ رہے اس حال کو باقی رکھا اور اسی لئے وہ اصم (بہرے) کے نام سے مشہور ہوئے، (خطیب ص ۲۴۴ ج ۸) حاتم بڑے ذہین اور ظریف آدمی تھے کسی نے کہا کہ مجھے نصیحت کیجئے، بولے کہ اسی جگہ جا کر گناہ کیا کرو جہاں اللہ میاں نہ ہوں۔ کہا کرتے تھے کہ گھر میں سب کچھ رکھتے ہوئے جو خدا کے آگے گڑگڑاتے ہیں خدایا مجھے روزی دے یہ کتنے مسخرے ہیں نہ رہے تب مانگنا ٹھیک ہے۔ لوگوں نے کہا کہ آپ بہت مطمئن نظر آتے ہیں بولے کہ جس کو یقین ہو کہ میری روزی دوسرا کھا نہیں سکتا وہ متردد کیوں ہو، ایک دفعہ کہا کہ جب سے اپنے آپ کو زمین پر چلنے والا دابہ (چوپایہ) میں نے یقین کیا ہے اسی وقت سے یہ یقین بھی پیدا ہو گیا کہ میری روزی کے متکفل اللہ میاں ہیں، قرآن میں بھی یہی فرمایا گیا ہے۔ ۱۲۔

ہے کہ بلخ سے حاتم حج کے ارادہ سے نکلے، راستہ میں شہر رے میں ٹھہرے ایک تاجر کے مہمان تھے تاجر نے ایک دن ان سے پوچھا کہ شہر کے ایک عالم بیمار ہیں میں ان کی عیادت کے لئے جا رہا ہوں۔ حاتم نے کہا کہ عالم ہیں تو میں بھی چلتا ہوں، فرمایا کہ :۔

النظر الی الفقیہ عبادۃ — فقیہہ کی طرف دیکھنا تو عبادت ہے۔

دراصل یہ رے کے قاضی القضاۃ محمد بن مقاتل تھے اس زمانے میں بیمار ہو گئے تھے جب تاجر کے ساتھ قاضی صاحب کے دروازے پر حضرت حاتم اصم پہنچے تو دیکھا کہ دروازہ کیا ہے وہ تو بڑی عظیم الشان ڈیوڑھی کا آستانہ ہے بولے کہ :۔

باب عالم ھذا الحال — ایک عالم کے دروازہ کا یہ حال؟

اتنے میں اندر سے طلبی آئی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو دیکھتے ہیں کہ :۔

پھولوں کا چمن ایک طرف ہے فوآرے سے پانی اچھل رہا ہے، آگے ہر ہر کمرے کے سامنے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ لوگوں کا ایک مجمع ہے (یعنی نوکروں چاکروں کا)

حاتم اصم کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی آخر قاضی صاحب کے سامنے پہنچے دیکھا کہ :۔

"ایک مکلف گدا بچھا ہوا ہے اور اسی پر قاضی صاحب آرام فرما رہے ہیں۔"

مہمانوں کو دیکھ کر قاضی صاحب اپنی مسند پر بیٹھ گئے اور حاتم اصم سے بھی کہا کہ تشریف لایئے، بیٹھئے، لیکن وہ کھڑے ہی رہے جب قاضی صاحب نے بیٹھنے پر اصرار کیا اور ان کو دیکھا کہ انکار پر مصر ہیں تو حاتم سے پوچھا کہ کیا آپ کسی ضرورت سے تشریف لائے ہیں: بولے ہاں! قاضی نے کہا تو فرمایئے کیا ضرورت ہے؟ حاتم نے کہا کہ ایک مسئلہ دریافت کرنا چاہتا ہوں، قاضی نے کہا پوچھئے، بولے ذرا اطمینان کے ساتھ آپ بیٹھ جایئے، غلام سامنے کھڑے تھے، تکیئے قاضی صاحب کی پیٹھ کے پیچھے رکھ دیئے گئے اور ان ہی سے ٹیک لگا کر وہ بیٹھ گئے انتظار کرنے لگے کہ حاتم کیا پوچھتے ہیں۔ پھر یہ مکالمہ دونوں میں شروع ہوا۔

حاتم :۔ آپ نے یہ علم کن لوگوں سے سیکھا ہے؟

قاضی :۔ بڑے بڑے معتبر اساتذہ سے۔

حاتم :۔ ان کے پاس علم کہاں سے آیا تھا ؟

قاضی :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے

حاتم :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان کے پاس علم کہاں سے آیا تھا۔

قاضی :۔ جبرئیل علیہ السلام لائے تھے۔

حاتم :۔ ہاں! تو ذرا یہ فرمایئے آپ کے پاس علم کا جو ذخیرہ ہے وہی ذخیرہ جسے اللہ سے جبرئیل نے پایا اور جبرئیل نے رسول اللہ کو پہنچایا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ذخیرہ صحابیوں تک پہنچا، اور صحابیوں سے آپ کے بڑے بڑے معتبر اساتذہ تک پہنچا، اس ذخیرے میں کہیں اس کی بھی اطلاع دی گئی ہے کہ جس کا گھر امیروں کے گھر کے مانند ہوگا اور جس کے پاس امیرانہ ٹھاٹ باٹ ہوگا اللہ کے نزدیک اسی کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہوگا۔

قاضی :۔ نہیں یہ تو میں نے نہیں سنا۔

حاتم :۔ یہ نہیں سنا تو پھر کیا اس کا علم بھی آپ تک پہنچا ہے یا نہیں کہ دنیا سے رخ پھیر کر آخرت کی تعمیر میں جو زیادہ مشغول رہیں گے اور غربا و مساکین سے جو زیادہ محبت کریں گے اور آئندہ زندگی کی تیاری کرتے رہیں گے خدا کے نزدیک ان ہی کا مرتبہ بلند ہوگا ؟ اسی کے ساتھ حاتم اصم کو جوش آیا اور اسی جوش میں فرمانے لگے،

تم نے اپنے آپ کو کن لوگوں کی زندگی سے مطمئن کر رکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابیوں اور امّت کے صالحین کی زندگی سے؟ یا فرعون اور نمرود کی زندگی میں تمہارے قلب نے اطمینان کو پایا ہے وہی فرعون اور وہی نمرود جس سے اینٹ اور چونے کی تعمیر کی ابتدا ہوئی۔

قاضی ابن مقاتل سن رہے تھے اور حاتم فرماتے جاتے تھے کہ

اے علماء سوء (برے علماء) تم ہی جیسوں کو ایک بیچارا غریب جاہل مسلمان دنیا دار دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ جب عالم اس حال میں ہے تو پھر اپنے آپ کو میں اس سے زیادہ برے حال میں نہیں پاتا۔

کہتے ہیں کہ بیچارے قاضی صاحب کے ہوش حاتم کی اس تقریر سے جاتے رہے۔ بجائے گھٹنے

کے بیماری میں اور اضافہ ہو گیا۔ اسی حال میں چھوڑ کر حاتم ان کے گھر سے باہر نکل آئے۔ ؎ ۱

خطیب نے محمد بن مقاتل کے حال میں لکھا ہے کہ:۔

انتقل بالاخرة الی مکة فجاور بها حتی مات (ص۲۷۵ ج ۳)

آخر میں محمد بن مقاتل مکہ منتقل ہو گئے اور وہیں قیام اختیار کیا، تاآنکہ مکہ میں ہی وفات ہوئی۔

کون کہہ سکتا ہے کہ حاتم اصم کے اسی وعظ نے ان میں اس انقلاب کو پیدا نہیں کیا تھا؟

(۲) مُلّا پہ تعاقب صوفی

خیر یہ قصہ تو ایک صوفی کا تھا جس میں بتایا گیا ہے کہ عالم کی ڈھٹر مکیڑ کی گئی اور غریب مولوی سٹ پٹا کر رہ گیا۔ اب سنیے دوسری داستان جس میں صوفی کا تعاقب طبقۂ علماء کے ایک بزرگ کی طرف سے ہوا۔ میرے نزدیک یہ ملائیت اور صوفیت کی تاریخ کا بڑا اہم واقعہ ہے۔ بہر حال میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ المحاسبی جن کا نام حارث بن اسد

؎ ۱ لکھا ہے کہ قزوین کے طنافسی سے بھی حاتم اصم کی ملاقات ہوئی، تکلف اور ترفع میں ابن مقاتل سے بھی وہ بڑھے ہوئے تھے، حاتم نے ایک ناواقف کی شکل میں قاضی طنافسی سے وضو کرنے کا طریقہ پوچھا انہوں نے بتا دیا، بولے کہ میں آپ کے سامنے وضو کرکے دکھاتا ہوں کوئی غلطی رہ جائے تو درست کر دیجئے گا۔ یہ کہہ کر وضو کرنے لگے، ابتدا میں تو تین تین دفعہ ہر چیز کو دھویا جب ہاتھ دھونے کی باری آئی تو بجائے تین دفعہ کے چار دفعہ ہاتھوں کو دھویا۔ طنافسی نے ٹوکا کہ تم نے غلطی کی، بولے کیا غلطی ہوئی قاضی نے کہا کہ تین بار سے زیادہ دھونا پانی کو بیکار ضائع کرنا ہے اور شریعت میں اس کو بھی اسراف (فضول خرچی) قرار دیا گیا ہے۔ تب حاتم نے سر اٹھایا اور کہنے لگے کہ سبحان اللہ قاضی صاحب میں غریب آدمی تو ایک چلو بہا کر اسراف کا مرتکب ٹھہرایا گیا اور جناب والا نے یہ طمطراق جو اکٹھا کر رکھا ہے آخر یہ کیا ہے۔ طنافسی نے گردن جھکا لی، حاتم بھاگ گئے، یہ سارے قصے حلیۃ الاولیاء میں ہیں اسی میں ہے کہ حاتم جب مدینہ پہنچے تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کا مدینہ (شہر) ہے۔ لوگوں نے کہا کہ مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے یعنی رسول اللہ کا شہر ہے۔ بولے میں اس محل میں نماز دو رکعت ادا کرنا چاہتا ہوں جس میں رسول اللہ رہتے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محل کہاں تھا کھجور کی شاخوں پر مٹی لپیٹ کر جس مکان کی دیوار بنائی گئی تھی اس میں رہتے تھے۔ حاتم نے کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی کوٹھیاں کہاں ہیں یہی جواب اس کا بھی دیا گیا۔ فرمایا تب بگڑے کہ تم نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر کو نمرود اور فرعون کا شہر بنا رکھا ہے۔ (ص۸۲ ج ۸ حلیۃ الاولیاء۔)

ہے دوسری صدی کے آخر اور تیسری کے ابتدائی سالوں میں بغداد میں انہوں نے شہرت حاصل کی ان کی جلالت قدر کے لیئے یہی کافی ہے کہ صوفیہ کے سید الطائفہ سیدنا جنید بغدادی قدس سرہٗ العزیز کا بھی شمار محاسبی کے صحبت یافتوں میں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صوفیہ کے نام سے مسلمانوں میں ایک طبقہ کا ظہور تو محاسبی سے بہت پہلے ہو چکا تھا حبیب عجمی، فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادہم، شفیق بلخی، ذوالنون مصری عبدالرحیم دیبلی، حاتم اصم، اور بھی بیسیوں اکابر محاسبی سے پہلے گزر چکے تھے لیکن اسلام کے جس شعبہ خاص کی خدمت اور نمائندگی کی وجہ سے اس طبقہ کو امتیاز کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اب تک اسلامی علوم کے اس شعبہ کے مسائل و حقائق کو باضابطہ کتابی قالب کسی نے عطا نہیں کیا المحاسبی پہلے بزرگ تھے جنہوں نے دوسری صدی ہجری کے آخری سالوں میں اس کام کو شروع کیا۔ خطیب نے لکھا ہے کہ :۔

للحارث کتب کثیرۃ فی الزھد (طا۲۱ ج ۸)	زہد (تصوف) میں حارث کی بہت سی کتابیں ہیں۔
کتب کثیرۃ الفوائد جمۃ المنافع (صـــــ)	ان کی کتابیں فوائد سے لبریز اور بہت زیادہ نفع بخش ہیں۔

حارث کی ان کتابوں کو مسلمانوں میں بڑا حسن قبول خود ان کی زندگی ہی میں حاصل ہوا۔ عام طور پر بکثرت ان کی کتابیں لوگ پڑھنے لگے، علماء جو اب تک صوفیوں کے وجود ہی سے پریشان تھے جب "صوفیت" کتابی قالب میں گھر گھر پہنچنے لگی تو مخالفت کہیئے یا رقابت کا جو جذبہ اب تک کچھ دبا دبا سا تھا زیادہ تر اس کا اظہار اشاروں اور کنایوں میں کبھی کبھی کھلے کھلے الفاظ میں معمولی لوگوں ہی کی طرف سے نہیں بلکہ بڑی بعض بڑی ذمہ دار ہستیوں کی طرف سے "صوفیت" پر سخت تیز و تند تنقیدیں ہونے لگیں۔ انتہا یہ کہ وقت کے امام المحدثین رئیس الحفاظ امام ابو ذرعہ[1] رازی کی طرف تو لوگوں نے یہ الفاظ منسوب کیئے ہیں کہ محاسبی کی کتابوں

---

[1] علم حدیث کے ائمہ و رجال سے جو نا واقف ہیں زاہدان کے لیئے اتنے معلومات غالباً حافظ ابوزرعہ کی اہمیت کے لیئے کافی ہو سکتے کہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ بغداد کے پل سے گزر کر آنے والوں میں ابوزرعہ سے بڑا حافظ حدیث کوئی نہیں آیا۔ ان ہی کا بیان ہے کہ نفلی عبادتوں کو ابوزرعہ کے علمی مذاکرے کا میں نے بدل خیال کیا۔ چھ لاکھ حدیثیں ان کو زبانی یاتھیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے متعلق فرمایا کرتے تھے،

هذه كتب بدع وضلالات — یہ ساری کتابیں صرف خودساختہ بدعات اور گمراہیاں ہیں۔ (ص۲۱۵ ج ۸)

جنہیں حارث کی کتابوں میں پڑھنے میں مزہ ملتا تھا اور فائدے حاصل ہوتے تھے، جب حافظ سے کہتے کہ حضرت ان کتابوں سے بڑی چونک پیدا ہوتی ہے، تو بگڑتے اور فرماتے،

من لم يكن له في هذا الكتاب عبرة فليس له في هذا الكتب عبرة۔ — اللہ کی کتاب ہے جس میں چونک نہ پیدا ہو تو ان کتابوں سے بھی اس میں چونک پیدا نہ ہوگی۔

پھر غصے میں عام مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرماتے:۔

لوگو بتاؤ کیا مالک بن انس، سفیان ثوری، اوزاعی، یا ان ہی جیسے دوسرے ائمہ جو پہلے گزرے ہیں ان بزرگوں نے اس قسم کے مسائل جن سے (حارث) اپنی کتابوں میں بحث کرتے ہیں یعنی وساوس خطرات اور وہی باتیں جو وہ کرتے اور لکھتے ہیں کیا کسی نے ان پر کتابیں لکھی ہیں؟

پھر علانیہ اپنا یہ دوٹک فیصلہ سناتے کہ

هؤلاء قوم خالفوا اهل العلم (ص۲۱۵ ج۸) — صوفیوں کا گروہ اہل علم (یعنی طبقۂ علماء) کے خلاف چل رہا ہے۔

فرماتے کہ یہ صوفی

ياتونا مرة بالحارث المحاسبي و مرة بعبد الرحيم الديبلي و مرة بحاتم الاصم ومرة بشقيق — کبھی ہمارے سامنے حارث محاسبی کا قول پیش کرتے ہیں کبھی عبد الرحیم دیبلی کا کبھی حاتم اصم کا کبھی شفیق کا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کہتے تھے کہ دولاکھ حدیثیں مجھے اس طرح ازبر ہیں جیسے قل ہو اللہ کی سورۃ انہیں کا لطیفہ ہے کہ ایک شخص گفتگو میں قسم کھا بیٹھا کہ حافظ ابوزرعہ کو دولاکھ حدیثیں زبانی یاد نہ ہوں تو میری بیوی کو طلاق ہے، قسم کے بعد حافظ کے پاس آیا بولے کہ تمہاری بیوی کو طلاق نہ پڑی مطمئن رہو۔ ۱۲

پھر مسلمانوں میں عام عقیدت صوفیہ کی طرف سے جو پھیل چکی تھی اور پھیلتی جا رہی تھی خصوصاً حارث محاسبی کی کتابوں نے اس کی اشاعت عام میں تازیانے کا جو کام کیا، اسی حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حافظ فرماتے کہ :۔

ما اسرع الناس الی البدع — بدعت کی طرف چل پڑنے میں لوگ کتنی جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔

یہ ایک ہزار سال سے زیادہ زمانے کا قدیم ترین وثیقہ "ملا اور صوفی" کی باہمی لاگ ڈانٹ کی تاریخ کا ہے، جہاں تک میرے محدود معلومات ہیں ان کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اتنے صاف صاف کھلے کھلے تیز و تند الفاظ میں صوفیوں کی تنقید طبقۂ علماء کی طرف سے شاید اب تک نہیں کی گئی تھی اور یہ عجیب بات ہے کہ آج بھی جب کوئی مولوی صوفی کے خلاف کچھ کہتا ہے تو تقریباً ان ہی باتوں کو دہراتا ہے جو حافظ ابوزرعہ نے ہزار سال پہلے دہرائی ہیں، فرق صرف اجمال و تفصیل کا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو تصوف کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے حافظ ابوذرعہ کی یہ تنقید سنگِ میل کا کام دے سکتی ہے۔

حارث سے متعلق امام احمد بن حنبل کی رائے

بہرحال میں جس قصے کو سنانا چاہتا تھا اب اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، مطلب یہ ہے کہ المحاسبی کی کتابوں سے مسلمانوں میں عام ہلچل جو پیدا ہوئی اور روز بروز دیکھا جا رہا تھا کہ اس کی شدت بڑھتی جا رہی ہے تو عام علماء جیسا کہ عموماً دستور ہے تجربہ سے پہلے تنقید پر آمادہ ہو گئے لیکن اسی زمانہ میں مسلمانوں کو حضرت امام احمد بن حنبل نور اللہ مرقدہٗ کی شکل میں ایک ایسی نعمت عطا ہوئی تھی جس کی بدولت خدا ہی جانتا ہے کہ فتنوں کے کتنے دروازے بند ہوئے۔ دین کے فروعی یا غیر بنیادی مسائل کی تشریح و توجیہ میں اہل علم کے مختلف نقاط نظر کی وجہ سے حنفیت و مالکیت شافعیت و حنبلیت وغیرہ کی شکل میں جو اختلافات امت مرحومہ میں پائے جاتے ہیں اور آج ان اختلافات کو ہم جو اس حال میں پا رہے ہیں کہ ایک حنفی اس کی بالکل پرواہ نہیں کرتا کہ جس مصنف کی کتابیں وہ پڑھ رہا ہے وہ امام مالک کی تشریحی مہارت پر اعتماد رکھتا ہے یا امام شافعی جو توجیہ ان مسائل کی کرتے ہیں ان کو مانتا ہے، یہی نہیں بلکہ استاد تک بنانے میں مسلمانوں نے اس کی پروا نہ کی، حد یہ ہے کہ استاد سے بھی جس کا مرتبہ بلند اور کہیں زیادہ بلند ہے یعنی پیر تک بنانے میں یہ نہیں دیکھتے کہ ہم جسے اپنا پیر بنا رہے ہیں اور جس کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں وہ

ان اماموں میں سے کس امام کا پیرو ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے پیر سیدنا الامام الشیخ الجیلی رضی اللہ تعالیٰ سمجھے جاتے ہیں، جیسا کہ دنیا جانتی ہے آپ حنبلی تھے لیکن آپ کے ماننے والوں میں جہاں تک میں جانتا ہوں زیادہ تر تعداد ان ہی کی شریک ہے جو حنبلی نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اختلافات کے باب میں رائی کو پہاڑ بنا دینا جس انسانی فطرت کا ادنیٰ کرشمہ ہے بحیثیت انسان ہونے کے چاہئیے تو یہی تھا کہ مسلمان بھی اپنے گھر کے ان اختلافات کو باہر کا اختلاف بنا لیتے لیکن اسلامی فقہ کی تاریخ سے جو واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضرت امام احمد بن حنبل کے مسلک صلح کل نے ابتدا ہی میں فتنے کی اس آگ کو ایسے حکیمانہ طریقوں سے سجھا دیا کہ اختلافات گو باقی رہے لیکن بجائے "زحمت" کے "امت" مرحومہ کی دینی زندگی کے وقتی مشکلات کے حل کرنے میں یہی اختلاف رحمت کا کام دیتا رہا ہے جس کا قصہ طویل ہے میری غیر مطبوعہ کتاب "تدوین فقہ" سے حضرت امام کے ان مساعی قیمہ کا آپ کو اندازہ ہوگا، جو اس راہ میں آپ نے انجام دی ہیں "صلح کل" اور اختلافات کے باب میں ہر فریق کے

لہ اس مسئلہ کی تفصیل کے لیے میرا مقالہ "تدوین فقہ" پڑھیئے افسوس ہے کہ صرف ایک مقالہ کی شکل میں مضمون کا ابتدائی حصہ اب تک شائع ہو سکا ہے تاہم اس میں بھی آپ کو اس سلسلہ کے متعلق بعض اہم باتیں مل جائیں گی اپنی کتاب میں میں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی فقہ حقیقی معنوں میں امام ابوحنیفہ کی فقہ ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے شخصی طور پر فتووں کے جو جوابات دیئے تھے بعد کو ان کے مذہب کے ایک عالم اسد بن فرات نے حنفی فقہ کی تعلیم حاصل کر کے اسی ترتیب پر امام مالک کی فقہ کو مرتب کر دیا۔ یوں مالکی فقہ نے ایک مستقل مکتب خیال کی شکل اختیار کی اس کے بعد امام شافعی آئے ان کی حیثیت تدوین قوانین اسلامی کے سلسلہ میں حزب مخالف کی ہے یعنی شریعت کی اصل سرچشمہ (کتاب و سنت) کو پیش نظر رکھ کر فقہی نتائج کی تنقید امام شافعی کا حقیقی کام یہی ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے مذاہب و ادیان کی طرح اسلام اپنے سرچشمہ سے دور نہیں ہوا، امام شافعی کے بعد امام احمد بن حنبل نے مصالحت کی راہ پیش کی تقریباً ہر اختلافی پہلو کے جواز کی گنجائش اپنے وسیع معلومات کی روشنی میں آپ نے نکالی، میرا خیال ہے کہ فقہی اختلافات نے کسی زمانے میں خطرناک صورت اسلام کی طویل تاریخ میں جو اختیار نہیں کی تو اس میں بہت زیادہ دخل امام احمدؒ کی مخلصانہ کوششوں کو ہے۔ بہر حال اسی کا نتیجہ ہے کہ پچاس ساٹھ کروڑ کی تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمانوں میں فرقہ بندی کا عارضہ نہ پھیل سکا۔ بحمد اللہ سارے عالم کے مسلمانوں کی اکثریت اہل سنۃ و الجماعۃ کے طبقہ سے تعلق رکھتی ہے، ان کے مقابلہ میں اقلیت قلیلہ صرف ارباب امامیہ یعنی شیعوں کی ہے۔ ۱۲۔

صحیح نقطۂ نظر کی تحقیق کا جو فطری میلان امام احمد میں قدرتاً ودیعت تھا، جہانتک میں خیال کرتا ہوں اسی کا نتیجہ تھا کہ محاسبی کے خلاف جو طوفان عام طبقۂ علماء میں پھوٹ پڑا تھا اس کے متعلق بھی امام نے بجائے سنی سنائی باتوں کے چاہا کہ واقعہ کی براہِ راست خود تحقیق کرنی چاہیئے۔ ایک صاحب جن کا نام اسمٰعیل بن اسحاق السراج تھا شماران کا وقت کے معتبر محدثین میں کیا گیا ہے، بڑے بڑے ائمہ سے حدیث کا علم انہوں نے حاصل کیا تھا، رہنے والے نیشاپور کے تھے بغداد میں تجارت کا کاروبار کرتے تھے اور اسی کے ساتھ علم حدیث کی خدمت میں بھی وہ اپنی بساط کے مطابق مشغول رہتے یوں تو عام اہل علم ودین سے ان کا میل جول تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے تھے خطیب نے ان کے اساتذہ کے نام گنواتے ہوئے امام احمد کا نام جہاں لیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ :-

کان له اختصاص باحمد بن حنبل — امام احمد بن حنبل کے ساتھ خاص تعلق ان کا تھا۔

(تاریخ بغداد ص۹۲ ج ۶)

بہرحال اسمٰعیل میں معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری علوم کے ساتھ کچھ دوسری لٹک بھی پائی جاتی تھی، حارث محاسبی سے ان کا تعلق اسی جستجو کے سلسلہ میں پیدا ہو گیا تھا، محاسبی ان کے یاں آمدورفت رکھتے تھے اور وہ بھی ان کے حلقۂ خاص میں کبھی کبھی شریک ہوا کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل نے اسمٰعیل[۱] ہی کو واسطہ بنانے کا ارادہ کیا۔ خطیب کی روایت ہے کہ ایک دن امام نے اسمٰعیل سے پوچھا کہ :-

مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ حارث یعنی المحاسبی کی تمہارے پاس بہت زیادہ نشست رہتی ہے،

اس تمہید کے بعد امام نے فرمایا کہ :-

کیا ایسا کر سکتے ہو کہ اپنے گھر تم حارث کو بلاؤ اور مجھے کسی ایسی جگہ بٹھا دو کہ وہاں سے حارث کی باتیں براہ راست میں خود سن سکوں۔

میرے نزدیک امام جیسے بھاری بھرکم آدمی کے لیے اس طریقہ سے چھپ کر بیٹھنے کا ارادہ اور اس

---

[۱] جیسا کہ بتا چکا ہوں دراصل یہ نیشاپور کے رہنے والے تھے لیکن طلب علم کے شوق میں خود بھی اور ان کے بھائی ابراہیم و محمد بغداد چلے آئے تھے۔ پڑھنے کے بعد حدیث کا درس بغداد میں دینے لگے۔ سنہ ۲۹۳ھ میں بمقام بغداد ہی وفات (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ارادے کا اظہار اور اس سے بھی زیادہ کسی کو کسی خاص کام کے لیے تکلیف دینے پر آمادہ ہو جانا یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے حضرت امام کے حالات اور ان کی فطری خصوصیات[۱] سے جو واقف ہیں یقیناً ان کے لیے اس کا باور تک کرنا مشکل ہے کہ اپنے کسی شاگرد سے انہوں نے ایسی خواہش کی تھی؟ اور اسی سے فتنہ کی اس آگ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جو علماء اور صوفیہ کے درمیان اس زمانے میں خصوصاً حارث کی کتابوں کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۔ ہوئی ۔ ایک دلچسپ لطیفے کا خطیب ہی نے ان کی وفات کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے یعنی اسمٰعیل کی وفات کے بعد ان کے بھائی محمد بن اسحٰق بغداد سے چلے گئے لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے بغداد جیسے شہر کو کیوں چھوڑ دیا، بولے کہ بھائی کیا کہوں میرے بھائی پچاس سال تک بغداد میں رہے لیکن ان کی وفات ہوئی اور جنازہ اٹھایا گیا تو سڑک پر میں نے سنا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے پوچھا کہ کس کا جنازہ ہے، جواب میں کہا گیا کہ۔ غریب کان هنا (یعنی ایک پردیسی غیر ملکی بغداد میں رہتا تھا اسی کا جنازہ ہے) محمد کہتے تھے کہ جس وقت یہ فقرہ میرے کان میں پڑا بے ساختہ انا للہ میری زبان پر جاری ہو گیا، دل میں کہنے لگا کہ پچاس سال تک قیام اور علم میں مشہور ہونے کے بعد بھی کہا جاتا ہے کہ غریب غیر ملکی یہاں تھا بس اسی کے بعد بغداد سے روانہ ہو جانے کا میں نے فیصلہ کر لیا۔ (ص ۲۹۳ ج ۶-)

[۱] امام کے وقار و تمکین کا اندازہ آپ کو ان مثالوں سے ہو سکتا ہے جس کا ذکر ان کے سوانح نگار اپنی کتابوں میں کرتے ہیں، اسمٰعیل بن علیہ مشہور محدث و فقیہ ہیں تیس سال کی عمر تھی جب امام احمد ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اسمٰعیل بوڑھے تھے کہتے ہیں کہ حلقہ میں ایک شخص کسی بات پر ہنس پڑا۔ اسماعیل نے تیز نگاہ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ تم ہنستے ہو اور احمد اس مجلس میں بیٹھے ہوئے ہیں واسط کے مشہور محدث یزید بن ہارون کے حلقہ میں لکھا ہے کہ ان کی حدیثوں کو جو دہراتا تھا اس سے یزید نے درمیان میں کچھ مذاق کی بات کی حلقہ کافی بڑا تھا اچانک ایک گوشہ سے کھانسنے کی آواز آئی یزید کو جب معلوم ہوا کہ امام احمد کھانس رہے ہیں تو سر پیٹ لیا، اور بولے کہ تم لوگوں نے مجھے پہلے سے مطلع نہ کیا کہ احمد حلقہ میں آچکے ہیں تاکہ مذاق کی جرأت مجھ میں پیدا نہ ہوتی۔ (ابن عساکر ص۳۱ ج ۲) بڑی سے بڑی مصیبت گزر جاتی لیکن امام کی عادت ہی نہ تھی کہ اس کا ذکر کسی سے کرتے اس سلسلے میں بیسیوں واقعات کا کتابوں میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

وجہ سے بھڑک اٹھی تھی۔ بہرحال خطیب نے لکھا ہے کہ اسمٰعیل بن اسحاق کے سامنے امام نے اپنی اس عجیب و غریب خواہش کا اظہار کیا تو اسماعیل ہی کا بیان ہے کہ مجھے اس کی بڑی خوشی ہوئی میں نے عرض کیا "بسر و چشم" اسماعیل حارث محاسبی کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ کی آپ کے خاص اصحاب کے ساتھ میں دعوت کرنا چاہتا ہوں محاسبی نے کہا کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے پھر خود ہی فرمائش کی کہ دعوت میں بس

"کسب[1] اور کھجور ہو۔ مقدار ان کی جتنی زیادہ بڑھا سکتے ہو اس میں مضائقہ نہیں ہے"

خلاصہ یہ کہ المحاسبی سے تاریخ وغیرہ دعوت کی طے کر کے اسمٰعیل امام کی خدمت میں حاضر ہوئے طے ہوا کہ مغرب کے بعد اسماعیل کے مکان پر صوفیوں کا مجمع جمع ہوگا امام احمد مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر اسماعیل کے مکان میں آگئے ابھی المحاسبی اور ان کے رفقاء نہیں پہنچے تھے اسماعیل نے اپنے مکان کے بالاخانے پر پہنچا دیا۔ وہیں اپنے ورد و وظائف میں مشغول رہے تا اینکہ حارث اپنے رفقاء کہئے یا موجودہ اصطلاح میں مریدوں کو لے کر پہنچ گئے پہلے تو دسترخوان بچھایا گیا کھانے سے لوگ فارغ ہوئے اس کے بعد عشاء کی نماز ہوئی نماز کے بعد حلقہ بنا کر سب بیٹھ گئے۔ اسماعیل کا بیان ہے کہ المحاسبی نے اپنی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ آدھی رات تک یہ سلسلہ بغیر کسی انقطاع کے جاری رہا۔ درمیان میں بعضوں نے سوال کیا، حارث اس کا جواب دیتے تھے حال یہ تھا کہ حارث کہتے جاتے تھے اور سارا مجمع خاموشی سے سن رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سروں پر چڑیا بیٹھی ہوئی ہے۔ تقریر سننے والوں میں بعض لوگ رونے بھی لگتے تھے۔ اور بعضوں کو ہچکیاں لگ گئیں مگر حارث اپنے کام میں مستغرق تھے۔

اسمٰعیل کہتے ہیں کہ آدھی رات جب گزر گئی تب میں نے خیال کیا کہ امام کو بھی جا کر تو دیکھوں وہ کس حال میں ہیں، کہتے ہیں کہ میں اس غرفے (کمرے) میں گیا تو دیکھا کہ امام پر غشی طاری ہے معلوم ہوا کہ روتے روتے بالآخر بے ہوش ہو گئے میں نے اسی حال میں ان کو چھوڑ دیا اور نیچے اتر کر پھر حارث کے حلقہ میں شریک ہو گیا تا اینکہ صبح کا سپیدہ نمودار ہو گیا۔ تب یہ لوگ اٹھ کر چلے گئے میں امام کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت تک ان کو افاقہ ہو چکا تھا۔ تاہم بقول شخصے "شبینہ" کا اثر امام پر پھر بھی باقی تھا۔

---

[1] واللہ اعلم کسب سے اس زمانہ میں کیا مراد لیتے تھے عام طور پر تو لغت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ روغنی دانوں کی کھلی کو کہتے ہیں، شاید کوئی خوراک اس مادہ سے اس زمانہ میں تیار کی جاتی ہو ورنہ صرف کھلی تو بظاہر کھانے کی چیز معلوم نہیں ہوتی ۱۲۔

اسمٰعیل کے الفاظ ہیں،

فصعدت الیٰ ابی عبد اللہ وھو متغیر الحال (ص۲۱۵)

میں چڑھ کر اس کمرے میں گیا جس میں ابوعبداللہ (یعنی امام احمد) تھے اور ان کی حالت اب متغیر تھی،

اسمٰعیل کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔ " آپ نے لوگوں کو اے ابوعبداللہ کیسا پایا؟"

جواب میں ارشاد ہوا کہ:۔

ما اعلم انی رأیت مثل ھؤلاء القوم

میں نہیں جانتا کہ اس قسم کے لوگوں کو میں نے کبھی دیکھا ہے۔

یہ تو المحاسبی کے اصحاب کے متعلق امام کی رائے تھی جو "شنیدہ" نہیں بلکہ " دیدہ مشاہدات" کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی، پھر المحاسبی کے متعلق آپ نے فرمایا کہ

ولا سمعت علم الحقائق مثل کلام ھذا الرجل ص۲۱۵

اور حقائق وواقعات کے متعلق جیسی گفتگو اس شخص نے کی میں نے نہیں سنی تھی۔

اور یہ تھا وہ فرق جو "ملا اور صوفی" میں پایا جاتا تھا، حاتم اصم نے قاضی محمد بن مقاتل اور قاضی طنافسی کو دیکھ کر جو رائے قائم کی تھی اسے بھی آپ پڑھ چکے ہیں اور طبقۂ علماء کے سرخیل کبیر امام الائمہ حضرت امام احمد بن حنبل ایک صوفی کو اس کے حلقے اور حلقہ کی گفتگو کو دیکھ کر اور براہ راست سن کر جس حال میں مبتلا ہوئے یعنی روئے خوب روئے اتنا روئے کہ بالآخر بے ہوش ہو گئے یہ حال تھا جو امام پر طاری ہوا اور اس مشاہدہ اور تجربہ کے بعد جس قال کو اسمٰعیل نے آپ سے نقل کیا اسے بھی سن چکے امام احمد ان بزرگوں میں ہیں جنہوں نے علم حدیث کی تلاش میں اس زمانے کے عام اسلامی ممالک کا متعدد بار دورہ فرمایا تھا مشکل ہی سے اس زمانے کی کوئی ممتاز ہستی ہو گی جس سے آپ نہ ملے ہوں اور ان کی باتیں آپ نے نہ سنی ہوں ان کے حال کو نہ دیکھا ہو، اس کے بعد ان کے اس قول کا وزن محسوس ہو سکتا ہے کہ :۔

" نہ میں نے (حارث کے اصحاب کے مانند) دیکھے ہیں اور نہ علم حقائق پر اس شخص کی گفتگو جیسی گفتگو میں نے سنی ہے۔"

شیخ عبدالوہاب شعرانی نے طبقات الصوفیہ الکبریٰ میں بھی امام احمد اور حارث محاسبی کے درمیان جو یہ واقعہ گزرا ہے اس کا ذکر کیا ہے واللہ اعلم کس ذریعہ سے انہوں نے امام کے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں یعنی آخر

ہیں فرمایا کہ

کنت اسمع عن الصوفیۃ خلاف ھذا — صوفیوں کے متعلق میں نے اس کے مخالف اور برعکس باتیں سنی تھیں۔

شعرانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مذکورہ بالا فیصلہ کے بعد امام نے فرمایا کہ

استغفر اللہ العظیم (طبقات ص۲۵ ج ۱) — میں خدائے بزرگ و برتر سے اس کی مغفرت چاہتا ہوں۔

شعرانی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعد کو امام یہ بھی فرماتے تھے کہ حلقے والے المحاسبی سے ریا اخلاص اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کے متعلق سوالات اس مجلس میں کرتے تھے اور میں نے دیکھا کہ المحاسبی ان سوالات کے جوابات کو بیان کرتے ہوئے

استشھد علیہ بالای والحدیث — دلیل میں قرآنی آیتوں اور حدیث کو بطور شہادت کے پیش کرتے تھے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا مجھے یہ نہیں معلوم ہے کہ امام شعرانی تک اس مجلس کے متعلق یہ باتیں کس سے پہنچی ہیں لیکن جہانتک اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر میرا احساس ہے کہ شعرانی نے کسی معتبر کتاب ہی سے ان اجزاء کا اضافہ اپنے بیان میں کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

لم ینکرہ من احوالہ ولا من احوال اصحابہ شیئا (ص۲) — یعنی اس ذاتی مشاہدے کے بعد امام نے نہ محاسبی کے کسی حال پر اعتراض کیا اور نہ ان کے اصحاب (مریدوں) کے حالات میں ان کو کوئی قابل اعتراض بات نظر آئی۔

اور میں تو کہتا ہوں کہ شعرانی کے بیان میں یہ زائد تفصیلات جو پائی جاتی ہیں اگر انصاف اور فکر معقول سے کام لیا جائے تو خطیب والی روایت جسے انہوں نے مسلسل سند کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کیا ہے خود اس روائیت کے اجمالی بیان سے بھی ان ہی نتیجوں کو پیدا کیا جا سکتا ہے آخر حاصل خطیب والی روائیت کا بھی تو یہی ہے کہ امام احمد بن حنبل محاسبی کے کلام سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ اتنے متاثر کہ گریہ طاری ہوا، بے ہوش ہو گئے۔ پھر جن الفاظ میں محاسبی اور ان کے اصحاب کے متعلق اپنے تاثر کا اسمٰعیل بن

اسحاق کے پوچھنے پر اظہار فرمایا ان کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز اس مجلس کی قابل اعتراض حضرت امام کو نظر نہ آئی گویا اپنے "دیدہ" کو انہوں نے "شنیدہ" روایات کے مطابق نہیں پایا یا زائد شنیدہ روایات جن کو سن کر ان کے دوست حافظ ابو زرعہ نے نہ صرف المحاسبی سے پہلے طبقہ صوفیہ کے اکثر سربرآوردہ اکابر شقیق بلخی، حاتم اصم، عبدالرحیم دیبلی سب ہی پر انکار و اعتراض کی بارش برسا لے ہے تھے، بلکہ آپ سن چکے کہ ان تمام بزرگوں کے طریقۂ زندگی پر "بدعت" ہونے تک کا فیصلہ صادر فرما چکے تھے۔

میرے نزدیک ان ہی وجوہ سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مشاہدہ اور اس مشاہدے کے تاثرات تصوف کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، مسئلہ خلق قرآن کے امتحان کے گزرنے کے بعد "محبوبیت عامہ" کی جو عجیب و غریب کیفیت عام مسلمانوں میں آپ کو حاصل ہو گئی تھی اس کی تو خیر شاید مشکل ہی سے نظیر مل سکتی ہے لے لیکن اس واقعہ سے پہلے اور بہت پہلے جس زمانے میں حضرت امام بھی نوجوان تھے اور امام شافعی کی ملاقات بعد میں اسی زمانہ میں ان سے ہوئی تھی۔ جب بغداد سے امام شافعی تشریف لے گئے تو لوگوں کا بیان ہے کہ اپنی مجلسوں میں فرمایا کرتے کہ

" میں نے بغداد میں تین عجیب چیزیں دیکھیں ایک تو نبطی (غیر عربی

لے قطع نظر اس سے کہ واقعہ خلق قرآن کے بعد بالاتفاق امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اسلامی تاریخ کی ایک ایسی منزل قرار دیئے گئے جس کی چند ہی تمثالیں ان سے پہلے گزری تھیں یعنی کہا جاتا تھا کہ ابوبکر یوم الردہ وعمر یوم السقیفہ وعثمان یوم الدار وعلی یوم صفین و احمد یوم المحنۃ (ابوبکر ارتداد کے زمانہ میں عمر سقیفہ کے دن عثمان وارداے دن اور علی صفین کے دن احمد بن حنبل محنت کے دن) ابن عساکر صفحہ ۴۰ ج ۲) لیکن اس کا اندازہ تو خواص کر سکتے تھے عوام پر امام کا جو اثر تھا اس امر کا ظہور آپ کے جنازے میں ہوا جس میدان میں نماز پڑھی گئی تھی جب اس کی پیمائش کر کے حساب کیا گیا جو اس میدان میں بھرے ہوئے تھے تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی تو تیرہ لاکھ آدمیوں کا تخمینہ کیا گیا، بلکہ لوگ تو مسلمانوں سے آگے بڑھ کر لکھتے ہیں کہ بغداد کے یہود و نصاریٰ اور مجوس سب ہی امام کے ماتم میں شریک تھے کہتے تھے کہ بعض تو اتنے متاثر ہوئے کہ مسلمان ہو گئے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ان نو مسلموں کی تعداد جو امام کی وفات کے دن مسلمان ہوئے تھے چودہ ہزار تھی۔

(صفحہ حلیۃ الاولیاء ج ۹)

النسل عجمی آدمی تھا) جو نحوی تھا (یعنی زبان کے قواعد و ضوابط کا عالم
تھا) اور ایک اعرابی کو دیکھا (جو عربی النسل اور عرب کا باشندہ ہونے
کے باوجود) لحان تھا۔ (یعنی غلط عربی بولتا تھا)"
بغداد کے ان دو اعجوبوں کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں کہ

ورائت شاباً اسود الراس واللمّة اذا قال حدثنا قال الناس كلهم صدق وهو احمد حنبل۔
ص۱۳۱ ج ۲ تاریخ دمشق ابن عساکر)

اور میں نے ایک جوان کو دیکھا جس کا سر بھی سیاہ تھا اور زلفیں بھی سیاہ تھیں (یعنی ابھی شباب کی عمر میں تھا) اس کا حال یہ ہے کہ جب وہ حدثنا کہتا ہے (یعنی اس لفظ کو بیان کرکے حدیث بیان کرتا ہے) تو لوگ کل کے کل کہتے ہیں کہ سچ کہتا ہے۔

جوانی میں عامۃ الناس کے قلوب میں جس کے متعلق اعتماد و وثوق کی یہ عمومی کیفیت پائی جاتی ہو سمجھا جا سکتا ہے کہ بعد کو جب اس کے علمی و عملی کمالات کا ظہور پختہ سالی کے زمانہ میں ہوا تو اس کی ہر دلعزیزی اور غیر معمولی حسن قبول کا کیا حال ہوگا؟

ایسی صورت میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ المحاسبی اور ان کے اصحاب کے متعلق امام احمد کے اس ذاتی مشاہدے اور اس مشاہدے کے تاثرات و نتائج کا چرچا عوام میں جب پھیلا ہوگا اور پھیلے بغیر وہ کیسے رہ سکتا تھا تو اس کا اثر تصوف اور تصوف کے ان ممتاز نمائندوں کے متعلق عام مسلمانوں پر کیا پڑا ہوگا؟

اگرچہ ترتیب کے ساتھ تاریخ میں ہم ان واقعات اور ان نتائج کو نہیں پاتے لیکن ابھی کچھ دیر پہلے آپ مجھ ہی سے سن چکے کہ امام احمد ہی کے زمانہ میں تصوف اور صوفیوں پر یہ تنقید ہو رہی تھی کہ یہ لوگ اہل علم اور علماء کے مخالف ہیں، ان کے خلاف یہ دعوے علماء کی طرف سے دائر ہو رہا تھا کہ جن مسائل پر یہ لوگ بحث کرتے ہیں ان پر امام مالک سفیان ثوری اور ان ہی جیسے ائمہ متقدمین نے کیا کبھی کوئی بحث کی تھی، یا ان مسائل کے متعلق ان بزرگوں کی کوئی کتاب پائی جاتی ہے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ کسی معمولی مولوی کی طرف سے نہیں بلکہ حافظ الحدیث امام ابو زرعہ جیسے بزرگ مذکورہ بالا الفاظ میں علانیہ تصوف اور صوفیوں پر تنقید فرما

رہے تھے اور ان کو بدعتی قرار دے رہے تھے، لیکن اچانک اسی زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان ہی بدنام صوفیوں کے چند سرآوردہ نفوس (جن میں خود المحاسبی بھی ہیں) ان کا تذکرہ مورخین ان الفاظ میں کر رہے ہیں یعنی المحاسبی کا نام لے کر لکھتے ہیں کہ یہ ان پانچ

الخمسة من الشيوخ الجامعين بين علم الظاهر والباطن في عصر واحد هم ابو القاسم الجنيد وابو محمد رديم ابو العباس بن عطاء و عمرو بن عثمان المكي رحمهم الله تعالى[1]

شیوخ (صوفیہ کے سرآوردہ) لوگوں میں ہیں جن میں علم ظاہر و علم باطن جمع ہوگیا ہے۔ یہ پانچوں ایک ہی زمانے میں تھے یعنی ابوالقاسم جنید ابومحمد رویم ابوالعباس بن عطا عمرو بن عثمان مکی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسی زمانہ میں ایک حال یہ تھا کہ بجز ان مسائل کے جن کا ذکر امام مالک و سفیان ثوری وغیرہ ائمہ فقہ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے ان کے سوا علم کے احاطہ میں کسی دوسری چیز کی شرکت کو علماء برداشت نہیں کر سکتے تھے گویا اس وقت تک سارا دین از سرتا پا ان ہی فقہی مسائل کے اندر منحصر سمجھا جاتا تھا ان کے سوا آپ سن چکے کہ وساوس و خطرات اور اسی قبیلہ کے وہ سارے مسائل جن سے بیچارے صوفی بحث کرتے تھے ان کو صاف صاف کھلے لفظوں میں "بدعت" یا دوسرے الفاظ میں دین میں خود ساختہ اضافہ قرار دیا جا رہا تھا۔ حافظ ابوزرعہ جیسے امام فی الحدیث سب کو "ضلالات و بدعات" کہنے سے نہیں جھجکتے تھے پھر یہ کیا ہے کہ اچانک اسی زمانہ میں علم ظاہر کے ساتھ علم باطن کو بھی علم ہی کے ذیل میں داخل کر لیا جاتا ہے اور تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ بعض لوگ علم کے ان دونوں شعبوں کے جامع ہیں جن میں ایک المحاسبی بھی ہیں بلکہ جہاں جہاں کتابوں میں اس فقرے کو لوگوں نے نقل کیا ہے سب سے پہلے المحاسبی کا نام عموماً سرفہرست نظر آتا ہے۔ نقطۂ نظر کے اس اچانک فجائی انقلاب میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس تاریخی رات ہی کی تاریکی میں غالباً یہ روشنی پیدا ہوئی جو اپنی افتاد طبع کے خلاف امام احمد نے اسماعیل

---

[1] قرآن حکیم انسانی دماغ کی منطق کو سلجھانے کے بعد جس عقل کو آدمی کے اندر پیدا کرتا ہے اور اس عقل سے حکمت کے جو سرچشمے جاری ہوتے ہیں اسی قرآنی حکمت کے یہ چند خاص برگزیدہ حکما ہیں ان میں ہر ایک مستحق ہے کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی جائیں جن لوگوں کو شوق ہو حلیۃ الاولیاء ابونعیم صفوۃ الصفوۃ ابن جوزی وغیرہ میں ان کے حالات و مقالات پڑھ سکتے ہیں۔

بن اسحٰق کے بالاخانے پر گزاری تھی وہی رات جس میں بچشم خود معائنہ فرمانے کے بعد آپ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ یہ صوفی بے چارے مظلوم ہیں ان کے متعلق پھیلانے والے جو کچھ پھیلاتے رہتے ہیں واقعہ کے خلاف ہے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی کہ دین کے ایک خاص حصے کو اپنی فکری و نظری قوتوں کی جولاں گاہ بنا کر جیسے فقہائے اُمّت نے نتائج پیدا کیے ہیں ٹھیک یہی کام یہ صوفی دین ہی کے دوسرے خاص حصے کے متعلق انجام دے رہے ہیں[1]، بہرحال میرا خیال ہے کہ عوام میں صوفیہ تصوف اور تصوف کے مسائل کے متعلق جو بدگمانیاں طبقۂ علماء کی طرف سے پھیلائی گئی تھیں۔ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ امام احمد کے اس مشاہداتی اور تجربی فیصلہ کے بعد وہ باقی رہ سکتی تھیں اسی لیے میں تو سمجھتا ہوں کہ صرف فقہی اختلافات کی سمیت کے ازالہ میں حضرت امام احمد بن حنبل کامیاب نہیں ہوئے ہیں بلکہ "ملا اور صوفی" کے قضیئے کو بھی قدرت نے امام ہی کی مبارک کوششوں سے طے کرا دیا گو اختلافات فقہی مکاتب خیال میں بعد کو بھی باقی رہے بلکہ اب تک باقی ہیں اور شاید رہتی دنیا تک اسلام کے ساتھ ساتھ یہ اختلافات بھی باقی رہیں گے۔ کبھی کبھی خود ان اختلافات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان اختلافات کو غلط استعمال کی وجہ سے جدال پسند جھگڑالو طبائع بعض ناگوار حالات کو بھی پیدا کر دیتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ اختلافات کا نہیں بلکہ ان سے غلط استعمال لینے والی ہستیوں کی فطری نہاد افتاد طبع اور ذاتی رجحانات کا نتیجہ ہوتا

---

[1] شیخ عبدالوہاب شعرانی نے اپنی کتاب طبقات الصوفیۃ الکبریٰ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ فقہ کے ائمہ مجتہدین جیسے کتاب و سنّت کے کلیات سے جزئیات پیدا کر کے ان پر فرض و واجب سنت و مستحب یا حرام و مکروہ خلاف اولیٰ ہونے کا حکم لگاتے ہیں، آخر تصوف کے ائمہ عارفین کتاب و سنّت کے اس حصہ میں جن سے ان کے متعلقہ مسائل کا تعلق ہے اگر جزئیات پیدا کریں اور ان پر حکم لگائیں تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے۔ آخر میں وہ فرماتے ہیں کہ لیس ایجاب مجتھد باجتھادہ شیئا لم یصرح الشریعۃ بوجوبہ اولیٰ من ایجاب ولی اللہ تعالیٰ حکما فی طریق لم تصرح الشریعۃ بوجوبہ (یعنی شریعت میں جن امور کے وجوب کی تصریح نہیں ملتی لیکن ایک امام مجتہد اپنی اجتہادی کوششوں سے ان کے وجوب کا حکم اگر بتلا سکتا ہے تو اپنے طریقہ خاص (یعنی تصوف) کے متعلق اللہ کا ولی کسی ایسے مسئلہ پر وجوبی حکم اگر لگاتا ہے جس کی تصریح شریعت میں نہیں پائی جاتی تو دونوں میں سے ایک کو ترجیح دینے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ (طبقات الصوفیۃ الکبریٰ ص۱۲ ج ۱۔) واقعہ یہ ہے کہ اتنے صاف اور واضح مسئلہ کو سمجھنے سے بعض لوگ نہ معلوم کیوں گریز کرتے ہیں۔ ۱۲

سے جھگڑوں کو ان اختلافات کی طرف منسوب کرنا بجنسہ وہی بات ہے کہ عام طور پر جب دنیا مذہب کے زیر اثر تھی، اور لڑتی تھی، تو پچھلے دنوں یہ فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ لڑائی جھگڑوں کے یہ سارے قصے مذہب سے پیدا ہوتے ہیں مگر لامذہبیت کے موجودہ دور میں بھی جنگ و جدال کا یہ سلسلہ جب نہ رکا بلکہ نسبتاً زیادہ بڑھ گیا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے تب لوگوں کی سمجھ میں آیا اور نہ آیا ہے تو اب سمجھ میں آنا چاہیئے کہ مذہب نہیں بلکہ ان لڑائیوں کو خود انسان یا انسانوں کے وہ افراد پیدا کرتے ہیں جن کی فطرت ہی لڑاکو اور جنگ و جدال کے میلانات کو لے کر پیدا ہوتی ہے، اسی طرح گو ملائیت اور صوفیت کی باہمی چشمکوں اور نوک جھونک کا سلسلہ رکا تو نہیں ہے اور شاید آئندہ بھی نہ رکے لیکن مسلمانوں کی عمومیت نے یہ تسلیم کر لیا کہ پیغمبرؐ نے جو دین کا ذخیرہ "الکتاب و السنتہ" کی شکل میں ان کو عطا کیا ہے یہ ذخیرہ صرف ان ہی مسائل پر مشتمل نہیں ہے جن سے فقہی کتابوں میں بحث کی جاتی ہے بلکہ دین کا بڑا اور بہت بڑا حصہ ان کے سوا بھی ہے جنہیں تصوف یا معارف و حقائق کے ائمہ نے اسی دینی ذخیرے سے برآمد اور استنباط کیا ہے جیسے فقہی مسائل کے ائمہ امام ابوحنیفہ، مالک و شافعی وغیرہ نے فقہی مسائل کو اسی ذخیرے سے پیدا کیا ہے[1]

---

[1] ہمارے استاذ امام علامہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ نماز میں خشوع خضوع مسئلہ ظاہر ہے کہ قرآنی مطالبہ ہے لیکن فقہ کی کتابوں میں سالہا سال سے تلاش کر رہا ہوں کہ فقہا نے اس مسئلہ کا کہیں اپنی کتابوں کا ذکر کیا ہے یا نہیں فرماتے تھے کہ مدت کے بعد ایک غیر مطبوعہ کتاب میں صرف ایک فقرہ ملا کہ نماز کے مستحبات میں یہ بھی ہے، واقعہ وہی ہے کہ فقہاء نے اسلام کے قالب پر اپنی بحث کا موضوع بنایا اسی لیئے صرف ان ہی عناصر کا ذکر اپنی کتاب میں کرتے ہیں جن سے اس اسلامی قالب کی تعمیر میں مدد ملتی ہو باقی اسلام کا قلب اور اس کی روح اس کے عناصر و اجزا یہ بالکلیہ جدا گانہ چیزیں ہیں۔ کتاب سنت کا جو حصہ ان پر مشتمل ہے فقہاء نے اپنی فقہی کتابوں میں دین کے اس حصہ پر بحث کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا ہے مثلاً روزے کے مسائل میں آپ کو ہر فقہی کتاب میں یہ مسئلہ ملے گا کہ غیبت کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا یعنی روزے کا قالب متاثر نہیں ہوتا۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ روزے کا قلب اور اس کی روح غیبت سے نکل جاتی ہے۔ صحیح حدیثوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح کی ہے۔ ۱۲

طریقۂ غزالیہ کے "مذہب اوائل" ہونے کا مفہوم

میرا مطلب یہ ہے کہ غیر اطلاقی تصوف کے زیر اثر کرنے والے جو کچھ کرتے کہتے اور سنتے رہے اسلام اور اسلامی وثائق مستندات سے وہ قطعاً جاہل ہے۔ جو ان کو اسلامی تعلیمات کے دائرے سے باہر کی چیزیں سمجھتا ہے امام احمد بن حنبل کی تصحیح و توثیق کے بعد اس قسم کی ہرزہ درائیوں پر وہی جری ہو سکتے ہیں جو نہ اسلام ہی سے واقف ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ اسلام کے فروع و اصول کے علم میں امام رحمۃ اللہ علیہ کا کیا مقام تھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے تصوف اور صوفیت کا وہ خاص طریقہ جس کی نمائندگی امام احمد کے زمانے میں حارث اور حارث کے اصحاب کرتے رہے تھے بعد کو امام غزالی نے اسی طریقہ کا احیاء فرمایا۔

تصوف کے جزئیات تک نصوص و آثار سے مؤید ہیں!

بلاخوف تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ صوفیہ کے مختلف طرق و سلاسل میں جن اشغال و اعمال اور ان کے نتائج و ثمرات کا تذکرہ کیا جاتا ہے نہ صرف ان کے کلیات بلکہ جزئیات تک کی تائید قرآنی نصوص اور آثار و روایات سے ہوتی ہے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے بلکہ ایک مستقل کتاب کا وہ مضمون ہے۔ مثلاً سرسری طور پر لوگوں کو ان ہی عام باتوں پر غور کرنا چاہیئے کہ موسیٰ علیہ السلام کو تورات دینے کے لیے حق تعالیٰ نے جب بلایا تو اربعین یا چلّہ کی تکمیل کا حکم ان کو کیوں دیا گیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کیا خود خاتم المرسلین کے قلب مبارک میں الخلوت کی خواہش نزول وحی سے پہلے جو پیدا کی گئی حراء میں آپ کا تحنث کیا صوفیوں کی چلہ کشی کی تصحیح کے لیے کافی نہیں، شہادت یا ناسوتی آثار میں الجھی ہوئی روح پر غیبی تجلیات کا انعکاس یکسوئی کے ان خاص طریقوں کے ساتھ صوفی جو کہتے ہیں کہ وابستہ ہے کیا ان کا یہ دعویٰ قطعاً بے بنیاد ہے۔ حرائی زندگی میں انوار، غیبی اصوات کا تجربہ و مشاہدہ اور آخر میں غیب کے ساتھ تعلق کو مستحکم کرنے کے لیے جبرئیل امین کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دبانا اور اتنا دبانا کہ بلغ الجھد منی حتی ظننت انہ الموت (کشمکش انتہا کو پہنچ گئی میں نے خیال کیا کہ بس موت

آگئی) بلکہ اسی سلسلہ میں بعض روایتوں میں جو آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سانس رک گئی، یا روک دی گئی کیا صوفیہ کا طریقہ توجہ اور حبس دم وغیرہ کی تصحیح کے لیے اتنی واضح شہادتیں کافی نہیں ہوسکتیں واقعہ شق الصدر اور لطائف و اسرار کا جو مسئلہ صوفیہ بیان کرتے ہیں دونوں کی باہمی مناسبت کا کیا کوئی انکار کرسکتا ہے خصوصاً جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شق صدر کا واقعہ ہی پانچ دفعہ پیش آیا اور لطائف و اسرار کی تعداد بھی صوفی بتاتے ہیں کہ پانچ ہی ہے۔

رہا سیر و سلوک سو معراج و اسراء کے واقعات کا کسی رنگ میں امتیوں کو بھی مشاہدہ کرایا جاتا ہو تو اس کے انکار کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ والقصۃ بطولہا۔

طریقۂ غزالیہ پر مولینا گیلانی کی تنقید

تصوف یا صوفیانہ زندگی کا معاملہ دینی علوم کی دوسری شاخوں سے کچھ مختلف ہے حدیث ہو یا فقہ، کلام ہو یا عقائد، یہ علوم ہیں، مگر تصوف یا صوفیت سچ پوچھیے تو مومن کی شخصی زندگی کے دین کے "جمالی قالب" کی یہ تعبیر ہے۔ اپنی دینی زندگی کو اسی "جمالی قالب" میں ڈھالنے کا ذوق اگر کسی پر ہو جائے تو دوسروں کے حاصل کردہ کمالات سے اس بیچارے کو اپنے شخصی ایمانی دین کے حسن و جمال کے اضافہ میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

ایسی صورت میں تصوف یا "صوفیانہ زندگی" کو اسی خاص طریقہ ہی کے ساتھ اگر مختص سمجھا جائے جس کی نمائندگی "طریقۂ غزالیہ" کرتا ہے، تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ دنیا تو دنیا دین کے بھی دوسرے اہم شعبوں کی تکمیل میں جو مشغول ہیں اور ان کی یہ مشغولیت کسی حیثیت سے بھی "طریقۂ غزالیہ" کے تصوف کی مشغولیت سے کم اہم اور ضروری نہیں ہے۔ ان بے چاروں کے دین کے اس "جمالی قالب" کے حصول کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

سچ پوچھیے تو "ملا اور صوفی" کی باہمی رقابت و لاگ ڈانٹ میں بہت کچھ دخل اس نقطہ نظر کو بھی ہے۔ ایک محدث علم حدیث اور اس کی مختلف شاخوں کی تحقیق و تدقیق میں مشغول ہے یا ایک فقیہ مسلمانوں کی عملی زندگی کے آئینی پہلوؤں کی تشریح و توضیح کو اپنی زندگی کا سودا بنائے ہوئے ہے ایک مورخ مسلمانوں کے حال کو ان کے ماضی کے ساتھ مسلسل مربوط رکھنے کے لیے کتابوں کا کیڑا بنا ہوا ہے بلکہ ایک مجاہد فن حرب و مقاتلہ کے عملی مشقوں میں اپنی ساری توانائیوں کو دین ہی کی حمایت و صیانت

کے لیے خرچ کر رہا ہے حالانکہ یہ سب کچھ کر رہے ہیں دین ہی کے لیئے کر رہے ہیں لیکن ان مشاغل کے ساتھ طریقہ غزالیہ کے تصوف کے مطالبات کی تکمیل کا موقع ان بیچاروں کو چونکہ میسّر نہیں آ رہا ہے اس لیے فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اپنے دین کو "جمالی قالب" میں ڈھال کر قرآن کے "المحسنوں" کے طبقہ میں شریک کرنے کا کوئی موقع ان کے لیے باقی نہیں رہتا ہے "الاحسان" کے حسن لفظ سے ایمانی حسن و خوبی کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے نشاندہی فرمائی ہے مذکورہ بالا نوعیت کے مشاغل رکھنے والے مسلمان اپنے شخصی ایمان و اسلام کو اس مقام تک ترقی دے کر پہنچانے سے گویا محروم ہو جاتے ہیں' کہنے والوں نے کنز و ہدایہ کا نام لے کر یہ طنز جو کیا ہے کہ ان کتابوں میں خدا نہیں مل سکتا، یجوز ولا یجوز کی بحثوں میں پھنسنے والے اس سے بھی آگاہ نہیں ہو سکتے کہ خود ان کا شخصی وجود "یجوز ولا یجوز" کے چکر سے نکلا بھی ہے یا نہیں یہ سارے قصے اسی مفروضہ پر مبنی ہیں کہ "الاحسان" کا مقام تصوف اور صوفیت کے ثمرات ان ہی مشاغل کی پابندیوں کے ساتھ وابستہ ہیں جن میں مشغول ہونے والوں کے لیے ضروری ہے کہ دین دنیا کے دوسرے مشاغل سے اپنے آپ کو بیگانہ کر لیں۔

آپ دیکھیئے ان ہی اسمٰعیل بن اسحٰق السراج کو غالباً ان کے مختصر سے حالات خطیب کے حوالہ سے کہیں درج کر چکا ہوں [۱]۔ معلوم ہوتا ہے کہ دینی حیثیت سے ان کا خصوصی مشغلہ روائت حدیث تھا خطیب ہی نے لکھا ہے کہ

نزل بغداد وحدث بها — یعنے (اصل وطن تو ان کا نیشاپور تھا) بغداد آئے اور یہاں حدیث کا درس دیتے تھے۔ (صفحہ ۲۹۲ ج ۶)

اور معاشی مشغلہ ان کا تجارت تھا تاریخ بغداد ہی میں ہے۔ "کہ علم (حدیث) اور تجارت میں وہ مشہور تھے۔" صفحہ ۲۹۳

آپ ہی بتایئے کہ ایک ایسے مرد مومن کے لیئے جو معاش تو تجارت سے حاصل کرتا ہو اور دینی خدمت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی اشاعت و تدریس کو اس نے اپنا مشغلہ بنا لیا ہو اس بیچارے کے لیے اس کا کہاں موقعہ تھا کہ حارث جیسے صوفیوں کی زندگی اختیار کر سکے، حارث کا حال تو

---

[۱] ملاحظہ ہو مضمون "طریقہ غزالیہ" کی آخری نعلی سرخی "ملابہ تعاقب صوفی" (غ م)

یہ تھا کہ باپ نے لاکھوں لاکھ روپے چھوڑے تھے، لیکن اس مال کو ہاتھ بھی نہ لگایا اور بقول خطیب

وان الحارث لمحتاج الی دانق فضۃ — حارث چاندی کے ایک حبہ کے محتاج تھے

(ص ۲۱۲ ج ۸)

حضرت جنید فرمایا کرتے تھے

کان الحارث کثیر الضر۔ — سخت تکلیف کی حالت میں رہتے تھے یعنی فقر و فاقہ کی مصیبت میں مبتلا رہتے تھے۔

(ص ۲۱۲ ج ۸)

سوال یہی ہے کہ دین کے اس "جمالی قالب" کے حصول سے ان غریبوں کو کیا بالکلیہ مایوس ہونا چاہیئے؟ یہ صحیح ہے کہ نیت کو درست کر لینے کے بعد دین اور علم دین کے جس شعبہ کی خدمت جس سے بن پڑے گی آنے والی زندگی میں امتیازی مراتب و مدارج سے وہ محروم نہ رہے گا۔ جس نے فقہ کی یا حدیث و تفسیر کی یا دین کی کسی اور راہ میں کوئی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے انشاء اللہ آخرت میں اپنی غیر معمولی خدمت کے صلہ کو بھی غیر معمولی شکلوں میں اپنے آگے پائے گا۔

مگر ایمان کے "احسانی مقام" یا دین کے "جمالی قالب" کے ثمرات و نتائج کا ظہور جیسا کہ تجربہ شاہد ہے، مرنے سے پہلے اسی زندگی میں شروع ہو جاتا ہے کچھ نہیں تو بجائے خود ان کی ایمانی زندگی حسن و جمال کے اس قالب میں ڈھل جانے کے بعد مومن کے لیے سرمایۂ نشاط اور سرچشمۂ سرور بن جاتی ہے ہم تصوف اور صوفیت کو طریقۂ غزالیہ ہی کے اندر اگر منحصر یقین کر لیں تو دین و ایمان کے اس نقد لذت و بہجت نشاط و سرور سے تو ان لوگوں کی محرومی کا قطعی فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں گے جن کو طریقۂ غزالیہ کے مطالبات کی تکمیل کا موقع دوسرے اہم دینی و دنیوی مشاغل کی وجہ سے میسر نہیں آ رہا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے قول سے تائید

میرا خیال تو یہی ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اسماعیل بن اسحاق السراج سے آخر میں جو یہ فرمایا کہ تمہارے لیے حارث اور ان کے اصحاب کو پسند نہیں کرتا[1]، اس سے غرض غالباً یہی تھی کہ جن مشاغل

---

[1] خطیب نے جو الفاظ نقل کئے بجنسہٖ ان کو درج کر دیتا ہوں، لکھا ہے کہ امام نے فرمایا:-

وعلی ما وصفت من احوالھم فانی — میں نے جو کچھ حال ان لوگوں کا (یعنی حارث اور

میں تم مشغول ہو ان سے خواہ مخواہ تم کو الگ ہونا پڑے گا۔ اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کے اس جمالی قالب کا حصول امام ہمام کے نزدیک بھی حارث محاسبی کے اس خاص طریقۂ سلوک کے ساتھ وابستہ نہ تھا اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ تصوف کے ان غیر اطلاقی طریقوں کے سوا جن کی قدر مشترک خصوصیت یہ ہے کہ دین و دنیا کے عام مشغلوں سے الگ ہو کر اسی میں استغراق تام اور کلی انہماک کے بغیر نتائج و ثمرات کی توقع نہیں کی جا سکتی اسلام میں الاحسان یا دین کی اسی "جمالی قالب" میں اپنی زندگی کو ڈھالنے کا ایک اطلاقی طریقہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے چلا آتا ہے خود امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے ساری دنیائے اسلام کی خاک چھان کر اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک ایک جزئیہ الفاظ اقوال ملفوظات و حالات کے جمع کرنے میں اتنی غیر معمولی کامیابی حاصل کی کہ اس کامیابی کی نظیر نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ ان کے بعد، آج بھی ان کی مسند شریف سیرت طیبہ کی تحقیق کی سب سے بڑی محیط یا دائرۃ المعارف ہے۔ اسی کے ساتھ فقہی مکاتب خیال میں آپ کی مصالحانہ روش نے مسلمانوں کے ا مذ فقہ کے متعلق ایک خاص قسم کی رواداراانہ ذہنیت جو پیدا کی دینی علوم کے ان مہمات کی مشغولیت کے ساتھ ظاہر ہے کہ غیر اطلاقی تصوف کے مشاغل کے لیئے وقت نکالنا آسان نہ تھا پھر کیا یہ مان لیا جائے کہ کسی اور کا نہیں بلکہ امام احمد جیسے اکابر اسلام کا ایمان احسانی خوبیوں کی رعنائیوں سے (العیاذ باللہ) محروم تھا اور جمالی قالب ان ہی جیسے بزرگوں کا اسلام حاصل نہ کر سکا، اپنی عقل و خرد کے ساتھ اس قسم کی جاہلانہ بے باکیاں خود سوچیئے کہ تمسخر و استہزا کے سوا اور کیا ہے۔

صحابہ کرام کی زندگی سے تائید

اور سچ تو یہ ہے کہ نبوت کبریٰ کے براہ راست فیض یافتہ بزرگوں خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء راشدین اور اکابر صحابہ کے متعلق ذہنی تشویشوں سے اپنے آپ کو پاک کرنے کی تدبیر ان لوگوں کے لیئے کیا ہے، جو تصوف

لا اری لک صحبتھم۔
(ص۲۱۵ ج ۸ تاریخ بغداد)

حارث کے اصحاب کا) بیان کیا باوجود اس کے پھر بھی میرا خیال یہی ہے کہ ان لوگوں کی صحبت تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔

صوفیوں یا تصوف کے نمائندوں کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے تاثرات کی روئداد کے اسی آخری فقرے کو جہاں تک میرا خیال ہے "اطلاقی تصوف" کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔

کو ہی اسلام و ایمان ہی کے احسانی و جمالی ارتقا کی شکل یقین کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس عقیدت کو بھی اپنے اندر سے وہ نکال نہیں سکتے کہ اسلامی تاریخ کا بہترین طلائی قرن ہر لحاظ سے وہی ہے جس میں خود خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی نگرانی میں صحابۂ کرام کو دینی تربیت اور اس تربیت کے زیر اثر روحانی ارتقاء کا موقع میسر آیا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہی اصحاب جو کشور کشائی اور جہاں گیری کے عام مشاغل کے سوا جہاں داری اور دین پناہی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں اپنی آپ نظیر تھے، صوفیانہ زندگی کے نتائج و ثمرات کو اگر ان ہی پابندیوں کے ساتھ مختص اور محدود کر دیا جائے گا، جن کو غیر اطلاقی تصوف کے لوازم قرار دیتا ہوں تو صحابۂ کرام کی پاک زندگیوں میں ان پابندیوں کی جستجو میں آپ خود سوچئے کہ اسلامی تاریخ کا کوئی طالب علم صحیح معنوں میں کیا کامیاب ہو سکتا ہے؟

غلط فہمی کی وجہ

واقعہ یہ ہے کہ "طریقۂ غزالیہ" جس آن و بان شان و شوکت طرز و بیان کے ساتھ مسلمانوں میں پیش ہوا تھا اور نہ صرف نظری بلکہ عملی حیثیت سے پے در پے اسلامی ممالک کے مختلف اقطار و جہات میں بڑی بڑی گرامی ہستیاں اس طریقہ کی پشتی بانی اور اس کے آگے بڑھانے کے لیے جس عزم و ارادے کے ساتھ کھڑی ہو گئیں جیسا کہ گزر چکا کہ اونچے نیچے متوسط مسلمانوں کے ہر قسم کے طبقات میں اس طریقہ کو عمومی حسن قبول حاصل ہوا۔ علماء میں سلاطین میں وزراء میں امراء میں غرباء میں آپ دیکھ چکے کہ تصوف کے اس طریقہ کی عملی تشکیل و تعمیل میں امام غزالی کے بعد لوگ مصروف نظر آتے ہیں ایسی صورت میں باور کرنے والے اگر یہ باور کرنے لگے ہوں کہ صوفیانہ زندگی یا بالفاظ دیگر اسلام و ایمان کے "جمالی قالب" اور "احسانی مقامات" ان کے فیوض و برکات کے لیے "طریقۂ غزالیہ" کی پابندی کرنا ناگزیر ہے تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔

اختلافِ سلاسل کی حیثیّت

فہرست مضامین

اختلافِ سلاسل کی حیثیت

تمہید

اتنی بات تو عوام و خواص سے تقریباً مخفی نہ ہوگی کہ تصوف یا صوفیت کا نام پانے والوں میں بیسیوں ہی نہیں بلکہ کہا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیکڑوں طرق مروج ہیں۔ سلاسل و طرق کے نام سے کتابوں میں ایک طویل فہرست ان کی پائی جاتی ہے بلکہ پچھلے چند دنوں سے عام مذاق لوگوں میں جو یہ پھیل گیا ہے کہ طریقہ یا سلسلہ کے مرکزی ہستی کے اسم مبارک کے انتساب کو گویا کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اپنے پیر سے شروع کر کے نسبتوں میں اضافوں کا طریقہ مروج ہو گیا ہے۔ مثلاً صرف قادری یا چشتی لکھنے سے جی نہیں بھرتا بلکہ براہ راست جس پیر کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی لوگ سعادت حاصل کرتے ہیں، خود ان کے نام ان کے پیر کے نام پھر پیر کے نام کی طرف منسوب کر کر کے نسبتوں کے اس سلسلے کو دراز سے دراز تر کرتے چلے جانے کی عام عادت روز بروز دیکھ رہا ہوں کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ میرے خیال میں لفظی زنجیرہ بندیوں سے اس کاروبار کی ہمت افزائی غالباً مناسب نہ ہوگی، آخر اس سلسلۂ دراز کی درازی کہاں تک پہنچ کر رہے گی۔

کوئی اساسی اختلاف نہیں!

خیر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ طرق و سلاسل کی یہ کثرت جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں صرف اسمی کثرت نہیں ہے بلکہ انتساب کی تبرکی سعادت کے ساتھ ساتھ سب کے متعلق تو کہنا دشوار ہے، لیکن تصوف کے بڑے بڑے اہم مرکزی طریقوں کے متعلق اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں ہر ایک طریقہ اپنی کچھ خصوصی شان بھی رکھتا ہے اور زیادہ انتسابات سے ان ہی خصوصیتوں کو لوگ ظاہر کرنا چاہتے ہیں، یا کم از کم انتساب کی زنجیرہ بندیوں کا عارضہ جب تک نہیں پھیلا تھا اس وقت تک بڑی غرض ان نسبتوں کے استعمال کرنے کی عموماً یہی ہوتی تھی لیکن ہر طریقہ اور سلسلہ کی اسی خصوصی شان کی بنیاد پر یہ خیال کر لینا کہ تصوف کے ان طرق و سلاسل میں کوئی اساسی اور بنیادی اختلاف ہے۔ اہلِ طرق جانتے ہیں کہ یہ بھی قطعاً بے بنیاد خیال ہے، اسی لیے

تصوف اور صوفیت کے جس اختلاف کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں اس سے مراد طریقوں کے "خصوصی شان" کا یہ اختلاف نہیں ہے اختلاف کی یہ صورت کتنی غیر اہم ہے اس کا اندازہ آپ کو بزرگوں کے اس مشہور قول ہی سے ہو سکتا ہے، یعنی اردو زبان میں ہم اس کو یوں ادا کر سکتے ہیں کہ جیسے ہر شخص دوسرے شخص کی سانس سے مختلف ہے. اسی طرح صوفیت کے طریقے اور سلسلے بھی مختلف ہیں "بعدد الطرق الی اللہ للناس بعدد الانفاس" یا اسی کے قریب قریب الفاظ میں اسی مفہوم کو لوگوں نے ادا کیا ہے۔

اختلاف کا تعلق جبلی شاکلہ اور ماحول سے ہے

اس قسم کے اختلافات کا تعلق زیادہ تر صاحب طریقہ کے خصوصی افتاد طبع اور ان کے جبلی شاکلہ[1] سے ہوتا ہے، یا جس ماحول اور جن لوگوں میں بزرگوں میں ابتداءً کام کیا تھا ان لوگوں کے فطری اقتضاؤں کو ان میں دخل ہوتا ہے طریقۂ نقشبندیہ کا ذکر کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تفہیمات میں فرماتے ہیں کہ :۔

ان الشیخ بہاء الدین نصب مجدداً للاحسان فی ارض الترک وکانوا قوی البہیمیۃ وکان ھو مجذوبا قد قبل سرہ الملکی لنور الالہیا وتدلیا فتولد من نسبتہ وتربیت طریقۃ مفیدۃ غایۃ الافادہ۔

(ص۸۶ ج ۱)

مقام احسان کی تجدید کے لیے شیخ بہاء الدین نقشبند (مؤسس طریقہ) ترکوں کی سرزمین میں مقرر کیے گئے اور ترکوں کا بہیمی پہلو بہت پُر زور تھا، خود (حضرت خواجہ) مجذوب تھے (یعنی ذات حق نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا) ان کی فطرت کے ملکی پہلو نے الٰہی نور کو قبول کر لیا اور نور الٰہی کی تدلّی ان پر ہوئی اسی وجہ سے ان کی شخصی نسبت اور جن لوگوں کی تربیت ان سے متعلق تھی دونوں کی اجتماعی اقتضاء نے حد سے زیادہ فائدہ بخش طریقہ کو پیدا کیا۔

---

[1] اشارہ ہے آیت پاک قل کل یعمل علی شاکلتہ کی طرف (غ م)

تدلی یا بہیمی و ملکی قوت وغیرہ کے خاص الفاظ شاہ صاحب کے اصطلاحات ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، اس وقت تو مجھے صرف اپنے خیال کی تائیدی شہادت پیش کرنی تھی سو آپ دیکھ رہے ہیں کہ طریقہ نقشبندیہ کی خصوصی شان میں دونوں باتیں یعنی صاحب طریقہ کے شخصی خصوصیات اور جس قوم (ترک) میں کام کرنے کے لیے قدرت کی طرف سے وہ مقرر ہوئے تھے۔ ان کے قومی رجحانات دونوں کو شاہ صاحب کے قول کے مطابق کتنا دخل ہے[1]

خواجہ حسن بصریؒ اور علامہ محمد بن سیرین کی تقابلی مثال

حقیقت یہ ہے کہ رسمی علوم کے سلسلے کے اختلافات ہوں، یا باطنی طرق و سلاسل کے اختلافات ہر ایک میں اختلافات کی عمومی نوعیت یہی ہوتی ہے۔ حضرت خواجہ حسن بصری سے تو لوگ واقف ہی ہیں ظاہری و باطنی علم کے ان دونوں حلقوں میں آپ کا احترام مساوی طور پر کیا جاتا ہے۔ ان ہی کے ہمعصر اور ہم شہر دوسرے پاک نفس بزرگ محمد بن سیرین ہیں ان دونوں بزرگوں نے صحابہ کرام کی آنکھیں دیکھی تھیں اور صحابہ ہی کی صحبتوں میں ظاہری و باطنی کمالات کی دولت دونوں نے کمائی تھی، محمد بن سیرین حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خصوصی تلمیذ اور ان کے علم کے راوی عمل کے نمونہ تھے۔

کہنا یہ ہے کہ اعتقادی یا کلامی مسائل کے متعلق اختلاف کی ابتدا بصرہ ہی سے ہوئی۔ قدریہ اور مرجیہ دو اعتقادی فرقے سب سے پہلے اسی شہر میں پیدا ہوئے ان دونوں فرقوں کے اختلافات

---

[1] سیدنا الامام القطب الجیلی شیخ عبدالقادر رضی اللہ عنہ کے متعلق اسی موقع پر شاہ صاحب نے اپنا یہ کشفی وجدان ظاہر کیا ہے کہ ان الشیخ عبدالقادر لہ شعبۃ من سریان فی العالم وذلک انہ لما مات صار بہیتہ الملاء الاعلی والطبع فیہ الوجود الساری فی العالم کلہ (ص۸۵) اصطلاحات خاص جن کا شاہ صاحب نے اس عبارت میں استعمال فرمایا ہے۔ ان کے جانے بغیر مطلب کا سمجھنا عوام کے لیے دشوار ہے اس لیے ترجمہ غیر ضروری معلوم ہوا۔ شاہ صاحب سے عقیدت رکھنے والے علماء کے لیے بلاشبہ یہ عبارت قابل توجہ ہے۔ ۱۲

کا اصلی منشا جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ تھا کہ بعض لوگ صرف عمل پر زور دیتے تھے اعلم صحیح یعنی ایمان کے ذریعہ جن صحیح معلومات کا یقین آدمی اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے محض اس ایمان اور یقین کی ان نگاہوں میں کوئی قیمت نہ تھی، اسی کے مقابلہ میں بعض لوگ ایمانی معلومات ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے اسی لیے عمل کو وہ چنداں اہم نہیں خیال کرتے تھے۔ بحث و مباحثہ میں ان ہی دو مختلف نقاط نظر نے بالآخر یہ شکل اختیار کی کہ ایک طرف قدریہ جس کا نام بعد کو معتزلہ ہوا ان کے نزدیک سب کچھ عمل و کردار ہی تھا اسی بنیاد پر ان کا خیال تھا کہ معمولی کمزوریاں تو نہیں لیکن دین کے اہم عملی مطالبات میں سے کسی ایک مطالبہ کی بھی خلاف ورزی نجات سے آدمی کو قطعاً محروم کر دیتی ہے۔ اسی کی تعبیر یہ کی گئی ہے کہ کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان جنت میں نہیں جا سکتا، بالفاظ دیگر صرف ایمان اس کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا، اسی مقابلہ میں مرجیہ اس بات پر مدعی ہو گئے کہ اصل چیز فقط ایمان ہے جب ایمان کی دولت سے ایک شخص سرفراز ہو چکا ہے تو نجات کی حقیقی ضمانت اس کو مل چکی اب جہنم سے اس کا کیا تعلق اسی خیال کو مدرسوں میں یوں ادا کرتے ہیں کہ مرجیہ کے نزدیک نجات کے لیے صرف ایمان کافی ہے عملی کمزوریاں خواہ جیسی کچھ بھی ہوں ان کی وجہ سے مسلمان جہنم میں نہیں جا سکتا ظاہر ہے کہ دونوں عقیدے صرف افراط و تفریط اور بحث و مباحثہ کی گرما گرمی ہی سے پیدا ہوتے ہیں، مسلمانوں کے عام جمہور جو اہل السنت والجماعت کے نام سے موسوم ہیں ان کا فیصلہ یہ ہے کہ نجات کے باب میں عمل کو قطعاً بے قیمت اور غیر موثر سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ قرآنی آیت

لها ما کسبت وعلیها ما اکتسبت — یعنی آدمی نے جو کیا اس کا نفع بھی اسی کے لیے ہے اور نقصان بھی اس کے کرتوتوں کا اس کو پہنچتا ہے۔

جب قرآنی نص ہے تو یہ خیال کہ عملی مکاسب و اعمال سے نہ ضرر ہی پہنچتا ہے اور نہ نفع قطعاً غلط ہے۔ قرآنی بیان کی تکذیب ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ عمل کی قیمت ایمان ہی سے پیدا ہوتی ہے ایمان کے بغیر صحیح عمل سے نجات تو نجات اسلامی دائرے میں شریک ہونے کے لیے بھی وہ کافی نہیں۔[1]

---

[1] قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں بلکہ بار بار نجات کی اس جوہری بنیاد کو دہرا دہرا کر بیان کیا گیا ہے کہ عمل صالح بار آور اور

برعکس اس کے ایمان کا حال یہ ہے کہ بڑے سے بڑا کٹر کافر ایمان کی راہ سے علمی تصحیح کی توفیق پانے کے ساتھ ہی کفر کی جماعت سے نکل کر مومنین کے حلقہ میں داخل ہو جاتا ہے خواہ دین کے عملی مطالبات میں سے کسی ایک مطالبہ کی تعمیل نوبت اسے نہ آئی ہو۔ بلکہ اس علمی تصحیح سے پیشتر اس نے بحالت کفر جو کچھ کیا کرایا تھا سب حرف غلط بن جاتے ہیں۔ اسی بنیاد پر اہل سنت کا عام عقیدہ یہ ہے کہ مومن ہونے کے بعد عملی غلطیوں میں جو مبتلا ہوگا اس کا معاملہ خدا سے غفور و رحیم کے سپرد ہے۔ چاہے اس کی غلطیوں سے درگزر کرے قرآن ہی میں ہے کہ شرک کے سوا سارے عملی اغلاط کا مسئلہ مشیت الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے چاہے بخشدیا جائے چاہے ان کے مرتکب کو جہنم میں بھیجا جائے لیکن کافروں اور منکروں کی طرح اگر جہنم ہی میں وہ بھی پڑا ہی رہا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایمان کی کوئی قیمت اس کو نہیں ملی اسی لیے اپنی غلط کاریوں کے خمیازوں کو بھگت لینے کے بعد ایمان کا اقتضاء بھی پورا ہو گیا۔ یعنی جہنم سے نجات پائے گا، قرآنی آیات اور صحیح حدیثوں کو مجموعی حیثیت سے پیش نظر رکھنے کے بعد اسی نتیجہ تک ہر صاحب انصاف پہنچ سکتا ہے۔

مگر میں نے جیسا کہ پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ دراصل طبائع کے انفرادی رجحانات سے اس قسم کے مسائل کی ابتداء ہوتی ہے پھر بحث و مناظرہ، مجادلہ و مقابلہ کی گرم بازاریوں کے بعد جن کی طبیعتوں میں صحیح اعتدال و توازن نہیں ہوتا وہ کسی ایک پہلو پر بیجا اصرار کر کے اپنا ایک مستقل مسلک بنا لیتے ہیں[1]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نتیجہ خیز اسی وقت ہو سکتا ہے جب مومن ہونے کے بعد کیا جائے آخر ایسی آیتیں مثلاً ومن یعمل من الصالحات وھو مومن فلا یخاف ظلما ولا ھضما (ط) ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثیٰ وھو مومن (نساء) کی کیا کمی ہے نحل میں سورہ مومن میں سورہ بنی اسرائیل میں جہاں چاہے آپ کو اس مضمون کی آیت مل جائے گی اور یہ تو معمولی قرآن کے تلاوت کرنے والے جانتے ہیں کہ عملوا الصالحات سے پہلے آمنوا کا ذکر قرآن کا ایک دوامی التزام ہے یہی فطری بات بھی ہے علم ہی جس کا غلط ہوگا اس کے عمل کی درستی کی شکل ہی کیا ہے اصل چیز تو عمل میں یہ ہے کہ کس کے لیے کیا گیا اور کس کے حکم سے کیا گیا لاکھ اچھے کام کسی نے کیے ہوں لیکن اللہ کے لیے اللہ کے حکم سے اگر نہیں کیا تو حق تعالیٰ سے جزاء کی توقع آخر کس بنیاد پر۔ [1] اسی مسئلہ میں یاد ہوگا کہ دنیا کے پرانے ادیان تک کی تاریخوں میں دو مستقل مختلف الخیال فرقے نظر آتے ہیں۔ ہندو مذہب میں کرم کانڈ اور گیان کانڈ دو اسکول جو پائے جاتے ہیں وہ اسی مسئلہ کی ہندی تعبیر ہے حضرت

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بہرحال میں کن قصوں میں پڑ گیا یہ بیان کر رہا تھا کہ بصرہ کے یہ دونوں بزرگ جن کے متعلق اسی زمانہ میں جب صحابہ کرام سے ابھی بصرہ بالکل خالی نہ ہوا تھا یہ سمجھا جاتا تھا کہ دونوں شہر بصرہ کے سردار ہیں عربی النسل مسلمانوں کے بھی اور غیر عربی النسل مسلمانوں کے بھی [1]۔

یہ وہ وقت تھا کہ خلافت راشدہ ہی کا دَور ختم نہیں ہو چکا تھا بلکہ حجاج جیسے لوگوں کو مسلمانوں پر جو حکومت مطلق العنان حاکم بنا کر مسلط کر سکتی تھی بنی امیہ کی وہی حکومت اپنے تمام لوازم و آثار کے ساتھ قائم ہو چکی تھی فتوحات کی وسعت اور ایرانی و رومانی تمدن وعمران کی وراثت نے ان سارے جذبات وکیفیات کو پیدا کر دیا تھا۔ جو اس قسم کے تمدن وحضارت کے لازمی نتائج ہیں، تکاثر فی الاموال وتفاخر فی الاولاد کے مقابلہ کا بازار چار سو گرم تھا۔ تفصیل کے لیے تو اس عہد کی معاشرتی واجتماعی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے لیکن مثالاً وہی واقعہ جس کا حافظ ابونعیم نے خواجہ حسن بصری کے تذکرہ میں ذکر کیا ہے اندازے کے لیے کافی ہو سکتا ہے کہ ابوبکر ہذلی جو خواجہ حسن بصری کے حلقہ نشینوں میں تھے وہی بیان کرتے ہیں کہ :-

حسن بصری کے شخصی مزاج کا اور تربیتی ماحول کا ان کی تعلیمات کا اثر

ہم لوگ حسن کے حلقہ میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے آکر یہ خبر سنائی کہ ابھی عبداللہ بن اہتم کے پاس سے میں آ رہا ہوں اپنی آخری سانسیں وہ پوری کر رہے تھے میں نے عبداللہ سے پوچھا کہ کیا حال ہے تو جواب میں کہنے لگے کہ سخت تکلیف

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مسیح علیہ السلام کے نام سے سینٹ پال نے عیسائیوں میں جہاں دوسری باتیں پھیلائیں کہتے ہیں کہ ان میں ایک ارجاء کا خیال بھی تھا۔ سینٹ پال کی طرف جو خطوط یا مکتوب منسوب ہیں ان میں اب تک اس قسم کے فقرے پائے جاتے ہیں، مثلاً گلیتوں والوں کے موسومہ مکتوب میں ہے کہ

آدمی شریعت (تورات کے عمل مطالبات) کے اعمال سے نہیں بلکہ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانے سے راستباز ٹھہرتا ہے۔ (مکتوب مذکور باب ۲/۱۶)

غلو کہیے یا بیباکی میں اس حد تک پال پہنچ گیا تھا کہ اسی خط میں دوسری جگہ اسی کے الفاظ ہیں :-

جتنے شریعت کے اعمال پر بھروسہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں (باب ۳/۱)

[1] ابن سعد ص۱۴۳ ج ۷

ہیں ہوں۔

اسی کے بعد عبداللہ بن اہتم نے جو بات کہی وہی سننے کی ہے یعنی تکلیف کا ذکر کر کے ایک صندوق کی طرف جو سامنے رکھا ہوا تھا اشارہ کر کے کہہ رہے تھے

"اس ایک لاکھ کا کیا ہوگا جو اس صندوق میں رکھا ہوا ہے۔ جس کے ایک پیسہ کی نہ زکوٰۃ ہی ادا ہوئی اور نہ رشتہ داروں[1] کے ساتھ سلوک کرنے میں، کچھ خرچ ہوا۔"

---

[1] شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب تفہیمات میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے زمانہ میں مخاطب کرتے ہوئے ان کی غیر اسلامی زندگی پر جو جوہری تنقیدیں فرمائی ہیں ان میں اس کی شکایت کرتے ہوئے کہ زکوٰۃ کے فرض کو تم نے بھلا دیا آگے ایک چیز آپ کے قلم سے نکل گئی ہے، عبداللہ بن الاہتم کے ان الفاظ پر شاہ صاحب کی اس بات کا خیال آیا جی چاہتا ہے کہ اپنے عہد کے اہل ثروت و نعمت تک شاہ ولی اللہ کی یہ بات پہنچا دی جائے۔ شاہ صاحب نے اسی شکایت کے بعد لکھا کہ

کوئی ایسا امیر و تونگر آدمی نہیں ہے جس کے رشتہ داروں میں ایسے غریب غربا اور نادار لوگ نہ ہوں جو مستحق ہوتے ہیں کہ انہیں کھلایا جائے اور ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ مالداروں کو اپنے رشتہ داروں کے ساتھ کچھ حسن سلوک کے مواقع جو مل جاتے ہیں ان کے متعلق زکوٰۃ کی اور حکم الٰہی کی تعمیل کی نیت کر لیا کرے۔ یہ لوگ اتنا بھی کریں تو ان کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

شاہ صاحب کے عربی الفاظ یہ ہیں یعنی لو انہ نوی الزکوۃ والعبادۃ لکفاہ (ص۲۱۹ ج ۱)

یہ ایک محدث جلیل اور فقیہ نبیل کا فتویٰ ہے کاش کچھ نہیں تو اسی نیت کی توفیق مسلمانوں کے ارباب ثروت و سرمایہ کو میسر آجائے کیونکہ رشتہ داروں کے ساتھ اس قسم کے حسن سلوک بہرحال عموماً لوگ کیا ہی کرتے ہیں الا یہ کہ کوئی اشقی القوم و اقسی القلب ہو، یہاں ایک فقہی جزئیہ کا ذکر بھی غالباً بے محل نہ ہوگا۔ علامہ سہیلی نے روض الانف میں حنفیوں کے امام ثانی ابو یوسف کی طرف اس فتوے کو منسوب کیا ہے کہ سادات (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے آل میں جو لوگ داخل ہیں اگرچہ زکوٰۃ ان پر حرام ہے لیکن تحل لھم صدقۃ بعضھم علی بعض وھم بنوھاشم وبنو عبدالمطلب (یعنی خود باہم سادات کی زکوٰۃ سادات کے لیے حلال ہے۔ ص۱۴۲ ج ۱ روض الانف ——— شاہ ولی اللہ کے مشورہ سے قاضی ابو یوسف کے اس فتویٰ کی بنیاد پر سادات بھی اپنے اقربا و اعزہ کے ساتھ حسن سلوک کر کے چاہیں تو نفع اٹھا سکتے ہیں قاضی ابو یوسف کے اس فتویٰ کا ذکر حنفیوں کی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ ۱۲

خواجہ حسن بصری سے جو صاحب اس قصہ کو بیان کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ میں نے تب عبداللہ سے کہا کہ آخر اس طریقہ سے آپ نے یہ رقم کس لیے جمع کی تھی۔ عبداللہ بولے کہ

" کیا کہوں خدا کی قسم، گردش ایام کے خوف اور حکومت کی بے اعتنائیوں کے اندیشے، ان ہی کے ساتھ اپنے کنبہ میں مالی برتری حاصل کرنے کا جو شوق مجھ میں تھا، ان ہی باتوں کا یہ نتیجہ ہے۔"

(حلیۃ الاولیا صفحہ ۱۴۵ ج ۲)

اور یہ ایک اعترافی نمونہ ہے ان جذبات اور خیالات کا جن میں مسلمان اسی زمانہ میں ماحول کے زیر اثر مبتلا ہو چکے تھے، یا ہوتے چلے جا رہے تھے۔

خود خواجہ حسن بصری کے ملفوظات و اقوال جن کا کتابوں میں کافی ذخیرہ پایا جاتا ہے ان میں بھی بکثرت اس قسم کی چیزیں جو ملتی ہیں، مثلاً راستباز مرد مومن کی علامتوں کو بتانے کے بعد یعنی کسی قسم کے نیک اعمال کی توفیق اسے میسر آئی ہو۔ مگر اپنے حسن انجام کے متعلق کبھی وہ مطمئن نہیں ہوتا، خواہ اس نے پہاڑ ہی کے برابر مال اللہ کی راہ میں کیوں نہ خرچ کر دیا ہو۔ لیکن نتیجہ جب تک اس کے سامنے نہ آجائے اس وقت تک وہ ڈرتا ہی رہتا ہے مگر اس کے مقابلہ میں نام نہاد مسلمانوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ

" سواد اعظم یعنی عام مخلوق (عموماً میری ہی جیسی ہے) پس سب کے ساتھ ہم بھی بخش دیئے جائیں گے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ (اسی قسم کی طفل تسلیوں کے بعد) عمل خیر میں سستی سے وہ کام لیتے ہیں اور دل میں خدا کے متعلق من مانی آرزویں پکارتے رہتے ہیں۔"

(صفحہ ۱۵۳ ج ۲ علیہ)

کبھی فرماتے کہ

" سب سے بڑا بدکردار فاسق وہ ہے جو ہر قسم کے کھلے اور بڑے گناہوں کا ارتکاب بھی کیے جاتا ہے اور یہ کہتا جاتا ہے کوئی خطرے کی بات نہیں اور میرے لیے کوئی کھٹکا نہیں ہے۔" (صفحہ ۱۴۵ ج ۲ حلیۃ الاولیاء)

ایک دن آپ نے ایک طویل تقریر فرمائی جس میں یہ بتاتے ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے اور ماننے والوں نے آپ کو اللہ کا رسول مان لیا تو پھر دیکھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقہ زندگی کے اختیار کرنے میں ان ماننے والوں میں ہر ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ صحابہ کی اسی قسم کی خصوصیتوں کے ذکر کے آخر میں فرمایا کہ

"خدا کی قسم ان کے پاس یہ بڑی بڑی دیگیں (لذیذ کھانوں سے بھری ہوئی) صبح و شام پیش نہیں ہوتی تھیں، نہ آنے والوں کے لیے اپنے دروازوں پر وہ پہرے بٹھاتے تھے اور نہ دربان ان کی ڈیوڑھیوں پر رکھے گئے تھے۔"

پھر مسلمانوں کی خود ان کے زمانے میں جو حالت ہو چکی تھی اس کا اظہار ان الفاظ میں انہوں نے کیا ہے:۔

"یہ بدکردار، پاجی، گنوار، سود خواروں اور بد دیانتی کرنے والے مالدار لوگ ہیں جنہیں حق تعالٰے نے ٹھکرا دیا ہے وہ (سب کچھ کیے چلے جاتے ہیں مگر اسی کے ساتھ یہ بھی کہتے چلے جاتے ہیں کہ) ہم جو کچھ کھا پی رہے ہیں، گھروں کو پردوں سے جو مڑھ رہے ہیں اور تعمیری طمطراق سے جو کام لے رہے ہیں ان سے کسی قسم کا کوئی خطرہ اور کچھ کھٹکا ان کو نہیں ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ مشہور قرآنی آیت یعنی من حرم زینة الله التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق (کس نے زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام کیا جو خدا نے اپنے بندوں کے لیے پیدا فرمائی ہیں اور پاک ستھری غذاؤں کو) اسی آیت سے ان تکلفات لایعنی کی تصحیح کرتے تھے، لکھا ہے کہ خواجہ حسن بصری اسی آیت کو تلاوت کر کے فرماتے کہ

"آیت کو غلط مقام پر وہ استعمال کر رہے ہیں یہ سچ ہے کہ ہمارے بدن کے لیے خدا نے زینت پیدا کی (یعنی ستر پوشی کے لیے لباس عطا کیا ہے) اور ہمارے شکم کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے غذا پیدا کی ہے۔"

اسی کے بعد کہتے ہیں کہ

"پھر تم میں لوگ خدا کی نعمتوں کو لیتے ہیں اور ان کو لے کر کبھی اپنے پیٹ

کے ساتھ کھیلتے ہیں اور کبھی اپنی شرم گاہوں کے ساتھ کھیلنے کا ذریعہ ان
ہی خدائی نعمتوں کو بناتے ہیں اور کبھی ان نعمتوں کو لے کر اپنے بدن کے
ساتھ بازی گری کرتے ہیں،

آخر میں قرآن کی دوسری آیت جس میں اسراف اور فضول خرچی سے روکا گیا ہے اس کا حوالہ دے کر کہتے تھے کہ خدا کی نعمتوں سے استفادہ حدود میں رہ کر کرنا چاہیئے۔ اپنے پیٹ، اپنے بدن، اپنی شرمگاہوں کے ساتھ کھیلنے کا ذریعہ جو ان کو بنا رہے ہیں قیامت کے دن اس کے وبال کو دیکھیں گے (حلیہ ص۱۵۴ ج ۲)۔

کوفہ کا گورنر ابو ہبیرہ تھا، غالباً دورے پر بصرہ بھی پہنچا اور کسی ضرورت سے خواجہ کو بھی اس نے بلایا مل کر جب واپس ہو رہے تھے تو دروازے پر چند علماء کو پایا جنہیں اس زمانے میں القرار کہتے تھے، دیکھ کر بدن میں آگ لگ گئی بے ساختہ ان پر ٹوٹ پڑے فضیل بن جعفر جو اس واقعہ کے راوی ہیں ان کا بیان ہے کہ خواجہ اس زمانے کے ان مولویوں کو کہہ رہے تھے۔

"کیا تم ان گندوں اور خبیثوں کے پاس جانا چاہتے ہو خدا کی قسم تمہاری نشست یہاں ابرار اور نیک لوگوں کی نشست نہیں ہے۔ بھاگو! یہاں سے خدا تمہاری جان کو تمہارے جسم سے جدا کرے تم لوگوں نے اہل علم کو رسوا کیا خدا تمہیں رسوا کرے۔ خدا کی قسم اگر تم اس چیز سے جو ان (امیروں) کے پاس ہے بے نیازی اختیار کرتے تو جو کچھ تمہارے پاس ہے اس کے یہ طالب بن جاتے لیکن ان کے پاس جو کچھ ہے اسی کو تم نے مطلوب بنا لیا تو جو کچھ تمہارے پاس ہے اس سے وہ بے نیاز ہو گئے"۔ (ص۱۵۱ حلیہ)

نمونے کے ان چند اقتباسات کا اندازہ اس عہد کی معاشرت اور اس ماحول سے کیا جا سکتا ہے۔ جو بتدریج مسلمانوں کو اپنے گھیرے میں لاتا چلا جا رہا تھا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں خواجہ حسن بصری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں آنکھیں کھولی تھیں، بڑے بڑے صحابی مثلاً ابو ہریرہ، ابن عمر، ابن عباس، عمران بن حصین، سمرۃ بن جندب وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے حدیثیں روایت کرتے تھے خود کہتے تھے جیسا کہ حلیہ میں ہے :۔

ادرکت سبعین بدریا۔ (ص۱۳۴ ج ۲) میں نے بدر میں شریک ہونے والے صحابیوں میں سے ستر کو پایا۔

ممکن ہے کہ ستر سے کثرت تعداد ہی مراد ہو جیسا کہ عربی زبان کا عام محاورہ ہے تاہم بدری صحابیوں کی کثیر تعداد کے دیکھنے کا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو موقع ملا تھا، ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں خواجہ حسن کی والدہ رہتی تھیں۔ (بعض کہتے ہیں کہ ام المومنین کی شرعی خادمہ تھیں) بہر حال نبوت کبریٰ کی صحبت میں جن لوگوں کی تربیت ہوئی تھی ان کے دیکھنے والے کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت جب اس حال میں پہنچ گئی ہو۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس پر کیا گزرتی ہوگی، خود ہی فرمایا کرتے تھے :۔

" ساری جانی پہچانی باتیں گم ہو گئیں، اور جن باتوں کو کوئی نہیں پہچانتا وہی باقی رہ گئیں۔"

کبھی ان ہی صحابیوں کو یاد کر کے اپنے زمانے کے مسلمانوں سے کہتے کہ :۔

" خدا کی قسم ان کو (یعنی رسول اللہؐ کے صحابیوں کو) تم اگر دیکھتے تو سمجھتے کہ پاگل لوگ ہیں، اسی طرح اگر تم کو (حضرات صحابہ دیکھ پاتے) تو جو تم میں نیک سمجھے جاتے ہیں ان کو دیکھ کر کہتے کہ (دین میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے) اور جو برے ہیں تو ان کے متعلق فیصلہ ان کا یہی ہوتا کہ حساب کے دن کو یہ نہیں مانتے"

پیغمبر کی صحبت و تربیت نے جاہلی عرب میں جس انقلاب کو پیدا کیا تھا اپنی چشم دید شہادت اسی کے متعلق ان الفاظ میں ادا کرتے :۔

" میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے جن کی نظر میں دنیا اس سے بھی زیادہ بے قدر تھی جتنی بے قدر و بے قیمت تمہاری نظروں میں تمہارے پاؤں کے نیچے کی گرد ہے میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے کہ جن کے گھر رات آتی اور بجز اتنی غذا کے جو صرف انہیں کے لیے کافی ہو، ان کے پاس اور کچھ نہ ہوتا اس پر بھی وہ کہتے کہ صرف اپنے پیٹ میں اسے ڈال دوں یہ مناسب نہیں ہے بلکہ یہ کروں گا کہ کچھ خود کھاؤں گا اور کچھ اللہ کی راہ میں تقسیم کروں گا۔ حالانکہ

اللہ کی راہ میں جو کچھ وہ دیتے تھے اس کے خود ہی زیادہ محتاج ہوتے تھے۔
(ص۱۳۶ ج ۴)

کبھی ان ہی بزرگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے :۔

"مسلمانوں کے یہ دانشمند لوگ یہ سمجھتے تھے (کہ اصل کام وہی ہے جو) صبح و شام اور کچھ رات کی تاریکیوں میں بن پڑے (یعنی خدا سے مناجات کا موقع نماز میں جو مل جائے) اسی پر ڈٹے رہنا (یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین تھا)۔"

پھر اپنے زمانے کے لوگوں کے طرز عمل کو پیش نظر رکھ کر فرماتے :۔

"بہشت خدا کو دھوکہ دے کر کوئی حاصل نہیں کر سکتا صرف آرزوؤں سے کچھ نہ ملے گا۔ لالچ کا کتنا زور بڑھ گیا ہے لوگ صرف آرزوؤں میں غرق ہیں اسی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔"

خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایک ذکی الحس آدمی جیسے خواجہ رحمۃ اللہ علیہ تھے مسلمانوں کے دو متخالف حالات جن کا مشاہدہ زندگی کے دو مختلف ادوار میں خود ان کو کرنا پڑا تھا اس کا اثر ان کے دل پر کیا پڑ سکتا تھا ان کی سوانح عمریوں میں بکثرت اس کا جو ذکر کیا گیا ہے کہ ہمیشہ وہ مغموم و ملول رہتے تھے۔ ان کے شاگرد ابراہیم بن عیسیٰ الیشکری کہتے تھے کہ

حسن سے زیادہ مغموم آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ جب ان پر نظر پڑتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کسی زندہ مصیبت میں یہ شخص مبتلا ہے۔

حمید نامی دوسرے صاحب ہیں جن کا بیان ہے کہ

رجب کا مہینہ تھا، مسجد میں حسن بصری کو میں نے دیکھا کہ کلی کر رہے ہیں اور سرد آہیں کھینچ رہے ہیں پھر ڈھاڑیں مار کر رونے لگے ان کے دونوں مونڈھے کانپ رہے تھے۔ (ص۱۴۳)

دوامی حزن و ملال، غم و کرب کی اس کیفیت کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کچھ پیشگوئیاں بھی ہوتی تھیں اپنی تقریر میں جیسا کہ راوی کا بیان ہے۔ خواجہ نے ایک دن فرمایا :۔

" خدا کی قسم ایسا آدمی جس نے قرن اول کو پایا ہو (یعنی صحابہ کرام کو دیکھا ہو) اور پھر وہ تم لوگوں کے درمیان بھی رہ گیا ہو کوئی دوسری صورت اس کے لیے نہیں ہے بجز اس کے کہ صبح کو جب اٹھے تو مغموم اٹھے اور جب شام ہو تو اس وقت بھی وہ مغموم ہی رہے ۔"

(حلیہ ص ۱۳۳)

کبھی کہتے کہ

" موت دنیا کو رسوا کر رہی ہے کسی دانشمند کے لیے مسرت کی یہاں گنجائش ہی اس نے کب چھوڑی ہے ۔"

خواجہ حسن بصری کے ان ہی باطنی تاثرات اور اندرونی بے چینیوں، دوامی قلق اور کبیدگیوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی گفتگو، تقریر، تحریر سب میں غیظ و غضب کا جوش و خروش بھرا رہتا تھا اس قسم کے فقرے تو جہاں چاہیے آپ ان کے کلام میں پا سکتے ہیں مثلاً

" ارے آدم کے بچے تجھ پر افسوس ہے کیا اللہ سے جنگ کی سکت اپنے اندر رکھتا ہے دیکھ جو خدا کے حکموں سے سرتابی کر رہا ہے وہ خدا سے جنگ میں مصروف ہے ۔"

اور اس قسم کے فقرے تو ان کی تقریروں اور خطبوں میں محوری عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً :-

" آدم کے بچے! عمل صرف تیرا عمل، یہی تیرا گوشت ہے یہی تیرا خون ہے تیرا عمل ہی تولا جائے گا، برا بھی اور بھلا بھی: پھر کسی بھلائی کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھنا اور کسی برائی کے متعلق یہ خیال نہ کرنا کہ وہ تو معمولی ہے۔ تم لوگوں کو گھسیٹ رہے ہو اور قیامت تمہیں گھسیٹ کر اپنے قریب لا رہی ہے آخر کس چیز کا انتظار ہے؟ کیا سن مکھ ہو جانے کا؟ تو دیکھ! وہ سامنے ہے ۔"

مسلمانوں کو خطاب کر کے کہتے :-

" تمہاری کتاب (قرآن) کے بعد پھر کوئی کتاب نازل نہ ہوگی، تمہارے

حاشیہ میں ان کے والد سیرین کا مختصر حال میں نے درج کیا ہے اس سے اتنا تو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ ایک کھاتے پیتے خاندان کے آدمی تھے۔ والد سے ترکہ میں کافی سرمایہ اور جائداد بھی ملی تھی لیکن ابتدا ہی سے ان کا جو فطری میلان تھا اس کا اندازہ اسی واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جرجرایا نامی ضلع میں ان کے والد نے جو زمین خریدی تھی اور وراثتاً اس کا جو حصہ ابن سیرین تک پہنچا اس زمین میں انگور کی کاشت ہوتی تھی۔ تاکستان کے ساتھ انہوں نے کسی کے ہاتھ اس زمین کو بندوبست کر دیا۔ کافی زرلگان پر معاملہ طے ہو چکا تھا اتنے میں ابن سیرین کو معلوم ہوا کہ تاکستان کے انگوروں سے بندوبست لینے والے شراب بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں انہوں نے یہ سن کر کہا کہ کیا ان کو تم پھلوں کی صورت میں فروخت نہیں کر سکتے۔ بولے کہ ایسی صورت میں نفع نہ ہو گا۔ تب ابن سیرین نے کہا کہ کشمش بنا کر یعنی انگوروں کو خشک کر کے بیچو۔ بولے کہ یہ جس قسم کے انگور ہیں ان سے کشمش نہیں بن سکتی یہ سن کر ابن سیرین نے لینے والوں سے معاملہ فسخ کرا لیا لکھا ہے کہ اس کے بعد

ضرب الکرم الفاکہ فی الماء — تاکستان کی تمام بیلوں کو کاٹ دیا اور سب کو پانی میں بہا دیا۔

ابن سعد ص۱۴۴ ج ۷/۲

دینی شائستگی کا حال یہ تھا کہ گفتگو کرتے ہوئے ایک شخص کے متعلق زبان سے ان کے نکل گیا کہ

"اس کالے آدمی کو میں نے نہیں دیکھا۔"

پھر خود کہنے لگے کہ میں نے اس شخص کی غیبت کی اور استغفار کرنے لگے، ایک صاحب ان سے طبیب کے متعلق مشورہ لے رہے تھے کہ علاج کس سے کراؤں، پہلے ایک طبیب کا نام لیا مگر پھر ان کو کچھ خیال آیا تو بولے کہ "فلاں طبیب مگر اس سے بھی زیادہ ماہر اور عالم ہے۔" کہنے کو تو کہہ گئے لیکن پھر خود فرمانے لگے "استغفر اللہ! میں خیال کرتا ہوں کہ اس پہلے طبیب کی غیبت کا میں مرتکب ہوا۔" یہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات سے ان کے نازک ترین دینی احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی لیے ابن عون کہا کرتے تھے کہ

"ابن سیرین تو تلوار کی دھار پر چلتے تھے۔" (ص۱۴۴ ج ۷/۲ ابن سعد)

اور یہ قصے تو ان کی جوانی کے دنوں کے ہیں، ان کی زندگی کا سب سے بڑا عبرت انگیز واقعہ تو وہ ہے

جسے سن کر آج بھی طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جو سرمایہ ان کو والد سے ملا تھا اسی سے بصرہ میں ابن سیرین کپڑے اور غلہ کا کاروبار کرتے تھے اور ان کا یہ کاروبار بڑے پیمانہ پر زمانہ تک جاری رہا۔ بڑی خوش حال زندگی گزر رہی تھی[1]۔ ایک دفعہ یہ صورت پیش آئی کہ چالیس ہزار کا غلہ انہوں نے خریدا مال ایسے موقعہ سے مل گیا تھا کہ تقریباً اسّی ہزار نفع بھی اس پر حاصل ہوا، لیکن اچانک ان کو محسوس ہوا کہ اس معاملہ میں شرعی نقطۂ نظر سے کچھ نقص رہ گیا۔ بالاتفاق لوگوں کا بیان ہے کہ یہ نقص ایسا نہ تھا جس کی وجہ سے معاملہ کو شرعاً حرام یا قطعی ناجائز ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ بلکہ جتنا صاف اور کھرا معاملہ کرنے کے ابن سیرین عادی تھے یہ کیفیت اس معاملہ کی نہ تھی[2]۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابن سیرین نے اصل مع نفع سب کو خیرات کر دیا، مگر اسّی ہزار کا یہ خسارہ معمولی خسارہ نہ تھا دیوالہ نکل گیا، قرض داروں نے مطالبہ شروع کیا جن میں ایک بدبخت عورت بھی تھی۔ اس نے جیل دینے کی درخواست حکومت میں ابن سیرین کے لیے دے دی بے چارے قید ہو گئے اور زمانہ تک قید کی سزا بھگتی جسے بخوشی برداشت کرتے رہے۔

فراغ بالی اور رفاہیت کی زندگی کے بعد عمر کے آخری حصے میں دین اور جیل کی اس مصیبت میں ابن سیرین

---

[1] خوش حالی کے ان دنوں میں ابن سیرین کی سب سے بڑی خصوصیت مہمان نوازی اور احباب پروری تھی۔ ان کے ملنے والوں کا بیان ہے کہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے پاس ہم میں سے کوئی جاتا اسے بے کھلائے پلائے وہ رخصت کرتے اس سلسلے میں بڑے دلچسپ قصے کتابوں میں لوگوں نے نقل کیے مگر اس قرض کے بعد ان کی مالی حالت خراب ہو گئی اس زمانے میں چھوٹی مچھلیوں کے سالن کے سوا روٹی کے ساتھ اور کچھ نہ کھاتے۔

[2] میں نے اس قصہ کو ابن سعد سے نقل کیا ہے۔ مختلف روایتوں کو جمع کر کے مجموعی نتیجہ جو پیدا ہوتا ہے اسی کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ابن سیرین معاملہ کی صفائی میں کتنی نزاکتوں سے کام لیتے تھے میمون بن جہران کہتے تھے کہ کوفہ میں کپڑوں کا معاملہ میں نے ابن سیرین سے کیا تھا۔ ہر ہر تھان پر کہتے کہ تم لینے پر راضی ہو چکے۔ خرید لیا۔ میں کہتا ہاں! پھر تین دفعہ اس کو مجھ سے دہراتے اس کے بعد دو آدمی کو گواہ بنا کر کہتے کہ اس معاملہ کے گواہ رہو۔ میمون کہتے تھے کہ میرا پہلا تجربہ تھا ان کے اس احتیاط کو دیکھ کر میں نے قاعدہ مقرر کر لیا تھا کہ ابن سیرین کی دوکان میں جو چیز مل سکتی اس کو دوسری جگہ نہیں خریدتا حتیٰ کہ کپڑوں کی گٹھڑیوں کا لفافہ بھی۔ (ص ۱۴۷ ج ۷)

جب مبتلا ہوئے تو دوسروں کا نہیں خود ابن سیرین کا خیال اپنے ان مصائب کے متعلق کیا تھا ؟ اخلاقی قوانین کی گرفت کے متعلق ابن سیرین کی حسی ذکاوت کا چونکہ اس سے اندازہ ہوتا ہے اسے بھی سن لیجئے۔ شاگردوں سے ڈاڑھی کو ہاتھ سے پکڑتے ہوئے کہتے کہ :۔

" اپنے پاس اٹھنے بیٹھنے سے میں آپ لوگوں کو جو روکا کرتا تھا وہ اسی خطرے کا احساس تھا۔ جو آج میرے سامنے ہے یہ اسی شہرت کا نتیجہ ہے جو تم لوگوں کی آمد و رفت کے بدولت مجھے حاصل ہوئی اور شہرت نے بالآخر اس مقام پر مجھے پہنچایا کہ پولیس کی چوکی پہ کھڑا کیا اور کہنے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ :۔

هذا ابن سيرين قد اكل اموال الناس — یہ ابن سیرین ہے جس نے لوگوں کا مال مارا ہے۔ "

عام شاگردوں سے تو یہ کہتے، لیکن خاص محرم اسرار ابن عون کہا کرتے تھے کہ ابن سیرین نے ایک دن مجھ سے کہا کہ :۔

" یہ قرض کی مصیبت جو آج میرے سامنے آئی ہے چالیس سال پہلے کی ایک غلطی کا خمیازہ ہے۔ "

یہ غلطی جو چالیس سال پہلے ان سے سرزد ہوئی تھی کیا تھی ؟ خود ہی اس کی خبر ان الفاظ میں ابن عون کو دی کہ :۔ قلت لرجل من اربعين سنة يا مفلس — ایک شخص کو چالیس سال ہوئے ہیں نے اسے قلانچ (مفلس) کہہ دیا تھا۔ (ص ۲۷۱ ج ۲ حلیۃ الاولیا)

اسی کے ساتھ ابن سعد کی اس روایت کو بھی حافظے میں محفوظ کر لیجئے یعنی بکار بن محمد کہتے تھے کہ :۔

" ابن سیرین کی ایک ہی بیوی سے تیئس اولاد ہوئی جن میں ان کے بیٹے عبداللہ بن محمد کے سوا کوئی باقی نہ رہا۔ " (ابن سیرین کے سامنے سب کی وفات ہوئی)

(ص ۱۴۲ ج ۷)

بچپن ہی سے کچھ ثقل سماعت کی بھی ابن سیرین کو شکایت تھی۔ (ص ۱۴۲ ج ۷)

ان حالات کے بعد آپ کے سامنے خواجہ حسن بصری کے مقابلہ میں ابن سیرین کی افتاد طبع اور فطری رجحان کا اندازہ ان کے سوانح نگاروں کے ان بیانات سے کیجئے، مثلاً :۔

"ابن سیرین کا عام طریقہ یہ تھا کہ ان کی مجلس میں جو لوگ آتے ان سے خوب گھل مل کر باتیں کرتے اور بیچ بیچ میں ہنستے بھی جاتے، دنیا کی خبریں پوچھتے۔" (ص۱۴۲ ابن سعد ج ۷)

انہیں کے ایک دوسرے شاگرد کا بیان ہے کہ :۔

"ابن سیرین اشعار بھی اپنے مطلب کے ادا کرنے کے لیے بطور مثال کے پڑھا کرتے تھے اور باتیں کرتے ہوئے ہنستے رہتے تھے۔ (ص۲۷۲ حلیہ ج ۲)

اور کیسا ہنسنا ایک نہیں دو دو شاگردوں یعنی سری بن یحییٰ، اور ابن شوذب دونوں کے حوالہ سے حافظ ابو نعیم نے حلیہ میں نقل کیا ہے۔

کان ابن سیرین ربما ضحک حتی یستلقی و یمد رجلیہ۔ (ص۲۷۴ ج ۲)	بسا اوقات ایسا ہوتا کہ ابن سیرین ہنستے اور اتنا ہنستے کہ لیٹ جاتے اور پاؤں پھیلا دیتے۔

حبیب بن شہید کہتے کہ :۔

"ابن سیرین اتنا ہنستے تھے کہ آنکھوں میں پانی نکل آتا تھا۔"

اور صرف ہنسی ہی نہیں، ہنسی کے ساتھ ظرافت اور خوش طبعی کا جو فطری میلان ان میں پایا جاتا تھا اسی کو ظاہر کرتے ہوئے ان کے حلقہ ہی کے ایک صاحب ابو سہل کہا کرتے تھے کہ :۔

کان ابن سیرین کثیر المزاح و کثیر الضحک (ص۲۷۴ ج ۲)	خوش طبعی اور ظرافت بھی ابن سیرین بہت کیا کرتے تھے اور ہنستے بھی بہت زیادہ تھے۔

مزاح اور طبیعت میں کہاں تک بڑھ جاتے تھے جویریہ نامی صاحب اپنا قصہ اس سلسلہ میں خود یہ سناتے تھے کہ :۔ "میں نے ایک دفعہ ابن سیرین سے ذکر کیا کہ جو چھوکری (جاریہ) میں نے خریدی ہے اس کے ہونٹ بہت بڑے اور موٹے ہیں"

کہتے ہیں سننے کے ساتھ بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا کہ :۔

"بوسہ لینے میں زیادہ سہولت ہوگی۔" (ص۲۷۵ حلیہ ج ۲)

ایک صاحب نے عقد کے متعلق مشورہ لیا، کہنے لگے ایسی عورت کرو جس کی نظر تمہارے ہاتھ کی طرف رہے، نہ کہ ایسی جس کے ہاتھ پر تمہاری نگاہ رہے[1]

---

[1] مطلب یہی تھا کہ بیوی کی راہ سے دولت حاصل کرنے والوں کی نظر ہمیشہ بیوی کے ہاتھ ہی کی طرف رہتی ہے۔ ۱۲۔

انار کے چند پھل ان کے سامنے رکھے ہوئے تھے، سعید بن ابی عروبہ کا بیان ہے کہ :-

" ابن سیرین کہہ رہے تھے، پھلوں میں انار کی حیثیت وہی ہے جو جبرئیل کی ملائکہ میں " (ز)

ایک شخص ان کے پاس آیا اور بولا! آپ کی میں نے غیبت کی ہے فاجعلنی فی حلّ (میرے لیے اس کو حلال کر دیجئے) یعنی معاف کر دیجئے۔ ابن سیرین نے جواب میں کہا کہ :-

" اللہ میاں کی حرام کی ہوئی چیز کو میں کیسے حلال کر دوں۔"

یہ بھی خوش مزاجی ہی کا ایک جملہ تھا،

ان کے دیکھنے والوں اور ان کی مجلس میں شریک ہونے والوں نے اس سلسلہ میں ایک بڑی داستان چھوڑی ہے۔ بے تکلفی کی یہ حد تھی کہ ایسے اشعار جن میں شراب، محبوب، اور ساقی وغیرہ ساری چیزوں کا ذکر ہوتا لوگوں کو سناتے ہوئے مصلّے پر پہنچ جاتے اور عربی کا ایک شعر جس کا ترجمہ ہے :-

مجھے اطلاع ملی ہے کہ جس لڑکی کے ساتھ میری منگنی ہوئی ہے اس

کی ایڑیاں اتنی لمبی ہیں جیسے ماہ رمضان کے دن لمبے ہوتے ہیں۔

ادھر شعر ختم ہوا، راوی کا بیان ہے کہ ثم قال اللہ اکبر (حلیہ ص۲۷۵ ج ۲) یعنی اسی کے بعد اللہ اکبر کہتے ہوئے نماز کی نیت باندھ لی ــــــ لیکن اسی کے ساتھ راویوں کا یہ بیان بھی ہے کہ دستور ابن سیرین کا یہ تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ روزانہ بلا ناغہ غسل کے عادی تھے حلیہ والے یہ بھی کہتے ہیں کہ ہنسی مذاق کی گفتگو ہو رہی ہے لیکن کہیں اس عرصہ میں موت کا نام بھی کسی نے اگر لے لیا، تو ایسا معلوم ہوتا کہ ابن سیرین کے جوڑ موڑ پر موت طاری ہو گئی، (ص۲۷۲ حلیہ)

اور یہی حال ان کا اس وقت ہو جاتا تھا جب دین کا مسئلہ کوئی پوچھتا۔ طبقات ابن سعد میں ہے :-

" یوں تو ابن سیرین ہنسی مذاق کرتے رہتے لیکن جوں ہی فقہ کے کسی مسئلہ کا یا حلال و حرام کا ذکر چھڑ جاتا ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ایسا معلوم ہوتا کہ اب یہ وہ آدمی نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ (ص۱۴۲ ج ۷)

اس سلسلہ میں ان کے تقوے طہارت ان کے ذکر و شغل کی ایک طویل فہرست لوگوں نے نقل کی ہے ان کے پڑوسی کہا کرتے تھے کہ ہم تو اسی احاطہ میں رہتے تھے جس میں ابن سیرین کا گھر تھا۔ واقعہ یہ تھا :-

کنا نسمع بکاءہ باللیل وضحکہ بالنہار۔ (حلیہ ص۲۷۲)

رات کو تو اس شخص کے رونے کی آواز سنتے تھے اور دن کو ہنسنے کی۔

یونس ابن علیہ جو ابن سیرین کے خاص آدمیوں میں تھے وہ کہتے تھے کہ:

لم یعرض لہ امران فی دینہ الا اخذ باوثقہما۔ (حلیہ ص۲۶۸)

جب دینی معاملات کے سلسلہ میں دو باتیں پیش ہوتیں تو ان میں سے ہر لحاظ سے جو پہلو زیادہ پختہ اور احتیاط کا ہوتا اسی کو ابن سیرین اختیار کرتے تھے۔

دیکھا آپ نے دونوں دین کے چوٹی کے پیشوا ہیں دونوں کی تربیت و تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی گود میں ہوئی ہے۔ ایک ہی زمانہ، ایک ہی شہر میں دونوں موجود ہیں مسلمانوں پر دونوں ہی کے علم و دین کا غیر معمولی اثر ہے، لیکن ایک طرف خواجہ حسن بصری کا حال وہ تھا کہ صبح کو بھی اٹھتے تو غمگین ہی اٹھتے اور شام ہوتی تو کبیدہ خاطر ہی رہتے پیغمبرؐ کی اُمت کی حالت پر ان کا دل کڑھتا رہتا تھا اور چوبیس گھنٹے یہی چیز ان کو مرغ بسمل بنائے رکھتی تھی، ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہتے تھے۔ یہی ایک آرزو تھی کہ کاش سارے مسلمان سچے مسلمان بن جاتے، بڑھتے ہوئے ان میں یہی جذبہ ترقی کرکے اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ گلیوں میں، سڑکوں پر، گھروں میں، اندر میں، باہر میں جو بھی ان کو نظر آتا تھا، ان کو نام نہاد مسلمان یعنی منافق خیال کرنے لگے۔ بھری مجلسوں میں ان کے گندے اور خبیث اعمال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتے کہ خدا کے انکار کے سوا ان لوگوں کے عمل کی کیا توجیہہ کی جائے۔ بہرحال جو کچھ فرماتے تھے ان کا کافی حصہ آپ کے سامنے گزر چکا ہے ——— مگر علم میں، تقویٰ میں، دیانت میں، امانت میں خواجہ حسن بصری سے ابن سیرین جیسا کہ اس وقت بھی سمجھا جاتا تھا اور اب تک بھی علمی حلقوں میں اسی نظر سے وہ دیکھے جاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کا کیا حال تھا، ظرافت اور خوش مزاجی تو خیر ان کی فطرت تھی ہی لیکن ان ہی مسلمانوں کے متعلق ان کا نقطۂ نظر کیا تھا، افسوس ہے کہ کلی شکل میں ان کے مسلک کا صراحۃً کتابوں میں ذکر نہیں پایا جاتا لیکن اس سلسلہ میں مختلف روائتیں جو مجھ تک پہنچی ہیں ان کو پیش نظر رکھنے کے بعد بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی آدم کی اجتماعی زندگی کی صحت و سلامتی جن قدرتی قوانین کے ساتھ وابستہ بلکہ اس دنیا میں جکڑی ہوئی ہے ان قوانین کی پابندی میں ابن سیرین کا نقطۂ نظر حد سے زیادہ محتاط بلکہ سخت تھا، ابن سعد

نے طبقات میں اور حافظ ابونعیم نے حلیہ میں ان کے متعلق یہ روایت نقل کی ہے کہ دنیاوی کاروبار خصوصاً تجارت اور بیوپار کی غرض سے جب کوئی سفر پر جاتا، اور رخصت ہونے کے لیے ابن سیرین کے پاس آتا تو جس چیز کی شدید تاکید اس کو کرتے وہ یہی تھی کہ

اتق اللّٰہ واطلب ما قدر لك في الحلال۔	اللہ سے ڈرتے رہنا اور حلال (یعنی جائز قانونی ذرائع سے) جو روزی تمہارے لیے مقدر ہو چکی ہے بس اسی کو اپنا مطلوب بنانا۔

پھر اسلام کے مسئلہ تقدیر سے جو اہم عملی نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے کہ

"دیکھو! تمہاری تقدیر میں جو کچھ روزی لکھی گئی ہے اس کے سوا کچھ بھی تم کرد حاصل نہ کرسکو گے۔" (ص۲۶۳ ج ۲)

حافظ ابونعیم نے حلیہ میں اس روایت کو جن الفاظ میں ادا کیا ہے ان کا حاصل تو یہی ہے لیکن ابن سعد والی روایت میں یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں کہ

فانک ان اخذ تہ من حرام لم تصب اکثر مما قدر لك (ص۱۴۶ ج ۷)	یعنی حرام (غیر قانونی ذرائع) سے بھی اگر کچھ حاصل کرو گے تو مقدار وہی رہے گی جو تمہارے لیے مقدر ہو چکی ہے۔

میرے نزدیک اسلامی تعلیمات سے ابن سعد کی روایت کی یہ تعبیر زیادہ قریب ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے اس وقت تو مجھے ابن سیرین کے اس نقطۂ نظر کو پیش کرنا ہے جو اجتماعی زندگی کے قوانین کے متعلق وہ رکھتے تھے۔ جن میں سب سے اہم یہی مالیات کا مسئلہ ہے کسی قوم و ملک میں افراد باہم ایک دوسرے میں مالیات کے متعلق اعتماد پیدا کرنے میں جب تک کامیاب نہ ہوں گے اجتماعی زندگی کی گاڑی زیادہ دیر تک فطری رفتار کے ساتھ رواں نہیں رہ سکتی، آدمی جن حالات اور جن جذبات کو لے کر زمین کے اس کرے پر پیدا کیا گیا ہے ان کا یہ ناگزیر اقتضاء ہے۔ قوموں کا اجتماعی شیرازہ اسی وقت منتشر اور پراگندہ ہوتا ہے جب مالی لین دین میں ایک دوسرے پر اعتماد باقی نہیں رہتا، اسی کا نام ساکھ ہے۔ اس ساکھ کو کھو کر دنیا میں آج تک کوئی قوم پنپ نہیں سکی ہے۔

خیر میں ذکر ابن سیرین کے طرز عمل کا کر رہا تھا ایسے مسلمان جن کی زندگی اسلام کے دینی مطالبات

پر منطبق نہ ہو، ابن سیرین کا خیال اس قسم کے مسلمانوں کے متعلق کیا ہے، اس کا تذکرہ ابھی آپ سنیں گے لیکن مالیات کے مسئلہ میں وہ یہی کہتے تھے

المسلم المسلم عند الدرهم والدينار — درہم اور دینار (یعنے روپے پیسے) کے سامنے جو بھی مسلمان رہ جائے وہی مسلمان ہے۔

(ص۲۶۷ حلیہ ج ۲)

ان ہی باتوں کے وہ نتائج تھے کہ اپنے ہاتھوں سے لگے لگائے تاکستان کو کاٹ کر ابن سیرین نے پھینک دیا تھا، بلکہ آپ سن چکے کہ جیل تک کی مصیبت بھی اسی مالی قصہ میں انہوں نے برداشت کی،

مال کے بعد اجتماعی زندگی میں ایسا معلوم ہوتا ہے ان کی نگاہ میں لوگوں کی عزت و آبرو کا مسئلہ تھا، اجتماعی فسادات کی یہ دوسری اساسی بنیاد ہے، آپ سن چکے کہ (اسود) کالا ہونے کی صفت کے انتساب کو یا ایک طبیب کے مقابلہ میں دوسرے طبیب کو زیادہ ماہر قرار دینے تک کو بھی غیبت قرار دے کر ابن سیرین استغفار کرتے تھے بلکہ ابن عون سے قید اور قرض کی مصیبت کی توجیہہ کرتے ہوئے انہوں نے اس کا اعتراف جو کیا تھا کہ "یا مفلس" کے ساتھ ایک شخص کو میں نے چالیس سال پہلے جو خطاب کیا تھا، یہ اسی کا خمیازہ ہے۔ ان ساری باتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی قوانین کی خلاف ورزی کے نتائج سے وہ بہت خوفزدہ رہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کی سزا اسی زندگی میں افراد و اقوام[1] کو بھگتنی پڑتی ہے، مگر اسی کے مقابلہ میں مذہبی مطالبات کے ایسے عناصر جن کا آدمی کی انفرادی زندگی سے تعلق ہے مثلاً نماز و روزہ وغیرہ۔ ذاتی طور پر عملاً ان مطالبات کی تعمیل میں

---

[1] قرآن کی سورۂ انفال میں ایک مستقل رکوع میں اس مضمون کو ادا کر دیا گیا ہے کہ قدرت کی طرف سے فاسد عناصر کو جلا کر اجتماعی زندگی کو پاک کرنے کا ارادہ جب کیا جاتا ہے، قرآن میں جس کا نام "فتنہ" ہے۔ تو فتنہ کی ایسی بھٹی میں مُردوں کے ساتھ کھلوں کو بھی جھونک دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اصلاح و تطہیر کا اسی وقت اختیار کیا جاتا ہے جب امانت اور دیانت کے جذبہ کو لوگ کھو بیٹھتے ہیں، اسی سورہ کی مشہور آیت یعنی واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة (اور ڈرو اس آزمائش سے جو تم میں سے فقط ظلم کرنے والوں کی حد تک محدود نہیں رہتی) اس آیت کے ساتھ اور لاحقہ آیتوں کے مضامین کو ملا کر غور کیجئے انشاء اللہ اسی نتیجہ تک آپ بھی پہنچیں گے۔ حدیثوں میں بھی فرمایا گیا ہے کہ قرآن کے مطالبات کی تکمیل کی پہلی شرط یہی ہے کہ امانت کے جذبہ کو پہلے زندہ اور بیدار کیا جائے۔ مشہور حدیث لا ایمان لمن لا امانة له

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ان کا جو حال تھا اجمالاً اس کا ذکر آپ سن چکے۔ بھلا صوم داؤدی (یعنی ایک دن افطار ایک دن روزہ) جس کی زندگی کا دوامی دستور ہو ذکر اللہ کے ساتھ انہماک کی حالت جس کے یہ ہو کہ ایسے وقت میں جب بازار میں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوتی یعنی نصف النہار میں دیکھا جاتا کہ

یدخل السوق ویکبر ویسبح ویذکر اللہ تعالیٰ۔ (حلیہ صـ۲۷۲ ج ۲)	بازار میں داخل ہوتے اور تکبیر و تسبیح، اللہ کے ذکر کا مشغلہ بھی جاری رکھتے۔

کسی نے کہا بھی کہ کونسا موقع ہے۔ جواب میں بولے کہ انھا ساعۃ غفلۃ (یہی تو غفلت کی گھڑی ہوتی ہے) لیکن اسی کے ساتھ دیکھیے اور اوراد و اشغال میں ان کا طریقہ ان لوگوں کے مانند نہ تھا کہ جس ورد کے لیے جو وقت مقرر کیا گیا ہے اس کی حیثیت گویا فرض و واجب کی ہو جاتی ہے، اسی پابندی کو دینی احساس کی بلندی خیال کرتے ہیں لیکن ابن سیرین کے متعلق لوگ بیان کرتے ہیں کہ چوبیس گھنٹوں میں سات وظیفے پڑھا کرتے تھے۔

فاذا فاتہ شئی من اللیل قرأہ بالنہار۔ (صـ۱۹۵)	اگر رات میں (اس ورد میں مشغولیت) کا موقع نہ ملتا تو دن میں پڑھ لیا کرتے۔

اور وظائف کا مسئلہ تو اتنا اہم نہیں ہے، حافظ ابو نعیم نے تو ایک روایت بھی درج کی ہے کہ

ان محمد انام عن العشاء حتی تفرطت ثم قام فصلاھا۔ (حلیہ صـ۲۷۲ ج ۲)	محمد بن سیرین ایک دفعہ عشاء کی نماز سے پہلے سو گئے یہاں تک کہ وقت تنگ ہو گیا تب اٹھ کر عشاء کی نماز ادا کی۔

غالباً عشاء کی فرض نماز ہی سے اس روایت کا تعلق معلوم ہوتا ہے، یقیناً ان جیسے آدمی کے لیے اتفاقی واقعہ ہے جو کسی وجہ سے پیش آ گیا، لیکن مالی معاملات میں جس شخص کا حال یہ ہو کہ جب کسی سے تول کر کوئی چیز قرض لیتے تو لکھا ہے کہ جس باٹ سے وہ چیز تولی جاتی تھی تو شاید کاغذ یا کپڑے وغیرہ میں اس کو لپیٹ کر

ختمہ فاذا قضاہ وزنہ بذلک الوزن	اس پر مہر لگا دیتے اور جب قرض کو ادا کرتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) (جس میں امانت نہیں ہے اس میں ایمان بھی نہیں ہے) اس کا حاصل بھی یہی ہے یہ ایک مستقل مقالہ کا مضمون ہے میں نے صرف اشارہ کر دیا۔ ۱۲

ثم دفعه الیه۔ (ص۱۴۷ ج ۷، ابن سعد) تو اسی مہر زدہ باٹ سے تول کر واپس کرتے۔

خود اپنے اس فعل کی توجیہہ بیان کرتے تھے، باٹ کا وزن گھٹ بڑھ جاتا ہے جس کا بظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ پتھر جس سے عموماً تولنے کا کام لیا جاتا ہے کچھ ذرات اس کے جھڑ گئے ہوں اور یوں وزن میں کمی پیدا ہو جانے کے اندیشہ کی گنجائش ان کے نزدیک پیدا ہو جاتی تھی، مگر مالی معاملات میں جو اس درجہ محتاط تھا خیال تو کیجیے کہ اسی کو ہم دیکھتے ہیں کہ متغزلانہ شعر پڑھتے ہوئے نماز کے مصلے پر جانے سے نہیں جھجکتا بلکہ آپ سن چکے کہ شعر ختم کر کے "اللہ اکبر" کہتے ہوئے نماز کی نیت باندھ لیتے تھے۔

حیرت ہوتی ہے کہ مالیات میں جس کی احتیاط کا وہ حال ہو، اور مالیات ہی نہیں انسانوں کی عزت و آبرو کے مسئلہ میں جس کے احساس کی نزاکت کی یہ کیفیت ہو کہ زندہ تو زندہ مرنے والوں اور ان میں بھی آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ حجاج جیسے آدمی کے متعلق حافظ ابو نعیم نے نقل کیا ہے کہ ابن سیرین کے کان میں آواز آئی کہ حجاج کو کوئی صاحب برا بھلا کہہ رہے ہیں، ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ میاں! اگر آخرت کا خیال تمہارے سامنے رہے تو اپنے چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو تم پاؤ گے کہ تمہاری نظر میں حجاج کے بڑے سے بڑے جرم سے بھی زیادہ اہم ہے، کیونکہ جرم خواہ کتنا ہی بڑا ہو، دوسرے کو اس کی کیا پڑی ہے اس کا خمیازہ مجرم کو ہی کو بھگتنا پڑے گا۔ بخلاف اپنے گناہوں کے کہ خواہ جتنے بھی معمولی ہوں لیکن خطرہ تو اس کا لگا رہتا ہے کہ اس کی سزا دوسرے نہیں بلکہ کرنے والے ہی کو بھگتنی پڑے گی۔ لکھا ہے کہ حجاج کی مذمت کرنے والے صاحب سے ابن سیرین نے اس کے بعد یہ بھی کہا کہ:۔

"حق تعالیٰ سب سے بڑے عادل حاکم ہیں، حجاج کے مظالم کا بدلہ اگر ان لوگوں کی طرف سے لیں گے جن پر حجاج نے ظلم توڑے ہیں تو حجاج کی طرف سے بھی تو ان لوگوں سے بدلہ لیں گے جو اس پر ظلم کریں گے۔"

آخر میں فرمایا:۔

فلا تشغلن نفسک بسب احد — پس چاہیئے کہ کسی کی مذمت اور اس کو برا بھلا کہنے میں اپنے آپ کو مت پھنساؤ۔ (ص۲۷۱ ج ۲)

خلاصہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کا سدھار جن قوانین پر مبنی ہے ان کی ذمہ داریوں کے احساس میں جتنی زیادہ نزاکت اور ذکاوت بڑھائی جائے ابن سیرین مسلمانوں کے لیے اس کی ہمت افزائی میں

قولاً وعملاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوشش کا کوئی دقیقہ چاہتے تھے کہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ خود تاجر تھے، لکھا ہے کہ لین دین میں کھوٹے یا ستوقہ[۱] قسم کے دراہم اگر ان کے یاں آجاتے تو ان کو استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے الگ گوشہ میں ان کو ڈال دیتے تھے۔ مرنے کے بعد جب ان کی چیزوں کا جائزہ لیا گیا تو اس قسم کے دراہم پانچ سو کی تعداد میں معلوم ہوا کہ جوں کے توں ان کے یاں پڑے ہوئے تھے۔

مگر اسی کے مقابلہ میں دین ہی کے دوسرے شعبوں میں اس قسم کی حسی نزاکتوں کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ مثلاً ان ہی کے زمانے میں بعض لوگوں کو دیکھا جاتا تھا کہ قرآن جب سنتے ہیں تو چیخ مارتے ہیں۔ ابن سیرین سے کسی نے پوچھا کہ آپ کا ان لوگوں کے متعلق کیا خیال ہے۔ بولے:۔

"ان لوگوں کو کسی دیوار پر بٹھا دیا جائے اور اس کے بعد اول سے آخر تک قرآن ان کے سامنے پڑھا جائے میں جب جانوں کہ دیوار سے چیخ مار کر یہ گر پڑیں۔

(ص ۲۶۵ ج ۲)

اسی طرح کھانے، پینے، پہننے میں خواہ مخواہ غیر ضروری پابندیوں کو اپنے اوپر جو عائد کر لیا کرتے تھے ان کو بھی ابن سیرین اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس عہد کے ایک صاحب فرقد سنجی بھی ہیں، ترک دنیا اور زہد میں مشہور تھے۔ ابن سیرین کے یاں کوئی تقریب تھی، فرقد بھی مدعو تھے آئے۔ مہمانوں کے لیے ایک قسم کا حلوا جسے خبیص کہتے تھے پیش کیا جارہا تھا۔ فرقد کے سامنے بھی حلوے کی رکابی رکھی گئی تو آپ نے فرمایا کہ اسے اٹھا لو میرے کھانے کی چیز نہیں ہے۔ اٹھا لیا گیا۔ بجائے اس کے شہد اور روٹیاں لا کر ان کے سامنے رکھی گئیں کھانے لگے تب ابن سیرین نے فرمایا:۔

"تم نے جس چیز کو چھوڑا اسی کو تو کھا رہے ہو"۔ (ص ۲۶۹ حلیہ)

یعنی خبیص حلوا بھی تو گھی، شہد اور آٹے ہی سے بنایا جاتا ہے، بجز نام کے اور فرق کیا ہوا؟

یہی حال لباس میں تھا۔ فرقد سنجی جیسے بزرگوں کا دستور تھا کہ کمل سے لباس بناتے اور اسی کو تقوے کا تقاضا خیال کرتے تھے، لیکن ابن سیرین فردہ (پوستین) بھی پہنتے تھے۔ اور طیلسان بھی استعمال کرتے تھے،

---

[۱] ستوقہ فارسی لفظ سہ طاقہ سے بنا ہے۔ تانبے کے سکے پر اوپر نیچے دو طبق چڑھا دیتے تھے ظاہر دیکھنے میں چاندی کا سکہ معلوم ہوتا، لیکن زیادہ مقدار اس میں تانبے کی ہوتی تھی یہ سکہ میں جعل سازی کی ایک شکل تھی۔ ۱۲

کتان جو اس زمانے کے قیمتی کپڑوں میں شمار ہوتا تھا۔ ابن سیرین اس کے استعمال سے بھی پرہیز نہ کرتے تھے اور اپنی والدہ جن کے احترام میں اپنی نظیر آپ تھے[1]۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ ان ہی کے لیے جب کپڑے خرید تے تو

الین ما یجد لا ینظر فی بقائہ	نرم سے نرم جو کپڑا مل سکتا تھا اسی کو لیتے
(ص ۱۴۴)	یہ نہیں دیکھتے تھے کہ مضبوطی میں اس کا کیا حال ہے۔

اوران امور کا تعلق تو ایک حد تک معاشی مسائل سے ہے۔ ایسی باتیں جو قطعی دینی ہیں اور معادی ثمرات فوائد کی ضامن ہیں مگر ابن سیرین کا نقطۂ نظر ان کے متعلق بھی عجیب تھا، نماز اور وہ بھی جنازے کی نماز جو دنیا سے رخصت ہو کر آخرت کے حدود میں قدم رکھنے والے کے ساتھ براہ راست تعلق رکھتی ہے، کسی نے ابن سیرین سے پوچھا کہ ایک شخص ثواب کی نیت سے نہیں بلکہ برادری کی شرما شرمی اور موتی کے رشتہ وارد کی مروت سے جنازے میں شریک ہوتا ہے، آپ کا اس شخص کے متعلق کیا خیال ہے؟ جواب میں جانتے ہو ابن سیرین نے کیا کہا، حافظ ابو نعیم حلیہ میں راوی ہیں کہ پوچھنے والے سے وہ (یعنی ابن سیرین) کہہ رہے تھے۔

ایک اجر اور ثواب؟ اس نے تو ایسا کام کیا جس پر دو اجر اور دو ثوابوں کا وہ مستحق ہے۔

پھر اپنے دعوے کی دلیل خود ہی ان الفاظ میں پیش کی۔

اجر بصلاتہ علی اخیہ و اجر بصلتہ الحی۔ (حلیہ ص ۲۶۴ ج ۲)	ایک ثواب و اجر تو اس کا کہ اپنے (مسلمان) بھائی کے جنازے کی نماز اس نے پڑھی اور دوسرا اجر و ثواب اس بات کا کہ قبیلہ والوں کے

[1] لکھا ہے کہ والدہ سے جب بات کرتے تو ہمہ تن متوجہ ہو جاتے۔ آواز میں ابن سیرین کے اتنی پستی پیدا ہو جاتی تھی کہ دیکھنے والے سمجھتے کہ شاید بیمار ہیں۔ پھر دریافت سے معلوم ہوتا کہ ماں کے ساتھ گفتگو کرنے کا طریقہ ہی ان کے یہی ہے جب عید آتی تو والدہ کے کپڑوں کو خود رنگتے ان کی والدہ رنگ کو پسند کرتی تھیں۔ (ص ۱۴۴ ابن سعد

کو جھٹلا کر ان سے رشتہ توڑنے کا مجرم نہیں ہے کیونکہ اس جرم کا مجرم تو مسلمان ہی باقی نہیں رہتا بہرحال مسلمان جہنم میں داخل نہ ہوگا اس کے سوا کوئی دوسرا مطلب اس آیت کا اس وقت تک نہیں لیا جا سکتا جب تک کہ قرآنی الفاظ کے ساتھ خود اپنے الفاظ کو بھی باہر سے شریک نہ کیا جائے جدلی تاویل والوں نے یہی کیا بھی ہے۔[1]

---

[1] کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن ہی میں دوسری جگہ جب یہ فرمایا گیا ہے کہ شرک کے سوا اور جتنے جرائم ہیں ان کی معافی کو خدا نے اپنے اختیار اور مشیت کے ساتھ متعلق کر دیا ہے اب اگر اس آیت کا وہی مطلب لیا جائے جو بظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے تو شرک کے سوا دوسرے سارے جرائم کے متعلق یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے مرتکب کو سزا نہیں دی جائے گی یعنی سزا کی معافی مشیت کے ساتھ وابستہ نہ رہی لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جہنم سے بچ جانے کا مطلب یہ کیسے لے لیا گیا کہ سزا سے بھی مجرم بچ گیا۔ کیا سزا کے لیے جہنم جانا ضروری ہے ؟ آخر حدیثوں میں جو آیا ہے کہ دنیا کے مصائب گناہوں کے کفارہ بن جاتے ہیں تو اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیاوی مصائب کی شکل میں بھی مجرم سزا بھگت لیتا ہے قرآنی آیت من یعمل سوء یجز بہ (جو کرے گا برائی اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا) جب نازل ہوئی تو بخاری وغیرہ میں ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہر گناہ کا جب بدلہ ضروری ہے تو ہم میں ایسا کون ہے جس سے برائی صادر نہیں ہوتی ہے ؟ مطلب یہ تھا کہ مغفرت و شفاعت وغیرہ کی گنجائش اس آیت کے بعد باقی نہ رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت بھی یہی سمجھایا تھا کہ سزا کے لیے یہ کیوں سمجھتے ہو کہ مجرم کو جہنم ہی میں جانا پڑے گا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ دنیا کے مصائب حتیٰ کہ پاؤں میں) کسی کے کانٹا بھی جو چبھ جاتا ہے یہ بھی جرم کی سزا کی ایک شکل ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ رح نے اسی کی تعبیر یہ کی ہے کہ سزا کی تخفیف و تحویل کی یہ شکل ہے مثلاً مجرم قتل کا مستحق تھا اس کی گریہ وزاری پر قتل کی سزا حبس سے یا حبس کی سزا تازیانے سے یا تازیانے کی سزا زبانی تحقیر واہانت سے بدل دی جائے رحم و مغفرت کا برتاؤ بھی مجرم کے ساتھ کیا گیا اور جرم کی سزا بھی اس نے چکھ لی۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ "اہل کبائر کہ گناہ ایشاں بمغفرت نہ آمدہ اند بہ توبہ یا شفاعت یا بہ مجرد عفو و احسان و نیز آں کبائر را آلام و محن دنیوی یا شدائد و سکرات موت مکفر نہ ساختہ، امید است کہ در عذاب آنہا جمعے را بہ عذاب قبر کفایت کنندہ و جمعے دیگر را با وجود منتہائے قبر احوال قیامت و شدائد آں روز اکتفا فرمایند و از گناہاں باقی نگذارند کہ محتاج "بعذاب نار" گردند ص۳۱۸ ج ا مکتوب ۲۶۹ جس کا مطلب یہی ہوا کہ کبیرہ گناہوں کے مجرموں کی سزا کے لیے جہنم کے عذاب کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ توبہ و شفاعت

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ کے اختلاف کا موازنہ!!

بہر حال ابن سیرین اور خواجہ حسن بصری سلف کے ان دو بزرگوں کے مونوں کا ذکر جس غرض کے لیے کرنا چاہتا تھا غالباً اس کے لیے اتنی تفصیل کافی ہوگی، قرآن و حدیث اور صحابہ کرام کی پاک صحبتوں کے نتائج سے دونوں ہی کے سینے لبریز تھے، علم ہو یا عمل کسی حیثیت سے بھی کسی کو کسی پر ترجیح دینے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی پس یہ اختلاف جو کچھ بھی تھا فطری افتاد طبع اور ان رجحانات و میلانات کا نتیجہ تھا جو ان دونوں بزرگوں کی سرشت میں خالق کی طرف سے ودیعت کیے گئے تھے مسلمانوں کی تربیت اس اُمت کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلافات کے مسئلہ میں جس طریقہ سے فرمائی تھی اور جب تک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یا حق تعالیٰ کے فضل و کرم کی دستگیریوں سے اگر وہ محروم ہو گئے تو دنیاوی سکرات موت کی سختیوں اور قبر یا برزخ کی پریشانیوں پھر میدان قیامت کی ہولناکیاں یہ سب مل ملا کر اتنی کافی سزا کی صورتیں ان لوگوں کے لیے ہیں کہ جہنم جانے کی سزا پانے کے لیے ان کو ضرورت نہ ہوگی۔ اس بنیاد پر قرآنی آیت میں قطعاً کسی مزید اضافہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ ابن سیرین سے یہ روایت جو نقل کی گئی ہے کہ چالیس سال سے پہلے کسی کو انہوں نے یا مفلس جو کہہ دیا تھا اس کی سزا ان کو تجارتی خسارہ اور قید میں بھگتنی پڑی۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے جہنم کے اس قسم کی سزاؤں کو مسلمانوں کے لیے کافی سمجھتے تھے جو جہنم سے پہلے اسی زندگی میں یا برزخی یا حشری زندگی میں لوگوں کو جھیلنی پڑے گی پس یہ عقیدہ کہ مسلمان جہنم نہ جائے گا اور اپنی بدکرداریوں کی سزا بھی بھگتے گا دونوں میں کوئی تعارض و تناقض باقی نہیں رہتا۔ البتہ مسلمانوں کے لیے یہ دشواری ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ سزا و جزا کے جس قصے کو عموماً یہ سمجھ کر کہ جب پیش آئے گا دیکھا جائے گا۔ یعنی ادھار سودے کے خریداروں کی ذہنیت جو ہوتی ہے، عموماً اسی ذہنیت میں مسلمان بھی مبتلا نظر آتے ہیں اس کو بدلنے کی ضرورت ہوگی کیوں کہ ادھار کے قصے کا زیادہ تر تعلق غیر مسلم اور ان اقوام کے ساتھ محدود ہو کر رہ جاتا ہے جو اس وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو جھٹلانے پر اصرار کرتے رہے ہیں اور مسلمانوں کے لیے بجائے ادھار کے نقد یعنی اسی زندگی میں اپنے کرتوتوں کی سزاؤں کے بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے یا زیادہ سے زیادہ قبر و حشر جس تک ان کے لیے سزا یابی کا وہ میدان وسیع باقی نہیں رہتا۔ جو جھٹلانے والے کفار کے لیے جہنم کی لامحدود زمانے کی شکل میں کھلا ہوا ہے۔ ۱۲۔

اس تربیت کے آثار و نتائج کسی نہ کسی شکل میں مسلمانوں کے اندر باقی رہے اختلافات کی ان ناگزیر قدرتی شکلوں سے بجائے نقصان کے ان کو ہمیشہ فائدہ ہی پہنچتا رہا۔ ابوبکرؓ کی رافت و نرمی اور فاروقیؓ شدت وگرمی دونوں ہی کے استفادہ کا عجیب و غریب سلیقہ اس قوم میں پایا جاتا تھا۔

یہی خواجہ حسن بصری اور ابن سیرین ہیں، بصرے کے مسلمان سنتے تھے، دونوں کو اپنا بزرگ خیال کرتے تھے۔ مگر دونوں کے طریقۂ فکر و شیوۂ کار کا خلاصہ بصرے کے ان مسلمانوں نے جو نکال لیا تھا حقیقت رسی اور اس کی صحیح تعبیر کی یہ کتنی اچھی مثال ہے۔ حافظ ابونعیم نے حلیہ میں نقل کیا ہے کہ کہنے والے ان دونوں بزرگوں کے نقاط نظر کا جب ذکر کرتے تو کہتے کہ

قال الحسن انما ھی اطاعۃ اللہ او النار	حسن کہتے تھے۔ خدا کے احکام کی تعمیل یا جہنم
وقال ابن سیرین انما ھی رحمۃ اللہ او النار۔ (صـ۲۷ ج ۳)	اور ابن سیرین کہتے تھے اللہ کی رحمت یا جہنم،

گویا جس طول طویل بیان کو کئی صفحوں میں آپ کے سامنے پیش کیا خلاصہ سب کا یہی تھا۔ پھر اس خلاصہ کے بعد عمومیت کا فیصلہ دونوں بزرگوں کے ان دو مختلف مسلکوں کے متعلق جو تھا ابن سعد نے غالب قطان کے حوالہ سے اس کو نقل کیا ہے، یعنی فیصلہ کیا گیا تھا کہ

خذوا بحلم محمد و لا تاخذوا بغضب الحسن۔ (صـ۱۴۲ ج ۷)	محمد بن سیرین کے حلم (یعنی مسلمانوں کے لیے جس گنجائش کو وہ پیدا کرتے ہیں اس کا) اعتماد کرو اور حسن بصری کے غصہ کا خیال نہ کرنا چاہیے۔

حاصل جس کا یہی ہوا کہ سننے کے لیے دونوں ہی سنا کرتے تھے احترام کے مستحق دونوں ہی سمجھے جاتے تھے اور اختلاف کے اس قصہ کو یوں چکایا جاتا تھا کہ خواجہ حسن بصری کے مزاج میں غصہ زیادہ ہے تقریر کے وقت چونکہ غیض و غضب کا فطرۃً ان پر غلبہ ہو جاتا ہے اس لیے ایسی باتیں ان کی زبان مبارک پر جاری ہو جاتی ہیں جن میں سخت گیری کا رنگ غالب ہوتا ہے مگر اسی کے ساتھ نیت دونوں بزرگوں کی عوام کے نزدیک نیک ہی کہا جاتا تھا کہ حسن بصری جو کچھ کہتے ہیں ثواب و اجر ہی کی نیت سے کہتے ہیں،

قال الحسن احتسابا و سکت محمد احتسابا (طـ۱۴۲ ابن سعد)	اور محمد ابن سیرین اگر (مسلمانوں کے طرز عمل سے) خاموش رہتے ہیں تو یہ بھی اجر و ثواب ہی کی

نیت سے ایسا کرتے ہیں،

کاش! آئندہ بھی مسلمانوں میں توازن واعتدال کا یہ موروثی سلیقہ اسی طریقہ سے منتقل ہوتا رہتا تو پچھلے دنوں اہل علم کے بعض اختلافات نے جو گھناؤنی شکلیں اختیار کیں۔ اپنے تو اپنے غیروں کے سامنے جگ ہنسائی کی رسوائی میں مسلمانوں کو جو مبتلا ہونا پڑا یقین کیجیے کہ اس کی کبھی نوبت نہ آتی یہی اختلاف جو ان دونوں بزرگوں میں تھا چاہا جاتا تو اس کو کیا کچھ نہ بنا لیا جاتا، بھلا ایک طرف یہ خیال کہ مسلمان جہنم کی صورت بھی نہ دیکھے گا دوزخ مسلمان کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئی ہے اور دوسری طرف یہ حال کہ مسلمانوں کی بستیوں کی ہر گلی اور ہر کوچہ ہر گھر اور چھپر کے نیچے ان کو منافق ہی منافق نظر آتے تھے مگر نقطہ نظر کے اس شدید اختلاف کے قصے کو بھی مسلمان اس طرح پی گئے کہ تاریخ کی ورق گردانی کیجیے بغیر اس اختلاف کا علم بھی لوگوں کو نہیں ہو سکتا۔

درس عبرت مگر سچ پوچھیے تو بجائے عوام کے جہاں تک میرا خیال ہے پچھلے دنوں جو مکر دہ تلخیاں ان ہی مذہبی مسائل کے اختلافی قصوں کی وجہ سے پیدا ہوئیں ان کی ذمہ داری خواص کے ان ہی افراد پر عائد ہوتی ہے جن کے علمی نقاط نظر زیادہ تر ان کے فطری رجحانات اور افتاد طبع کے تابع تھے لیکن ان کو خود اندازہ نہ ہو سکا کہ جن اختلافی نتائج پر وہ اصرار کر رہے ہیں۔ ان کا دامن ان کے علم اور معلومات سے زیادہ ان کے دل و دماغ کی قدرتی ساخت اور ان کے فطری میلانات کے ساتھ بندھا بلکہ سلا ہوا ہے جنہیں لے کر وہ دنیا میں آئے ہیں جو غیر مخلص تھے اور اختلافات کی گرم بازاری سے اپنے بازار کی رونق بڑھانا چاہتے تھے۔ ملعونوں کے اس گروہ کو تو خیر خدا اور خدا کے فرشتوں کی لعنت کے حوالہ کیجیے لیکن ان میں جو نیک نیت تھے ان سے بھی یہ کوتاہی ضرور ہوئی کہ دین کی جو شکل ان کے خصوصی اور شخصی مزاج کے قالب میں ڈھل کر تیار ہوئی تھی اس شکل کو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش فرمودہ "خالص دین" کی واقعی شکل کو ایک یقین کیا اور ہر اس شخص کو محمد رسول اللہ کے دین ہی کے دائرے سے ڈھکیلنے پر اصرار کرنے لگے۔ جس کی دینی زندگی کا کوئی پہلو ان کے "شخصی مزاج کے قالب والے دین"[1] پر کسی حیثیت سے منطبق نہ تھا خود بھی اسی پر اصرار کرتے تھے اور اپنے ماننے والوں میں

---

[1] حدیث نبوی مِن حُسنِ اسلامِ المرءِ ترکہٗ مالا یَعنیہ" سے اصل دین کے سوا "شخصی مزاج کے قالب
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اصرار ہے جا کے اسی جذبہ کی پرورش وحوصلہ افزائی میں انہوں نے غلو سے کام لیا[1]
کاش! اپنے اسلاف کے نقش قدم کی جستجو ان میں پیدا ہوتی مگر اس سے ان میں لاپروائی پیدا ہوئی
پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلافات کی برداشت اور تحمل کا جو سلیقہ اپنی اُمّت میں پیدا کیا تھا عمومیت کے اس
موروثی اور قیمتی سلیقہ کی بربادی میں ان کے طرز عمل سے کافی نقصان پہنچا اگرچہ بحمداللہ مسلمان بالکلیہ اپنے
پیغمبر کے عطا فرمودہ اس نعمت سے ابھی محروم نہیں ہوئے ہیں، کاش! ان کے خواص اب بھی بزرگوں
کے نشان راہ کے دیکھنے کی زحمت گوارا فرماتے، یہی خواجہ حسن بصری اور ابن سیرین کے اس اختلافی قصہ کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) والے دین" (اسلام المرء) کی صاف تائید ملتی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ہمارے صلحاؤ اتقیاء دین
خالص اور شخصی قالب والے دین کے فرق کو فراموش نہ فرمائیں۔ (غ م)

[1] اس موقع پر حضرت شیخ محی الدین بن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے اس واقعہ کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی انفاس العارفین میں اس واقعہ کو درج فرمایا ہے۔ میں فتوحات شیخ ہی کی کتاب سے اس کا خلاصہ نقل کر رہا ہوں۔ شیخ فرماتے ہیں کہ ۵۹۰ھ میں جب میں تلمسان میں اپنے پیر شیخ ابومدین کی خدمت میں تھا خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک شخص کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ ہمارے حضرت ابومدین سے وہ کینہ رکھتا ہے، اسی وجہ سے میرے دل میں اس شخص کی جانب سے گرانی تھی۔ خواب میں جمال جہاں آرا نبوت سے جب سرفرازی ہوئی تو میں نے دیکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ فلاں شخص کو تم کیوں ناپسند کرتے ہو، میں نے عرض کیا کہ شیخ ابومدین سے وہ بغض رکھتا ہے۔ فرمایا اللہ اور رسول کو تو دوست رکھتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں! تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابومدین سے عداوت رکھتا ہے اس لیے تم بھی اس سے خفا ہو۔ لیکن مجھ سے اور اللہ سے وہ محبت رکھتا ہے اس تعلق سے تم اس سے محبت کیوں نہیں کرتے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ اسی وقت میں نے توبہ کی اور اقرار کیا کہ بلاشبہ اب وہ میرا محبوب ہے۔ بیدار ہوکر میں اور میرا شیخ اس شخص کے پاس گئے، خواب کا ماجرا بیان کیا کچھ تحفے تحائف پیش کیے۔ وہ بے چارہ بھی رونے لگا اور شیخ ابومدین سے اس کو جو نفرت تھی وہ بھی اس کے دل سے نکل گئی۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس شخص سے شیخ نے پوچھا کہ شیخ ابومدین جیسے بزرگ سے تمہارے دل میں نفرت کیسے پیدا ہوگئی تھی بولا کہ کچھ نہیں فقیر عید کے دن ان کے پاس تھا بہت سے بکرے آئے۔ سب کو دیا اور مجھے نہ دیا اسی سے دل میں گرانی ہوگئی تھی۔ (ص ۶۴۶ ج ۱۴ فتوحات مکیہ)

ملاحظہ فرمایئے، عام مسلمانوں کے جس طرزِ عمل کا نمونہ آپ کے سامنے گزرا، جانتے ہیں کہ اس کے پیچھے کارفرما طاقت کونسی تھی۔

بڑا دلچسپ لطیفہ ہے جسے ابن سعد نے نقل کیا ہے، حاصل جس کا یہ ہے کہ خواجہ حسن بصری سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد یوں تو بے شمار تھی لیکن سب میں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جن صاحب کو امتیاز خصوصی خواجہ صاحب کی ذات سے حاصل ہوا وہ اسی بصرے کے مشہور عالم و محدث و درویش ثابت البنانی تھے۔ خواجہ کی وفات کے بعد ان کے جانشین علماً و عملاً بھی ثابت البنانی سمجھے جاتے تھے اگرچہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت وعظ و نصیحت میں جتنا انہماک خواجہ کو تھا۔ ثابت البنانی خود کہتے تھے کہ اتنی محنت میں برداشت نہیں کرسکتا۔ ابن سعد ہی میں ان کا یہ فقرہ منقول ہے یعنی کہا کرتے تھے۔

لولا تصنعوا بی ما صنعتم بالحسن لحدثتکم احادیث موفقرتم قال منعوه القائلة منعوه النوم (ص ۴ ج ۷)	اگر مجھے اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ جو کچھ تم لوگوں نے حسن کے ساتھ کیا وہی میرے ساتھ بھی کرنے لگو گے تو میں بڑی ستھری حدیثیں تمہیں سناتا، پھر کہتے کہ حسن کو تو لوگوں نے دوپہر کے لوٹ پوٹ سے بھی روک دیا سونے تک سے بھی روک دیا۔

بہرحال قصہ یہ پیش آیا کہ جس زمانے میں بنی امیہ کا طاغیہ حجاج ثقفی مسلمانوں کی امتیازی ہستیوں کے درپے آزار تھا، خواجہ حسن بصری بھی لوگوں کے مشورے سے کچھ دن کے لیے روپوش ہو گئے تھے[1]۔ اتفاق کی بات اسی روپوشی کے زمانہ میں جب خواجہ اپنے کسی عقیدت مند کے گھر چھپے ہوئے تھے ان کی صاحبزادی

---

[1] اگرچہ یہ روپوشی زیادہ دن تک ان سے نبھ نہ سکی باہر نکل آئے۔ حجاج سے ان کی گفتگو ہوئی آخر میں اس نے خواجہ کو چھوڑ دیا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر تابعی کو انتہائی بے دردی کے ساتھ حجاج نے جب شہید کیا اور اسی کے بعد ایک خاص قسم کے جنون میں مبتلا ہو گیا۔ سوتا تھا تو خواب میں بھی سعید ہی نظر آتے اور کہتے کہ کس جرم میں تو نے مجھے قتل کیا۔ اور آنکھ کھلتی تو اس وقت بھی حجاج کا بیان تھا کہ سعید کو سامنے کھڑا پاتا ہوں۔ اسی زمانے میں حجاج کے پیٹ میں سرطانی پھوڑا نکلا جس کی سمیت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ اسی اندرونی گھاؤ کی وجہ سے ایک اور

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کا انتقال ہوگیا۔ ثابت البنانی نے اس حادثہ کی خبر دہیں جا کر خواجہ کو سنائی۔ سننے کی بات یہی ہے، ثابت البنانی کو جس قسم کی خصوصیت خواجہ سے تھی خود ان کا بیان ہے کہ اسی بنیاد پر خیال کیے ہوئے تھا کہ جنازے کی نماز پڑھانے کا حکم مجھ ہی کو دیں گے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ

رجوت ان یامرنی ان اصلی علیہا (ص۱۶۱ ج ۲)

مجھے[1] امید تھی کہ اس بچی کے جنازے کی نماز پڑھانے کا حکم حسن مجھے دیں گے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بیماری اس پر مسلط ہوئی جسے زمہریرہ کہتے تھے یعنی ایسی سخت سردی اس کو معلوم ہوتی تھی، انگیٹھی کو بدن سے قریب کرتے کرتے یہاں تک متصل کر دی جاتی کہ کھال جلنے لگتی لیکن اس کی تشفی نہ ہوتی تھی۔ اطبا نے جب تجویز کیا کہ پیٹ میں پھوڑا ہے تو جانچنے کے لیے روٹی کے ٹکڑے کو تاگے میں باندھ کر حجاج کو نگلوایا جب اندر چلا گیا تب جھٹکا دے کر ٹکڑا باہر کھینچ لیا گیا جو صرف کیڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ آخر مرض ناقابل علاج قرار پایا، خواجہ حسن بصری کو اس نے بلایا، رونے لگا اور گڑگڑا کر التجا کرنے لگا کہ میرے لیے دعا کیجیے۔ خواجہ نے کہا کہ حجاج! دیکھ اللہ والوں سے ہمیشہ میں نے تجھ کو نصیحت کی کہ دور رہنا۔ سعید کے ساتھ تو نے جو کچھ کیا اسی کا خمیازہ ہے۔ حجاج نے کہا کہ اب صحت کی دعا نہ کیجیے بلکہ موت کی دعا کیجیے تاکہ میری مشکل آسان ہو۔ حجاج مر گیا، خواب میں مرنے کے بعد کسی نے دیکھا، کہنے لگا کہ سعید کے بدلے میں مجھے مسلسل قتل کیا جا رہا ہے قتل ہوتا ہوں پھر جلایا جاتا ہوں پھر قتل ہوتا ہوں۔ (دیکھو ابن عساکر اور الیافعی وغیرہ)۔

[1] علاوہ خصوصی تعلقات کے ثابت البنانی شہر بصرہ میں سب سے بڑے نمازی سمجھے جاتے تھے ناممکن تھا کہ کسی مسجد سے ثابت گزرے ہوں اور دوگانہ ادا کیے بغیر گزر جائیں حتیٰ کہ کسی کے گھر عیادت کے لیے بھی جاتے تو سب سے پہلے مریض اپنے گھر میں جس جگہ نماز پڑھا کرتا اس کو پوچھتے اور دوگانہ ادا کرنے کے بعد مزاج پرسی کے لیے اس کے سرہانے آتے، خود کہتے تھے کہ بیس سال تک نماز کے ساتھ مجھے کشمکش کرنی پڑی (یعنی نفس پر گرانی ہوتی تھی مگر بہرحال پڑھتا رہا) اور اب نماز ہی میری زندگی کا سرمایۂ نشاط و سرور ہے نماز کا ذوق اتنا غالب آگیا تھا کہ سب سے بڑی آرزو جس کے لیے آخر عمر تک وہ دعا کرتے رہے یہی تھی کہ پروردگار! مرنے کے بعد نماز مجھ سے چھوٹ جائے گی، آپ اس دنیا میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت مجھے عطا کیجیے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ قبر میں ان کی لاش رکھنے والوں میں سے ایک صاحب نے چاہا کہ دونوں کو اچھی طرح بند کریں اسی لیے کچی اینٹ جو لحد پر لگی ہوئی تھی اس کو درست کرنے کے لیے انہوں نے اکھاڑا، کیا دیکھتے ہیں کہ ثابت

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن ثابت البنانی کو حیرت ہوگئی، خود کہتے تھے کہ بچی کی وفات کی خبر سن کر کچھ ہدایتیں دیتے رہے یعنی یہ کرنا وہ کرنا مگر ہدایتوں کا قصہ جب ختم ہوگیا تو خلاف توقع ثابت کہتے ہیں کہ حسن کہنے لگے :-

اذا اخرجتموها فنروا محمد بن سیرین — جب جنازے کو گھر سے باہر نکال کرلے آؤ

یصلی علیہا (") — تو محمد بن سیرین سے کہنا کہ نماز وہی پڑھائیں۔

دیکھا آپ نے اپنے بزرگوں کے اس طرز عمل کو، اختلاف ایسا کہ ایک طرف حسن بصری کا فیصلہ تھا کہ "تعمیل حکم یا دوزخ کی آگ" دوسری طرف ابن سیرین کے حلقہ سے آواز آتی تھی "رحمت الٰہی یا دوزخ کی آگ" یہ آمین و رفع الیدین وغیرہ اولیٰ خلاف اولیٰ کے فروعی مسائل کا اختلاف نہ تھا، عقائد کا اختلاف تھا۔ مگر وقت جب آیا تو بصرے کے سب سے بڑے نمازی بلکہ شاید تاریخ اسلام کے سب سے بڑے مصلی یا عاشق نماز ثابت البنانی کی نماز پر بھی اس شخص کی نماز کو خواجہ حسن بصری نے ترجیح دی جس سے ان کو اور حسن کو ان سے اتنا شدید اختلاف تھا میرے نزدیک تو مسلمانوں کے عوام کے مذہبی جھگڑوں کی ذمہ داری بجائے عوام کے زیادہ تر خواص ہی پر عائد ہوتی ہے۔ ان ہی کے طرز عمل کو دیکھ کر ان کے زیر اثر عوام بے چارے وہی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اگر خواص ہی اپنے اختلافات میں اتنی گنجائش رکھا کریں جتنی گنجائش خواجہ حسن بصری کے قلب میں ابن سیرین کے متعلق تھی تو یقین مانئے کہ مسلمانوں کی مذہبی اختلاف میں وہ کیفیت کبھی پیدا نہ ہوتی جس کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نماز پڑھ رہے ہیں۔ رفیق جو ساتھ تھا اس کو اشارہ کیا کہ یہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ چپ ہو اینٹ کو اپنی جگہ جما دو۔ ان لوگوں نے ثابت کی لڑکی سے اس قصے کو بیان کیا کہنے لگیں کہ پچاس سال سے ابا کو دیکھتی تھی کہ تہجد کی نماز کے بعد صرف یہی دعا کرتے تھے کہ قبر میں بھی نماز کی اجازت عطا فرمائی جائے۔ ان کی دعا قبول ہوئی۔ بصرے کے قبر کنوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ جب کبھی پچھلی رات کو کسی کی قبر کھودنے کے لئے ثابت کی قبر کے سامنے سے ہم لوگ گزرتے ہیں تو قرآن پڑھنے کی آواز آتی ہے۔ حضرت انس صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثابت سے بہت محبت کرتے تھے ایک دفعہ حضرت انس نے کہہ دیا تھا کہ ثابت تمہاری آنکھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے بہت مشابہ ہیں کہتے ہیں کہ اسی کے بعد ثابت پر گریہ طاری ہوا جس کا سلسلہ آخر زندگی تک جاری رہا، روتے روتے آنکھیں بھی متاثر ہوئیں، اطباء نے لاکھ کہا کہ آپ رونا چھوڑ دیجئے تو شکایت جاتی رہے گی۔ فرماتے کہ رونے سے رک جانے کے بعد آنکھ کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے۔ اسی حال میں وفات ہوئی۔ (حلیۃ الاولیاء ج ۲)

رنگ دنیا کے دوسرے مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کے مذہبی اختلافات کے لحاظ سے خواہ جتنا بھی ہلکا اور پھیکا ہو لیکن بجائے خود جو ناگواریاں باہم مسلمانوں میں بھی ان ہی مذہبی جھگڑوں کی وجہ سے جو پیدا ہوئیں وہ بھی نہ ہوتیں[۱] یا لیت قومی یعلمون۔

---

[۱] مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کے قصے میں فقیر کے جو خاص خیالات ہیں ان کا اظہار اپنے مختلف مقالات اور مضمونوں میں تفصیل کے ساتھ کر چکا ہوں، میں نے اپنے ان مضامین اور مقالات میں یہ دکھایا ہے کہ دوسرے مذاہب و ادیان کے اختلافات پر مسلمانوں کے دینی اختلافات کو قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے مذہبی فرقوں کی باہمی آویزشوں کی دردناک داستان سے جو واقف ہیں آویزش کے وہی قصے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قریب قریب دس لاکھ انسانوں کو زندہ جلا دیا گیا، انتہائی قساوت قلبی کے ساتھ لوگ قتل کیے گئے ایک فرقے کے مردوں نے دوسرے فرقے کی عورتوں کے پیٹ چاک کر کر کے بچے نکالے اور کتوں کو کھلائے۔ یا ہندوستان ہی میں جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے بودھ متی اور برہمن دھرم والوں کی کشمکش میں دیکھا گیا کہ کھولتے ہوئے تیل کے کڑھاؤں میں زندہ انسانوں کو تلا گیا۔ حالانکہ بودھ متی ویدک دھرم ہی کی ایک اصلاح یافتہ شکل سمجھنا چاہیئے تھی مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کی تاریخ بحمد اللہ ان جانگسل روح فرسا اجتماعی واقعات سے خالی ہے۔ بعض فرقوں میں کشمکش اگر حد سے بڑھی بھی ہے تو مذہب سے زیادہ سیاسی موثرات کارفرما تھے ماسوا اس کے میں نے دعوی کیا ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں نومسلم اقوام کی وجہ سے مذہبی اختلافات کی وجہ مسلمانوں میں ضرور پھوٹ پڑی تھی لیکن بتدریج اسلام نے خود اپنی اندرونی قوت سے ان اختلافات کو مٹاتے ہوئے اس نقطہ تک پہنچا دیا کہ صحیح معنوں میں آج مسلمانوں کے اندر اگر دیکھا جائے تو صرف دو ہی فرقے رہ گئے ہیں یعنی سنی اور شیعہ عددی لحاظ سے جو حیثیت رکھتا ہے، اس کو پیش نظر رکھ کر صفر نہیں تو صفر کے قریب قریب ہی اس اکثریت کے مقابلہ میں ۵ بہ ۲ جاتے ہیں جو سنیوں کی دنیائے اسلام میں پائی جاتی ہے۔ یہی کیا کم معجزہ ہے کہ پچاس ساٹھ کروڑ کی برادری میں صرف دو ہی فرقے مسلمانوں میں باقی رہ گئے، رہا خود سنیوں میں حنفی و شافعی وغیرہ تو واقعہ میں یہ اختلاف قطعاً نہیں ہے آخر جب ایک دوسرے کے پیچھے نہ صرف یہی کہ لوگ نماز پڑھتے ہیں، شادی بیاہ کے تعلقات جاری ہیں بلکہ پیری مریدی تک میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ پیر حنفی ہے یا شافعی پیران پیر سیدنا شیخ الجیلی قدس اللہ سرہ العزیز حالانکہ حنبلی ہیں لیکن ان کے ماننے والوں میں زیادہ تعداد ان ہی لوگوں کی ہے جو حنبلی نہیں ہیں۔ ۱۲

بہر حال مجھے تو سلف کے اختلافات کی جو نوعیت تھی اس کی ایک تاریخی مثال چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے سامنے پیش کردوں، یہ بتانا چاہتا تھا کہ اختلافات کے سلسلہ میں زیادہ تعلق لوگوں کی شخصی افتادِ طبع، اور فطری سرشت سے ہوتا ہے اس کو اگر سمجھ لیا جائے تو اختلافات کے قصوں میں جو دشواریاں محسوس ہوتی ہیں وہ حل ہوسکتی ہیں[1]۔ باقی ابن سیرین اور خواجہ حسن بصری کے اس اختلاف میں صحیح دینی فیصلہ کیا ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے

---

[1] علمائے دیوبند سے دردمندانہ اپیل

اور یہ تو عہد قدیم کی داستان تھی آج ہندوستان میں دینی علوم کی نمائندگی جو طبقہ کر رہا ہے یعنی دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل علماء، کاش! دارالعلوم کے بانی حضرت مولینا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے طریقۂ عمل کو پیش رکھتے! ان کے حالات کے راوی خصوصی امیر شاہ خاں مرحوم، مولینا کے جو واقعات بیان کرتے تھے ان ہی میں ایک قصہ یہ بھی ہے جس کا ذکر امیر الروایات کے مؤلف صاحب نے بھی کیا ہے۔ اس کتاب پر مولینا اشرف علی قدس اللہ سرہٗ نے بعض حواشی بھی لکھے ہیں۔ اور ان کی توثیق کے بعد کتاب شائع ہوئی ہے، بہر حال اسی کتاب میں لکھا ہے کہ مولینا محمد قاسم صاحب جن دنوں منشی ممتاز علی مرحوم کے مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے تو اسی مطبع میں ایک صاحب بھی ملازم تھے امیر شاہ خاں کے الفاظ ان صاحب کے متعلق یہ ہیں کہ وہ بالکل آزاد تھے رندانہ وضع تھی چوڑی دار پاجامہ پہنتے، ڈاڑھی چڑھاتے تھے اور سب سے آخری بات یہ ہے کہ "نماز کبھی نہیں پڑھتے تھے" امیر شاہ خاں فرماتے ہیں کہ یہی صاحب جو نماز کبھی نہیں پڑھتے تھے اور رندانہ وضع رکھتے تھے، ان ہی سے مولینا کی "بہت گہری دوستی تھی" یہاں تک بے تکلفی تھی کہ مولینا کو وہی بے نمازی جو کبھی نماز نہیں پڑھتا تھا مولینا کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے اور مولینا ان کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے۔ آگے جو واقعہ پیش آیا اس کو سنیئے کیوں کہ گنہگار بندوں کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے بانی کا یہ حال اس دارالعلوم سے استفادہ کرنے والوں کے لیے شمع راہ کا کام کیا دے سکتا ہے۔ امیر شاہ خانصاحب مرحوم اس کے بعد بیان کرتے تھے کہ آخر مولینا کے بھی بے نمازی دوست نمازی بن گئے، مگر میں کہتا ہوں کہ اس قاسمی عمل کا تجربہ کرکے دیکھا جائے انشاء اللہ ہمیشہ نہیں تو زیادہ تر اس کا نتیجہ ہر تجربہ کرنے والے کے سامنے پیش آسکتا ہے۔ اسی کتاب میں شاہ اسحٰق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ مکہ معظمہ بہ نیت ہجرت جب جانے لگے تو راستہ میں اجمیر بھی تشریف لے گئے، ان کے بعض نیازمندوں نے کہا کہ آپ کے اجمیر جانے سے دوسروں کی ہمت افزائی ہو گی "فرمایا کہ رقیبوں کے خوف سے محبوب کو نہیں چھوڑ سکتا" ص ۹۷ اسی کتاب میں ہے کہ اجمیر شاہ صاحب تشریف لے گئے اور حضرت خواجہ کے مزار مبارک کے مجاوروں کو "لپیں بھر بھر کر روپے دیئے" اس سے بھی زیادہ دلچسپ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ اس کا فیصلہ ہم جیسے کوتاہ دستوں کی یقیناً ایک گستاخانہ بلکہ مجرمانہ درازدستی ہوگی تاہم مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی پشت پناہی میں خاکسار نے اپنے ذاتی رجحان کا اظہار حاشیہ میں بھی کر دیا ہے[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لطیفہ اس بوڑھے پنڈت کا ہے جو شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا لڑکپن سے دوست تھا اسی وجہ سے شاہ اسحٰق صاحب پنڈت کو بھی نانا کہتے تھے کہ ان کے نانا شاہ عبدالعزیز کا دوست تھا اور جب وہ آتا تو اس کو "سلام کرتے" مولینا تھانوی نے اس پر حاشیہ بھی لکھا ہے اور یہ ارقام فرمایا ہے کہ "ضرورت یا مقتدیہا مصلحت یا کسی حال محمود کے غلبہ سے جائز ہے" صا۱۱ ایک بے نمازی سے گہری دوستی جس مدرسہ کے بانی کی تھی اور جس مدرسہ کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ کی جگہ دیوبند میں قائم کیا گیا ان ہی شاہ عبدالعزیز کی اس پنڈت سے دوستی جو روزانہ ان کے مدرسہ کے کنوئیں میں غسل کر کے اسی کا پانی سورج کی طرف رخ کر کے چڑھاتا تھا، ان لوگوں کے لیے کچھ بیداری کا پیغام دے سکتی ہے جو اسی مدرسہ سے پڑھ پڑھ کر ہر سال اقطاع ہند میں پھیلتے ہیں جن دلوں میں آپ اترنا چاہتے ہیں ان کے دروازوں کو بند کر کے اس مقصد میں مشکل ہی سے آپ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ "فظاً غلیظ القلب" بنا کر عالم کا رسول جو پیدا نہیں کیا گیا تھا تو عالمین کے لیے اس کی ذات رحمت کیسے بن سکتی تھی، ان فی ذالک لذکریٰ لمن کان لہٗ قلب او القی السمع وھو شہید۔

[1] کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حسن بصری کے طرز عمل سے بعد ہی کو نہیں بلکہ اسی زمانہ میں بعض لوگوں نے ناجائز نفع اٹھانا چاہا۔ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ کان اھل القدر ینتحلون الحسن بن ابی الحسن (ص۱۲۷ ج ۷) جس کا مطلب یہی ہوا کہ قدریہ یعنی معتزلہ کا طبقہ خواجہ ہی کو اپنے فاسد عقیدے کا امام قرار دیتا ہے۔ لیکن واقعات سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ طبقات ہی میں حضرت خواجہ حسن بصری کا وصیت نامہ نقل کیا ہے اس میں ہے کہ حضرت معاذ کی حدیث کو پیش کر کے آپ نے اہل سنت والجماعت ہی کے عقیدے کی توثیق دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے فرمائی بلکہ معتزلہ جو اپنے آپ کو اصحاب العدل والتوحید کے شاندار لقب سے ملقب کیا کرتے تھے مگر بجائے اس کے معتزلہ کے نام سے امت میں وہ جو رسوا ہوئے تو جیسا کہ شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں لکھا ہے کہ اس رسوا لقب کی ابتدا خواجہ حسن بصری ہی کی زبان مبارک سے ہوئی۔ شہرستانی کا بیان ہے کہ کسی نے حسن بصری کے حلقہ میں آکر پوچھا کہ بعض لوگ اس زمانے میں ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو گناہ کبیرہ کے مرتکب کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ اور اسی کے مقابلہ میں ایک گروہ ہے جو مدعی ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد کسی قسم کے گناہ کا آدمی مرتکب ہو اس کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کوئی نقصان نہ پہنچے گا جیسے کفر کی حالت میں کسی قسم کی نیکی اس کے لیے فائدہ بخش نہیں ہوتی بسائل کے سوال کو سن کر حسن بصری کچھ سوچ میں پڑ گئے ابھی جواب دینے بھی نہ پائے تھے کہ واصل بن عطا جو خواجہ کے حلقہ میں بیٹھا تھا، چلا کر بولا کہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب نہ مومن ہے نہ کافر ملکہ درمیانی منزل کا آدمی ہے۔ اسی کے بعد وہ اٹھ کر مسجد کے دوسرے ستون کے نیچے جاکر اپنے خیال کی توضیح کرنے میں مشغول ہوگیا۔ واصل کی اسی جرأت و حرکت پر خواجہ حسن بصری نے فرمایا کہ "اعتزل عنا واصل" (واصل ہمارے حلقہ سے کنارہ ہوگیا) کہتے ہیں کہ اسی دن سے معتزلہ ان لوگوں کا نام ہوگیا۔ جو کبیرہ کے مرتکب کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ (ص۵۵ ج ۱ بر حاشیہ ملل ابن حزم) دراصل بات وہی ہے کہ ابن سیرین اور حسن بصری میں کوئی اختلاف ہی نہ تھا۔ دونوں ہی کتاب و سنت کے صحیح نتائج سے پیدا ہونے والے عقائد کے پابند تھے۔ البتہ افتادِ طبع اور شخصی رجحانات میں دونوں کے جو فرق تھا اسی فرق کا ظہور دونوں کے طرز عمل سے ہوتا تھا ورنہ واقعی اختلاف اگر دونوں میں ہوتا تو اپنی صاحبزادی کے جنازے کی نماز کی فرمائش حسن بصری کیا ابن سیرین سے کرسکتے تھے؟ ۱۲۔

طریقۂ اشغالِ مُطلقہ

یا

اِطلاقی تصوّف

○

فہرست مضامین

۸ اطلاقی تصوّف کا طریق

ہر سبب کی حکمت کو پانا

کسی سبب کی نفی نہ کرنا

مگر سبب پر تکیہ بھی نہ کرنا

کیونکہ یہ ایک عرفانی غلط فہمی ہے

فرار الی اللہ کا قرآنی مفہوم

شیخ اکبرؒ کے نزدیک اطلاقی تصوف کے پیرو ہی سب سے بدترین ہیں۔

"اطلاقی" طریق تصوف کی تلقین مرشد گیلانیؒ کی زبانی!

اطلاقی تصوّف کی تحریر کا محرک

چند مہینے ہوئے جب ایک خاص محرک کے تحت "اطلاقی تصوّف" کا عنوان قائم کر کے فقیر نے کچھ لکھنے کا ارادہ کیا، کچھ وقت تو خیر تمہید کے نظر ہوا[1] لیکن اصل مدعا کے قریب اس عرصہ میں جب کبھی قلم پہنچا دل سے آواز آنے لگی تو کیا لکھ رہا ہے اور کن کے لیے لکھ رہا ہے۔ "تصوف" اطلاقی ہو یا غیر اطلاقی بہرحال ہے وہ دین کی ایک اعلیٰ تکمیلی ہی شکل کا نام "الاحسان" کے لفظ سے اس کی تعبیر اسی لیے کی گئی ہے کہ اس کا تعلق دین کے بناؤ اور نکھار سے ہے حسن و جمال کا دینی زندگی میں اضافہ یہی "الاحسان" کے لفظ کا لفظی ترجمہ ہے۔ پھر جن مسلمانوں کی دینی زندگی کا پورا قالب ہی مسخ ہو کر رہ گیا ہے ان کے لیے حسن و جمال کا سوال ہی بے معنی ہے۔

اس کی ہمت تو خیر اپنے اندر تو نہیں پاتا کہ اپنے سوا دنیا کے عام مسلمانوں کے اسلام و ایمان کو بجائے ایمان و اسلام کے کفر قرار دوں، ایک شخص اپنے آپ کو جب تک مسلمان کہتا اور سمجھتا ہے تو یہ کیسے کہہ دیا جائے کہ اس کا اسلام اور ایمان واقعی اسلام اور ایمان نہیں ہے دلوں کو پھاڑ کر کس نے دیکھا ہے۔ ماسوا اس کے سوچنے کی بات خصوصاً اس زمانے میں یہ بھی تو ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے اور کہلانے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں شریک رکھنے کا جب کوئی مادی نفع بھی نظر نہیں آتا بلکہ کہا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ برعکس اس کے بے شمار مادی مشکلات میں اسلام کے اسی دعوے نے جن لوگوں کو مبتلا کر رکھا ہے اگر واقعی ان کے ایمان و اسلام کا دل سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے تو ان مشکلات میں اپنے آپ کو خواہ مخواہ ڈالے رکھنے کی ان بیچاروں کو کیا ضرورت تھی کچھ بھی ہو، اپنا خیال تو یہی ہے کہ کفر کی مردہ لاش سے خواہ وہ مضغۂ گوشت ہی سہی ہر وہ شخص بہتر ہے جو رسالت کی تکذیب کی قوت اپنے اندر نہیں پاتا اور خواہ مخواہ کسی حال میں ہو لیکن محمد رسول اللہ

---

[1] تمہید سے حضرت گیلانی کی مراد وہ مضامین ہیں جو اب "طریقۂ غزالیہ" اور "اختلافِ سلاسل کی حیثیت" کے زیرِ عنوان پیش کیے گئے ہیں۔ (غ۔م)

صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا رسول نہ ماننے اس پر اپنے آپ کو العیاذ باللہ کسی طرح آمادہ نہیں کر سکتا۔
مگر زندہ گوشت کا ایسا مجسمہ جس کی نہ آنکھیں درست ہوں[1] اور نہ کان ہی سلامت ہوں، لولھا اور لنگڑا ہو، الغرض اوّل سے آخر تک اس کے ایمانی جسد کا ہر عضو ناقص اور پر عیب ہو اس کے لیے حسن آرائی کا پیغام آپ بتائیے کہ تمسخر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ عربی کی مشہور مثل ہے۔

ثبت الجدار ثم النقش — پہلے دیوار کو درست کر لو تب اس پر نقش و نگار کرنا۔

میرے تمہیدی مضمون کی غیر معمولی طوالت سے لوگ جو اکتا چکے ہیں، ان کے سامنے مجبوراً دل کے اس ماجرا کا پیش کر دینا مناسب معلوم ہوا، واقعہ یہ ہے کہ اب بھی آگے بڑھنے کے لیے قلم آمادہ نہیں ہے۔ بار بار جی چاہتا ہے کہ جو کچھ لکھا جا چکا بس لکھا جا چکا اسی تمہید پر مضمون کو ختم کر دوں لیکن صرف ایک خیال سفارش کرتا ہے کہ کشتم پشتم بُرے بھلے، الغرض جس طریقے سے ممکن ہو، عنوان کے مطابق کچھ نہ کچھ لکھ ہی دیا جائے اور وہ خیال یہ ہے کہ ان ہی کانے کتروں، لنگڑوں لولھوں، غیر مسلمانوں میں خواہ تعداد میں جتنی بھی قلیل ہو، ایک جماعت ایسی ابھی باقی ہے جو کرنے کی ہمت نہ بھی رکھتی ہو لیکن اسلام کے جمالی مراتب، اور احسانی مقامات کے افسانے کو دلچسپی کے ساتھ سننا چاہتی ہے ممکن ہے کہ ان ہی سننے والوں میں چند افراد ایسے بھی مل جائیں جن کی دینی زندگی میں یہ احسانی مشورے ارادۃً یا بلا ارادہ کسی طرح شریک ہو جائیں قدرتاً ان سے آدمی کی دینی زندگی

---

[1] ایک پرانی تمثیل یعنی جس سوراخ میں یقین ہو کہ اس میں سانپ ہے کوئی انگلی نہیں ڈال سکتا اسی مثال کو پیش کر کے پہلے بھی کہا گیا ہے اور قریب قریب اسی قسم کی مثالوں کو پیش کر کر کے اب بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ غیر اسلامی زندگی دلیل ہے کہ شرعی قوانین کی خلاف ورزیوں کے نتائج وعواقب کا یقین ہی ان کے دل سے نکل گیا۔ گویا عمل کا فقدان ایمان کے فقدان کی دلیل ہے لیکن شرعی قوانین کی خلاف ورزیوں کے متعلق سوال ہے کہ جن عواقب نتائج کی دھمکیاں دی گئی ہیں شرک کے سوا کیا قرآن ہی میں دون ذلک لمن یشاء کی مغفرت کی خبر بھی نہیں پائی جاتی پس مواخذہ یا مغفرت جن امور کے متعلق دونوں کا احتمال ہو ان ہی کے متعلق مواخذہ کے یقین کا فیصلہ کیا خود ساختہ فیصلہ کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ کاش! میرے اس اشارہ ہی کو سمجھ لیا جائے مصلحت عام اس سے زیادہ تفصیل کی اجازت نہیں دیتی۔

لذیذ ہو جاتی ہے۔ مرنے سے پہلے اسی عبوری دور میں ایمانی نتائج کی تجلیاں جھانکنے لگتی ہیں ہو سکتا ہے کہ یہی چیز مزید توفیق کے رفیق بنانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ بس ہلکی سی اسی پژمردہ و افسردہ امید نے رک جانے کے خیال کو روک دیا ارحم الرّاحمین ہم مسلمانوں پر رحم فرمائے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مان کر ایمان کی جس اجمالی دولت کو اپنے یقین و اذعان کے دامن میں سمیٹ لینے کی جو سعادت حاصل کر چکا ہے اسی دولت کے تفصیلی جائزہ کا موقع کاش ہم اپنے لیے پیدا کرتے اور اب آپ کے سامنے جو کچھ بھی پیش ہو گا درحقیقت اسی اجمال کی ایک خاص شاخ کی گونہ یہ تفصیل و توضیح ہو گی۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طریقۂ اشغالِ مطلقہ

یا

اطلاقی تصوّف

ما اراھا الا غزالیۃ

" نہیں پاتا میں اسے لیکن غزالی کے طریقہ پر "

یہ فرمایا تھا آٹھویں صدی کے مشہور و جلیل عارف حضرت عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن المجد المرشدی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اس وقت جب اسی صدی کے دوسرے سربرآوردہ عالم و صوفی الیافعی ان سے ملنے کے لیے ان کی خانقاہ میں حاضر ہوئے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوّف کے متعلق یہ نقطہ خیال کہ ایک ہی طور اور طریقہ میں وہ منحصر نہیں ہے یہ کوئی جدید ابتدائی انوکھا خیال نہیں ہے۔ بلکہ آج سے صدیوں پہلے بھی یہی سمجھا جاتا تھا کہ تصوف کا ایک طریقہ تو وہ ہے جس کے امام اور پیشوا حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی ہیں اور اسی کے مقابلہ میں تصوف ہی کی ایک راہ اور تھی، آج میں اسی مسئلہ پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔

---

[1] یعنی اشغالِ مطلقہ کی راہ جس میں رذائل اخلاق کی اصلاح کو مقصود نہیں بنایا جاتا بلکہ وہ نتیجۃً مٹ جاتے۔

حکیم محمود احمد صاحب برکاتی کو جو مولانا گیلانیؒ کے استاد امام معقولات حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہیں، مولانا اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

" اوراد اور غیر اطلاقی تصوف کے مقابلہ میں اطلاقی تصوف کا ایک نظام پیش کیا ہے، دراصل حیدرآباد کے ایک نئے رنگ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں (المرشدی اور الیافعی) کے مختصر حالات سے ان لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے جو اسلامی تصوف کی ان دونوں عظیم شخصیتوں سے ناواقف ہیں۔ خود مسئلہ کے سمجھنے میں جہاں تک میرا خیال ہے ان دونوں بزرگوں کے اجمالی حالات سے واقفیت انشاء اللہ مفید ثابت ہوگی۔

تعارف الیافعی

الیافعی چونکہ صاحب تصنیف و تالیف ہیں خصوصاً تاریخ اسلام میں ان کی کتاب مراۃ الجنان[1] خاص اہمیت رکھتی ہے اس کی وجہ سے بھی نیز اپنی دوسری کتابوں کی وجہ سے بھی عام اہل علم و معرفت کے جانے پہچانے آدمی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے "درر کامنہ" میں ان کے حالات بھی لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء ہی سے ان پر زہد و تقویٰ کا غلبہ تھا۔ اور دنیا سے کنارہ کش تھے۔ حافظ کے الفاظ ہیں

نشاء علی خیر و صلاح و	نیکی اور صلاح دنیاوی تعلقات سے کنارہ کشی
انقطاع (ص۲۴۸ ج ۲)	کے حالات میں ان کی نشوونما ہوئی۔

انقطاع یعنی (دنیاوی تعلقات سے کنارہ کشی) کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور دنیا والوں سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یعنی شاہ صاحب (شاہ کمال اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خیال کو تصنیفی رنگ میں پیش کیا گیا ہے حضرت حکیم صاحب (علامہ برکات احمد) نور اللہ ضریحہٗ آخر میں ان سے بہت متاثر تھے۔" (غ۔م) ۱۳ فروری ۱۹۵۱ء

[1] ان کی یہ تاریخ چار ضخیم جلدوں میں ہے۔ خدا جزائے خیر دے مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کو اس نایاب کتاب کو شائع کر کے علم اور دین کی اس نے بڑی خدمت انجام دی۔ نصف آٹھویں صدی یعنی ۷۵۰ھ تک کے واقعات پر یہ کتاب مشتمل ہے سب سے بڑی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ علاوہ سیاسی واقعات کے علماء و صوفیہ اس صدی میں گزرے ہیں۔ الیافعی نے ان کے حالات بھی درج کیے ہیں۔ صوفیائے کرام کے ساتھ بڑی ہمدردی کے ساتھ پیش آئے ہیں۔ ان کی کتاب کا یہ خاص امتیازی سرمایہ ہے۔ ۱۲

علیحدگی کا میلان، الیافعی میں فطری طور پر پایا جاتا تھا مگر ان کی ابتدائی زندگی کے اس صلاح وتقویٰ انقطاع و زہد کی نوعیت کیا تھی؟ اس کا پتہ حافظ ہی کے ان الفاظ سے چلتا ہے جو اسی فقرے کے بعد ہیں کہ

لم یکن فی صباح یشتغل بشئ غیر القرآن والعلم۔ (ص۲۴۸) اپنے بچپن کے زمانہ میں قرآن اور علم (دین) کے سوا اور کسی چیز میں مشغول نہ رہے۔

جس کا مطلب یہی ہے کہ اس زمانہ میں جیسا کہ عام دستور تھا قرآن کی تجوید اور قرآن کے ساتھ ساتھ فقہ وحدیث وغیرہ علوم کی کتابیں لوگ پڑھا کرتے تھے۔ یہی حال الیافعی کا بھی تھا، گویا حافظ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ابتدائی عمر میں "الیافعی" کو تصوف یا صوفیہ کے خاص طریقہ سے کسی قسم کا لگاؤ نہ تھا ان کا اصلی وطن یمن تھا یمن میں جب تک رہے ان ہی مشاغل میں مصروف رہے لیکن حج کے لئے جب مکہ پہنچے اور مشہور شیخ الطریقہ علی الطواشی[له] کی صحبت ان کو میسر آئی تو جیسا کہ حافظ کا بیان ہے کہ فسلکه (تب سلوک کی راہ پر طواشی نے الیافعی کو لگا دیا) لکھا ہے کہ اس کے بعد بھی گو علوم ظاہری کے ساتھ الیافعی کا اشتغال باقی رہا، لیکن بالآخر تعلیم وتعلم کے قصوں سے الگ ہو کر انہوں نے سیاحت شروع کی حرمین کے سوا جہاں ان کی آمد ورفت بکثرت جاری تھی اسی سے اندازہ کیجئے کہ سیر سیاحت کا یہ زمانہ تقریباً سولہ سترہ سال کا ہے لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ

انه فی طول المدة التی قبل هذا لم یفته الحج۔ ص۲۴۸ اس طویل زمانے میں کوئی سال ایسا نہیں گزرا جس میں حج نہ کر سکے ہوں۔

گویا ہر پھر کر حج کے زمانہ تک وہ حجاز ضرور پہنچ جاتے تھے بہر حال علاوہ ان دو شہروں یعنی مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے فلسطین، مصر وشام وغیرہ عربی ممالک میں اصحاب قلوب، ارباب تصفیہ وتزکیہ کی تلاش میں ان کی صحبت سے فائدہ اٹھانے کے شوق میں وہ گھومتے رہے۔ اس عرصہ میں خصوصیت کے ساتھ حضرت امام شافعیؒ کے روضۂ مبارک (واقع مصر) میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دن قیام کیا اور آخر میں زندگی کا پچھلا حصہ الیافعی کا کچھ تو قبۂ خضراء کے زیر سایہ مدینہ منورہ میں گزرا، حافظ کے الفاظ ہیں۔

له مراۃ الجنان کے آخر میں الیافعی نے یمن کے چند خاص اولیاء کا تذکرہ لکھا ہے۔ ان میں الیافعی کے شیخ الطواشی بھی ہیں، ان کا نام علی تھا، نور الدین لقب اور ابوالحسن کنیت تھی۔ الیافعی نے بیان کیا ہے کہ وہ الطواشی نسباً والشافعی الصوفی مذہباً تھے۔ پھر ان کی بڑی تعریف کی ہے ان کی چند کرامتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں بعض کا مشاہدہ خود بھی الیافعی نے کیا تھا۔

ثم رجع الی الحجاز وجاور با المدینۃ۔ — پھر حجاز لوٹ گئے اور مدینہ منورہ کے مجاور بن گئے۔

پھر مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ آئے اور اپنی آخری سانس اسی بلد اللہ الحرام میں پوری کی، لکھا ہے

ثم رجع الی مکۃ واقام بہا۔ — مدینہ سے مکہ معظمہ واپس ہوئے اور یہیں قیام اختیار کر لیا۔

مکہ معظمہ ہی میں وفات ہوئی تخمیناً ۶۹ یعنی ایک سال کم ستر عمر پائی۔ ۷۶۸ھ ۲۰ جمادی الاخریٰ وفات کی تاریخ ہے ولادت کے سن میں حافظ نے شک ظاہر کیا ہے ۶۹۹ھ یا ۶۹۸ھ کے درمیان میں پیدا ہوئے خود لکھا ہے کہ ۷۱۱ھ میں وہ بالغ ہو چکے تھے گو تیرہ یا چودہ سال کی عمر ان کی اس وقت تھے۔

چونکہ ان کی آخری زندگی مکہ میں گزری اس لیے "الیمنی" کے ساتھ لوگ ان کو المکی بھی لکھتے ہیں، اس کا تو کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم فقراء کی سب سے بڑی خصوصیت یعنی "تجرد کی زندگی" یہ زندگی الیافعی کی نہیں تھی۔ حافظ نے لکھا ہے کہ مکہ معظمہ میں انہوں نے نکاح کر لیا تھا اور غالباً ایک سے زیادہ دفعہ تزوج کی نوبت آئی لیکن عام روش ان کی الاسنوی نے اپنے طبقات میں بھی بیان کی ہے۔

کان کثیر الایثار للفقراء کثیر المتواضع مترفعا علی الاغنیاء معرضا عما بایدیہم کثیر الاحسان للطلبۃ۔ — غریبوں کے لیے تو ہر طرح کی قربانی بھی کرتے تھے اور ان کے سامنے حد سے زیادہ متواضع اور خاکسار رہتے لیکن تونگروں اور امیروں سے ہمیشہ بے نیازی کا سلوک رکھا اور ان امراء کے ہاتھ میں جو کچھ ہوتا ہے یعنی مال و دولت اس کی طرف التفات بھی نہیں کرتے اور علم کے طلبہ کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے۔

جیسا کہ حاشیہ میں میں نے لکھا ہے کہ اپنی تاریخ کے آخر میں الیافعی نے اپنے اور اپنے شیخ طریقہ علی الطواشی کے بعض حالات بھی لکھے ہیں ان ہی حالات و واقعات کے سلسلہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میں آبادی سے باہر چلا گیا تھا اور

انحترت موضعا لبعيد أعن الناس فخلوت فيه تحت شجرة خفية بين اشجار البرية بحيث لا يهتدى مكانى احد (ص۳۱۹ مراۃ ج ۴)

لوگوں سے بہت دور میں نکل گیا، اور جنگل میں سے ایک ایسے درخت کے نیچے بیٹھ گیا، وہ ایسی جگہ تھی کہ کسی کو میرا پتہ نہیں چل سکتا تھا۔

اسی طرح ایک دوسرے قصے کے ضمن میں لکھا ہے کہ

طلعت لبعض الجبال وعزلت لبعيدا من الناس تحت لبعض الاحجار (ص۱۲۰)

میں ایک پہاڑی کے اوپر چڑھ گیا اور ایک پتھر کے نیچے لوگوں سے کنارہ کش ہوکر بیٹھا ہوا تھا۔

یہ اور اسی قسم کے ضمنی واقعات جن کا جستہ جستہ مقامات پر الیافعی نے خود تذکرہ کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صحرا اور پہاڑ، جنگل کی تنہائی کی زندگی سے ان کو خاص قسم کا انس تھا۔ عدن کا ذکر کرتے ہوئے ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ برکتوں سے بھرے ہوئے وہ دن یاد آتے ہیں جب سمندر کے کنارے ضراس نامی مقام پر جو وحقات نامی ساحل کے پیچھے ہی ہیں چند اصحاب کے ساتھ تھا۔ دیکھو مراۃ ص۳۰۹ ج ۴۔

ایک موقعہ پر اسی کتاب میں خدا سے اس کی آرزو بھی کی ہے مجھے اس کی توفیق میسر ہو کہ خلق اللہ سے کنارہ ہوکر تنہائی کی زندگی سے میرا دل مانوس رہے۔ (ص۲۹۵ ج ۴)

جہاں تک میں خیال کرتا ہوں علامہ الیافعی کی صوفیانہ زندگی، کے رنگ کا اندازہ مذکورہ بالا معلومات سے پڑھنے والوں کو ہوسکتا ہے۔

تعارف المرشدی

اس کے بعد اب میں المرشدی کے بھی مختصر حالات کا تذکرہ کرتا ہوں۔

المرشدی کا تذکرہ الیافعی نے بھی مرأۃ الجنان میں کیا ہے اور حافظ ابن حجر کے درر کامنہ میں بھی ان کے کچھ حالات ملتے ہیں ان دونوں کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اسی کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حافظ ابن حجر کے بیانات تو سماعی اور شنیدہ ہیں لیکن الیافعی براہ راست المرشدی کے دیکھے

والوں میں ہیں ان سے وہ ملے بھی تھے اس لیے ان کی روائتیں، روائتیں ہی نہیں بلکہ چشم دید شہادتوں کی بھی حیثیت رکھتی ہیں۔

حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وطناً مرشدی دھروط کے رہنے والے تھے ۷۰۰ھ کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ وقت کے چند مشہور علماء سے ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد ان پر باطنی سلوک کا شوق مستولی ہوا، کہاں کہاں رہے اور کہاں کہاں گئے کس کس سے کیا کیا سیکھا ہ تفصیل تو اس کی معلوم نہ ہوسکی صرف الیافعی نے لکھا ہے کہ براہ راست خود مرشدی نے ان سے کہا تھا کہ ستر بزرگوں کی صحبت سے انہوں نے فیض حاصل کیا ہے۔ اگر عربی زبان کے عام محاورے کا خیال کر کے ستر کے عدد کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ اس سے کوئی خاص عدد مقصود نہیں ہے بلکہ کثرت تعداد کے اظہار کا یہ ذریعہ ہے تو اس کے انکار کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی اس کا بھی پتہ نہیں چلا کہ بزرگوں کی صحبتوں میں مرشدی نے کتنا حصہ گذارا۔ بہرحال ان کی طلب کی زندگی پر تو پردہ پڑا ہوا ہے لیکن ایام طلب سے فارغ ہونے کے بعد ایک عجیب و غریب شخصیت کے قالب میں وہ نمایاں ہوئے۔

مختصر یہ ہے کہ گھوم پھر کر بالآخر مین کے ریگستانی اور صحرائی علاقہ کے ایک گاؤں میں انہوں نے قیام اختیار کر لیا تھا۔ اس گاؤں کا نام حافظ ابن حجر نے "نیتہ بنی مرشد" بتایا ہے اور الیافعی نے اس کو "قریہ مرشد کہلان" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ المرشدی، اسی گاؤں کی نسبت سے لوگ ان کو کہتے تھے ورنہ ان کا نام " محمد بن عبداللہ بن ابی المجد ابراہیم[1] " ہے۔

اسی گاؤں میں ایک زاویہ یعنی خانقاہ میں یہ مقیم تھے غالباً یہ خانقاہ ان ہی کی قائم کی ہوئی تھی۔
حافظ ابن حجر نے ابن فضل اللہ کے حوالہ سے اس گاؤں کی حالت یہ نقل کی ہے۔

ایک چھوٹا سا گاؤں ریگستانی راستہ پر واقع

ہے۔

یہ حال تو گاؤں کا تھا اور زاویہ یعنی خانقاہ جس میں حضرت کا قیام تھا اس کی کیفیت ابن فضل اللہ ہی کی زبانی سنیئے۔ لکھتے ہیں کہ

---

[1] الیافعی نے بجائے ابوالمجد کے ان کے دادا کا نام مجد لکھا ہے واللہ اعلم یہ کتابت کی غلطی ہے یا کیا ہے۔۱۲

لیس لہ خادم ولا عرف لہ طباخۃ ولا قدر ولا مغرفۃ ولا موقد نار (درر ص۴۶۴ ج۲)

(اس زاویہ میں) نہ مرشدی کے پاس کوئی خادم تھا اور پکانے والی (بڑھیا بھی) کوئی ان کے پاس تھی اس کا بھی کسی کو علم نہیں ہے۔ نہ وہاں ہانڈی ہی تھی اور نہ کفگیر اور نہ چمچہ نہ کوئی آگ سلگانے کی جگہ یعنی چولہا۔

المرشدی کی خاص کرامت بے نوائی اور بے سروسامانی کا یہ آخری نقطہ ہو سکتا ہے مگر باں ہمہ کسی ایک آدمی کی روایت نہیں ہے بلکہ جم غفیر کی یہ چشم دید شہادتیں ان ہی حضرت مرشدی کے متعلق حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے۔

کانت لہ احوال وھمۃ فی خدمتہ الناس وضیافتھم بحیث یطعم کل من مربہ من کبیر وصغیر وقلیل وکثیر۔ (ص۴۶۴)

ان کے خاص حالات تھے عام انسانوں کی خدمت اور مہمان نوازی کا خاص شوق تھا ان کی مہمان نوازی کا یہ حال تھا کہ جو کوئی بھی ان کے سامنے سے گزرتا بڑا ہو یا چھوٹا، تھوڑے سے لوگ ہوں یا بڑی جماعت سب کو کھلاتے تھے۔

سمجھا آپ نے کیا مطلب ہے یہ گاؤں ریگستانی راہ پر واقع تھا۔ کاروانی قافلوں اور حجاج کے قافلوں کی عام گزرگاہ تھی شیخ کی شہرت اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ الیافعی نے نقل کیا ہے کہ

یاتیہ الامراء والوزراء وغیرھم من اھل الدنیا (ص۲۹۶ ج۴)

امراء اور وزراء اور ان کے سوا دنیا کے لوگ ان کے پاس آتے رہتے تھے۔

اور وہ سب کی ضیافت فرماتے تھے الیافعی نے لکھا ہے کہ

لو اجتمع عندہ اکثر عسکر فی الوریٰ لعجل السیہ فی الحال ما احب من القریٰ (ص۲۹۲)

اور مخلوقات خدا کی بڑی سی بڑی فوج ہی کیوں نہ ان کی خانقاہ میں آجاتی ہر ایک کے سامنے اسی وقت بعجلت تمام ضیافت میں

اسی چیز کو پیش کرتے جو اس کا دل چاہتا۔

جن لوگوں نے مصر کے شاہان ممالک کی تاریخ پڑھی ہے وہ الناصر کے عہد کی اس شخصیت سے نا واقف نہ ہوں گے جس کا نام بکتمر الساقی[1] تھا، الناصر کے حکم سے جب بکتمر جیسا امیر کبیر بھی مرشدی کی خانقاہ میں آتا تھا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس خانقاہ میں عام لوگوں کی آمد و رفت کا کیا حال ہوگا۔ اور الیافعی کا فقرہ "لعجل الیہ فی الحال ما احب من القوی" یعنی بہت جلد ہر شخص کے سامنے اسی کھانے کو پیش کرتے تھے جو اس کا جی چاہتا تھا۔

یہ صرف انشائی قافیہ بندی یا شاعری نہیں ہے بلکہ المرشدی کی مہمان نوازی کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ تھی جیسا کہ ان کے تمام سوانح نگاروں نے بالاتفاق لکھا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:۔

یقدم لکل واحد ما یقع فی خاطرہ۔	ہر ایک کے سامنے اسی کھانے کو وہ پیش کرتے جس کا خیال کھانے والے کے دل میں گزرتا۔

ابن فضل اللہ کے الفاظ بھی اسی کے قریب قریب یہ ہیں کہ

احضر لکل واحد منہم ما اقترح۔	جو کچھ جو چاہتا وہی کھانا اس کے آگے پیش کیا کرتے تھے۔

---

[1] بکتمر مصر کے شاہان ممالک میں سے الناصر کے زمانہ کا سب سے بڑا امیر ہے لکھا ہے کہ ایک لاکھ غلام اس کے پاس تھے، ۹۵ لاکھ کے صرفہ سے الناصر نے بکتمر کا صرف اصطبل خانہ تعمیر کرایا تھا، ننو سائیس گھوڑوں کی نگرانی و تربیت و پرداخت کے لیے ملازم تھے بکتمر کی جب وفات ہوئی تو اس کے اصطبل کے گھوڑوں کی بڑی تعداد شاہی باڈی گارڈ کے سپاہیوں کے قبضہ میں چلی گئی تھی پھر بھی جو باقی رہ گئے تھے حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ حد سے زیادہ ارزاں قیمت میں فروخت کیے گئے اس پر بھی بارہ لاکھ قیمت وصول ہوئی۔ سلاح خانہ کے ہتھیاروں کی قیمت چھ لاکھ اشرفیاں (مصری دینار) تھیں، بادشاہ پر بکتمر کا اثر اسی قدر تھا کہ الناصر کسی کے نام انعام یا وظیفہ وغیرہ کا فرمان جاری کرتا۔ اور شکریہ میں وہ زمین بوس ہوتا تو ناصر ہدایت کرتا کہ بکتمر کا ہاتھ جا کر چومو (مطلب یہ تھا کہ جس کسی کو جو کچھ میں دیتا ہوں) بکتمر کے اشارے سے دیتا ہوں اس لیے لوگوں کا واقعی محسن وہی ہے۔ (دیکھو درر کامنہ ط ۴۸۶/۴۸۷ ج ۱ - ۱۲ -)

ابن حجر کا بیان ہے کہ ان کی ضیافت کی اسی خصوصیت کا عام شہرہ تھا یعنی جس کے دل میں جس چیز کی خواہش ہوتی اسی کو وہ اپنے سامنے پاتا۔ اور وہ معمولی چیزیں نہیں ہوتی تھیں۔ الذہبی کا بیان ہے کہ

کان یخرج للحاضرین الاطعمۃ الفاخرۃ۔ (ص ۴۶۳) — اعلیٰ درجہ کے بہترین کھانے لوگوں کے سامنے وہ پیش کرتے تھے۔

ابن فضل اللہ کا بیان ہے کہ اس صحرائی ٹاپو میں ایسی چیزیں ان کے دسترخوان پر ہوتی تھیں کہ

لا یوجد الا فی القاہرۃ او دمشق — دمشق اور پایہ تخت شام اور قاہرہ (پایہ تخت مصر) کے سوا اور کہیں نہیں پائی جاتی تھیں۔

اور ان لوگوں کی تو یہ سنی ہوئی روائتیں ہیں لیکن بقول حافظ ابن حجر

اشتہر ہذا عنہ وذاع — یہ باتیں المرشدی کی طرف سے عام طور پر مشہور شائع ذائع ہیں۔

لیکن الیافعی نے تو اسی سلسلہ میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا ہے۔ لکھا ہے کہ میں جس دن مرشدی سے ملنے اسی قریہ مرشد کھلان میں حاضر ہوا تھا روزے سے تھا میں نے اپنے روزے کا حال ان سے بیان نہیں کیا تھا لیکن خلاف دستور میں نے دیکھا کہ میرے لیے کھانے کا نظم اس وقت نہیں کیا، بلکہ تنہائی میں لے جاکر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر باہر نکلے اور لوگ جو آئے ہوئے تھے ان سے گفتگو میں مشغول رہے۔ شام تک انہوں نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں کہ کچھ کھاؤ گے بگر جوں ہی مغرب کا وقت ہوا، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ۔

اذا بہ قد مد عندی سماطاً یکفی جماعۃ کثیرۃ من الاضیاف من الاطعمۃ ما یکثر عددہ من الانواع والاصناف۔ (مرآۃ ص ۲۹۳ ج ۴) — المرشدی نے میرے لیے دسترخوان بچھا دیا ہے دسترخوان پر کھانے کی اتنی مقدار تھی جو مہمانوں کی بڑی جماعت کے لیے کافی ہو سکتی تھی، اور کھانے بھی طرح طرح کے مختلف قسموں کے تھے۔

اور بات اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ آگے الیافعی ذاتی شہادت ان الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں کہ

کان فی نفسی شہوۃ طعام مخصوص — میرا جی ایک خاص قسم کے کھانے کو چاہتا

ما كنت ذقته في جميع عمري	مگر ساری عمر اس کے چکھنے کا بھی موقع نہ ملا
احضره في ذالك السماط (ص۲۹۳ ج ۴)	تھا۔ میں نے اس دسترخوان پر اس کھانے کو بھی پایا۔

اور گو جیسا کہ میں نے بیان کیا ان کے دربار میں وزراء امراء کی بھی آمد و رفت تھی بلکہ ساقی جیسا امیر کبیر ان کی قدمبوسی کے لیے حاضر ہوا کرتا تھا۔ لیکن بالاتفاق اس کی گواہی بھی سب ہی دیتے تھے۔

لم يكن يقبل لاحد شيئاً	کسی شخص سے قطعاً قبول نہیں کرتے تھے۔

اور نہ بظاہر ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ تھا مگر حال یہ تھا کہ حج میں ایک مرتبہ بڑے قافلہ کے ساتھ روانہ ہوئے راستہ بھر آمد و رفت میں سب کھانا المرشدی کی طرف سے تقسیم ہوتا تھا۔ حافظ نے لکھا ہے،

ينفق كل ليلة عليهم تارة	ہر رات میں قافلہ والوں پر کبھی ایک ہزار کبھی
الفا و تارة اكثر	ایک ہزار سے زیادہ خرچ کرتے رہے۔

حساب کرنے والوں نے ایک دفعہ چند راتوں کے مصارف کا حساب کیا تو معلوم ہوا۔

انفق في ثلاث ليال ما قيمته	تین راتوں میں ہزار اشرفیاں خرچ ہوئیں
الف دينار و في خمس ليال اخرى ما قيمته	پھر پانچ دوسری راتوں میں پچیس ہزار اشرفیوں
نحو خمسة وعشرين الفا۔ (ص۴۶۳)	تک مصارف عائد ہوئے۔

بہر حال مرشدی کی ان عجیب و غریب مہمان نوازیوں اور شاہ خرچیوں کی داستان بہت طویل ہے ظاہری اسباب کا قطعی فقدان اور اس پر مزید لطیفہ یہ کہ ہر شخص کو اس کی خواہش اور آرزو کے مطابق کھانا ملتا، اور ایسے کھانے جو اس زمانہ میں دمشق اور قاہرہ کے دارالسلطنتوں کے سوا اور کسی جگہ میسر نہیں آ سکتے تھے اور بقول ابن فضل اللہ

لا يختص ذلك لوقت دون وقت	اور یہ بات کسی خاص شخص زمانہ کے ساتھ
بل لو اتاه في اليوم الواحد	مختص نہ تھی، بلکہ ایک ہی دن جتنے آدمی
من اتاه لا بد من ان يحضر له	بھی المرشدی کے یہاں آتے سب کے سامنے
ما يشتهيه (درر ص۴۶۴ ج ۳)	اس کی خواہش کے مطابق کھانا حاضر کیا
	جاتا تھا۔

اور اس ضیافت کے ذوق کے غلبہ کی حد یہ تھی جیسا کہ ذہبی کا بیان ہے:۔

کان یخدم الواردین بنفسہ — المرشدی اپنے مہمانوں کی خدمت خود بنفسِ نفیس کرتے تھے

طریقہ شیخ کا یہ تھا کہ مہمان جب آجاتے تو اپنے حجرے میں چلے جاتے بقول ذہبی

لا ید خلھا احد غیرہ — پھر اس وقت حجرے میں ان کے ساتھ کوئی دوسرا داخل نہ ہوتا۔

اور جیساکہ ابن فضل اللہ کا بیان ہے۔

دغاب ھنیھۃ واحضر لکل واحد منھم ما اقترح۔ (ص۲۶۴) — تھوڑی دیر کے لیے (اسی حجرے میں) وہ غائب ہو جاتے۔ اور اس کے بعد ہر شخص کی خواہش کے مطابق کھانا لاکر پیش کر دیتے۔

خود الیافعی نے اس کی تصویر بھی کھینچی ہے یعنی اس حجرے سے شیخ کھانا کس طرح لاتے اور لاکر مہمانوں کے سامنے رکھتے تھے۔ یافعی نے لکھا ہے کہ میں جس زمانہ میں شیخ سے ملنے گیا تھا، اتفاقاً یہ شعبان کا مہینہ تھا اور نصف شعبان کی رات میں شیخ کے یاں بڑا ہجوم ہوتا تھا۔ اس ہجوم کا خیال کرکے میرا دل گھبرایا اور میں نے طے کیا کہ کل صبح میں شیخ سے رخصت ہو جاؤں گا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں

وعزمت علی السفر ھارباً من لقاء من یاتیہ من سائر البلدان لما قد اعتادوا عندہ لیلۃ النصف من شعبان۔ (مرأۃ ص۲۹۳ ج۴) — میں نے سفر کا پکا ارادہ کرلیا کیوں کہ ان لوگوں سے میں بھاگنا چاہتا تھا جو پندرہ شعبان کی شب میں ہر شہر اور آبادی کے لوگ شیخ کے پاس حاضر ہوتے تھے یہ ان لوگوں کی سالانہ عام عادت تھی۔

شیخ سے یافعی نے اپنے اس ارادہ کو جب ظاہر کیا تو بولے کہ تم کو جانے نہیں دیا جائے گا بلکہ مُصر ہوئے کہ میرے ساتھ "کوم قرح" تم کو بھی جانا پڑے گا۔ یہ "کوم قرح" شیخ مرشدی کے گاؤں کے پاس کسی خاص جگہ کا نام تھا جہاں نصف شعبان کی رات میں لوگ جمع ہوتے تھے اور شیخ ہر ایک کو بہترین پاکیزہ عمدہ عمدہ لذیذ کھانے کھلایا کرتے تھے۔ (ص۲۹۴)

جس ڈر سے یافعی بھاگنا چاہتے تھے اسی ہجوم خلق اللہ میں انہوں نے حکم دیا کہ تم کو بھی شریک ہونا

پڑے گا، لکھا ہے کہ میں نے شیخ سے بہت معذرت کی اور التجا کی کہ اس مجمع میں شریک ہونے پر زیادہ اصرار نہ فرمائیں آخر میں شیخ نے کہا کہ جب تم جانا ہی چاہتے ہو تو عشاء کی نماز تک تم میرے پاس ٹھہرو۔ اس پر راضی ہو گئے، یہ دن کا وقت تھا اور آج یافعی نے روزے کی نیت نہیں کی تھی بلکہ لکھا ہے کہ شیخ کے روک لینے کے بعد میں نے روزے کا ارادہ دل میں فسخ کر دیا۔ ارادہ کا فسخ کرنا تھا کہ شیخ نے کسی آدمی سے اشارہ کیا کہ ان کے لیے کھانا لاؤ اس کے لانے میں کچھ دیر ہوئی تو میں نے دیکھا کہ

شد الشیخ وسطه وجاء نی — شیخ نے اپنی کمر کسی اور ایک خوانچہ خود اٹھا

بمائدة علیها الطعام۔ (مرآۃ ص ۲۹۴) — کر لائے جس پر کھانا رکھا ہوا تھا۔

میں نے اس واقعہ کا ذکر دو وجہوں سے کیا ایک تو یہی کہ شیخ جس شکل میں لوگوں کے کھانا لاتے اور پیش کرتے تھے اس کا کچھ اندازہ ہو اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ذہبی نے جو یہ لکھ دیا ہے کہ ایک مہمان کے سامنے خود ہی کھانا پیش کرتے تھے کلیہ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ خدام سے بھی کام لیتے تھے۔ صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جو ابن فضل اللہ نے لکھی ہے کہ

واکثر ما کان یحضر بنفسه — زیادہ تر کھانا مہمانوں کے سامنے وہ خود پیش

(ص ۴۶۴) — فرماتے تھے۔

المرشدی کی کرامت بدگمانیوں کا ازالہ

خیر یہ تو شیخ مرشدی کے کھانے کھلانے کے قصے تھے ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا خصوصاً جب لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ کسی کی امداد بھی شیخ قبول نہیں فرماتے اس چیز نے ان کی ان شاہانہ بلکہ شاہانہ حیثیت سے بھی بلند تر خصوصیت رکھنے والی مہمان نوازیوں کے راز کو اہم بنا دیا تھا۔ شیخ آخر یہ چیزیں کہاں سے لاتے ہیں اتنے آدمیوں کا کھانا ہر وقت ان کے ہاں کون تیار رکھتا ہے ؟ ہر شخص کے دل میں جس کھانے کی خواہش ہوتی ہے اس سے یہ بات کرنے سے پہلے کیسے واقف ہو جاتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ آج بھی کسی شخص کے متعلق اسی قسم کی باتیں اگر مشہو ہوں تو مختلف رجحانات رکھنے والے قلوب میں ان سوالوں کے حل کی مختلف صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے المرشدی کے زمانہ میں بھی تقریباً یہی باتیں کہی گئی تھیں۔

ایک طبقہ تو ان لوگوں کا تھا جو المرشدی کی مہمان نوازیوں کے ان قصوں کو صرف سنتا تھا لیکن براہ راست

مشاہدہ یا تجربہ کا موقع ان لوگوں کو چونکہ نہیں ملا تھا، ان کے لیے یہ آسان تھا کہ "پیراں نمے پرند مریداں می پرانند" کے نظریہ سے اپنی ذہنی خارشت میں سکون پیدا کرلیں۔ ابن فضل اللہ نے شاید ان ہی لوگوں کے خیال کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

لا یخلو اکثرها من مجازفة	ان قصّوں کے اکثر عناصر و اجزاء گپ سے پاک نہیں ہیں۔

مگر یہ لکھ کر حسب تواتر و کثرت سے ان کا چرچا پھیلا ہوا ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان قصّوں کو محض گپ اور "مجازفہ" قرار دینا بعید از عقل ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ براہ راست جن لوگوں نے ان واقعات کا مشاہدہ کیا تھا ان کی چشم دید شہادتیں ابن فضل اللہ نے پیش کر کے اس خیال کی تردید کی ہے۔ حافظ کے الفاظ یہ ہیں۔

وحکی عن جماعة متنوعة وقوع ذلك لهم لغير وساطة۔ (ص۲۶۴)	مختلف قسم کی جماعتوں سے ابن فضل اللہ نے براہ راست ایسی شہادتیں نقل کی ہیں جن کے ساتھ خود یہ واقعات پیش آئے ہیں۔

افسوس ہے کہ خود ابن فضل اللہ کی کتاب مجھے نہیں ملی ورنہ پتہ چل سکتا تھا کہ کن کن لوگوں کی شہادتیں انہوں نے پیش کی ہیں۔ اتنا تو حافظ کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی طبقہ کے لوگ ان میں شریک نہیں ہیں بلکہ "جماعة متنوعہ" کے افراد ہیں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ علماء، صوفیاء، عوام اور علماء میں بھی مختلف خیالات اور رجحانات رکھنے والے لوگوں کے نام ابن فضل اللہ نے اس موقعہ پر اپنی کتاب میں غالباً درج کیے ہیں۔

ایک بے بنیاد افواہ

ان قصّوں کو گپ یا "مریداں می پرانند" قرار دینے والوں کے قریب قریب یا شاید اسی جماعت میں اور حضرات بھی تھے جنہوں نے بیچارے شیخ کی ان مہمان نوازیوں کو اپنے ریسرچ اور تحقیقات انیقہ کا تختۂ مشق بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بنایا جاتا تھا، خدا جانے ان کی اس "ریسرچ" کی بنیاد جس واقعہ پر قائم کی گئی تھی بجائے خود وہ کس حد تک صحیح تھا لیکن ان کی طرف سے جو تحقیق پیش کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ جس علاقہ میں المرشدی رہتے تھے ان لوگوں کا دعویٰ تھا کہ وہاں کا قاضی ان سے ساز باز رکھتا تھا آنے والوں سے آگے بڑھ کر یہی

قاضی ملاقات کرلیا کرتا تھا اور باتوں باتوں میں ان سے دریافت کرلیتا کہ کس حاجت اور ضرورت سے وہ آئے ہیں، پھر قاضی اور شیخ کے درمیان کچھ مقررہ علامات طے شدہ تھے، ان ہی علامات سے قاضی شیخ کو اس شخص کی حاجت یا اس کے خیالات سے مطلع کردیا کرتا تھا یہی چیز لوگوں کی عقیدت کو بڑھا دیتی تھی، قاضی اس طریقہ سے شیخ کی عقیدت کے دائرے کو بڑھاتا تھا اور شیخ اپنے اس اثر سے جو ان عقیدت مندیوں کی بدولت قدرتاً ان کو حاصل ہوگیا تھا قاضی کو یہ فائدہ پہنچاتے تھے۔ کہ معزولی اور تبادلہ کے خطروں سے بیخوف ہوکر اپنے مستقر پر جما رہے جس کی وجہ سے اس کو ہاتھ پاؤں پھیلانے کے کافی مواقع ملے، علاوہ قضاء کی تنخواہ کے

اکثر من التجارۃ والزراعۃ والولاۃ ترعاہ لجاھہ بالشیخ (ص ۲۶۴)	(ایک ہی جگہ جم کر جو قیام کا موقع ملا) تو تجارت اور زراعت کے ذریعے اس قاضی نے اپنے کاروبار کو خوب فروغ دیا حکام اس کے ساتھ خاص رعایت شیخ مرشدی کے خیال سے کرتے تھے۔

حافظ ابن حجر نے ابن فضل اللہ کے حوالہ سے اس عہد کے کسی صاحب تحقیق و ریسرچ کا مذکورہ بالا حل نقل کیا ہے۔

لیکن کیا ان حقائق و واقعات کی توجیہہ کے لیے جو بالتواتر المرشدی کی طرف منسوب ہیں صرف ایک قاضی الناختیہ (یعنی کسی سب ڈویژن کے قاضی) کا وجود اور المرشدی سے اس قاضی کے تعلقات کافی ہیں۔

اگر مان بھی لیا جائے کہ ایسا کوئی قاضی تھا بھی اور اس قاضی سے حضرت مرشدی کے تعلقات بھی تھے اور جس سوء ظن سے ان لوگوں نے کام لیا ہے یعنی دونوں میں " من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو " کی ملی بھگت بھی تھی جب بھی اس واقعہ کی زیادہ سے زیادہ یعنی آنے والوں کے خواطر وضمائر سے المرشدی کے مطلع ہوجانے کی ایک حد تک توجیہہ ہوسکتی ہے بشرطیکہ ان سارے مفروضات کو صحیح تسلیم کرلیا جائے جن پر اپنی اس تحقیق کی ان لوگوں نے بنیاد قائم کی ہے۔ اگرچہ اس کا ماننا بھی آسان نہیں ہے۔

المرشدی کے پاس عوام ہی نہیں آتے تھے بلکہ بڑے بڑے علماء، صوفیاء اور امراء بھی ان کی

خانقاہ میں آمد و رفت تھی جن میں بعض جلیل القدر ہستیوں کا ذکر آئندہ آ رہا ہے بہر حال قاضی اور مرشدی کے پاس باہمی ساز باز کا راز ممکن ہے کہ عوام پر مخفی رہ جاتا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کاغذ کی یہ ناؤ علم و عقل کے ان تھپیڑوں کی مسلسل زد کو زیادہ دن تک برداشت کر سکتی تھی ابھی کچھ دیر پہلے الیافعی کی ذاتی شہادت گزری ہے کہ بغیر کسی اطلاع کے ان کے ساتھ روزہ داروں کا سا سلوک شیخ نے کیا تو یہ ایک ایسا مخفی اور عدمی فعل ہے کہ قرائن و قیاسات سے اس کا پتہ چلانا آسان نہیں ہے خصوصاً ایک مسافر کے متعلق عام خیال یہی ہو سکتا ہے کہ روزے سے نہ ہوگا[1]

بہر حال تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اشراف علی الخواطر میں تو قاضی کے ساز و باز کو دخل تھا لیکن ان شاہانہ مہمان نوازیوں کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ بے چارے قاضی کے پاس کتنی دولت تھی کتنے نوکر چاکر ہوں گے جو چوبیس گھنٹے المرشدی کے ہر مہمان کی خواہش کے مطابق کھانا تیار کر کے حاضر کر دیا کرتے تھے، میں نے پہلے بھی کہا ہے اس کے لیے ایک دیہاتی قاضی کی آمدنی تو خیر کیا کافی ہوتی اس قسم کا انتظام تو حکومتوں اور سلطنتوں کی طرف سے بھی آسان نہ تھا اس تماشے کے دیکھنے والے الیافعی نے لکھا ہے کہ جس قسم کی اولوالعزمیاں اس باب میں المرشدی سے ظاہر ہو رہی تھیں۔

لیس للسلطان علی احضارھا	عین وقت پر بادشاہ بھی اس قسم کے کھانوں
فی الحال اقتدار ـ (ص ۲۹۵ ج ۴)	کے پیش کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

خصوصاً جب بیان کرنے والے اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ عموماً ان کی خانقاہ میں پکنے پکانے کا بھی کوئی منتظم موجود نہ تھا۔ اگر قاضی کے گھر سے کھانا پک کر آتا تھا تو آخر یہ بات کب تک پوشیدہ رہتی ایک دو دن کی بات ہوتی اور دس بیس آدمی کا قصہ ہوتا تو خیر کچھ کہا بھی جا سکتا تھا۔ لیکن جہاں صبح سے شام تک یہی قصہ ہو لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہو اور سالہا سال سے یہ سلسلہ جاری ہو، قطعاً ناممکن تھا کہ قاضی کی اندرونی امداد کا راز فاش نہ ہو جاتا۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قاضی جو بظاہر دنیا ساز اور

---

[1] درر کامنہ میں حافظ ابن حجر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ شیخ مرشدی کی خانقاہ میں جن صلاحیتوں کے لوگ آتے تھے بغیر کسی سابقہ و تعارف کے ان کی صلاحیتوں سے واقف ہو جاتے تھے اسی لیے جس میں امامت کی صلاحیت ہوتی اس کو امامت کے لیے جس میں خطابت کی اس کو خطابت کے لیے جس میں اذان کی اس کو اذان دینے کا وہ حکم دیتے تھے کیا ان ساری صلاحیتوں کا قاضی پتہ چلا لیتا تھا؟ ۱۲

مال و دولت کا حریص قاضی معلوم ہوتا ہے کیا اس قسم کے آدمی سے ممکن ہے کہ اتنی بڑی عظیم مہانداری کا بار مفت برداشت کرتا چلا جائے۔ لاکھوں روپے بے دردی کے ساتھ آنے جانے والوں پر برباد کرے۔

بہرحال مجھے تو اس زمانے کے اس ریسرچ میں بھی اسی شاعری کی جھلک معلوم ہوتی ہے جو عہد حاضر کے ریسرچی تدقیقات کی خصوصیت ہے، بڑے بڑے انقلابی نظریات محض چند شاعرانہ مناسبتوں پر قائم ہیں، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے آخر اس زمانے کا سب سے بڑا انقلابی نظریہ جس نے "خدا کے خلیفہ" الانسان کا شجرۂ نسب جنگل کے بندروں اور لنگوروں سے ملا دیا جب اسی کی ساری عمارت محض چند صوری شہادتوں پر اٹھائی گئی ہے اسی سے دوسرے تحقیقاتی نتائج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ابن تیمیہ کا الزام مخدومیت

اور میرے نزدیک تو اس قصے کے بے بنیاد اور محض بے اصل ہونے کی سب سے بڑی دلیل کہ شیخ الاسلام ابن تیمیۃ الحرانی، جو طبقۂ صوفیاء و مشائخ پر بے تحاشا تنقید کرنے میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ یہ المرشدی کے ہم عصر ہیں دونوں کا زمانہ ایک ہی ہے۔

المرشدی کے خوارق و کرامات کے چرچوں سے اس زمانہ کی دنیا گونج رہی تھی۔ ابن تیمیہ جیسے دوسرے صوفیوں سے روٹھے ہوئے تھے المرشدی سے بھی وہ خوش نہ تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ قاضی کے گڑھے ہوئے اس قصہ میں کچھ بھی اصلیت ہوتی تو اس قصے کے مشہور کرنے میں یقیناً ابن تیمیہ پیش پیش ہوتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بجائے اس توجیہہ کے المرشدی کے ان غیر معمولی اعمال و افعال کی توجیہہ میں انہوں نے دوسری راہ اختیار کی ہے۔ الیافعی نے مرأۃ الجنان میں لکھا ہے۔

نقل عن ابن تیمیۃ انہ قال ھو مخدوم لما اشتھر عندہ واستفاض کثرۃ خوارقہ للعوائد لم یمکنہ جحدھا۔ (ص ۲۹۵ ج م)	ابن تیمیہ سے لوگ نقل کرتے ہیں کہ وہ المرشدی کو مخدوم قرار دیتے تھے کیونکہ خلاف معمول خوارق عادات کو ان کی طرف منسوب کرنے والے اتنی کثرت اور تواتر سے منسوب کر رہے تھے جس کے بعد ابن تیمیہ سے انکار تو ممکن نہ ہوا۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ ابن تیمیہ تک ایسے ناقابل انکار ذرائع سے المرشدی کے ان محیر العقول کارناموں کی خبر پہنچ رہی تھیں کہ ان واقعات کے انکار یا ان کو قطعی بے بنیاد قرار دینے کی گنجائش چونکہ باقی نہ رہی تھی اس لیے ان غیر معمولی واقعات (خوارق) کی توجیہہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن تیمیہ نے اپنے اس خاص نظریہ سے کام لیا تھا جس سے صوفیہ کے مقابلہ میں کام لینے کے وہ عام طور پر عادی تھے، یہ "مخدومیت" کا نظریہ تھا[۱] اپنی مختلف کتابوں میں ابن تیمیہ نے اس نظریہ کی تفصیل کی ہے۔ میں اس وقت ابن تیمیہ کے ایک خاص نظریہ

الزام کا جواب خود صاحب الزام کی زبان سے

اور جن بے پناہ فیاضیوں سے اس نظریہ کے استعمال میں انہوں نے کام لیا ہے، تفصیلی بحث کے لیے تو تیار نہیں ہوں لیکن اتنی بات تو پھر بھی کہہ سکتا ہوں کہ منطقی طور پر شیخ الاسلام سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ آپ کے اس کلی فیصلہ کا کیا مقصد ہے؟ یعنی آیا یہ کلیہ ہے کہ جہاں کہیں اور جس کسی سے جس شکل میں بھی اس قسم کے واقعات ظاہر ہوتے ہیں ہر حال میں وہ آپ کے جنی کا اثر ہوتا ہے یا آپ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جناتی اثرات بھی ان شکلوں میں کبھی ظاہر ہوتے ہیں، یقیناً پہلی شق کا اختیار کرنا کسی حیثیت سے بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ نہ نقلاً اور نہ عقلاً بلکہ خود ان ہی کے تصریحات اس کے مخالف ہیں، خود اپنی اسی کتاب "النبوات" میں بیسیوں جگہ "کرامات اولیا" کی انہوں نے تصحیح کی ہے۔ بلکہ معتزلہ وغیرہ مسلمانوں کے بعض گمراہ فرقوں نے اولیاء اللہ کی کرامتوں کا جو انکار کیا ہے اور بعض اشعری متکلمین جیسا کہ ان ہی کی روایت ہے کہ معتزلہ کے ہم نوا ہو گئے ہیں ان سب کا تذکرہ بایں الفاظ کرتے ہوئے کہ

والذین ذکر عنهم انکار کرامات	اولیاء اللہ کی کرامتوں کا انکار معتزلہ میں
الاولیاء من المعتزلة وغیرهم	سے جن لوگوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے
کابی اسحاق الاسفرائینی	یا معتزلہ کے سوا ابو اسحاق اسفرائینی اور
وابی محمد بن ابی زید کما	اور ابو محمد بن ابی زید کے متعلق بھی ابن حزم
ذکر ذلک ابو محمد بن حزم	نے یہی دعویٰ کیا ہے (یعنی غیر معتزلہ ہونے

[۱] اس نظریہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حضرت مؤلف کا مضمون "ابن تیمیہ کا نظریہ مخدومیت" (غ م)

اور اشعری علماء کے طبقہ میں شریک ہونے
کے باوجود یہ لوگ اولیاء اللہ کی کرامتوں
کا انکار کرتے تھے۔

خود انہوں نے ایک اچھی بات اس سلسلہ میں لکھی ہے کہ

لا ینکرون الدعوات المجابۃ
ولا ینکرون الرؤیاء الصادقۃ
فان ھذا متفق علیہ بین
المسلمین۔ (ص ۲۶۷)

وہ اس کا انکار تو نہیں کر سکتے کہ دعائیں
قبول ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ سچے خوابوں
کے وجود کی تردید نہیں کر سکتے کیونکہ یہ باتیں
تو ایسی ہیں جن پر سارے جہان کے مسلمانوں کا
اتفاق ہے۔

اور ظاہر ہے کہ اولیاء کے کرامت کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ان کی خواہش اور مرضی
کو خدا پوری فرما دیتا ہے بسا اوقات کسی وجہ سے اولیاء اللہ خدا سے ایسی باتوں کا مطالبہ کرتے
ہیں جن کا عام اسباب کے لحاظ سے وقوع پذیر ہونا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے مگر ان کی دعاؤں
کی وجہ سے یہی غیر معمولی باتیں ظہور پذیر ہو جاتی ہیں اور کرامت اسی کو تو کہتے ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں :-

وھو ان اللہ تعالیٰ قد یخص
بعض عبادہ باجابۃ دعائہ
اکثر من بعض (ص ۲۶۸)

اور وہ یہ ہے کہ اللہ اپنے بعض بندوں
کی بہ نسبت عام بندوں کے زیادہ سنتا ہے
اور ان کی دعائیں قبول فرماتا ہے۔

شیخ الاسلام نے اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ
کے متعلق نقل کیا ہے، کہ

کان سعد بن ابی وقاص معروفا
باجابۃ الدعاء (ص ۲۶۸)

حضرت سعد ابن ابی وقاص اس میں مشہور
تھے کہ ان کی دعا قبول ہوتی ہے۔

اور یہی نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث میں آیا ہے کہ خدا کے بظاہر بعض
ناپرسان حال بندے ایسے بھی ہیں کہ

لو اقسم علی اللہ لابرہ (صحاح)

خدا پر اگر قسم کھا بیٹھیں تو خدا ان کی قسم

پوری فرماتا ہے۔

کو پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ کرامتوں کے ظہور کی ایک شکل یہ بھی ہے بلکہ علاوہ اس قصے کے جس میں حدیث کے یہ الفاظ پائے جاتے ہیں یعنی انس بن نضر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی کی قسم خدا نے پوری کی تھی۔ شیخ الاسلام نے عہد صحابہ کے اس واقعہ کو بھی یاد دلایا ہے جس کا تاریخ کی عام کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے یعنی ایک دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں معاملہ زیادہ نازک شکل اختیار کر لیتا لوگ حضرت انس کے بھائی براء بن مالک کے پاس آتے اور کہتے جیسا کہ خود ابن تیمیہ نے بھی نقل کیا ہے کہ

یا براء اقسم علیٰ ربک — براء وقت آگیا ہے کہ تم اپنے رب پر قسم کھاؤ۔

صحابیوں کے اصرار سے حضرت براء پھر قسم کھاتے مثلاً کہہ دیتے کہ خدا کی قسم مسلمان اس جنگ کو جیت لیں گے یا خدا کی قسم ہمیں شکست نہیں ہو سکتی، تو عام تجربہ لوگوں کا تھا ابن تیمیہ نے بھی لکھا ہے کہ

فیقسم علیٰ ربہ فینصرون — پس وہ قسم کھا لیتے اس کے بعد مسلمانوں کی خدا کی طرف سے مدد فرمائی جاتی۔ (یعنی فتح مند ہو جاتے۔)

جس کا حاصل یہی ہوا کہ دوستوں کے احترام و عزت کو باقی رکھنے کے لیے بھی حق سبحانہ تعالیٰ بعض دفعہ ان کی وجہ سے ایسے امور ظاہر فرماتے ہیں کہ جن کا عام حالات و اسباب کی راہ سے واقع ہونا عقل کے نزدیک کچھ ناممکن سا نظر آتا ہے۔ عہد صحابہ اور اس کے بعد مسلمانوں کی تاریخ کے ہر قرن اور ہر دور میں اس قسم کے واقعات کا مسلسل مشاہدہ کیا گیا ہے۔ اسی کتاب میں خود شیخ الاسلام نے بھی بیسیوں واقعات عہد صحابہ و تابعین کے نقل کیے ہیں مثلاً حضرت خالد بن ولید کا "سم الفور"[1] کی شیشی کا ایرانیوں سے لے کر پی جانا اور اس کے ضرر سے قطعاً محفوظ رہ جانا، یا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جمعہ کے خطبہ میں مدینہ منورہ سے اس فوج کے سپہ سالار ساریہ کو پکارنا جو ہزاروں میل دور دشمن کے مقابلہ میں صف آرا تھی، شیخ الاسلام نے اسی سلسلہ میں حضرت ابو مسلم الخولانی کے اس واقعہ کا ذکر بڑے دلدوز لفظوں میں کیا ہے جو یمن کے متنبی اسود عنسی کے مقابلہ میں پیش آیا تھا۔ میں ان کے الفاظ کا ترجمہ درج کرتا ہوں،

---

[1] سم الفور یعنی فوراً اثر کرنے والا زہر اس کا ترجمہ ہوا۔ عام تاریخوں میں اس کا ذکر ہے۔

"ابو مسلم الخولانی کو جب مشہور متنبی اسود عنسی نے کہا کہ کیا تو اس کی شہادت دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں جواب میں انہوں نے فرمایا کہ میں نہیں سن رہا ہوں، اس نے پھر پوچھا کہ تم شہادت دیتے ہو کہ محمدؐ اللہ کے رسول تھے ابو مسلم نے تب کہا کہ ہاں! اسود نے اس جواب کو سن کر حکم دیا کہ آگ کا ایک الاؤ جوڑا جائے، اس آگ میں اسود نے حکم دیا کہ ابو مسلم جھونک دیئے جائیں، یہی کیا گیا، مگر اسی کے ساتھ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ اس بھڑکتے ہوئے آتشکدہ میں ابو مسلم خولانی نماز پڑھ رہے ہیں یہ آگ ان پر ٹھنڈی ہو گئی اور سلامتی بن گئی۔"

شیخ الاسلام نے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابو مسلم مدینہ منورہ جب آئے تو حضرت عمرؓ نے اس طور پر انہیں بٹھایا کہ بیچ میں ابو مسلم تھے، اور ان کی ایک طرف حضرت ابو بکرؓ دوسری طرف خود حضرت عمرؓ تھے، حضرت عمر اس کے بعد فرماتے جاتے تھے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے مرنے سے پہلے مجھے محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں ایسے آدمی کو دکھا دیا جس کے ساتھ خدا نے وہی سلوک کیا جو سلوک اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔ (النبوات ص۲۶۵)

اور ایک یہی واقعہ کیا میں نے جیسا کہ عرض کیا اسلام کے ہر قرن اور ہر دور میں اس قسم کی ہستیاں ہمیشہ پیدا ہوتی رہی ہیں جنہوں نے اپنے محبوب پیغمبر کی زندگی کو نمونہ بنا کر چلنا شروع کیا کچھ ہی دن بعد ان کی محبوبیت کا تجربہ شروع ہو جاتا ہے جس کا وعدہ قرآن میں ہر اس شخص کے ساتھ کیا گیا ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ ڈھنگ چال ڈھال، طور وطریق، ہدی وسنت کو اختیار کرتا ہے[1] اور ظاہر ہے کہ

---

[1] اشارہ قرآن کی مشہور آیت قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (کہہ دو اگر اللہ کو تم چاہتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تمہیں چاہنے لگے گا) (آل عمران)

اللہ تعالیٰ کا اپنے محبوب بندوں کی مرضی اور خواہش کو پورا کرنا ان کی محبوبیت کے اظہار کی ایک شکل ہے حافظ ابن تیمیہ نے اس موقع پر بالکل صحیح فرمایا ہے کہ

کرامات الصالحین تدل علی صحة	صالحین کی کرامتیں بتاتی ہیں کہ رسول جس دین
الدین الذی جاء به الرسول (ص۵)	کو لے کر آئے ہیں وہ صحیح اور سچا دین ہے۔

بہرحال جب خود ابن تیمیہ اولیاء اللہ کی کرامتوں کے معتقد اور ان کا تذکرہ اتنی بلند آہنگیوں کے ساتھ کرتے ہیں تو یہ دعویٰ کہ سارے خوارق عادات جن کا ظہور کسی شخص سے ہوتا ہے، یہ سب جناتی بکھیڑے ہیں، ظاہر ہے کیسے صحیح ہو سکتا ہے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہمیشہ خوارق عادات کا ظہور کرامت ہی کی وجہ سے نہیں ہوتا، یعنی ان ہی کے لفاظ میں ہمیشہ ان خوارق کا تعلق

الکرامات الرحمانیة التی یکرم اللّٰه	ان رحمانی کرامتوں سے نہیں ہوتا جن سے
بها عباده الصالحین۔	اپنے نیک بندوں کا اکرام و اعزاز خدا کو منظور ہوتا ہے۔

لیکن جیسے یہ کلیہ صحیح نہیں ہے اسی طرح یہ کلیہ بھی غلط ہے کہ اس قسم کے غیر معمولی حوادث و واقعات کا ظہور ہمیشہ جنیوں ہی کی امداد و اعانت سے ہوتا ہے۔

اور جب یہی واقعہ ہے اور اس کے سوا مسئلہ کی کوئی دوسری صورت اور ہو بھی کیا سکتی ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت المرشدی بیچارے کے غیر معمولی ضیافتی کارناموں پر شیخ الاسلام نے اتنی بے دردی کے ساتھ اپنے نظریہ "مخدومیت" کا جو لقعہ چلا دیا آخر اس کو کہاں تک قرین انصاف قرار دیا جا سکتا ہے۔ شیخ الاسلام اسی کتاب "النبوات" میں خود لکھتے ہیں، یعنی صالحین کی کرامتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ پیغمبروں سے جس قسم کے معجزے صادر ہوتے ہیں اسی نوعیت کی کرامتیں اولیاء اللہ سے بھی صادر ہو سکتی ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ

کما صارت النار بردا و سلاما	جیسے آگ ابو مسلم خولانی کے لیے خنک اور
علی ابی مسلم کما صارت	سلامتی کا ذریعہ بن گئی یہ اسی کے مانند ہے
علی ابراهیم و کمایکثر اللّٰه	جیسے ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہی صورت
الطعام و الشراب لکثیر	پیش آئی تھی، یا اللہ کے نیک بندوں کے

من الصالحین کما جری فی بعض المواطن للنبی اولحیا اللہ میتا لبعض الصالحین کما احیاہ کلا نبیاء (ص۳)

لیے اللہ تعالیٰ خوردونوش کی چیزوں کو بڑھا دیتا ہے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف موقعوں پر یہ صورت پیش آئی یا بعض نیک بندوں کے لیے مردے کو خدا کی طرف سے زندگی عطا ہوئی ہے جیسے حضرات انبیاؑ کے لیے بھی یہی ہوا ہے۔

مجھے اس وقت ان چیزوں سے بحث نہیں بلکہ شیخ الاسلام جب خود یہ مانتے ہیں کہ اولیاء اللہ سے کرامتوں کا ظہور" طعام وشراب" یعنی خوردونوش کی چیزوں کے متعلق بھی ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے، ہوتا رہا ہے تو بے چارے المرشدی کی طرف سب سے بڑی کرامت جو منسوب ہے وہ غیر معمولی وسیع ترین شکل میں کھانے کھلانے ہی کی تو کرامت تھی میں حیران ہوں کہ شیخ الاسلام اس کی توضیح فرماتے ہیں کہ جس لاش سے زندگی قطعاً معدوم اور ناپید ہوچکی ہو، کرامۃً اسی لاش میں حیات اور زندگی واپس ہوسکتی ہے جب اولیاء اللہ سے ایسی کرامتوں کا ظہور ان کے نزدیک بھی ہوسکتا ہے تو ایسی جگہ جہاں کھانے پینے کا سامان موجود نہ ہو اگر کرامۃً وہاں یہ چیزیں حاضر ہوجائیں تو اس کو جنات کی طرف خواہ مخواہ منسوب کرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے وہی اللہ جو اپنے بعض نیک بندوں کے لیے قلیل طعام وشراب کو کثیر بنا دیتا ہے یا جس لاش سے زندگی ناپید ہوچکی ہے اسی میں جو اللہ اپنے بعض عباد صالحین کی عزت کو برقرار رکھنے کے لیے زندگی کو پیدا فرماتا ہے تو قریہ کھلان کی خانقاہ میں آخر کیا وجہ ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں کو یہ ماننے پر مجبور کیا جائے کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اللہ کے حکم سے نہیں بلکہ جناتی کرشمہ سازیوں کے تحت ہو رہا تھا سوچنا چاہیئے کہ آخر اس کی معقول وجہ کیا ہوسکتی ہے۔

شیخ الاسلام نے بیسیوں جگہ اس کی تصریح کی ہے۔ مثلاً اسی کتاب" النبوات" میں ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

الخوارق ثلاثۃ انواع اما ان تعین صاحبہا علی البر والتقوی فہذہ احوال

خوارق (یعنی عام اسباب کے مخالف حوادث کا ظہور جو ہوتا ہے ان کی) تین قسمیں ہیں، یا ان خوارق سے نیکی اور تقویٰ کی زندگی میں

نبیا و من اتبعه خوارقہم لحجه فی الدین او حاجة للمسلمین۔ (ص۱)

ان لوگوں کو مدد ملتی ہے جن کے ہاتھ پر ان خوارق کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خوارق و معجزات کا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروی کرنے والے بزرگوں کے خوارق کا بھی یہی حال ہے اس قسم کے خوارق دین کے لیے حجت اور دلیل کا کام دیتے ہیں یا ان سے مسلمانوں کی کوئی ضرورت اور حاجت پوری ہوتی ہے۔

آگے انہوں نے دو قسمیں خوارق کی اور بیان کی ہیں یعنی ایک صورت ان کی ایسی بھی ہوتی ہے کہ نیکی اور تقویٰ کی زندگی میں نہ ان سے مدد ملتی ہے اور نہ نقصان ہی پہنچتا ہے اور دوسری قسم ان کی وہ ہے جن سے لوگ حرام کاریوں اور سیہ کاریوں میں کام لیتے ہیں مثلاً فواحش ظلم و شرک میں مدد ملتی ہے اور غلط جھوٹے دعووں کی تائید ہوتی ہے شیخ نے لکھا ہے کہ

فهذا من جنس خوارق السحرة والكهان والكفار والفجار (ص۱۱)

جادوگروں کاہنوں، کفار و فجار کے غیر معمولی کرشموں کی نوعیت یہی ہوتی ہے۔

بہر حال مجھے ان دو قسموں سے خوارق کے اس وقت بحث نہیں ہے بلکہ صرف پہلی قسم کے متعلق یہ کہنا ہے کہ پیغمبروں ہی سے نہیں بلکہ پیغمبروں کے ماننے والوں اور ان کی پیروی کرنے والوں سے بھی جب شیخ الاسلام کے نزدیک ان کا ظہور ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے بلکہ ہوتا رہا ہے تو سوال یہ ہے کہ حضرت المرشدی کے ان خوارق کو بجائے اس قسم کے ایسی قسموں کے تحت داخل کر دینے کا قطعی فیصلہ وہ کیسے کر بیٹھے جو سحرہ کہان کفار و فجار والے خوارق کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ خصوصاً یوں بھی المرشدی کے ضیافتی کاروبار کو "جناتی بکھیڑوں" کی طرف منسوب کر دینا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے خود شیخ الاسلام فرماتے ہیں، غالباً میں نے اس کا کہیں پہلے بھی تذکرہ کیا ہے کہ

فاهل الاخلاص والايمان لا سلطان له عليهم ولهذا ايهربون من

اخلاص و ایمان والوں پر شیطانی اثرات غلبہ نہیں پا سکتے اسی لیے اس گھر سے شیاطین الجن

البیت الذی تقراء فیه سورۃ البقرۃ ویہربون من قرأۃ آیۃ الکرسی واخر سورۃ البقرہ وغیر ذلک من قوارع القرآن (ص۲۶۴)

بھاگتے ہیں جس میں قرآن پڑھا جاتا ہے اور آیۃ الکرسی کی تلاوت سے یا سورۂ بقر کی آخری آیتوں یا دیگر قوارع القرآن سے وہ بھاگتے ہیں۔

وہ مسلسل اس کی بھی تصریح کرتے چلے جاتے ہیں اور غالباً علاوہ ذہنی کلیات کے خود ان کے ذاتی تجربات کو بھی اس میں دخل ہے، یعنی فرماتے ہیں

من یکون اخبارہ عن شیاطین تخبرہ لا یکاشف اھل الایمان والتوحید واھل القلوب المنورۃ بنور اللہ بل یہرب منہم لیعترف انہ لا یکاشف ھولاء وامثالہم۔ (ص۲۶۵)

جن لوگوں کو شیاطین الجن خبریں پہنچایا کرتے ہیں ان شیاطین جن کے متعلق یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ارباب ایمان و توحید اور روشن ضمیر لوگ جن کے قلوب اللہ کے نور سے روشن ہیں ان کے دل کی باتوں سے یہ شیاطین الجن اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اس قسم کے بزرگوں کے دل سے واقف نہیں ہو سکتے بلکہ ان سے تو وہ بھاگتے ہیں خود شیاطین الجن کی باتوں سے وہ آگاہی نہیں حاصل کر سکتے۔

میں ادب کے ساتھ شیخ الاسلام سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ شیخ مرشدی مسلمان نہیں تھے بلکہ "الکفار" کے طبقہ سے ان کا تعلق تھا۔ یا کافر نہ سہی کیا وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا تھے؟

میں نے خود شیخ مرشدی کو نہیں دیکھا ہے لیکن ان کے دیکھنے والوں نے کتابوں میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ تو میرے سامنے ہے اور ان دیکھنے والوں میں "الیافعی" جیسے ثقات حجت لوگ شریک ہیں، مرشدی کا ذکر کرتے ہوئے الیافعی مرآۃ الجنان میں لکھتے ہیں کہ "الشیخ الکبیر الولی الشہیر ذو العجائب المعطیۃ والکرامات الکریمۃ والہمم العالیۃ والشمائل المرضیہ والمکاشفات الجلیۃ والآیات الباہرۃ والانوار الطاہرۃ۔ (ص۲۹۲ ج۴ مراۃ۔

کیا کسی فاسق و فاجر مسلمان کے متعلق "الیافعی" جیسے متشرع بزرگ اس قسم کے الفاظ آداب القاب کے استعمال کر سکتے ہیں۔ میں نے شروع مضمون کی پیشانی پر المرشدی کے جس فقرہ کو "الیافعی" کے متعلق نقل کیا ہے اس کی وجہ جہاں تک میرا خیال ہے کچھ گرانی بھی مرشدی کی طرف سے یافعی کے قلب میں پیدا ہو گئی تھی آئندہ ان کی اس گرانی کا ذکر آ بھی رہا ہے باوجود اس گرانی کے جب اپنی چشم دید شہادت کے بعد المرشدی کے متعلق اس قسم کے الفاظ انہوں نے استعمال کیے ہیں تو جن لوگوں نے "المرشدی" کے واقعات صرف دور سے سنے تھے براہ راست ملاقات نہیں کی تھی ان کے دعوے کو کیسے مان لیا جائے۔ بہرحال کسی فاسق و فاجر کے متعلق ایسی شہادت الیافعی کبھی نہیں ادا کر سکتے، اور ایک الیافعی کیا، المرشدی اور ابن تیمیہ دونوں کے معاصر جلیل علامہ شمس الدین الذہبی جو ابن تیمیہ کی طرف داری و حمایت میں کافی شہرت رکھتے ہیں [1] اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، حضرات صوفیہ کے ساتھ بدگمانیوں میں ابن تیمیہ سے

---

[1] اس سلسلہ میں بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ایک تاریخی مخطوطہ کا ترجمہ یہاں درج کر دوں، واقعہ یہ ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ جو درحقیقت ایک خاندانی عالم تھے ان کے دادا ان کے والد بھائی الغرض سارا گھرانا علم دین میں امتیاز کی نظر سے دیکھے گئے ہیں فتنہ تاتار میں ان کے والد عبدالحلیم حران سے ہجرت کر کے شام تشریف لے آئے مہاجر ہونے کی وجہ سے اہل دمشق کے خواص و عوام نے بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا حکومت نے ایک معزز عہدہ بھی ان کے سپرد کیا جب شیخ الاسلام کے والد کا انتقال ہو گیا تو خود شیخ الاسلام کے ساتھ لوگوں نے اور حکومت نے احترام کے اسی برتاؤ کو جاری رکھا۔ مگر بعض خاص مسائل میں جب جمہور امت کے خلاف شیخ الاسلام نے تشدد کا رویہ اختیار کیا تو آہستہ آہستہ ہمدردوں کی جماعت ان سے ہٹنے لگی شمس الدین الذہبی بھی شیخ الاسلام کے بڑے قدرشناسوں اور مداحوں میں تھے بلکہ ان کے علم و ذہانت سے کافی مرعوب تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنے تشدد سے باز نہیں آتے اور عوام و عام علماء کی مخالفت کے سوا حکومت روز بروز دارو گیر میں آگے بڑھنے لگی تب الذہبی کچھ گھبرائے کہ کہیں اس فتنہ کی آگ میں میں بھی نہ گھسیٹ لیا جاؤں اس سلسلہ میں الذہبی نے جہاں اور بہت سی تدبیریں اختیار کیں۔ ان میں ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ بڑے اخلاص اور راست بازی سے ایک فصیح اور بلیغ خط شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے نام لکھا۔ اس خط کی نقل مصر و شام کے کتب خانوں میں موجود ہے مشہور قاضی ابن شہبہ کے ہاتھ کی نقل کا فوٹو بھی حال میں شائع ہوا ہے۔ خاکسار نے بھی اس کو دیکھا ہے اسی خط کے بعض فقروں کا ترجمہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الذہبی کسی طرح پیچھے نہیں ہیں لیکن حافظ ابن حجر نے درر کامنہ میں الذہبی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ المرشدی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یہاں درج کرنا چاہتا ہوں۔ علامہ ذہبی نے جو تمہید خط کی لکھی تھی وہی کافی دلدوز ہے۔ حمد اور دعا کے بعد لکھا تھا:-

"واویلا اور افسوس ہے کہ سنت اور سنت والے دنیا سے رخصت ہو گئے اب میں اپنے ان ایمانی بھائیوں کو کہاں سے ڈھونڈوں جو رونے اور گریہ میں میری مدد کرتے تھے، ان لوگوں کے ناپید ہونے پر افسوس ہے جو علم کے روشن چراغ تھے اور تقویٰ والے تھے، نیکیوں کے سرچشمہ تھے، آہ! حلال پیسے کو کہاں تلاش کروں اور اس بھائی کو کہاں پاؤں جس سے دل انس حاصل کرے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں

"مبارک ہیں وہ لوگ جن کو اپنے عیوب نے دوسروں کی عیب جوئی سے روک رکھا ہے اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے عیوب سے غافل ہو کر دوسروں کی عیب چینیوں میں مصروف ہیں تم کب تک دوسروں کی آنکھوں کے تنکوں کو ٹٹولو گے اور اپنی آنکھ کے شہتیر سے غافل بنے رہو گے تم اپنی تعریف آخر کب تک کرتے رہو گے اور تمہاری یہ لن ترانیاں جاری رہیں گی۔ علماء کو برا بھلا کہنے کا یہ سلسلہ کہاں تک پھیلتا چلا جائے گا، لوگوں کی پوشیدہ باتوں کی جستجو میں تم کب تک مشغول رہو گے حالانکہ تم جانتے ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (اپنے مرے ہوئے لوگوں کو بھلائی کے ساتھ یاد کیا کرو۔)"

اسی قسم کے چند فقروں کے بعد اب براہ راست خطاب کر کے ذہبی کہتے ہیں:-

"بھلے آدمی! خدا کے لیے اب بھی ہم لوگوں سے اپنی زبان کو روکو میں جانتا ہوں کہ تم بڑے زبان آور اور بڑے باتونی ہو، خدا کے لیے دین میں مناظرہ بازیوں سے (اغلوطات) سے کام نہ لو جسے تمہارے پیغمبر صلعم نے ناپسند کیا ہے۔"

الذہبی نے پھر بعض حدیثوں کا ذکر کیا ہے اور یہ لکھ کر حلال و حرام تک کے مسائل میں جب آدمی زیادہ باتیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے متعلق ذہبی نے لکھا ہے کہ

کان یتکلم علی الخواطر و کان قلیل الدعوٰی عدیم الشطح حسن المعتقد۔ (ص ۴۶۳)

وہ لوگوں کے قلبی خطرہ کو بتا دیا کرتے تھے، دعویٰ بہت کم کرتے تھے ان کے کلام میں شطح (بڑھ) بھی نہیں پایا جاتا، وہ حسن المعتقد تھے یعنی ان کے اعتقادات بھی اچھے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کرنے لگتا ہے تو دل میں سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے عقائد کے نازک مسائل میں بلند آہنگیوں سے ایک ہی پہلو پر زور دینے سے منع کیا ہے، چونکہ شیخ الاسلام کی دوستی میں الذہبی کا شہرہ تھا نیز حنبلی مذہب سے دونوں کا چونکہ تعلق تھا کچھ ان ہی امور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"خدا کی قسم تم نے اس کائنات کا ہم لوگوں کو مسخرا بنا چھوڑا ہے۔"

پھر نصیحت کی ہے کہ تم نے فلسفہ کی کتابوں کا بہت مطالعہ کیا اور ان کے زہر کو تمہارے دماغ نے چوس لیا شکایت کی ہے کہ تم اللہ کے نیک بندوں کے خلاف کب تک لٹھ گھماتے رہو گے اور اچھے لوگوں کی تحقیر و توہین کے درپے رہو گے۔ اس طریقے سے کہ، بظاہر تو تعریف نہ معلوم ہو، خود اپنی قصیدہ خوانی کب تک کرتے رہو گے۔ پھر لکھا ہے کہ حدیثوں کے متعلق ایک رویہ تم نے یہ اختیار کر رکھا ہے کہ ان پر ضعف کا وضع کا حکم لگاتے رہتے ہو۔ کاش صحیحین (بخاری و مسلم) کی حدیثیں تمہارے بے پناہ حملوں سے محفوظ رہ جائیں،

الذہبی نے پھر چونکایا ہے کہ

"دیکھو بھائی ستر کے قریب تمہاری عمر ہو گئی روانگی کی گھنٹی بجنے والی ہے۔"

پھر ناامیدی ظاہر کی ہے کہ تم بھلا موت سے کیا ڈر و گے بلکہ اسی پر بگڑ بیٹھتے ہو جو موت کو یاد دلاتا ہو۔ پھر مجھ غریب کی بات کیا سنو گے میں جانتا ہوں کہ کہیں تمہیں غصہ آ گیا تو میری ان چند سطروں کے مقابلہ میں ایک جلد ہی تصنیف کر کے رکھ دو گے آخر میں لکھا ہے میں جو تم سے محبت رکھتا ہوں جب تنگ آ کر اس کا یہ حال ہو گیا ہو تو اسی سے اندازہ کرو تمہارے دشمن کا کیا حال ہو گا میں نے تمہارے دشمنوں کا ذکر کیا سچ کہتا ہوں کہ ان میں نیکو کار اہل عقل و فضل والے لوگ بھی ہیں جیسے تمہارے ماننے والوں میں بہت سے فاسق و فاجر جاہل و کاہل گاؤ خر شریک ہیں۔ الذہبی نے خط کو ختم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ تم اس خط کو پا کر مجھ پر خوب برس گے لیکن خدا کرے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کیا فاسق و فاجر کے متعلق اس قسم کے الفاظ خصوصاً الذہبی کے قلم سے نکل سکتے ہیں؟ سب سے زیادہ ابن تیمیہ یا الذہبی جیسے بزرگوں کو صوفیوں سے اعتقادی خرابیوں ہی کی شکایت ہوتی ہے۔ لیکن جب ذہبی بھی "حسن المعتقد" اور خوش اعتقاد مسلمان المرشدی کو جب قرار دے رہے ہوں، تو میرے خیال میں یہ ان کی اعتقادی صحت کی سب سے بڑی سند ہوسکتی ہے۔ صوفیہ اپنے "شطحیات" میں بھی بدنام ہیں لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس صوفیانہ داغ سے ذہبی کہتے ہیں کہ المرشدی کا دامن پاک تھا۔ خاص حالات میں بعض صوفیوں سے " انا الحق "، یا سُبحانی ما اعظم شانی " وغیرہ الفاظ جو نکل گئے ہیں، ان ہی کا نام دعوی رکھا گیا ہے اور منجملہ مطاعن کے ایک طعن یہ بھی ہے جو اس گروہ پر علماء کی طرف سے عموماً کیا جاتا ہے لیکن ذہبی گواہی دیتے ہیں کہ اس طعن کی بھی ان میں گنجائش نہ تھی۔

اور ایک الذہبی ہی کیا، حافظ ابن حجر نے دوسری شہادتوں کی بنیاد پر المرشدی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے

کان اسمر مبدن نامر بعۃ حسن	وہ گندم گوں گداز بدن تھے، میانہ قد، پاکیزہ
الشکل منورۃ الصورۃ جمیل الہیئۃ	صورت روشن چہرہ خوبصورت شکل اور اچھے
حسن الاخلاق کثیر التلاوۃ (درر ص ۲۶۳)	اخلاق والے آدمی تھے اور کثرت سے قرآن
	کی تلاوت فرماتے رہتے تھے۔

گو ظاہری شکل و صورت سے باطنی کیفیات پر استدلال کلی حیثیت سے تو صحیح نہیں ہے لیکن پھر بھی ساحروں جادوگروں، خباثی اعمال والوں کی عمومی حیثیت سے شکلاً و صورتاً و لباساً وضعاً ہوتی ہے جیسے المرشدی کی طرف حافظ ابن حجر نے منسوب کیا ہے، اس قسم کی پاک و صاف ستھری دھلی دھلائی پھر اچھی زندگی عموماً تقویٰ و طہارت اور پارسائی و پاکبازی کی زندگی رکھنے والوں کی دیکھی گئی ہے اور حافظ نے صرف ظاہری حالات ہی کی تو رپورٹ نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کے بعد ان کے باطنی اوصاف و اخلاق کو بھی سراہا ہے سب سے زیادہ یاد رکھنے کی چیز یہ ہے کہ المرشدی کی طرف منجملہ دیگر صفات اور خصوصیتوں کے حافظ نے یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اندرونی طور پر اس خط سے تمہارا دل متاثر ہو میں اپنے عیوب سے خوب واقف ہوں مجھ پر افسوس اگر میں توبہ نہ کروں خدا کے سامنے رسوائیوں کا کیا ٹھکانا ہے میرا علاج صرف حق تعالیٰ کی درگزر و عفو سے ہوسکتا ہے (میں نے قصداً بعض زیادہ کرخت فقروں کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے اصل مکتوب السیف الصیقل کے آخر میں فوٹو کے ساتھ چھپا ہوا ہے)

یہ بھی منسوب کیا ہے کہ وہ "کثیر التلاوۃ" تھے، جس کا مطلب ظاہر ہے کہ بکثرت قرآن کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے میں پوچھتا ہوں کہ شیخ الاسلام جب خود فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والوں سے اس قسم کے جنات بھاگتے ہیں جن کے مخدوم ہونے کی تہمت انہوں نے المرشدی پر لگائی ہے تو بتایا جائے کہ تہمت اور سوء ظن کے سوا شیخ الاسلام کے اس بے محابا فیصلہ کو میں اور کیا قرار دوں۔

خود ان ہی نے لکھا ہے بلکہ تصریح کی ہے کہ جنوں کے اقرار سے یہ معلوم ہوا ہے کہ

وہ ارباب ایمان و اخلاص اور روشن ضمیر بزرگوں کے قلبی حالات سے آگاہی

واقفیت ان کے لیے ناممکن ہے"

ان کے الفاظ میں نقل کر چکا ہوں کہ

ولیعترف انہ لا یکاشف ھولاء واامثالھم۔

جن اقرار کرتے کہ اس قسم کے لوگوں کے اندرونی خیالات سے وہ آگاہی نہیں حاصل کر سکتے۔

پھر یہ باور کر لینا کہ لوگوں کے قلوب کے ضمائر و خواطر سے جو المرشدی واقف ہو جاتے تھے اور اسی بنیاد پر ہر مہمان کے آگے وہی کھانا ان کی طرف سے پیش ہوتا تھا جس کی اسے خواہش ہوتی تھی۔ اس کے متعلق یہ دعویٰ کہ جناتی تائیدوں کو اس میں دخل تھا بے بنیاد ہی نہیں بلکہ حد سے زیادہ سوء ظن کے سوا اور کیا قرار دیا جائے۔

"مخدومیت" کا دعویٰ ابن تیمیہ المرشدی کے متعلق کرتے تھے اس کا تذکرہ کرنے کے بعد الیافعی نے جو یہ لکھا ہے کہ یہ ابن تیمیہ کا صرف "ظن کاذب ہے" اور ان کی طرف سے یہ "تاویل فاسد" ہے اور اپنے خیال کی تائید میں انہوں نے یہ وجہ پیش کی ہے۔

فان الجان لیس لھم اطلاع علی بواطن العباد وما یخطر فی بواطنھم نعوذ باللہ من سوء الاعتقاد (ص۲۹۵)

کیونکہ اللہ کے خاص بندوں کی اندرونی کیفیات سے جن واقف نہیں ہو سکتے نہ ان سے اور نہ ان خطروں سے جو ان بزرگوں کے قلوب میں گزرتے ہیں۔ بدگمانی سے میں خدا ہی کی پناہ مانگتا ہوں۔

شاید اس سے بھی ان کا مقصود وہی ہو جو فقیر نے عرض کیا۔

الزام "مجذوبیت" یہ واقعہ ہے کہ المرشدی میں ظاہری اعمال و افعال کے لحاظ سے کسی قسم کی کوئی کمزوری بھی اگر ہوتی تو اگر دوسرے نہیں مگر الذہبی تو اس کا ذکر کیے بغیر قطعاً خاموشی کے ساتھ گزر نہیں سکتے تھے۔ صوفی ہونے کی وجہ سے طبعاً ان کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ تعریف کے الفاظ لکھیں لیکن یقیناً کوئی چیز ان کو ایسی ملی ہی نہیں جسے حملے کا ذریعہ وہ بنا سکتے ہوں البتہ کرامات اور کشوف کی اس کثرت کو دیکھ کر چلتے ہوئے ایک فقرہ آخر میں لکھ گئے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے ان کے حوالہ سے درر کامنہ میں نقل کیا ہے۔

والذی یظهر لی انه کان مجذوبا (ص ۲۶۳) — مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ المرشدی مجذوب تھے۔

مگر اس کی وجہ انہوں نے نہیں لکھی بظاہر خیال گزرتا ہے کہ الذہبی کچھ المرشدی سے ڈرے ہوئے ہیں اور غالباً "مجذوب" قرار دینے کی وجہ ان کا غیر شعوری خوف ہی معلوم ہوتا ہے۔

مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ جس جماعت سے ذہبی یا ابن تیمیہ کا تعلق ہے غالباً ان کے ہاں مجذوب مان لینے پر ذہبی کو کس چیز نے آمادہ کیا کسی ظریف کا خیال ہے کہ اس طرح دھن دولت کو مسلمانوں کے کھلانے پلانے میں پانی کی طرح بے دریغ لٹاتے رہنا علماء رسوم کے نزدیک جنون ہی کی شکل ہو سکتی ہے لیکن خیر یہ تو ظرافت کی بات ہے اگر جذب کا معیار یہی ہے تو الذہبی کیا فرمائیں گے اس شخص کے متعلق جو صرف اللہ اور اس کے رسول کے سوا سب کچھ اس کے پیغمبر کے قدموں پر نثار کرنے کے لیے آیا تھا، خود اس پیغمبر ہی کا (صلواۃ اللہ علیہ وسلامہ) کیا حال تھا اُحد پہاڑ کے برابر سونے کے متعلق جو بار بار اعلان کرتا ہو کہ میرے قبضہ میں اگر آجائے تو تین دن سے زیادہ وہ میرے پاس باقی نہیں رہ سکتا۔ بلالؓ کو حکم دیا جاتا ہے کہ

انفق یا بلال ولا تخش من ذی العرش اقلالا۔ — بلالؓ خرچ کیے چلے جاؤ اور عرش والے سے تنگی کا اندیشہ نہ کرو۔

اسی پیغمبر کے ایک امتی کے قبضۂ اقتدار میں جو کچھ آیا تھا اگر وہ سب کو مسلمانوں پر لٹاتا رہا تو اس کو جنون قرار دینے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ نے خود لکھا ہے کہ اس قسم کے خوارق عادات دین کی صداقت کے لیے یا حجت

کا کام دیتے ہیں یا مسلمانوں کی حاجت وضرورت ان سے پوری ہوتی ہے بجنسہٖ ان کے الفاظ میں نقل کرچکا ہوں۔

پھر المرشدی سے اس باب میں جس قسم کے غیر معمولی کارنامے ظاہر ہوئے تھے ان سے تو دونوں ہی نتائج پیدا ہو رہے تھے۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ قرآن کے اس قسم کے اعلانات عامہ مثلاً

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا	اللہ سے جو ڈرتا رہتا ہے خدا اس کے لیے
وَیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ	کشائش کی راہ پیدا فرماتا ہے اور ایسی جگہ سے اسے روزی پہنچاتا ہے جہاں سے
	سان گمان بھی نہ ہو۔

جن میں "غیر حسابی رزق" کا وعدہ تقویٰ کی زندگی بسر کرنے والوں کے لیے کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی شکل دعویٰ کی ہے یقیناً اس دعوے کی دلیل اس قسم کے واقعات بن سکتے ہیں جن کا ظہور المرشدی جیسے متقی اور پرہیزگار بزرگوں کے ہاتھ پر وقتاً فوقتاً اسلام میں ہوتا رہا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ آمدنی کے اسباب کی ناواقفیت لوگوں کو اچنبھے میں ڈالتی ہے پوچھتے ہیں کہ آخر جب وہ نہ کسی سے لیتے تھے اور نہ ان کی آمدنی کے ذرائع لوگوں کو معلوم تھے تو ان کے پاس یہ چیزیں کہاں سے آتی تھیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اسباب جس رزق کے معلوم ہی ہو جائیں تو پھر وہ "لایحتسب رزق" ہی کیا باقی رہتا ہے۔

اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف قرون وادوار ممالک وامصار میں ایسی ہستیاں مسلمانوں میں جو پیدا ہوتی رہی ہیں[1] جن کے مصارف کا پیمانہ غیر معمولی طور پر وسیع تھا لیکن مداخل کی راہیں عموماً لوگوں کو

---

[1] عہدِ صحابہ میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت ابوہریرہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بھی مختلف صحابیوں سے ایسی صحیح روائتیں کتابوں میں پائی جاتی ہیں کہ غلہ یا اسی قسم کا ایسا ذخیرہ جو چند دنوں سے زیادہ استعمال کے بعد باقی نہیں رہ سکتا تھا وہی ذخیرہ مدت ہائے مدید تک ان لوگوں کے کام آتا رہا حدیث اور سیرت کی کتابوں میں یہ روائتیں موجود ہیں اور مسلمان عموماً ان سے واقف ہیں، پچھلے زمانہ میں بھی اور تو اور ہندوستان میں ایسے متعدد تماشے دیکھے گئے ہیں
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

معلوم نہ تھیں، غالباً اس قرآنی اعلان اور دعوے کو ثابت کرنے کے لیے ایسا ہوتا رہا اور جہاں تک میرا خیال ہے آئندہ بھی قرآن کے اس دعوے کا تجربہ ان لوگوں کو قدرت کراتی رہیگی جو اس کا تجربہ کرنا چاہیں گے۔

بہرحال المرشدی کی غیر معمولی مہمان نوازیوں سے ایک طرف جہاں "تقویٰ" کے اس قرآنی ثمرہ اور نتیجہ کا ثبوت فراہم ہو رہا تھا وہیں ظاہر ہے کہ بیچارے عام مسافر مسلمانوں اور حجاج کی ایک ضرورت بھی اس ریگستانی ٹاپو میں پوری ہوتی تھی پھر ان کے اس طرز عمل کو جذب قرار دینے کے آخر معنی کیا ہو سکتے ہیں۔

جذب میں کچھ بھی ہو، اتنی بات تو اس میں بہرحال ضروری ہے کہ "عقلی نظام" مجذوبوں کا عموماً عمومی نقطۂ اعتدال پر باقی نہیں رہتا، اسی لیے مجذوب بزرگوں کو جن کا جی چاہتا ہے مجنون بھی کہتے ہیں لیکن عقلی اختلال کی آخر کچھ علامتیں ہوتی ہیں۔ ایک شخص جس کے متعلق دیکھنے والوں کا یہ بیان ہو کہ

"وہ بڑے خوبصورت میانہ قد آدمی تھے، ہیئت اور وضع اُن کی جمیل تھی، اخلاق بھی ان کے اچھے تھے۔" (ص ۴۶۳ دُرر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جن کی کوئی صحیح توجیہہ دنیا اب تک نہیں کر سکی ہے۔ حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کے سفرہ عام کے عام قصوں کے سوا جلال الدین خلجی کے زمانہ کے مشہور بزرگ شیخ مولہ جن کے باورچی خانے میں روزانہ خرچ بتایا گیا ہے کہ "ہزار من میدہ، پانچسو من گوشت، تین سو من شکر" تھا۔ اور ان کی یہی خصوصیت تھی کہ کسی سے کچھ نہ لیتے تھے، دیکھو میری کتاب "تعلیم و تربیت" ص ۲۱۷ ج ۱۔ اور یہ تو خیر پرانے زمانے کی باتیں ہیں، چند سال ہی گزرے ہیں اسی ہندوستان میں حضرت مولینا عین القضاۃ حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ لکھنؤ میں بیٹھ کر اسی "لا تحتسبی رزق" کا ثبوت سال ہا سال تک دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے ہزار ہا روپیہ ماہوار حضرت کی طرف سے امور خیر میں صرف ہوتے تھے لکھنؤ جیسے غدار شہر کی ہر سال سات دفعہ دعوت آپ کی طرف سے ہوتی تھی جس میں کسی کی تخصیص نہ ہوتی اور کھانا بھی کیسا کابلی دنبوں کا گوشت، کشمیری چاول کی بریانی، مزعفر گھی جس میں پانی کی طرح استعمال ہوتا تھا لیکن آخر وقت تک دنیا کو اس کا پتہ نہ چلا کہ اس متقی کے پاس رزق کا یہ دریا کس راستہ سے جاری ہے۔ ۱۲

پھر حافظ ابن حجر کے اُن الفاظ کا ترجمہ ہے جنہیں کچھ دیر پہلے میں نقل کرچکا ہوں سوچنا چاہیئے کہ مجنونوں یا مجذوبوں کی یہی شکل، یہی صورت یہی وضع و قطع ہوتی ہے ؟

اور ایک یہی کیا جس کسی نے بھی المرشدی کے حالات بیان کیئے تھے کسی کے بیان میں اب تک مجھے کوئی چیز نہیں ملی ہے جس سے ان کے عقلی نظام میں معمولی اختلال کا بھی ثبوت ملتا ہو۔ بلکہ جس کسی نے ان کا جو حال بھی بیان کیا ہے سب ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ صوفیانہ زندگی کے انہوں نے اپنی عالمانہ زندگی کی اس شان کو بھی باقی رکھا تھا، حافظ ابن حجر ہی نے لکھا ہے کہ

کان یفتی بلفظہ لا بکتابہ (ص ۴۶۳) تحریری طور پر تو نہیں لیکن زبانی فتوی دیا کرتے تھے[1]

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان سے فقہی سوالات بھی کیا کرتے تھے اور ان سوالوں کا جواب بھی وہ دے دیتے تھے۔ اگر کچھ بھی ان میں جذب یا مجذوبوں کی وارفتگی کا رنگ ہوتا تو جیسا کہ عام دستور ہے قطعاً مسلمان ان سے فتویٰ پوچھنے کی نہ جرأت ہی کرتے اور نہ وہی فتویٰ جیسے اہم علمی و دینی کام کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے کیونکہ مجذوبوں کا گروہ اور جس معاملہ میں بھی مجذوب ہو، پر تجربہ شاہد ہے کہ شریعت کے معاملات میں وہ بھی ہوشیار رہتے ہیں۔

بہر حال میں نے جہاں تک المرشدی کے حالات کا مختلف کتابوں میں مطالعہ کیا ہے ان میں کوئی ایسی چیز مجھے نہیں ملی جس سے ذہبی کے نظریہ "مجذوبیت" کی تائید ہوتی ہو، جیسے ابن تیمیہ کے نظریۂ "محذومیت" کا بھی ثبوت اس وقت تک نہیں ملا ہے اور نہ ان کی زندگی میں کوئی ایسی بات ملتی ہے جو کسی حیثیت سے بھی علماء رسوم کے نزدیک محل طعن و اعتراض ہو

ترک جمعہ و جماعت کا الزام صرف ایک چیز کا اس سلسلہ میں حافظ ابن حجر نے تذکرہ کیا ہے میں ان ہی کے الفاظ میں اس کو نقل کردیتا ہوں، ارقام

---

[1] یہ بات کہ تحریری فتویٰ نویسی سے المرشدی کیوں بچتے تھے یہ بھی ان کی غایت بیداری کا ثبوت ہے۔ علماء کی ایک جماعت گزری ہے جو فقہی فتووں کے متعلق قائل تھی کہ قید کتابت میں لانا ان کا مناسب نہیں ہے کیونکہ عموماً یہ اجتہادی مسائل ہوتے ہیں، وقت پر جو بات سمجھ میں جس عالم کے اپنے معلومات کی روشنی میں آگئی اس نے بتادی، آئندہ کی ضرورتوں کو اس زمانے کے علماء کے لیے چھوڑ دینا پسند کرتے تھے۔ میرے خیال میں یہ انتہائی احتیاط ہی کا اقتضاء ہوسکتا ہے۔

فرماتے ہیں

وانکروا علیہ ان فی زاویتہ ممبر للخطیب فیصلی الناس الجمعۃ والجماعۃ ولا یصلی معہم ۔ صـ۴۶۳	المرشدی پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ان کی خانقاہ میں خطیب کے لیے حالانکہ ممبر بھی موجود ہے لوگ جمعہ وجماعت کی نمازیں وہاں پڑھتے ہیں لیکن خود مرشدی لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے ۔

بلاشبہ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اعتراض کی گنجائش ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن سب سے پہلی بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ الجمعۃ والجماعۃ کے الفاظ جو حافظ نے لکھے ہیں ان کا مطلب کیا ہے آیا صرف جمعہ کی جماعت میں عدم شرکت مقصود ہے، تو اس کی یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ صوفی المشرب بزرگوں کا عام طریقہ چونکہ عمل بالاحوط تھا اور معلوم ہے کہ ان کا گاؤں مرشد کھلان ایک معمولی قریہ تھا، اس لیے ہو سکتا ہے کہ حنفی مذہب کی رعایت کر کے شیخ جمعہ کی نماز گاؤں میں نہ پڑھتے ہوں، اور اس علاقہ کے عوام جو عموماً حنفی نہ تھے ان کو پڑھنے سے منع بھی نہ کرتے ہوں۔

اور اگر جمعہ کی نماز کی حد تک "جماعت" کا مذکورہ بالا لفظ محدود نہیں ہے بلکہ پنج وقتہ نمازوں کی جماعت میں المرشدی شریک نہیں ہوتے تھے، یہی اس کا مطلب قرار دیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عام حالات کے لحاظ سے اعتراض کرنے والوں کو شرعاً اس اعتراض کا بجا حق حاصل ہے یہ مان بھی لیا جائے کہ نماز میں جماعت کی پابندی کا مطالبہ وجوب کی حد تک نہ بھی پہنچا ہو، تو سنت موکدہ ہونے میں اس کے کون شک کر سکتا ہے ۔ ایسی ہستیاں جو دین میں قیادت اور نمائندگی کی حیثیت رکھتی ہیں اور عوام جن کے نمونوں سے متاثر ہوتے ہیں ان کے لیے موکدہ سنتوں کا ترک یقیناً اہمیت رکھتا ہے، کم از کم اپنے ذاتی مذاق کی بنیاد پر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے مسائل اغماض اور چشم پوشی کے مستحق کسی حیثیت سے نہیں ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ ایک دوسرا پہلو بھی ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن بزرگوں کی دینی زندگی کے عام پہلوؤں کو لوگوں نے بے داغ پایا ہو اور باوجود اس کے کسی ایسے شرعی مطالبے کے متعلق جس کی حیثیت وہی ہو جو موکدہ سنتوں جیسی چیزوں کی ہے اگر ان کے متعلق کسی قسم کی کوتاہی پائی جاتی ہو، تو

اس وقت جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ شریعت کے ان مطالبات کی شدت میں بھی کمی پیدا ہو جاتی ہے جن کی حیثیت فرائض و واجبات کی ہوتی ہے۔ پھر ایسی صورت میں یہ کیوں نہ خیال کیا جائے کہ یہاں بھی کسی عذر ہی کی وجہ سے ممکن ہے کہ ترک سنت کی یہ کوتاہی مبنی ہو، آخر میں پوچھتا ہوں کہ مرشدی بیچارے تو پچھلے زمانہ کے آدمی ہیں قرون مشہود لہا بالخیر کی مسلم الثبوت ہستی امام دار الہجرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کیا یہ چھپی ڈھکی بات ہے کیا الذہبی یا شیخ الاسلام ابن تیمیہ اس سے واقف نہ تھے کہ آخر عمر میں حضرت امام مالک

لم یکن یشھد الصلوٰۃ فی المسجد ولا الجمعۃ۔ (الدیباج المذہب ص۲۲)	مسجد میں نمازوں کے لیے حاضر نہیں ہوتے تھے اور نہ جمعہ کی نماز میں حاضر ہوتے تھے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ

وکان ربما قیل لہ فی ذلک فیقول لیس کل الناس یقدر ان یتکلم بعذرہ (ص۲۲)	بسا اوقات اس مسئلہ میں لوگوں نے ان سے کہا بھی مگر جواب میں آپ نے فرمایا کہ ہر شخص اس کی قدرت نہیں رکھتا کہ اپنے عذر کو وہ بیان کرے۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ "جمعہ و جماعات" کے اس ترک کی وجہ بھی لوگوں کو معلوم نہ تھی، اور باوجود دریافت کرنے کے حضرت نے اس عذر کو بیان بھی نہیں فرمایا۔ پھر جب ان قرون کے مسلمانوں نے جیسا کہ لکھا ہے۔

واحتمل الناس لہ ذلک حتی مات علیہ	لوگوں نے امام مالک کے اس طرز عمل کو برداشت کیا حتیٰ کہ اسی حال میں حضرت امام کا انتقال ہوا۔

اور اس کے بعد بھی اس وقت تک حضرت امام مالکؒ کے اس خاص طرز عمل کے متعلق لوگوں نے سکوت ہی کو اولیٰ خیال کیا، محض اس کو ذریعہ بنا کر میں نہیں جانتا کہ ان کی امامت اور جلالت قدر پر کسی نے نکتہ چینی کی ہو۔ بلکہ یہی سمجھا گیا کہ خدا اور اس کے بندے کے درمیان یہ کوئی خاص معاملہ تھا۔

وجہ اس کی وہی تھی کہ امام مالک کی دینی زندگی اپنے پہلوؤں کے لحاظ سے جتنی پاک و صاف تھی۔ ان کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی اس کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا اور نہ اب کر سکتا ہے کہ العیاذ باللہ ان کا

یہ فعل شریعت سے بغاوت یا سرکشی پر مبنی تھا اور نہ ان کے متعلق کبھی سوچا جا سکتا ہے کہ شرعی مطالبات کی ان کی نظر میں اہمیت و وقعت نہ تھی، بہر حال بقول شخصے المرشدی کی طرف یہ انتساب صحیح بھی ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ

لیس ھذا اول قارورۃ انکسرت فی الاسلام — یہ پہلا شیشہ نہ تھا جو اسلام میں ٹوٹا ہو۔

منزلت و مرتبہ میں ان سے بھی بلند ترین ہستی کی طرف تاریخ جب ٹھیک اسی واقعہ کو منسوب کر چکی ہے تو جو توجیہہ حضرت امام مالک کی طرف سے پیش کر کے لوگ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ المرشدی کو بھی سکوت اور خاموشی کے حق سے محروم کرنے کی معقول وجہ خود ہی غور کرنا چاہیے کہ کیا ہو سکتی ہے۔

اور یہ سب تو جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں یہ مان کر کے عرض کر رہا ہوں کہ منسوب کرنیوالوں نے المرشدی کی طرف جمعہ وجماعات کو منسوب کیا ہے اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے، حالانکہ سچ پوچھیے تو بجائے خود اس انتساب میں گفتگو کی کافی گنجائش ہے بلکہ میرے نزدیک تو یہ بھی کچھ اڑائی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حافظ ابن حجر جنہوں نے الزام لگانے والوں کے اس الزام کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، اپنی اسی کتاب درر کامنہ میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ

وکان کل من انکر علیہ حالہ اذا اجتمع بہ ذال عنہ ذالک (صـ۴۶۳) — یہ واقعہ ہے کہ ہر شخص جسے مرشدی کے حال (طرز عمل) پر اعتراض ہوتا جب ان سے اس کی ملاقات ہو جاتی تو اس اعتراض و انکار کا اس کے دل سے ازالہ ہو جاتا تھا۔

حافظ کی کلی تعبیر اس باب میں خاص توجہ کی مستحق ہے، آخر ان کی اس کلی شہادت کی بنیاد پر اگر یہ سمجھا جائے کہ جمعہ وجماعات کا اعتراض بھی ان ہی الزاموں میں شریک ہے جن کا المرشدی سے ملنے کے بعد ازالہ ہو گیا تو جو ان کے الفاظ ہیں یقیناً ان میں اس کی کافی گنجائش موجود ہے۔

بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی مشہور ہستیوں کے متعلق جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ جہاں ان کی تعریف و ستائش کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے وہیں ہر زمانہ میں کچھ ایسے سرپھرے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو ان تعریفی چرچوں کو برداشت نہیں کر سکتے، اور ہم خیال

سے ہٹ کر ان کی بدگمانیاں مختلف قسم کے لطیفے تراش کر دنیا میں پھیلاتی رہتی ہیں۔ شاید المرشدی رح کے ساتھ بھی کچھ اس قسم کی صورت پیش آئی۔ بغیر کسی تحقیق کے پھیلانے والے ان کے متعلق اپنے خود تراشیدہ الزاموں کو عوام میں پھیلا دیا کرتے ہوں گے، لیکن ان سے ملنے کے بعد لوگوں پر اصل حقیقت واضح ہو جاتی ہو گی اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے مسلمانوں ہی کی تاریخ میں نہیں بلکہ عام انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی بڑا آدمی اس قسم کی چہ میگوئیوں کے شکار ہونے سے محفوظ رہا ہو۔

دوسرے الزامات اور اتہامات جو المرشدی پر لگائے گئے تھے ان کا تو مجھے علم نہیں ہے کیونکہ صراحۃً ان کا کسی نے ذکر نہیں کیا لیکن "ترک جمعہ و جماعات" کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں اگر کچھ بھی حقیقت کا شائبہ ہوتا ہے تو یہ ناممکن تھا کہ شمس الدین الذہبی جیسے بزرگ کا قلم اس کے ذکر کیے بغیر آگے بڑھ جاتا۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں ذہبی نے اپنی کتاب میں اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا اور نہ اسی کا پتہ چل سکا کہ ابن تیمیہ کی کسی کتاب میں اس کا تذکرہ پایا جاتا ہے حالانکہ "مخدومیت" ہو یا "مجذوبیت"، ان دونوں دعووں کے اثبات میں ظاہر ہے کہ ان حضرات کو اس واقعہ سے کافی مدد مل سکتی تھی۔

"میں کے بعد سارے اعتراضات اور شکایات جو المرشدی سے لوگوں میں پائی جاتی تھیں ان کا ازالہ ہو جاتا تھا۔" حافظ ابن حجر نے علاوہ اس "کلی دعویٰ" کے چند جزئی مثالیں بھی دی ہیں اور کیسی مثالیں؟

علامہ ابن سید الناس | علامہ ابن سید الناس سے عوام ممکن ہے واقف نہ ہوں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ علم و فضل کے ساتھ ساتھ تقویٰ و دیانت میں ان پایہ بلند ہے۔[۱]

---

[۱] حافظ ابن حجر نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے

صدوقاً فی الحدیث وحجۃ فیما ینقلہ۔ (دررکامنہ ص۲۰۹ ج۴) — حدیث کی روایت میں وہ سچے ہیں اور جو بات بھی نقل کرتے ہیں اس کے متعلق وہ حجت ہیں یعنی ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

البرزالی کے حوالہ سے حافظ ہی نے نقل کیا ہے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بہر حال ابن سید الناس کی بلند شخصیت اور ان کی مذکورہ بالا خصوصیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اب حافظ ابن حجر کی اس شہادت کو سنیئے یعنی ملنے کے بعد جن لوگوں کے دل سے شکوک شبہات کا ازالہ ہوا ان کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں،

منہم ابن سید الناس۔ (ص۴۶۳ ج ۳) ان لوگوں میں ؟ ابن سید الناس بھی ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کسی عامی آدمی کی حالت نہیں ہے بلکہ تنقید رجال میں جس کی نظر محدثین میں مسلم تھی یہ اس کا حال ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ملاقات کے بعد صرف ابن سید الناس کی طرف سے یہ اعلان کہ المرشدی کی طرف جو باتیں منسوب کی جاتی ہیں غلط ہیں شیخ مرشدی کے تزکیہ اور توثیق کے لیے نہ صرف کافی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کان احد الاعیان معرفۃ واتقانا وحفظا للحدیث وتفہما فی عللہ واسانیدہ عالما بصحیحہ وسقیمہ۔

چند ممتاز شخصیتوں میں ان کا شمار تھا یعنی حدیث کے علم میں اس کے متعلق ضبط و احتیاط میں اور اس کے حفظ اور یاد رکھنے میں حدیثوں کی علتوں کو پہچانتے میں اور ان کی سندوں کے پرکھنے میں وہ سربرآوردہ لوگوں میں گنے جاتے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ صحیح حدیثیں کونسی ہیں اور قابل اعتراض کونسی۔

اسی سے ان کی جلالت قدر کا اندازہ کیجئے کہ شیخ تقی الدین بن دقیق العید جن کے ابن سید الناس جیسے شاگرد تھے لکھا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں ہی شیخ ابن دقیق العید ان پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ درس حدیث میں کسی صحابی یا سند کے کسی راوی کے حالات پیش کرنے کی ضرورت ابن دقیق العید کو اگر پیش آتی تو ابن سید الناس کو خطاب کر کے فرماتے

ایش ترجمہ ھذا یا ابا الفتح — ابو الفتح اس شخص کے حالات کیا ہیں بیان کرو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو رجال کی کتابیں گویا زبانی یاد تھیں شیخ سے اشارہ پانے کے ساتھ ہی

فیاخذ فی الکلام ویسرد والناس سکوت والشیخ مصغ الی مایقول۔ (ص۲۱)

وہ جواب میں گفتگو شروع کر دیتے اور کہتے چلے جاتے لوگوں پر خاموشی طاری رہتی (ابن دقیق العید) ہمہ تن گوش بن کر جو کچھ وہ کہتے جاتے اسے سنتے رہتے۔

ملکہ سند کی حیثیت ان کے اس اعلان کو اگر دی جائے تو ابن سیدالناس کا علم و تحقیق میں جو مقام ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہ یہ غلو ہوگا نہ مبالغہ۔

المرشدی اور الامیر محمد بن جنکلی بن بابا کی شہادت

حافظ ابن حجر نے اسی سلسلہ میں دوسرا نام جو لیا ہے وہ تو اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے، مصر کے سلاطین کا وہ سلسلہ جو "ممالیک" کے نام سے موسوم ہے، ان ہی سلاطین کے امراء میں ایک عجیب و غریب شخصیت تھی، نام بھی ان کا کچھ عجیب سا تھا، حافظ ابن حجر نے "جنکلی" لکھا ہے، واللہ اعلم یہی اس کا واقعی تلفظ تھا یا اصل نام کی یہ معرب تشکل ہے، کچھ بھی ہو حافظ ہی کا بیان ہے کہ نسباً یہ حضرت ابراہیم بن ادہم سے تعلق رکھتے تھے۔ پورا نام ان کا یہ ہے، جنکلی بن محمد البابا بن جنکلی بن خلیل بن عبداللہ العجلی، بدرالدین ان کا لقب تھا۔ ابتداءً تاتاری بادشاہ غازان خان جس نے اسلام قبول کرلیا تھا، اس کی طرف سے آمد کے متصلہ علاقہ "راس علین" کے گورنر تھے، غازان خاں کی وفات کے بعد مصری حکومت کی دعوت پر یہ شام ہوتے ہوئے مصر پہنچے، اور وہاں کے طبقۂ امراء میں شریک ہوگئے۔ مصر کے متعدد ممالیک سلاطین کا زمانہ انہوں نے پایا تھا۔ حافظ نے لکھا ہے کہ سلطان صالح اسمٰعیل کے زمانہ میں تو ان کا اقتدار و اعزاز اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ بادشاہ کی طرف سے ان کو "الوالدی الامامی" کا خطاب ان کے موسومہ فرامین میں لکھا جاتا تھا[1]۔ بہرحال مجھے یہ کہنا ہے کہ منجملہ دوسری خصوصیتوں کے حافظ ابن حجر نے ان کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ

يميل الى ابن تيمية ويتعصب له — ابن تیمیہ کی طرف امیر جنکلی کا خاص میلان

---

[1] حافظ ابن حجر نے اسی سلسلہ میں اس لطیفہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ شاہی "موکب" میں نقیب جنکلی کے آگے آگے یہ پکارتا جاتا تھا کہ "یا آتا بک سبحان من اتی بک" یعنی اے شاہی اتالیق پاک ہے وہ خدا جو آپ کو مصر لایا، اسی کتاب میں ہے کہ حکومت مصر کی طرف سے بڑی جاگیر ملی تھی اسی سے ان کی دولت کی فراوانی کا اندازہ کیجئے کہ علاوہ زکوٰۃ ان کی سے آٹھ ہزار اردب گیہوں اور چار ہزار درہم نقرہ غرباء میں بطور خیرات کے ہر سال تقسیم ہوتے تھے بالاتفاق مورخین کا بیان ہے کہ دنیا اور دین دونوں کی عقل اس شخص کو غیر معمولی طور پر عطا ہوئی تھی۔ اس زمانہ کے امراء کے عام عیوب سے ان کا دامن پاک تھا ایک بیوی کے سوا دوسری عورت ان کے پاس نہ تھی۔ (درر کامنہ ص ۵۴۲ ج ۱)

ویرد علی من یرد علیہ۔ (ص۵۳۹ ج ۱)

تھا بلکہ ان کی طرف سے وہ متعصبانہ جانب داری سے کام لیتے تھے، ابن تیمیہ پر جو اعتراض کرتا تھا اس کا جواب دیتے تھے۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ "امیر جنکلی" ابن تیمیہ کے خاص معتقدوں میں تھے۔ اب سنیئے ان ہی امیر جنکلی کے صاحبزادے جن کا نام محمد بن جنکلی بن محمد بن بابا تھا۔ علاوہ امارت کے انہوں نے علم بھی حاصل کیا اور "جنکلی" کے غالباً اسی میلان کی وجہ سے جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی طرف سے ان کو تھا امیر محمد بن جنکلی نے اپنے آبائی مسلک حنفی کو چھوڑ کر حنبلی مذہب اختیار کرلیا تھا، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ

تفقہ للحنفیہ ثم تحویل حنبلیا۔ (ط۴۱۶ ج ۳)

گو انہوں نے تعلیم تو فقہ حنفی کی پائی تھی لیکن حنفی مذہب کو ترک کر حنبلی مذہب اختیار کرلیا تھا۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ ابن تیمیہ کی عقیدت میں وہ اپنے والد سے بھی آگے بڑھ گئے تھے کیونکہ جہاں تک میں جانتا ہوں "امیر جنکلی" نے حنفی مسلک ترک نہیں کیا تھا۔ اگرچہ شیخ الاسلام سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے بہرحال امیر محمد بن جنکلی کی ان تمام خصوصیتوں کو پیش نظر رکھیئے اور اسی کے ساتھ حافظ وغیرہ کی اس علمی توثیق کو بھی کہ

تخرج فی معرفۃ اسماء الرجال و مذھب السلف۔ (ص۴۱۷)

اسماء الرجال اور سلف کے مذاہب کے جاننے میں انہوں نے امتیاز حاصل کیا تھا۔

اور اس کے بعد ملاحظہ فرمائیے حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ المرشدی سے مل کر جن لوگوں کے قلوب میں ان کی جانب سے کسی قسم کی شکایت باقی نہ رہی ان میں ابن سید الناس کے بعد دوسرے آدمی یہی امیر محمد بن جنکلی بن البابا بھی ہیں، اگر امیر محمدؒ کی اس شہادت کو حافظ ابن تیمیہ کے ایک غالی معتقد کی شہادت قرار دی جائے تو اس کے انکار کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور یہ شہادتیں ان ہی دونوں حضرات تک محدود نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجر نے یہ لکھ کر منہم ابن سید الناس و ابن جنکلی بن البابا" کے بعد وغیرہما" کا بھی اضافہ کیا ہے جس کے معنی یہی ہوئے کہ ان دونوں ثقات علماء ناقدین کے سوا اوروں کو بھی اس کا تجربہ ہوا تھا۔ کہ المرشدی کی طرف جو قابل اعتراض باتیں منسوب کی جاتی ہیں، وہ بے بنیاد اور غلط تھیں، جب

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا ایک خاندانی معتقد بھی یہی شہادت ادا کرتا ہو تو پھر نہیں سمجھتا کہ جمعہ اور جماعات کے ترک کا جو الزام ان کی طرف منسوب کرنے والے اب تک منسوب کر رہے ہیں اس انتساب کا حق ان کو کس حد تک باقی رہتا ہے ۔

حاصل کلام

بہرحال بات زیادہ پھیل گئی ورنہ میرا مقصود تو صرف یہ تھا کہ المرشدی کی طرف حافظ ابن تیمیہ نے اپنے نظریہ "مخدومیت" کو جو منسوب کرنے کا ادعا فرمایا ہے یا ان سے ذرا نیچے اتر کر الذہبی نے بجائے مخدومیت کے "مجذوبیت" سے ان کی زندگی کے واقعات کی توجیہ کرنی چاہی ہے میرے نزدیک یہ دونوں دعوے، دعووں سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہیں رکھتے واقعات آپ کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہر انصاف پسند آدمی ان کو سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے ۔

اور واقعہ تو یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ المرشدی کی شاہی مہمان نوازیاں جیسا کہ ابن تیمیہ کا ادعا ہے مخدومیت ہی کی رہین منت تھیں یعنی تسلیم بھی کر لیا جائے کہ "جنات" ان کے تابع تھے اور وہی اس غیر معمولی ضیافت کے سارے کاروبار کو انجام دیتے تھے اور لوگوں کے ضمائر و خواطر کا علم بھی ان کو ان ہی جنات کے ذریعہ سے ہو جاتا تھا تو ابن تیمیہ جب خود فرماتے ہیں کہ

والجن اذا خدموا الرجل الصالح فی بعض اغراضه المباحة فاما ان یکونوا مخلصین یطلبون الاجر من الله او لا یطلبوا منه اما دعاءه لهم واما نفعه لهم بجاهه او غیر ذلک ۔
(کتاب النبوات صـ ۲۶۲)

اور جنوں کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کسی مرد صالح کی جب وہ خدمت کرتے ہیں یعنی ایسے اغراض و مقاصد جو شرعاً جائز ہیں، ان میں اس صالح آدمی کی جنی جب مدد کرتا ہے تو کبھی وہ اس امداد میں مخلص ہوتا ہے یعنی صرف اللہ سے ثواب و اجر کی توقع قائم کر کے ان کی مدد کرتا ہے یا اس بزرگ آدمی کی دعا کا طالب ہوتا ہے یا ان کے جاہ سے نفع اٹھانا چاہتا ہے یا اسی قسم کے اغراض جنی کے سامنے ہوتے ہیں ۔

اس کے بعد میری سمجھ میں نہیں آتا کہ "مخدوم" قرار دے کر ارباب صلاح و تقویٰ کی جماعت سے المرشدی کو جو ابن تیمیہ خارج کرنا چاہتے ہیں اس کی بنیاد کیا باقی رہتی ہے ۔

اور ابن تیمیہ لکھتے یا نہ لکھتے ولی تو ولی قرآن میں تو "نبی" تک کے متعلق یہ خبر دی گئی ہے کہ "جن" ان کے خادم تھے، اور طرح طرح کے خدمات انجام دیتے تھے آخر سلیمان علیہ السلام کے قرآنی قصہ سے کون ناواقف ہے پس جنوں کی مخدومیت جب نبوت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے تو ولایت کے ساتھ کیوں جمع نہیں ہو سکتی[1]

اور یہی حال مجذوبیت کا بھی ہے بلکہ "مجذوبیت" تو ولایت ہی کی راہوں میں سے ایک عام اور مسلمہ راہ ہے، خاکسار نے آج سے تیس سال قبل حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح عمری میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مسلمانوں میں "مجاذیب و بہالیل" فقراء کا ایک سلسلہ جو پایا جاتا ہے عہد صحابہ میں اس طبقہ کے خصوصی آثار کا بہت بڑا حصہ حضرت ابوذر صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتا ہے واقعات کی روشنی میں اپنے اس دعویٰ کو خاکسار نے پیش کرنے کی جرأت کی تھی خدا کا شکر ہے کہ اتفاقاً اس مضمون

---

[1] شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے امام غزالی کی بعض کتابوں میں شکایت کی ہے کہ فلسفہ کے جال سے نکل بھاگنے کی گو اس شخص نے پوری کوشش کی لیکن فلسفہ کی آنتوں میں پھر بھی ٹانگیں الجھ کر رہ گئیں، شیخ الاسلام بڑے آدمی ہیں ان کی علمی و دینی عظمت کا خیال سامنے آجاتا ہے ورنہ میرا احساس تو یہ ہے کہ کچھ یہی کیفیت مجھے خود شیخ الاسلام ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ ان کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے فلسفہ کا کافی مطالعہ انہوں نے کیا ہے بظاہر اسی مطالعہ نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیر شعوری طور پر ان کے دماغ کو علت و معلول کے قانون کی زنجیروں میں کچھ اس طرح جکڑ دیا تھا کہ ان کے لیے یہ ناقابل برداشت تصور تھا کہ نہ کھانے والے دیکھے جاتے تھے۔ نہ پکنے والی چیزیں نظر آتی تھیں، لیکن ہر وقت پکا پکایا کھانا جتنے مہمان بھی مرشدی کے پاس آتے تھے ان کی خواہش کے مطابق پیش کر دیا جاتا تھا، اب ایک طرف ان کا تدین جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اس نے ان میں جنوں کے ماننے کی گنجائش پیدا کر دی تھی اور تفلسف علت و معلول کے قانون کو تلاش کرتا تھا دونوں ہی کی باہمی ترکیب سے مخدومیت کا نظریہ ان میں شاید پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے تسکین حاصل کر لیتے ہوں گے ان دیکھے طور پر جن کہیں سے کھانے پکا کر مرشدی تک پہنچا دیا کرتے تھے۔ حالانکہ ایسا ایمان جو فلسفہ کی آمیزش سے قطعاً پاک ہو اس کے لیے "لا یحتسب رزق" کی صورت ہی یہ ہونی چاہیے کہ بجائے اسباب کے خود مسبب الاسباب کے امر و حکم سے اس کی توجیہ کرے آخر چار چار سو یا پانسو کھانے والوں کے لیے بسا اوقات تین چار آدمی کے کھانے کو کافی ہوتے ہوئے متعدد بار عہد نبوت میں جو پایا گیا تو کیا شیخ الاسلام مسبب الاسباب کے سوا کسی دوسرے سبب کو ثابت فرما سکتے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰ کے آسمانی مائدہ کی کیا توجیہہ فرمائیں گے؟

پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی التھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کی جب نظر پڑی تو گو فقیر کی شخصیت سے اس وقت تک ناواقف تھے کیونکہ میری طالب علمی کا زمانہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا تھا، تاہم آپ نے اپنے ایک خاص گرامی نامہ سے فقیر کو سرفراز فرماتے ہوئے خیال کی تائید فرمائی، بلکہ اسی مکتوب گرامی یہ بھی ارقام فرمایا گیا تھا کہ "مقالہ نگار سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں لیکن اس مضمون کو دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ محقق نہیں ہو چکے ہیں تو "محققیت متوقعہ" کی دلیل ان کا یہ مضمون ضرور ہے" یہ حضرت والا کی ذرہ نوازی تھی ورنہ اس وقت بھی چار پائے بروکتا بے چند کا جو حال تھا اسی حال میں اس وقت تک گرفتار ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

المرشدی پر صوفیائے وقت کی تنقیدیں

اور اب میں چاہتا ہوں کہ "المرشدی" کی خاص روش پر علماء رسوم یا "طبقۂ ملا" ہی کی طرف سے نہیں بلکہ جس گروہ سے اس کا تعلق تھا یعنی خود "صوفیوں" کی جانب سے اس زمانہ میں جو بعض تنقیدیں کی گئی تھیں ان کا ذکر کروں سچ پوچھئے تو ان ہی صوفیانہ تنقیدوں کا تذکرہ یہاں اصل مقصود ہے اسی سے اندازہ ہوگا کہ "تصوف" اور "صوفیاء" میں بھی علاوہ جزوئی اختلافات کے نقطۂ نظر کا ایک ایسا اصولی اختلاف بھی ہے جس نے میرے نزدیک صوفیاء کی روش اور طریقۂ عمل کو دو مستقل حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ اسی تقسیم سے جو دو راہیں تصوف میں پیدا ہو گئی ہیں ان ہی میں سے ایک راہ کی تعبیر خاکسار نے "اطلاقی تصوف" سے کی ہے۔

پہلی تنقید

المرشدی کے متعلق ان صوفیانہ تنقیدوں کا تذکرہ الیافعی نے مرآۃ الجنان میں کیا ہے پہلی تنقید تو انہوں نے اپنے استاد اور شیخ حسین الحالی کے حوالہ سے بایں الفاظ نقل کیا ہے۔

لو کنت یظھر علی یدی مثل	المرشدی کے ہاتھ جو باتیں ظاہر ہو رہی ہیں اگر
ھذا الذی یظھر علی یدیہ لدخلت	میرے ہاتھ پر بھی باتیں ظاہر ہونے لگیں تو میں
فی سرب تحت الارض۔ (ص۲۹۵ ج ۴ مرآۃ)	زمین کے اندر کسی تہہ خانہ میں جا کر چھپ جاتا۔

قریب قریب اسی کے شیخ الہادی المغربی سے بھی انہوں نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ

لاشک انہ حصل لہ نصیب من	اس میں مجھے شک نہیں ہے کہ المرشدی
احوال الفقراء الا ان الفقراء	کو فقراء کے بعض حالات سے حصہ ضرور ملا

یرضون لاشہرۃ ھذہ الکرامات التی تظہر منہ۔ (صفۃ مرأۃ) | تھا لیکن فقراس طریقہ سے اپنی کرامتوں کے اظہار کو پسند نہیں کرتے جیسے اس شخص سے ظاہر ہو رہی ہیں۔

مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خوارق عادات جن کا ظہور ہر کس و ناکس کے سامنے المرشدہ کے ہاتھوں پر ہو رہا ہے جو گویا کرامات کے افشاء و اعلان کی ایک شکل تھی ان کے اس طریقہ عمل کو "صوفیانہ اخلاص" کے مناسب نہیں خیال کیا۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ بالکلیہ اپنے مذاق کی بات ہے، فطرۃً بعض بزرگوں میں ستر و خاموشی اخفاء کا جذبہ غالب ہوتا ہے حدیثوں میں اللہ کے ان ہی خاص بندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

رب اشعث اغبر مدفوع بالابواب لواقسم علی اللہ لابرہ (رواہ مسلم) | بہت سے پراگندہ مو، گرد آلود چہرے والے لوگ جنہیں دروازوں پر دھکے دیئے جاتے ہیں۔ (خدا کے پاس ان کا مرتبہ اتنا بلند ہوتا ہے کہ) اگر خدا پر قسم کھا بیٹھیں تو خدا اس کو پوری کر کے رہتا ہے۔

لیکن کرامات کا چھپانا ہر حال میں ہر شخص کے لئے ضروری ہے میرے نزدیک نہ قرآن ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نہ حدیث سے، بلکہ خود حضرات صوفیائے کرام میں ایک بڑا طبقہ ایسا پایا جاتا ہے جنھوں نے یہی نہیں کہ اپنی کرامتوں کے اخفاء کی کوشش نہیں کی بلکہ علانیہ ان خوارق عادت کا اظہار علی رؤس الاشہاد وہ کرتے رہے، سید الاولیاء حضرت شیخ عبد القادر الجیلی رضی اللہ عنہ ہی کی زندگی اس کی سب سے بڑی مثال ہو سکتی ہے تواتر کے ساتھ یہ قصے ان کی طرف منسوب ہیں ہزار ہا ہزار انسانوں کے مجمع میں حضرت والا سے خوارق عادات کا ظہور بھری مجلسوں میں ہوتا رہتا تھا اور یہ ان کی مجلس کی عام بات تھی۔ شاید ہی کوئی مجلس حضرت والا کے خطبات کی ایسی ہو گی جس میں شریک ہونے والوں کو غیر معمولی خوارق کا تجربہ نہ ہوتا تھا، آخر میں پوچھتا ہوں حضرات انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ منکرین کے مطالبہ پر وہ خوارق کا اظہار فرماتے تھے۔ حالانکہ یہ کلیہ بھی صحیح نہیں ہے بسا اوقات

رفع ضرورت کے لیے بھی انہوں نے خوارق سے کام لیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جن معجزات کا قرآن میں تذکرہ کیا گیا ہے ان میں "فلق البحر" یا انفجار عیون (یعنی پتھر سے پانی کے جھرنے کا) جاری ہونا یا بادل کا وہ سایہ جو بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ چلتا تھا، یا من وسلویٰ وغیرہ چیزوں کا تعلق ظاہر ہے ان ہی خوارق سے ہے جن سے رفع حاجات میں مدد لی گئی ہے خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جن آیات باہرات کا انتساب حدیث وسیر کی کتابوں میں کیا گیا ہے ان میں زیادہ تر تو رفع حاجات ہی والے خوارق ہیں، عموماً مسلمان ان سے واقف ہیں۔

لیکن نبوت کے جو منصب عالی سے سرفراز نہ تھے مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جو صاحب کتاب کا علم رکھتے تھے، عام طور پر آصف بن برخیا سمجھا جاتا ہے کہ ان کا اسم گرامی تھا اور حضرت سلیمانؑ کے وزیر تھے انہوں نے ملکہ سبا کے تخت کے لے آنے کا جو دعوی فرمایا اور دعویٰ کے مطابق اس کو کر دکھایا، ظاہر ہے کہ اس قرآنی قصہ کا تعلق ایک ایسی ہستی سے ہے جو نبی بھی نہ تھے اور اپنی کرامت کا رفع ضرورت کے لیے انہوں نے اظہار فرمایا، صحابۂ کرام کے حالات میں بھی ایسے سیکڑوں خوارق کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کا رفع ضرورت سے تعلق تھا، تفصیل کے لیے دفتر درکار ہے۔

خود شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے حوالہ سے میں نقل کر چکا ہوں کہ "خوارق عادات" کی ایک قسم کے متعلق وہ بھی لکھتے ہیں کہ اللہ کے عباد صالحین سے ان کا ظہور دین کی تائید اور مسلمانوں کی حاجتوں کی تکمیل کے لیے بھی ہوتا ہے میں نے اس موقعہ پر عرض کیا تھا کہ اسلام کی سیزدہ صد سالہ تاریخ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف ممالک اور اقالیم میں اس قسم کی ہستیوں کو قدرت پیدا کرتی رہی ہے۔

اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ المرشدی جو کچھ کر رہے تھے یا کر کے دکھا رہے تھے اس میں بجائے ان کے ارادے اور خواہش کے اسی کا ارادہ اور اسی کا حکم کارفرما نہ تھا جو ان کے ذریعہ سے ان امور کو ظاہر فرما رہا تھا، جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ چیزیں ان ہی لوگوں کو ملتی ہیں جو اپنا سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں، پھر کیوں یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ بھی جو کچھ ہو رہا تھا اسی کے ارادے سے ہو رہا تھا جس کے ارادے میں المرشدیؒ[1] نے اپنے ارادے کو گم کر دیا تھا۔

---

[1] الیافعی نے بھی اس مقام پر تقریباً اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں ان کا خیال ہے کہ اپنی کرامتوں کے اظہار پر وہ مامور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بہرحال شیخ حسین الحاکی یا شیخ عبدالہادی المغربی کی یہ تنقیدیں بظاہر ان بزرگوں کے ذاتی مذاق کی تابع معلوم ہوتی ہیں[1] اسی لیے ان کی اس تنقید کی کم از کم میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔

دوسری تنقید

البتہ اس کے بعد الیافعی نے ان الفاظ کے ساتھ جو دوسری تنقید نقل کی ہے، یعنی :-

بلغنی عن السید الجلیل الامام الحفیل الشیخ خلیفۃ الشاذلی الاسکندرانی انہ لما ذکر عندہ قال کلاما معناہ تری متی یتفرغ ھذا الرجل لذکر اللہ لشغل اوقاتہ بمن یاتیہ من الامراء والسوزراء وغیرھم من اھل الدنیا۔ (ص ۲۹۶)	سید جلیل حضرت شاذلی کے خلیفہ جو سکندریہ کے رہنے والے تھے ان کا بیان مجھ تک پہنچا ہے کہ جب المرشدی کے کارناموں کا ذکر لوگوں نے ان کے سامنے کیا تو خلیفہ شاذلی نے سن کر فرمایا جس کا حاصل یہ تھا کہ یہ شخص (یعنی المرشدی) آخر اللہ تعالیٰ کی یاد کے لیے کب وقت نکالتا ہے کیوں کہ اس شخص کا سارا وقت ان دنیا دار امیروں وزیروں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۔ تھے وہ فرماتے ہیں ان الاولیاء لا یتعاطون الاشیاء بھوی نفوسھم اذ لو فعلوا ذلک ما کانوا اولیاء اللہ (یعنی اولیاء اللہ تو نام ہی ان لوگوں کا ہے جو اپنی نفس کی خواہشوں سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور جو نفس کے مطالبہ کے تحت اس قسم کے کام کرے گا اس کا شمار اولیاء اللہ کے گروہ ہی میں کیسے ہو سکتا ہے۔ (دیکھو ص ۲۹۶ ج ۴ مرآۃ)

[1] چنانچہ قریبی دور میں اس کی ایک واضح مثال حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور حضرت حافظ ضامن شہید کی ہے جو ایک ہی شیخ کے خلفاء و مریدین اور مصاحبان ضمیم ہونے کے باوجود مختلف المذاق تھے، مشہور واقعہ ہے کہ قحط پڑا اور لوگوں کو روٹی میسر نہ آتی تھی تو حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنا متبرک رومال چند روٹیوں پر ڈال دیا اور روٹیوں کی تقسیم کا حکم دیا۔ رومال کے اندر سے روٹیاں نکال نکال کر تقسیم کی جا رہی تھیں اور ختم نہ ہوتی تھیں، ایسے میں حافظ صاحبؒ ادھر آ نکلے اور اس کرامت کو دیکھ کر فرمایا، "او ہو اللہ میاں تو لوگوں کو بھوکا رکھنا چاہتے ہیں اور آپ روٹی کھلا رہے ہیں" حضرت حاجی صاحب نے فوراً اپنا رومال کھینچ لیا اور روٹیاں ختم ہو گئیں۔ اس واقعہ کو حکیم الامۃ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے کئی جگہ نقل فرمایا ہے۔ (غ۔م)

وغیرہ کی ملاقاتوں میں گزرتا ہے جو اس کے
پاس آتے رہتے ہیں۔
"آخر خدا کو یاد کرنے کے لیے یہ شخص کب وقت نکالتا ہے؟"

المرشدی کا جواب اسی سوال کا جو جواب حضرت شیخ المرشدی نے دیا ہے، درحقیقت اس کا تذکرہ میرا اصل مقصود ہے، اور یہ ساری گفتگو محض اس فقرے کو پیش کرنے کے لیے کی گئی۔
الیافعی ہی نے شیخ اسکندرانی کی مذکورہ بالا تنقید کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

قال الراوی فلما سمعنا منه هذا الکلام اتینا الشیخ محمد لنزوره فقال لنا قولوا للفقیه خلیفه واللّٰه ما شغلونی عن اللّٰه طرفة عین او قال ما قوتهم السلام او کما قال من الکلام۔
(ص ۲۹۶ ج ۸ مرآۃ)

راوی کا بیان ہے کہ اسکندرانی کے الفاظ کو سننے کے بعد میں شیخ محمد یعنی (المرشدی) کی زیارت کے لیے ان کے پاس حاضر ہوا، تو مجھ فرمانے لگے کہ اس فقیہہ (ملّا) خلیفہ (شاذلی) سے کہنا کہ خدا کی قسم ایک چشم زدن کے لیے بھی اگر (ان لوگوں کی آمد و رفت) مجھے حق تعالیٰ سے غافل بناتی، شیخ المرشدی نے یہ فرمایا کہ اللہ سے یہ لوگ مجھے چشم زدن کے لیے بھی اگر غافل کر سکتے تو میں ان لوگوں کو سلام بھی نہیں کرتا، بہرحال یہ یا اسی کے قریب مرشدی نے ارشاد فرمایا۔

راوی کے طریقہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ المرشدی نے شیخ شاذلی کے اعتراض کا یہ جواب کہنے والے سے سنے بغیر دیا تھا، اور یہ ان کی عام عادت تھی بلکہ اس قسم کے بزرگوں کے متعلق عام تجربہ ہے کہ سوال سے پہلے ان کی طرف سے ہر ایک کو اپنے خیال کے مطابق جواب مل جاتا ہے۔
ظاہر ہے کہ فرائض و واجبات یا شریعت کے دوسرے عام مطالبات سے یقیناً اسکندرانی کے اس اعتراض کا تعلق نہ تھا، اس کے متعلق کافی بحث میں پہلے کر چکا ہوں اس قسم کی کوتاہیاں اگر المرشدی کی زندگی میں ہوتیں تو صرف جمعہ اور جماعات کے ترک ہی والے الزام کے منسوب کرنے پر لوگ قناعت

نہ کرتے ، نیز خود اس الزام کے متعلق بھی عرض کر چکا ہوں کہ سنی سنائی باتوں کی حد تک۔ تو ان الزاموں کا اثر لوگوں پر باقی رہتا تھا لیکن براہ راست شیخ مرشدی سے جو بھی ملا ، اور جس طبقہ کے لوگوں کو ذاتی تجربہ و مشاہدہ کا موقع ملا ، حافظ ابن حجر کی شہادت گزر چکی کہ ان کی بدگمانیاں بالکلیہ ختم ہو جاتی تھیں ان لوگوں میں ابن سید الناس جیسے عالم تھے اور محمد جنکلی جیسے امیر عالم باعمل شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے خاندانی عقیدت مند بھی شریک ہیں پس بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت نکالنے کا مطالبہ شیخ اسکندرانی کی طرف سے جو کیا گیا تھا اس مطالبہ کا تعلق یقیناً ان عام نوافل و اوراد ، اور دیگر صوفیانہ مشاغل سے تھا جن کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ صوفیانہ زندگی بسر کرنے والوں کے لیے ان کی پابندی بہر حال ضروری ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ المرشدی کی مشغول زندگی کا جو نقشہ پیش کیا جاتا ہے اس قسم کی اژدھامی زندگی میں ان خاص صوفیانہ مشاغل کے لیے وقت نکالنا ناممکن تھا جن کی پابندی کی توقع عموماً اس طبقہ کے لوگوں سے کی جاتی تھی ، جلوت کی ایسی گرم مجلس میں کھلی ہوئی بات ہے کہ ان اوراد اور اذکار ، مراقبات و محاسبات اشغال وغیرہ کی گنجائش نکل سکتی ہے جن کے لیے تنہائی اور خلوت کی ضرورت ہے ۔ شیخ اسکندرانی کا اپنی اس تنقید سے یقیناً ان ہی امور کی طرف اشارہ تھا جن کی تعبیر انہوں نے ایک عام اجمالی لفظ یعنی "خدا کی یاد" یا ذکر اللہ کے الفاظ سے فرمائی تھی اور جیسے اجمالی رنگ میں ان کا اعتراض تھا ، المرشدی نے بھی اس کا جواب اجمال ہی کے رنگ میں دیا ہے اور گو المرشدی کے جواب کے اس مجمل فقرے کے الفاظ عدداً بظاہر زیادہ ہیں لیکن میرے نزدیک اسی اجمال کی شرح المرشدی کا وہ پر معنی فقرہ ہے جسے خاکسار نے اپنے اس مضمون کی پیشانی پر ثبت کیا تھا یعنی الیافعی کو دیکھ کر المرشدی نے جو فرمایا تھا کہ

ما اراھا الا غزالیہ (صـ ۲۹۳ مرأة) نہیں پاتا ہوں میں اس شخص کو مگر غزالی کے طور پر ،

جیسا کہ میں نے عرض کیا ، ہیں تو یہ چند ہی الفاظ لیکن درحقیقت "اسلامی تصوف" کی ایک طویل تاریخ کا عکس ان ہی الفاظ میں جھانک رہا ہے ۔

شاہ ولی اللہ صاحب کا تائیدی ارشاد

شیخ مرشدی کے ان ارشاد فرمودہ الفاظ کا کیا مطلب ہے ، مناسب ہے کہ اس مطلب کو بجائے میرے

اس راہ کے ایک ماہر بصیر یعنی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے سنیئے اپنی مشہور کتاب "انفاس العارفین" میں شاہ صاحب نے اپنے عم محترم حضرت شیخ ابوالرضا محمد رح کے ایک مکتوب گرامی کو نقل کرنے کے بعد اس خط کے بعض خاص جملوں کی شرح فرمائی ہے اسی سلسلہ میں ارقام فرماتے ہیں۔

بدانکہ صوفیہ در تربیت سالکین دو مذہب دارند، یک مذہب اوائل کہ امام محمد غزالی شرح و بیان او کرد و آں این است کہ چوں کسے از مقتضیات طبیعت توبہ کرد او را می فرمایند کہ در خلوت نشیند و بخلق نیامیزد، و در جمیع حالات مخالفت نفس پیش گیرد خود را چناں سازد کہ از شتم و ضرب نفس او شورش نکند و مدح و ذم مردم ہمہ نزدیک او مساوی شود و نوافل اعمال بسیار کند، و دقائق ریا و عجب و سمعہ و غرور نیک بفہمد و در تفحص آنہا افتد و در لقمہ احتیاط تمام نماید و محل شبہہ فرو نگذارد و در قیام و قعود و اکل و شرب و سائر حالات آداب را لازم گرداند و غیر ذلک و دریں امور استقصا داشتہ تا بجائے کہ از قبیل قضایا شعریہ و خطبیہ اند تمسک می نمایند۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ (اللہ کی راہ) پر چلنے والوں کی تربیت میں صوفیہ کے دو مختلف طریقے ہیں ایک تو اوائل یعنی ان لوگوں کا ہے جو پہلے زمانے میں گزرے ہیں، اور یہی وہ طریقہ ہے جسکی تشریح و تفصیل امام غزالی رح نے فرمائی ہے حاصل اس طریقہ کا یہ ہے کہ طبیعت کے عام اقتضا اور خواہشوں سے جب آدمی توبہ کرتا ہے تو اس کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ خلوت میں بیٹھے اور عام مخلوق سے ملنا جلنا چھوڑ دے اور ہر حال میں نفس کی مخالفت کو اپنا وتیرہ بنائے اور اپنے آپ کو ایسا بنائے کہ گالی گفتہ، مار پیٹ سے اس کے نفس میں کسی قسم کی شورش پیدا نہ ہو اور لوگ تعریف کریں یا مذمت دونوں باتیں اس کے لیے برابر ہو جائیں نیز نفلی عبادتوں میں زیادہ مشغول رہے اور ریا و فخر و غرور وغیرہ کی باریک باتوں کو خوب سمجھتا ہو، ہمیشہ ان کی جستجو اور تلاش میں رہے اور لقمہ میں احتیاط کی راہ اختیار کرے اور شبہہ کے لقمہ کو چھوڑ دے اسی طرح نشست و برخاست، خورد و نوش میں مقررہ طریقوں کا پابند بن جائے۔ امام غزالی رح

نے ان امور کی نفی و اثبات میں زیادہ تر شاعرانہ
مقدمات جن سے وعظ گوئی میں کام لیا جاتا
ہے ان ہی کو پیش کیا ہے۔

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ جب ان منزلوں کو طے کر لیا جاتا ہے تب

چوں از ہمہ پاک شد بمحبت خدا تعالیٰ راہ می دہند۔ — جب سالک ان منزلوں سے گزر جاتا ہے تب اللہ تعالیٰ کی محبت کی راہ پر سالک کو ڈال دیتے ہیں۔

تربیت کے اس اصول کی تفصیل امام حجۃ الاسلام نے اپنی جن کتابوں میں فرمائی ہے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

چنانکہ بہ تفصیل در احیاء و کیمیا مبیّن ست۔ (انفاس ص ۱۴۲) — جیسا کہ احیاء العلوم اور کیمیاء سعادت میں امام غزالیؒ نے اس طریقہ کی تفصیل کی ہے۔

سچ پوچھئے تو تربیت کے اس خاص طریقہ کو "طریقۂ غزالیہ" کے نام سے المرشدی نے جو موسوم کیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ، اس طریقہ کے سلوک کی جتنی تفصیل اور جتنے دل نشین پیرائے میں اس کی تعبیر امام حجۃ الاسلام نے اپنی مذکورہ بالا کتابوں یا ان کے سوا دوسرے چھوٹے بڑے رسالوں میں فرمائی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ان کی کتابیں مروج ہو گئیں اور آئندہ تصوف کی اس راہ کے بزرگوں نے جو کچھ بھی لکھا امام غزالی کی ان ہی کتابوں کو سامنے رکھ کر لکھا، ورنہ بقول شاہ ولی اللہؒ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جو امام غزالی سے بہت پہلے گزر چکے ہیں[1]۔

---

[1] چنانچہ احیاء العلوم میں خود حجۃ الاسلام نے بھی یہ ارقام فرمانے کے بعد کہ

لقد صنف الناس فی بعض ھذہ المعانی کتبا (احیاء ص ۳ ج ۱) — ان مسائل کے متعلق جن کا میں اپنی کتاب (احیاء العلوم) میں ذکر کر چکا ہوں لوگ کتابیں لکھ چکے ہیں۔

اپنے کام کی خصوصیتوں کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے

ولکن یتمیز ھذا الکتاب عنھا بخمسۃ امور الاول حل ما عقدوہ — پہلے لوگوں کی تصنیف کردہ کتابوں میں اور میری اس

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وکشف ما اجملوہ والثانی ترتیب ما بددوہ ونظم ما فرقوہ الثالث ایجاز ما طولوہ وضبط ما قرروہ الرابع حذف ما کررّوہ واثبات ما حررّوہ الخامس تحقیق امور غامضة اغتاضت علی الافہام لم یتعرض لہا فی الکتب اصلاً۔ (ص ۴)

کتاب میں صرف پانچ باتوں کا فرق ہے یعنی ان کے کلام میں جو مضامین پیچیدہ تھے ان کو میں نے حل کر دیا ہے، جو چیزیں اجمالاً بیان کی گئی ہیں میں نے ان کی تفصیل کی ہے یا غیر ضروری تفصیل جن مسائل کے بیان کرنے میں ان لوگوں نے اختیار کی ہے میں نے ان کو مختصر کر کے بیان کیا ہے اسی طرح جن اصولی باتوں کا پتہ ان کی کتابوں سے چلتا ہے میں نے ان کو منضبط کر دیا ہے اور بار بار دُہرا کر جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کو میں نے حذف کر دیا ہے اور جو فیصلے انہوں نے کیے ہیں ان کو میں نے اور مضبوط کر دیا ہے اور ان چار باتوں کے سوا پانچواں کام میں نے یہ کیا ہے کہ بعض مشکل باتیں جن کا سمجھنا لوگوں کے لیے دشوار تھا اور ان کتابوں میں ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا میں نے ان کی بھی تحقیق کی ہے۔

اپنی کتاب کی ان پانچ خصوصیتوں کو گنوانے کے بعد امام غزالیؒ آخر میں فرماتے ہیں کہ

فہذہ خواص ہذا الکتاب مع کونہ حاویا لجامع ہذا العلوم۔ (ص ۴)

یہ ہیں میری کتاب کی خصوصیتیں ان خصوصیتوں کے سوا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ (صوفیہ کے علوم) پر میری یہ کتاب حاوی ہے

جس کے معنی یہی ہوئے کہ ان کی کتاب احیاء العلوم، سلوک و تربیت کے اس خاص طریقہ کی گویا انسائکلوپیڈیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ترتیب و تہذیب، احتواء و اختصار کے اس کام کو امام حجۃ الاسلام کے قلم سے زیادہ بہتر طریقہ پر مشکل ہی سے کوئی دوسرا انجام دے سکتا تھا، انتخاب طبعی کے عام قانون کے تحت امام کی کتاب نے اس سلسلہ کی دوسری کتابوں کو میدان سے ہٹا دیا۔ تقریباً آٹھ ساڑھے آٹھ صدیوں سے اسلامی دنیا امام کی ان کتابوں کے مطالعہ میں مشغول و منہمک ہے۔

"طریقۂ غزالیہ پر علامہ ابن جوزی کی سخت تنقید"

جس صدی کی تعبیر امام غزالی کی صدی سے میں کرتا چلا آرہا ہوں اسی صدی کے اختتام سے پہلے ہی تصوف کے خلاف شدید قسم کا ردعمل علامہ ابن جوزی یا ابن عقیل[1] وغیرہ علماء کی طرف سے جو رونما ہوا جس کی زندہ شہادت ابن جوزی کی مشہور "تلبیس ابلیس" ہو سکتی ہے، بظاہر اس کتاب میں اگرچہ ابن جوزی نے ہر اس چیز کی غلطیوں پر مسلمانوں کو متنبہ کرنے کا دعویٰ کیا ہے جو صحیح اسلامی دین میں ان کے خیال کے مطابق شریک ہوگئی تھیں اس کتاب میں مسلمانوں کے گمراہ فرقے معتزلہ خوارج باطنیہ، سب ہی کے عقائد و مسلمات کی انہوں نے تنقید کی ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے حقیقی نشانہ ان کا وہی تصوف نظر آتا ہے جس کا چرچا امام غزالی کے بعد مسلمانوں میں پھیلا ہوا تھا جس کی سب سے زیادہ کھلی دلیل یہ ہے کہ کتاب تقریباً دو ثلث حصہ صوفیاء اور تصوف ہی کے نذر ہو گیا ہے جتنا جوش و خروش کتاب کے ان اجزاء میں نظر آتا ہے دوسرے مباحث میں اتنی تندی اور تیزی ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی، اور کتاب تو کتاب ابن جوزی تو ان بزرگوں میں ہیں جنہوں نے سرخیل صوفیاء سیدنا الشیخ عبدالقادر الجیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابلہ میں وہ سب کچھ کیا اور وہ سب کچھ کہا جس کا سننا بھی شائد آج کل مسلمانوں کی عام جماعت برداشت نہیں کر سکتی۔[2]

---

[1] علمائے اسلام کی تاریخ میں ابن عقیل کا شمار عجائبات میں کیا جا سکتا ہے ابن جوزی جو ابن عقیل کے تلمیذ رشید ہیں ان کا بیان ہے کہ دو سو جلدوں میں ابن عقیل نے وہ کتاب لکھی ہے جس میں مختلف علوم و فنون کے مسائل سے انہوں نے بحث کی ہے بعضوں کا بیان ہے کہ یہ کتاب آٹھ سو جلدوں میں تھی واللہ اعلم یہ ان کی دوسری تصنیفات کے سوا ہے گویا تنہا انسائیکلو پیڈیا کے مصنف تھے۔ (دیکھو شذرات ص ۳۵ ج ۴ -)

[2] **علامہ ابن جوزیؒ** یہ عجیب بات ہے کہ سیدنا الامام الجیلی اور ابن جوزی دونوں ہی حنبلی ہیں، لیکن بایں ہمہ فضل و کمال ابن جوزی نے حضرت کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا اسلام کی علمی تاریخ کا کم از کم میرے نزدیک بڑا ناخوشگوار حصہ ہے، ایک طرف ہم ابن جوزی کی کتابوں کو پڑھتے ہیں تو ان کی تحقیق و جستجو، دقیقہ سنجی کی داد دینی پڑتی ہے مشکل ہی سے کوئی اسلامی حق ہوگا جس میں ان کی طویل یا مختصر کتاب نہ ہو۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بہ ظاہر کچھ ان ہی باتوں کا غالباً نتیجہ ہے کہ ابن جوزی اور ان جیسے علماء کے شدید حملوں سے تصوف کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہو رہی تھیں ان کے ازالہ کی طرف ان بزرگوں کو خاص توجہ مبذول کرنی پڑی جن کا اسلام کے رسمی اور ظاہری علوم میں پایہ بھی بہت نمایاں طور پر بلند تھا، اور اسی کے ساتھ تصوف اور صوفیہ کی راہوں کے عملی تجربات سے بھی سرفراز تھے، اور اس راہ کے صحیح حقائق و واقعات سے ابن جوزی وغیرہ علماء کی طرح بیگانہ نہ تھے یا خواہ مخواہ بیگانہ بننے کی روش انہوں نے نہیں اختیار کی تھی،

طریقۂ غزالیہ کے مقابل شیخ اکبرؒ کی توضیحات

نہیں کہا جا سکتا کہ تحریری طور پر اس سلسلہ میں کن کن بزرگوں نے کیا کچھ لکھا ہے تاہم اپنی محدود رسائی کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سب سے زیادہ واضح، شستہ، صاف اور کھرا بیان ابن جوزی کے بعد لوگوں میں جو ملا ہے وہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔ شیخ ابن عربی پیدا تو ابن جوزی کے زمانے ہی میں ہو چکے تھے۔ یعنی ۵۶۰ھ ہجری آپ کا سنہ ولادت ہے لیکن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لوگوں کا بیان ہے کہ روزانہ چار کراریس (تختے) لکھنے کا ابن جوزی نے التزام کر رکھا تھا، سال بھر میں پچاس سے ساٹھ جلدوں تک ان کی تصنیف پہنچ جاتی تھی، یہ لطیفہ بھی ان کے سوانح نگاروں نے بیان کیا ہے کہ اپنی میت کے غسل کے لیے وصیت کی تھی کہ قلامہ (یعنی قلم تراشوں) کا جو ذخیرہ عمر بھر انہوں نے جمع کیا ہے اسی سے پانی گرم کیا جائے وہ بڑے زبردست خطیب تھے خود ان کا بیان ہے کہ ایک لاکھ آدمیوں نے ان کے مواعظ سے متاثر ہو کر ان کے ہاتھ پر توبہ کی بلکہ یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ تقریباً ایک لاکھ ہی آدمی ان کی تقریروں کو سن کر مشرف باسلام ہوئے۔ (دیکھو ان کی کتاب المنتظم) مگر بایں ہمہ ان کے ہم مشرب ابن عماد حنبلی نے شذور میں لکھا ہے کہ سیدنا الشیخ الجیلی کے صاحبزادے شیخ عبدالوہاب سے ان کا مدرسہ ابن جوزی نے چھین لیا۔ یہ وہی مدرسہ تھا جس میں خود حضرت غوث پاک درس دیتے تھے مگر آخر میں حکومت نے ابن جوزی سے اس مدرسہ کی تولیت واپس لی اور شیخ عبدالوہاب کے سپرد کر کے حقدار تک حق کو پہنچا دیا ابن جوزی کے حالات میں لوگوں نے یہ دلچسپ بات لکھی ہے کہ کم سن نوجوان عورتوں سے نکاح کرنے کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ ایک دفعہ بھلاوا استعمال کیا جس کی وجہ سے ان کی ڈاڑھی کے بال جھڑ گئے تھے خضاب سے ہمیشہ ان کو سیاہ رکھتے بیاہ خضاب کے جواز پر ایک مستقل رسالہ بھی ابن جوزی نے لکھا ہے۔ (دیکھو شذور ص۳۲ ج ۴)
ابن جوزی کی وفات ۵۹۷ھ میں ہوئی یعنی غزالی کی وفات کے ۹۲ سال بعد

جہاں تک میرا خیال ہے تحریری طور پر اپنے خیالات کے قلم بند کرنے کا موقعہ آپ کو ابن جوزی کی وفات کے بعد ملا ہے[1]۔ شیخ اکبر ابن عربی کے سوانح نگاروں کا یہ بیان کہ

اجازہ جماعۃ منہم الحافظ السلفی وابن عساکر وابو الفرج ابن الجوزی (صلا مقدمہ فتوحات بحوالہ مقری)

یعنی حافظ سلفی اور ابن عساکر اور ابو الفرج ابن جوزی بھی ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے شیخ محی الدین ابن عربی کو اجازت دی

تفصیلات سے قطع نظر کر کے مختصراً یہ سمجھنا چاہئیے کہ شیخ اکبر کا شمار ان اکابر اسلام میں ہے جن کے متعلق علمی حیثیت سے تو یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ

ھو اعرف بکل فن اھلہ۔ (شذورص۱۹۰ ج۔ ۵)

یعنی ہر وہ فن جس کا شیخ کے زمانہ میں رواج تھا خواہ وہ دینی ہو یا عقلی، شیخ ابن عربی اس فن کے خصوصی ماہرین سے زیادہ اس علم

---

[1] بجائے خود یہ ایک مستقل مضمون ہے۔ تفصیلات کے لیے دعا فرمائیے کہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کے علوم اور ان کے حالات پر عنفوان شباب سے ایک کتاب ہی کے لکھنے کی نیت کر چکا ہوں لیکن خدا ہی جانتا ہے اس پرانی آرزو کی تکمیل کا موقع ملتا بھی ہے یا نہیں۔ (افسوس کہ یہ نخل تمنا بارآور نہ ہو سکا۔ (ز ع م)) شیخ اکبر رضی اللہ عنہ جیسا کہ معلوم ہے خاص اندلس (یورپ) ہی سے وطنی تعلق رکھتے تھے اندلس کے مشرقی ساحل پر اب بھی مرسیہ نامی شہر پایا جاتا ہے جو خاص مسلمانوں کا آباد کیا ہوا شہر ہے۔ عربوں نے صحرائے عرب کی مشہور واحہ جاتی تدمیر کے نام پر اس یورپین شہر کا نام بھی تدمیر ہی رکھا تھا لیکن چلا نہیں۔ مرسیہ ہی کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ علاقہ اندلس کا باغ سمجھا جاتا تھا شیخ رحمۃ اللہ علیہ جس زمانہ میں پیدا ہوئے یہی وہ وقت ہے جب مسلمانوں کی سیاسی قوت کا یہ انتشار عیسائیوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ بے حمیت امراء اندلس کی عیسائی حکومتوں کو سالانہ خراج ادا کرتے تھے ان ہی میں مرسیہ کا نواب مرذنیش بھی تھا۔ شیخ اسی خاندان کے عہد حکومت میں مرسیہ کے ایک علمی گھرانے میں۔ رونق افروز ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اشبیلیہ اندلس کے مغربی علاقے میں چلے گئے وہاں کے تعلیمی مرکزوں سے مستفید ہوتے رہے اندلس سے مسلمان اس زمانے میں مسلسل ہجرت کر کر کے افریقہ اور ایشیا یعنی مشرقی ممالک کی اسلامی حکومتوں میں پناہ لے رہے تھے۔ شیخ نے بارادۂ حج اندلس کو خیرباد کیا۔ اور مشرقی ممالک ہی میں گھومتے رہے تا اینکہ دمشق میں وفات ہوئی ۱۲۔

کے مسائل سے واقف تھے۔

جس نے شیخ کی کتاب فتوحات مکیہ کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ کیا ہے وہ ان کے خصوصی نظریات سے اتفاق کرتا ہو، یا نہ کرتا ہو لیکن اہل علم کے مذکورہ بالا فیصلہ کے اعتراف پر جہاں تک میرا خیال ہے اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔

باقی تصوف اور صوفیت سو اس کے متعلق کہنے کی کیا ضرورت ہے شیخ کی نیک نامی ہو یا بدنامی اسی تصوف اور صوفیت ہی کے تعلق کے ساتھ وابستہ ہے اس میدان کے مرد یکہ و تازہ وہ ان میں بھی سمجھے جاتے ہیں جو تصوف اور صوفیت کو اسلامی دین کے دائرے کی چیز نہیں سمجھتے۔ باقی خود صوفیوں کے مختلف طبقات میں نہیں جانتا کہ شیخ کی جلالت قدر کے متعلق ان میں کسی قسم کا اختلاف پایا جاتا ہے علاؤالدولہ سمنانی یا حضرت مجدد الف ثانی نے اگرچہ شیخ کے بعض خصوصی نظریات بلکہ کہیے تو کہہ سکتے ہیں، ان کی بعض تعبیروں پر تنقید ضرور کی ہے[1]۔ لیکن ان کے اخلاص و صداقت، للہیت پر ان بزرگوں نے بھی اتفاق ہی کی مہر ثبت فرمائی ہے۔ "منکر او درخطر ست" (یعنی شیخ اکبر کی بزرگی یا ولایت کا انکار کرنے والا خطرہ میں ہے) حضرت مجدد کا مشہور فقرہ ہے اور کچھ یہی کیفیت شیخ علاؤالدولہ سمنانی کی بھی ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

شیخ اکبر کے نزدیک رجال اللہ کی سہ گانہ تقسیم

بہرحال کہنا یہ ہے کہ تصوف یا "صوفیانہ زندگی" طریقۂ غزالیہ کے ساتھ مختص نہیں ہے اس مضمون کو شیخ اکبر نے اگرچہ فتوحات میں مختلف مقامات میں مختلف پیرایہ میں میں ادا کیا ہے، لیکن اسی کتاب کی تیسری جلد کے باب ۳۰۹ میں "رجال اللہ" یا "مردان خدا" کی تقسیم کرتے ہوئے شیخ نے اس سلسلہ میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس نے "حقیقت" کو قطعاً بے نقاب کر دیا ہے اصل عربی عبارت کو درج کر کے ترجمہ کرنے میں چونکہ طوالت ہوگی۔ اس لیے ان لوگوں کو جو شیخ کے اصل کلام سے واقف ہونا چاہتے ہیں چاہیئے کہ اصل کتاب کا مطالعہ فرمالیں۔ میں اپنے الفاظ میں شیخ کے کلام کا ترجمہ پیش کرتا ہوں، یہ فرما کر کہ

---

[1] شیخ اکبر پر کیے ہوئے ان اعتراضات کے جواب کے لیے ملاحظہ ہو "التنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی" از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی۔ (غ۔م)

ان رجال اللہ ثلاثۃ لا رابع لھم۔ — مردان خدا کی تین ہی قسمیں ہیں کوئی چوتھی قسم ان کے سوا نہیں ہے،

ارقام فرماتے ہیں،

(۱) **العبّاد**

" ایک قسم تو ان لوگوں کی ہے جن پر زہد (ترک دنیا) اور دنیاوی لذائذ سے علیحدگی کا جذبہ غالب ہو جاتا ہے، سارے اچھے کام جن کی ظاہر شریعت میں تعریف کی گئی ہے ان کی تعمیل کرتے ہیں، اسی طرح اپنے باطن کو بھی ان صفات سے پاک رکھتے ہیں جن کی شارع علیہ السلام نے مذمت کی ہے۔"

شیخ نے اسی کے بعد لکھا ہے کہ

" اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ لے دے کر دین کا مطالبہ بس اسی قدر ہے جس کے وہ پابند ہیں، اس کے سوا، احوال و مقامات اور وہبی و لدنی علوم سے ان کو کسی قسم کا لگاؤ نہیں ہوتا کشفی اسرار و رموز یا اسی قسم کی دوسری چیزیں جن سے اس راہ کے دوسرے لوگ سرفراز ہیں ان سے وہ نا آشنا ہوتے ہیں۔"

" رجال اللہ" کے اس طبقہ کا نام شیخ نے " العبّاد" (یعنی عبادت گزاروں کی جماعت) رکھا ہے لکھا ہے کہ ان لوگوں کی پہچان یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی جب یہ پیش کرتا ہے کہ آپ میرے لیے دعا کیجئے تو اس کو جھڑک دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

" بھائی! میری کیا حقیقت اور میں کون ہوں جو آپ کے لیے دعا کروں میرا مقام ہی کیا ہے۔"

لکھا ہے کہ غرور نفس، یا ریاء وغیرہ سے بچنے کے لیے وہ یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں، شیخ اکبر نے آخر میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ مطالعہ کے لیے اس قسم کے لوگ ایسی کتابوں کو پسند کرتے ہیں جیسے حارث محاسبی کی کتاب " الرعایۃ" ہے۔

۲ **اہلِ خُلق و فتوت** — رجال اللہ کی اس پہلی قسم کے بعد دوسری قسم کے متعلق یہ فرماتے

ہوئے کہ نسبتاً پہلی قسم سے ان لوگوں کا درجہ بلند ہے، تعریف اس طبقہ کی ان الفاظ میں فرماتے ہیں :-

" ان لوگوں کی نظر میں کائنات کی ساری کارفرمائیاں براہ راست ذات حق کے ساتھ وابستہ ہیں، سارے افعال کو وہ اللہ ہی کے لیے سمجھتے ہیں اور یہ پاتے ہیں کہ خود ان کو ان کارفرمائیوں میں کسی قسم کا کوئی دخل نہیں ہے"

فعلی توحید کے اس رسوخ کا نتیجہ جیسا کہ شیخ نے لکھا ہے یہ ہوتا ہے کہ

" ریاء یا دکھاوے کا سوال ہی سرے سے ان کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے۔"

یہ بھی لکھا ہے کہ

" اس راہ کے چلنے والوں کو جن چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے جب اس طبقہ کے لوگوں سے کوئی ان امور کے متعلق دریافت کرتا ہے تو ڈانٹتے ہوئے اس کے آگے قرآن کی آیتیں مثلاً اغیر اللہ تدعون (کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو) یہ یا قل اللہ ثم ذرھم (بس بول اللہ اور چھوڑ ان لوگوں کو) پڑھ کر چپ ہو جاتے ہیں۔"

شیخ کا بیان ہے کہ

ریاضت و مجاہدہ، کد و کاش، تقویٰ اور پارسائی، زہد و توکل وغیرہ جیسی باتوں میں یہ لوگ بھی وہی سب کچھ کرتے ہیں جو پہلی قسم والے جن میں مشغول رہتے ہیں۔

البتہ ان میں اور رجال اللہ کی پہلی قسم (العباد) کے درمیان فرق یہ ہوتا ہے کہ

" صرف ان ہی باتوں کو وہ آخری منزل نہیں سمجھتے، بلکہ یقین کرتے ہیں کہ جس حال میں وہ ہیں اس سے پرے بھی احوال و مقامات، علوم و اسرار کشف و کرامات جیسی چیزیں ہیں۔"

شیخ فرماتے ہیں کہ

اپنے اسی احساس کے تحت وہ ان امور کے حصول کی کوشش میں مشغول رہتے ہیں اور اپنی ہمتوں کو ان باتوں کے ساتھ متعلق کرتے

ہیں اور کوئی قسط ان امور کی ان کو میسر آجاتی ہے تو بطور کرامات کے ان
کے ظاہر کرنے سے بھی وہ نہیں ہچکچاتے کیوں کہ کارفرما ان کی نظر میں اللہ
کے سوا کوئی دوسرا باقی ہی نہیں رہتا۔

شیخ نے لکھا ہے کہ ان لوگوں کو اصطلاحاً "اہل خلق وفتوت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے،
یعنی بلند اخلاق اور جوان مردانہ ہمت والے لوگ ہیں۔ عام طور پر جیسا کہ شیخ کا بیان ہے لوگ "صوفیہ"
کے نام سے بھی ان ہی کو پکارتے ہیں، لیکن واقعہ میں بھی کیا "صوفیہ" جو "رجال اللہ" یا مردان خدا
ہی کی دوسری تعبیر ہے وہ اسی گروہ کی حد تک محدود ہیں، سنیئے! شیخ فرماتے ہیں اور اسی کا پیش کرنا میرا
مقصود ہے۔

(۳) ملامتیہ[1] تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو نماز پنجگانہ کے فرائض اور مقررہ
سنتوں پر مزید نمازوں کا اضافہ نہیں کرتے اور شریعت کے
مفروضہ مطالبات کی تعمیل کرنے والے عام مسلمانوں سے کسی قسم کا امتیاز
اپنی زندگی میں پیدا ہونے نہیں دیتے یعنی ایسا امتیاز جو دوسروں سے گونہ ان
کو جدا کردے اس کو وہ پسند نہیں کرتے وہ بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں اور
عام لوگوں سے بات چیت بھی کرتے ہیں الغرض دیکھنے والے ان کی زندگی
میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتے جو عوام الناس سے ان کو امتیاز عطا کرسکتی ہو
پس جن فرائض اور سنن کی عوام الناس عموماً پابندی کرتے ہیں ان سے زیادہ
بظاہر ان کے اندر اور کچھ نظر نہیں آتا۔[2]

---

[1] "ملامتیہ" سے مراد شیخ اکبر کی نگاہ میں وہ گروہ ہے جو اپنی دینی زندگی کو عوام کی نظر امتیاز سے بچائے رکھتا ہے اور سب میں ملا جلا رہتا ہے، شیخ کے ہاں "ملامتیہ" کا وہ مفہوم نہیں جو بعد کو پیدا ہوگیا کہ ہر دینی مطالبہ مثلاً نماز روزہ اور شرعی وضع قطع کو چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا دم بھرا جائے یہ تو صریح زندقہ ہے، اللہ بچائے! (غ۔م)

[2] دوسری جگہ اسی گروہ کا ذکر کرتے ہوئے شیخ نے لکھا ہے کہ ان میں حسب ذیل خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) مسجد میں عجلت کی نماز پڑھنی (۲) جس ملک میں جس شہر میں جائیں گے وہاں کے عام لوگوں کا لباس اختیار کریں گے (۳) مسجد میں اپنے
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ان چند منفی اور سلبی صفات کے بعد شیخ نے رجال اللہ کے اس طبقہ کے ایجابی خصوصیات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

بات تاکہ بہ سہولت ذہن نشین ہو سکے اور گرفت میں آجائے شیخ کے بیان کردہ ایجابی صفات کا الگ الگ نمبروں میں مطالعہ مناسب ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس طبقہ میں حسب ذیل ثبوتی کمالات پائے جاتے ہیں۔

(۱) اللہ کے ساتھ ایک ایسا ناقابل شکست گہرا ربط ان کے قلوب پیدا کر لیتے ہیں کہ حق کے ساتھ بندگی اور عبودیت کا تعلق پل بھر کے لیے بھی آگاہی سے اوجھل اور غائب نہیں ہو پاتا۔

(۲) حق تعالیٰ کی پروردگاری اور ربوبیت و آقائیت کا ذ[illegible] ان کے قلوب میں کچھ اتنا راسخ اور جاگزیں ہو جاتا ہے کہ کسی قسم کی سر[illegible]ی اور برتری کی خواہش کا کوئی شائبہ ان کے اندر باقی نہیں رہتا۔

(۳) ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ہر مقام اور ہر جگہ کے صحیح اقتضاء کا علم ان کو بخشا جاتا ہے اور اس علم کے مطابق جس عمل اور جس حال کی ضرورت ہوتی ہے اس کی توفیق بھی ان کو میسر ہوتی ہے۔ (اس جزء کی تفصیل شیخ نے آگے کی ہے)

(۴) عام انسانی عادات اور عوام کے طرز بود و باش کی چادر اوڑھ کر اپنے آپ کو مخلوق کی نگاہوں سے یہ چھپائے رکھتے ہیں مگر درحقیقت اپنے آقا اور مالک کے یہ راستباز و وفادار بندے ہوتے ہیں، (ان میں خاص قسم کی بیداری پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے) کھانے پینے، سونے جاگنے، لوگوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لیے کوئی خاص جگہ مقرر نہیں کرتے (۴) جمعہ کی نماز کسی خاص مسجد میں ادا نہیں کرتے (۵) ہر چھوٹے بڑے بیوہ غریب کی ضرورتوں کی تکمیل کی کوشش کرتے ہیں۔ (۶) بیوی بچوں کے ساتھ ہنستے بولتے کھیلتے ہیں یعنی جن باتوں کو خدا پسند کرتا ہے۔ (۷) جہاں کے لوگ واقف ہو جاتے ہیں وہاں سے چل نکلتے ہیں، (ص ۲۳۶ ج ا فتوحات)

سے بات چیت کرنے ، الغرض ہر حال اور ہر وقت میں اپنے مالک پر ان
کی نگاہ جمی رہتی ہے مشاہدے کی یہ کیفیت دواماً ان پر طاری رہتی ہے۔

اطلاقی تصوّف کا طریق

ہر سبب کی حکمت کو پانا پھر تیسرے جز کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قدرت نے جس چیز کا سبب جس شے کو مقرر کر دیا ہے اس سبب کو ٹھیک اپنے مقام پر رکھتے ہوئے اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اسباب کا طویل وعریض نظام جو قائم کیا گیا ہے ان کی حکمتوں کی قدر وقیمت کو وہ خوب پہچانتے ہیں شیخ نے اس مقام پر بھی اور فتوحات ہی میں بیسوں جگہ اس مسئلہ کا تعلق ذکر کیا ہے، دوسری جلد کے باب۲ میں " رجال اللہ" کے اسی طبقہ کے خصوصیات کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> یہ دانشمندوں اور حکماء کا گروہ ہے جو ہر چیز کو ٹھیک اس کے قدرتی مقام پر رکھتا ہے اور اسی پر اپنی توبہ کا سارا زور ختم کر دیتا ہے پھر وہ لوگ جو اسباب کے متعلق یہ مسلک رکھتے ہیں کہ قدرت نے جہاں پر ان کو جما دیا ہے وہاں ان کا اثبات کیا جائے اور جن مقامات میں (خواہ مخواہ وہمی اسباب لوگوں نے تراش لیے ہیں) وہاں ان کی نفی کی جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قدرت نے جس چیز کو نظم عالم میں جگہ دی ہے اور جو ترتیب اسباب میں حق تعالیٰ نے قائم کی ہے اس میں خلل اندازی سے وہ پرہیز کرتے ہیں، جن اسباب کا دنیا کی موجودہ زندگی سے تعلق ہے ان کے اقتضاء کو اس زندگی میں وہ پورا کرتے ہیں اور آئندہ اخروی زندگی کے نتائج کو جن اسباب کے ساتھ قدرت نے وابستہ کیا ہے ان کے اقتضاء کی تکمیل بھی آئندہ زندگی کے نتائج کے لیے کرتے ہیں، الغرض خالق کائنات جس نظر سے اپنے مرتب کردہ نظام کو ملاحظہ فرما رہا ہے اسی کی پوری پوری پیروی یہ لوگ کرتے ہیں، واقعات

اور حقائق اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے خالق نے ان کو دیکھا ان میں
گڑبڑ اور غلط مبحث نہیں پیدا کرتے۔

سبب کی نفی نہ کرنا

شیخ نے جیسا کہ ان کا طریقہ ہے اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے آخر میں فرمایا کہ

فانہ من رفع السبب عن الموضع الذی وضعہ فیہ واضعہ وھو الحق فقد سفہ واضعہ وجہل قدرہ (فتوحات ص۲۱ ج ۲)

سبب کو رکھنے والے نے جس مقام پر قائم کیا ہے یعنی حق تعالیٰ نے جس چیز کی پیدائش کا سبب جس شئے کو قرار دیا ہے جو اس مقام سے سبب کی نفی کرتا ہے یوں سمجھنا چاہیئے کہ وہ خدا کی حکمت کو داغ دار بنا رہا ہے اور حق تعالیٰ کی عظمت کی قدر سے جاہل ہے۔

مگر سبب پر تکیہ نہ کرنا

آپ دیکھ رہے ہیں "اسباب" کی اہمیت میں بدترین قسم کی عقلیت کا مریض کیا اس سے زیادہ استوار و مستحکم نقطۂ نظر اختیار کر سکتا ہے مگر جہاں "مردانِ خدا" یا "رجال اللہ" کا یہ طبقہ "مریضانِ عقل" سے ممتاز ہو جاتا ہے وہ یہ ہے، شیخ نے بڑے بلیغ فقروں میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، لکھتے ہیں کہ

من اعتمد علیہ فقد اشرک والحد والی ارض الطبیعۃ اخلد (فتوحات ص۲۱ ج ۲)

(سبب اور اس کے اقتضاؤں کی تکمیل میں ان نزاکتوں کے ساتھ کام لینے کے باوجود یہ یاد رکھنا چاہیئے) سبب ہی پر جس نے ٹیک لگا لیا (اور اسی کو سب کچھ سمجھ لیا) وہی مشرک ہو گیا اور الحاد میں جا گرا طبیعت (نیچر) کی زمین کی مٹی پکڑ کر بیٹھ گیا۔

دنیوی امور سے گریز کرنا

پوری تفصیل شیخ کے مسلک کی اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے اس کے لیے موزوں کتاب وہی ہو سکتی ہے جس میں شیخ اکبر کے نظریات

کا تفصیلی جائزہ انشاءاللہ لوگوں کے سامنے پیش ہوگا[1] مگر جہاں ان کی اتنی باتیں آپ سن چکے یہ بھی سن لیجئے یعنی دنیا اور دنیاوی امور سے گریز، اور فرار سے متعلق فتوحات ہی میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

الزھد فی الاشیاء لا یقع الا من الجھل القائم بھذا الزاھد (ص ۳۴۹ ج ۳)	عالم کی چیزوں سے پرہیز، اس کا منشا دراصل اس شخص کا جہل ہے جس نے پرہیز کا یہ شیوہ اختیار کیا ہے یعنی زاہد بن گیا ہے، یہ اس کی جہالت کا نتیجہ ہے۔

کیونکہ یہ ایک عرفانی غلط فہمی ہے | پھر بیچ میں بعض دقیق حقائق پر تنبیہ کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں۔

فدعواہ انہ خرج عن کل ما سوی اللہ جہل محض وانما ذلک انتقال احوال لا یشعر بہا الجھل فیخیل لہ جھلہ ان العالم بمعزلہ عن العالم فیطلب الفرار الیہ فھذا دھی۔	اس قسم کے لوگوں کا یہ دعویٰ کہ ماسوا اللہ سے وہ الگ ہو گئے، یہ محض نادانی اور صرف جہالت ہے (ماسوا اللہ سے علیحدگی) تو صرف حالات کی تبدیلیوں کی تعبیر ہے، مگر اپنی ناواقفیت کی وجہ سے ان کو اس کا شعور نہیں ہوتا وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ عالم حق تعالیٰ سے (گویا) کوئی ٹوٹی ہوئی الگ چیز ہے اسی لیے عالم سے گریز کی راہ وہ اختیار کرتے ہیں، حالانکہ ان کا یہ گریز صرف ایک وہمی بات ہے۔

"فرار الی اللہ" کا قرآنی مفہوم | قرآنی آیت ففروا الی اللہ (بھاگو طرف اللہ کے) کا ذکر اسی کے بعد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کا صحیح مطلب اسی وقت سمجھ میں آئے گا جب آگے کی آیت یعنی:

---

[1] افسوس کہ یہ کام انجام نہ پا سکا اور حضرت مصنف اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ (غ۔م)

ولا تجعلوا مع اللہ الھا اخر — اور مت بناؤ اللہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ (معبود)
کے مفہوم پر غور کیا جائے۔

فلو عرف ھذا التتمہ عرف قولہ ففروا الی اللہ انہ الفرار من الجھل الی العلم — اگر قرآن کے اس تکملہ کو یہ شخص سمجھ لیتا تو جان لیتا کہ اللہ کی طرف بھاگنے کا مطلب یہ ہے کہ جہل سے علم کی طرف بھاگو۔

یعنی اسباب کے متعلق اپنے علم کی آدمی کو چاہیے کہ تصحیح کرے شیخ کے الفاظ میں وہ یہ ہے کہ

الفرار المامور بہ فرار من حیث نسبۃ الالوھیۃ الیہ — حکم جس گریز اور فرار کا دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ الٰہ بنانے میں سب سے بھاگ کر اللہ کی الوہیت میں پناہ لے۔

"شیخ اکبر کے نزدیک اطلاقی تصوّف کے پیرو ہی سب سے برترین ہیں"

بہر حال مقصد جس کا اظہار اس موقع پر مطلوب تھا، غالباً شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اتنی شہادتیں اس کے لیے کافی ہیں انہوں نے " رجال اللہ" کے اس خاص گروہ کا نام جو غالباً ان کی شخصی اصطلاح ہے " ملامتیہ" رکھا ہے۔ شیخ نے اس طبقہ کے مذکورہ بالا سلبی و ایجابی خصوصیات کو درج کرنے کے بعد اپنا خیال یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ

ھم ارفع الرجال وتلامذتھم اکبر الرجال۔ (ص۴۵ ج ۳) — مردان خدا کا یہ طبقہ سب سے زیادہ برتر اور بلند ہے اور ان کے شاگرد و مرید بھی بڑے لوگ ہیں۔

پھر اپنے مذاق کے مطابق ایک لطیف نکتہ اسی سلسلہ میں یہ بھی بیان کرتے ہوئے چلے گئے ہیں کہ

دنیا میں حق تعالیٰ نے عام مخلوقات کی نگاہوں سے جیسے اپنے آپ کو پوشیدہ اور پس پردہ کر لیا ہے اسی طرح رجال اللہ کا یہ طبقہ جو خاصان حق سے ہیں اپنے آقا اور سردار کے ساتھ عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو گئے۔ (یعنی کسی قسم کی امتیازی حیثیت عوام کے مقابلہ میں اپنے اندر

پیدا نہیں ہونے دیتے۔

یہ حال تو زندگی کے موجودہ عبوری دور میں ان لوگوں کا ہوتا ہے مگر

فاذا كان الدار الاخرة وتجلى الحق ظهر هولاء هناك لظهور سيدهم (ص ۴۵)

دوسرے عالم کا جب دور آئے گا اور اس عالم میں حق تعالیٰ تجلی فرمائیں گے (اور لوگوں کے سامنے آجائیں گے) تو رجال اللہ کا یہ گروہ بھی اپنے آقا کے ظہور کی وجہ سے ظاہر ہو جائیگا۔

پھر حسب عادت رجال اللہ کے ان تینوں طبقات کے متعلق مبسوط گفتگو کے بعد آخر میں اسی تیسرے طبقہ کی متعلق پھر تصریح کرتے ہیں۔

فهم الطبقة العلياء وسادات الطريقة المثلى والمكانة الزلفى فى العدوة القصوى لهم اليد البيضا فى علم المواطن واهلها۔

یہی طبقہ سب سے اونچا طبقہ ہے اور معیاری طریقہ کے یہی لوگ پیشوا و سردار ہیں، ان ہی کو قرب کا بلند ترین درجہ حاصل ہے اس دنیا میں بھی اور آئندہ آنے والی زندگی میں بھی یہی لوگ ہر مقام پر "ید بیضا" کے مالک اور اس کے اہل ہیں۔

فتوحات ہی میں ایک اور مقام میں ارقام فرماتے ہیں،

فحبس ظواهرهم فى خيمات العادات والعبادات من الاعمال الظاهرة والمثابرة على الفرائض فيها والنوافل فلا يعرفون بخرق عادة فلا يعظمون ولا يشار اليهم بالصلاح الذى فى عرف العامة (ص ۲۳۵ ج ۱)

پس حق تعالیٰ ان لوگوں کو عام عادتوں کے اور عبادات کے ظاہری اعمال کے خیموں میں چھپائے رکھتا ہے یہ لوگ فرائض و نوافل کی پابندی پر جمے رہتے ہیں اور غیر معمولی اعمال (مثلاً کرامت) وغیرہ کی ان کی شہرت نہیں ہوتی، اسی لیے لوگ ان کی عظمت بھی نہیں کرتے۔ اور عوام کے نزدیک صلاح و نیکی

کا جو معیار ہے اس کو ان کی طرف اشارہ
بھی نہیں کرتے۔

طریق تصوّف کی تلقین مرشد گیلانیؒ کی زبانی

" اطلاقی تصوف" کی تفصیل و تشریح کے بعد پھر بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ حضرت گیلانی کی دعوت اور اس خاص طریق ہدایت کو چند جملوں میں پیش کیا جائے تاکہ بات صاف طور پر ذہن میں اتر سکے اور جو اس راہ پر چلنا چاہیں ان کے لیے چراغ راہ ثابت ہو۔

اس غرض کے لیے ہم کو شیخ گیلانیؒ کا ایک نہایت گرانقدر ہدایت نامہ ہاتھ لگا ہے۔ جو "طریقۂ غزالیہ" کے ایک سالک کے نام لکھا گیا ہے، سالکِ موصوف نے (غالباً اپنے شیخ کے وصال پر) حضرت گیلانیؒ کو اپنے اوراد و وظائف کی تفصیل لکھتے ہوئے مزید اوراد کا مشورہ طلب کیا تھا اور خود ان کی اور بعض اور بزرگوں کی خدمت میں حصولِ فیض کے لیے حاضری کی اجازت چاہی تھی۔

جواب باصواب کے وہ اجزاء جن سے " اطلاقی " طریق تصوف کی تفہیم ہوتی ہے پیش ہیں اور اس کے خاص خاص جملے راقم عاجز نے خط کشید کر دیئے ہیں —— پوری تحریر بہت غور سے اور بار بار پڑھیئے:۔

" اوراد و وظائف کے سلسلہ کو آپ دراز سے دراز تر کرتے چلے جاتے ہیں، اللہ میاں عنتر خوانی سے آدمی کے قابو میں نہیں آتے، اپنے حول و قوّت سے جو خالی ہو کر ان کے قدموں میں گر گیا، وہی اٹھایا جاتا ہے ....
کاش! جن اور بھوت سے آدمی جتنا ڈرتا ہے، اللہ میاں کو اتنا بھی تو اپنے آگے پیچھے، اوپر نیچے جانتا۔

وہ دیکھئے، اپنے سردار، بندوں کو خدا سے ملانے والے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے دیکھئے، اینما تولوا فثم وجہ اللہ (جدھر اپنا رخ موڑ دوگے، خدا کا چہرہ تمہارے سامنے آجائے گا) اپنی آنکھوں سے زیادہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں پر بھروسہ کرنے والے، یونہی جب

جی چاہے خدا کے چہرہ کو اپنے سامنے پاتے ہیں۔ آپ خدا کو پا رہے ہیں، خدا آپ کو دیکھ رہا ہے، ذرا اس کی مشق اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی یافت کے تابع ہو کر کیجیے سب کچھ آپ کو مل جائیگا۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپکا ذکر کسی بادشاہ یا حاکم مجازی نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی مجلس میں ہو، سنیئے آپ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سنا رہے ہیں کہ خدا ان کو یہ اطلاع دے رہا ہے کہ فاذکرونی اذکرکم۔ دل ہی دل میں اللہ میاں کو یاد کرنا شروع کیجیے، آپکا ذکر آپکا مالک کرے گا۔ ہم اُن کو یاد کریں اور وہ ہمیں یاد نہ کریں؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا، جو ایسا خیال کرے وہ مسلمان ہی نہیں!

الغرض ورد و وظیفہ سے زیادہ اپنے علم کی تصحیح کیجیے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم بخشا گیا، اسی علم کے مطابق اپنے علم کو کر لیجیئے، آپ اس کے بعد خدا کے سامنے ہیں اور خدا آپ کے سامنے ہے!

.... ایک تیرتھ گاہ سے فارغ ہو کر دوسری اور دوسری سے تیسری، آخر کہاں تک ہندوؤں کی طرح ٹھوکر کھاتے پھریئے گا[1] محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کو تھام لیجیئے، جو کچھ انھوں نے سکھایا اس کے اس کے سواطے کر لیجیے کہ اس راہ میں اور کسی سے کچھ سیکھنا نہیں ہے، آپ کا سلوک طے ہو گیا خدا آپ کو مل گیا، اب چین کیجیئے، آپ مانگتے چلے جائیں گے وہ دیتا چلا جائے!" [2]

---

[1] جملہ میں ذرا تیزی محسوس ہوگی، مگر یاد رہے کہ یہ مکتوب ہے اور مخاطب ایک خاص سالک طریقت جس کی اصلاح منظور ہے، اس لیے علاج کا مقتضا یہی ہوگا کہ نشتر لگا کر مواد کو نکال پھینکا جائے! (ع م)

[2] "صدق جدید" بابت ۳۰ رمضان ۱۳۷۵ھ م ۱۱ مئی ۱۹۵۶ء۔

ابنِ تیمیّہ کا نظریۂ مخدومیت

فہرست مضامین

ابنِ تیمیہ کا نظریۂ مخدومیت

"مخدوم" کا اصطلاحی مفہوم جیسا کہ ظاہر ہے کہ "مخدوم" لفظ کا ماخذ "خدمت" ہے لفظی ترجمہ تو اس بنیاد پر یہ ہوا کہ وہ شخص جس کی خدمت کی گئی ہو یا جس کی خدمت کی جائے، لیکن اصطلاحاً یہ نام ان لوگوں کو دیا جاتا تھا جن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ کسی "جنّی" کو مسخر کر کے اس سے خدمت لیتے ہیں۔ گویا "مخدوم" سے مراد "مخدوم الجن" ہے، یہ اصطلاح تو اس زمانہ کی عام اصطلاح تھی لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے جن صوفیوں کے ساتھ دل کھول کر اس لفظ کو استعمال کیا ہے اور بے محابا جس شخص کے متعلق جس وقت ان کا جی چاہتا ہے اپنے اس حربے کو چلا دیتے ہیں، علمائے اسلام میں اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے بعد خود ان کے ماننے والوں نے بھی اس لفظ کے دائرے میں اتنی وسعت کو شاید جائز نہیں رکھا، میں ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "النبوات" سے بعض چیزیں اس موقعہ پر نقل کرتا ہوں[1]

---

[1] ابن تیمیہ کی ایک دلچسپ کتاب ہے اور ان کی شیخ الاسلامی کی دلیل ہے بڑے عجیب و غریب معلومات جیسا کہ ان کا دستور ہے اس کتاب میں جمع کر دیئے ہیں، اور اصل کتاب ہی کی بحث کے سلسلہ میں وہ اس مقام پر جب پہنچے ہیں، یعنی خلاف عادت امور اور مظاہر کا صدور جب ساحروں اور کاہنوں وغیرہ سے بھی ہوتا ہے تو معجزہ جو خوارق عادت ہی کا نام ہے اس کو نبوت کی دلیل قرار دینے کی کیا صورت ہو سکتی ہے اسی کے جواب میں حافظ ابن تیمیہ نے صفحات کے صفحات اس کتاب میں رنگ دیئے ہیں، اسی سلسلہ میں سحر و کہانت کے ساتھ ساتھ جنوں کی تسخیر اور اس تسخیر کے آثار و نتائج کے متعلق انہوں نے معلومات بلکہ مشاہدات و تجربات کا ایک ذخیرہ اس کتاب میں اکٹھا کر دیا ہے اس وقت اس مسئلہ سے مجھے سروکار نہیں، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ دوسروں سے شیخ الاسلام کو جو شکایت ہے اس خاص مسئلہ میں یہی شکایت خود مجھے ان سے کرنی پڑتی ہے مطلب یہ ہے کہ قرآن میں اس قسم کے غیر معمولی مظاہر کو پیغمبروں کی طرف

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جنوں کی تسخیر اور حافظ ابن تیمیہ

سب سے دلچسپ چیز اس سلسلہ کی یہ ہے کہ جنوں کے متعلق اس قسم کی باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ جن کے جنات مسخر ہو جاتے ہیں ان کو لے کر وہ ہوا میں اڑتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ منسوب کرتے ہوئے اس میں شک نہیں کہ کبھی ان کی تعبیر "آیات" کے لفظ سے کی گئی ہے اور بعض موقعوں پر "برہان" کے لفظ کا استعمال بھی قرآن نے ان پر کیا ہے، لیکن آیت اور برہان کے الفاظ کا وہ مطلب بیان کرنا جو یونانیوں کی منطق میں "دلیل کی" اصطلاح کا مطلب ہے میں اوروں سے نہیں پوچھتا ہوں خود حافظ سے میرا سوال ہے کہ آپ کس بنیاد پر اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اسی کو مان کر دوسرے تو دوسرے خود حافظ شیخ الاسلام بھی ایسی الجھنوں میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ انتہائی زور صرف کر دینے کے باوجود معجزات اور سحر و کہانت وغیرہ کے آثار میں ایسا فرق جو دوسروں کے لیے قابل تسلیم ہو پیدا نہیں کر سکے ہیں، یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن مختصراً اتنا تو سن ہی لینا چاہیئے کہ نبی یا رسول ظاہر ہے کہ خدا کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں اس قسم کا دعویٰ جن لوگوں کی طرف سے پیش ہوتا ہے قدرتاً ان کے متعلق دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا جو لامحدود قدرت و قوت کا سرچشمہ ہے اس سے تعلق رکھنے والوں سے بھی اس کی توقع ہونی چاہیئے کہ ایسے امور کو وہ دکھائیں کہ جن سے معلوم ہو کہ واقعی لامحدود قدرت و قوت رکھنے والے خدا سے ان کا تعلق ہے یہ ایک عام بات ہے بزرگوں وغیرہ کے متعلق کرامت کا شعوری یا غیر شعوری مطالبہ لوگوں کے جو دلوں میں پیدا ہوتا ہے اس کی بنیاد بھی یہی ہے۔ گویا نبی کی نبوت کے انکار کے سلسلہ میں منکرین کی طرف سے قولاً یا حالاً یہ مطالبہ پیش ہوتا ہے کہ غیر محدود طاقت والے خدا سے اگر تمہارا تعلق ہے تو کوئی چیز ایسی پیش کرو جس سے اس تعلق کی توثیق ہو۔ بالفاظ دیگر جب تک اس قسم کے غیر معمولی امور کا ظہور پیغمبروں کی طرف سے نہیں ہوتا اسی کو انکار کرنے والے ان کی نبوت کے انکار کی دلیل ٹھہرا لیتے ہیں، پھر پیغمبروں کی طرف سے اس قسم کی چیزیں جب ظہور پذیر ہو جاتی ہیں تو ظاہر ہے کہ نبوت کے انکار کی اس دلیل کی تردید ہو جاتی ہے! درپہی معنی برہان کے ہیں کہ جو شبہ نبوت پر ان کی طرف سے پیش کیا گیا تھا اس شبہ کی جڑ کٹ جاتی ہے! اور غیر محدود قوت والے خدا کے ساتھ ان بزرگوں کا جو تعلق ہے، اس تعلق کے لیے ان کے یہ غیر معمولی کارنامے آیات اور نشانیاں بن جاتی ہیں، پس معجزے کا کام اسی حد تک ختم ہو جاتا ہے اب آگے منکرین کی طرف سے دوسرا اقدام ہوتا ہے یعنی ان معجزوں پر سحر و کہانت کا شبہہ تو یہ شبہہ بھی الگ مستقل حیثیت رکھتا ہے جس کا جواب بھی ظاہر ہے کہ الگ مستقل طور پر یہ دیا جانا چاہیے۔ انبیاء و رسل کی زندگی و کردار، سیرت، عادات و اطوار کا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یا کبھی خود کسی سواری کی شکل اختیار کر کے مثلاً گھوڑا بن کے اپنی پیٹھ پر تسخیر کرنے والے کو سوار کر لیتے ہیں۔
الغرض اسی قسم کی باتوں کا ذکر کر کے آخر میں یہ لکھتے ہوئے کہ:۔

والحکایات فی ھذا کثیرۃ معروفۃ عند من یعرف ھذا الباب۔

اس قسم کے قصے بہت سے ہیں جو اس راہ کے جاننے والے ہیں ان میں عام طور پر مشہور ہیں

آگے خود اپنے متعلق بھی دعویٰ کرتے ہیں:۔

ونحن نعرف من ھذا امورا یطول وصفھا۔ (ص ۲۶)

ہم خود ہی اس مسئلہ کے متعلق بہت سی باتیں جانتے ہیں جن کے بیان میں طوالت ہو گی۔

جس سے معلوم ہوتا ہے جنوں کے تسخیر کا روبار سے غالباً شیخ الاسلام بھی کسی قسم کا تعلق رکھتے تھے۔ ایک اور موقع پر جناتی کرشموں کا تذکرہ کرتے ہوئے مثلاً کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوڑے سے آدمی پر مار پڑتی ہے لیکن جنی کوڑوں کی مار کو نادیدہ طریقے سے روک لیتا ہے اس لیے مار کھانے والے پر تکلیف یا اذیت کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

وھذا امر کثیر معروف قد رأینا من ذالک ما یطول وصفہ۔ (ص ۲۶۵)

ایسے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں، عام طور پر مشہور ہیں اور خود ہم نے اس قسم کی چیزیں اتنی دیکھی ہیں کہ ان کی تفصیل باعث تطویل ہو گی۔

صرف یہی نہیں آگے اس پر اضافہ کرتے ہیں:۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ساحروں، کاہنوں، شعبدہ بازوں وغیرہ کی زندگی سے مقابلہ کر کے ہر اندھے کے سامنے دونوں زندگیوں کو الگ الگ کر کے بآسانی دکھایا جا سکتا ہے بہرحال بنیادی غلطی میرے خیال میں متکلمین اسلام سے شروع ہی میں یہ ہو گئی کہ آیات اور برہان کے قرآنی الفاظ کی تعریف میں انہوں نے یونانیوں کی حجت و دلیل کو مان لیا حالانکہ مبحث کی اس سے زیادہ واضح مثال اور کیا ہو سکتی ہے تعجب مجھے شیخ الاسلام سے ہے کہ اپنی اس کتاب میں بھی اور دوسری کتابوں بھی ہر جگہ اس مسئلہ میں خصوصیت کے ساتھ قرآنی الفاظ (آیات و برہان) کی تشریح یونانیوں والی "دلیل وحجت" کی منطقی اصطلاح خاص کو پیش نظر رکھ کر کرتے چلے گئے ہیں حالانکہ دوسرے بیسیوں مسائل میں عام متکلمین پر ان کا یہی اعتراض ہے۔ ۱۲

وقد ضربنا نحن من الشياطين فی الانس ماشاء اللّٰه حتی خرجوا من الانس ولم یعاودوه

ایسی شیطانی روحیں جو آدمیوں میں گھس جاتی ہیں ان کو میں نے خود مارا ہے اور اس آدمی سے شیطانی روح نکل گئی اس طور پر نکلی کہ پھر واپس نہ ہوئی۔

یہ اور اسی قسم کے تصریحات سے بظاہر یہی خیال گزرتا ہے کہ اس راہ کی جن چیزوں کا شیخ الاسلام نے اپنی کتابوں میں تذکرہ کیا ہے وہ محض دوسروں سے سنی سنائی ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو بھی ان معلومات کی فراہمی میں کافی دخل معلوم ہوتا ہے اسی لیے میرے نزدیک ان کے بیانات کی خاص قیمت پیدا ہوگئی ہے شیخ نے متفرق طور پر اس کتاب کے مختلف مقامات میں ان چیزوں کا تذکرہ کیا ہے سب کا دہرانا اور سمیٹنا تو مشکل ہے اور غیر ضروری بھی ہے لیکن بعض امور کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے انہوں نے پہلے تو یہ لکھا ہے کہ جنوں کو مسخر کرنا دنیا کی قوموں کی عادت ہے فرماتے ہیں۔

وخوارق الجن کالاخبار ببعض الامور الغائبة وکالتصرفات الموافقة لاغراض بعض الانس کثیرة معروفة فی جمیع الامم فقد کانت فی العرب کثیرة وکذلك فی الهند وفی الترك والفرس والبربر (ص ۲۶۶)

جنوں کو مسخر کر کے خوارق (یعنی عادت کے خلاف امور) کا ظہور مثلاً پوشیدہ باتوں کی خبر دینا یا آدمیوں کے اغراض کے مطابق تصرفات یہ عام مشہور باتیں ہیں اور بکثرت واقع ہوتی ہیں دنیا کی ساری قوموں میں ان کی شہرت ہے خود عرب میں بھی ان کے آثار بہت زیادہ پائے جاتے تھے اور ہندوستان، ترک، ایران، بربر و افریقہ کے باشندوں میں یہ جانی پہچانی چیزیں ہیں۔

انہوں نے اس سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ مشرکین کے بت خانوں میں بھی جناتی " اثرات ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

تدخل الشیاطین فی الاصنام وتکلم احیانا لبعض الناس

اصنام (یعنی بتوں) میں کبھی شیطانی روح (یعنی شریر جن) داخل ہو جاتے ہیں اور

وتتراآی للسدنة احیانا ولغیرھم ایضا۔ (ص۲۷۰)	بعض لوگوں سے گفتگو بھی کرتے ہیں۔ بتوں کے پنڈتوں اور پجاریوں کو بھی دکھائی دیتے ہیں، کبھی غیروں کو بھی،

پھر انہوں نے "جنات" کے مسخر کرنے کے بعد چند اصول بھی بتائے ہیں مثلاً وہی لکھتے ہیں،

لا یستطیع احد ان یسخر الجن مطلقا لطاعته ولا یستخدم احد منهم الا بمعاوضة اما عمل مذموم تحبه الجن اما قول تخضع له الشیاطین کالاقسام والعزائم (ص۲۶۳)	عام طور پر جنات کو اس طرح قابو میں لے آنا کہ بالکلیہ مسخر کرنے والوں کا وہ تابع ہو جائے یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے جنات ان ہی لوگوں کی خدمت میں جو یا توان کو یا کسی نہ کسی شکل میں کچھ معاوضہ ادا کرتے ہیں خواہ یہ معاوضہ کسی بُرے کام ہی کی شکل[1] میں ہو، جسے جنی پسند کرتا ہو، یا کسی خاص قسم کے قول سے ان کو تابع کیا جاتا ہے، مثلاً قسم دلائی جاتی ہے یا دوسرے عزائم پڑھے جاتے ہیں۔

شیخ الاسلام نے یہ بھی لکھا ہے کہ جیسے انسانوں میں مختلف طبقات ہیں اور نچلا طبقہ اوپر والے طبقہ کے حکم کو مانتا ہے یہی حال جنات میں بھی پایا جاتا ہے، ان کے الفاظ ہیں

کل جنی فوقه من هو اعلی منه	ہر جنی کے اوپر اس سے مرتبہ میں بالاتر جنی بھی ہوتا ہے۔

پس اعلیٰ طبقہ کے جن سے حکم لے کر وہ کہتے ہیں کہ نچلے طبقہ کے جنات کو بھی لوگ اپنا تابع بناتے ہیں، لکھتے ہیں۔

---

[1] میں نے سنا ہے کہ اپنے منہ میں غلاظت رکھ کر بعض ان خبیث روحوں کو تابع بناتے ہیں شاید شیخ الاسلام کا اسی قسم کی باتوں کی طرف اشارہ ہو۔

فقد یخدمون لبعض الناس طاعة لمن فوقهم کما یخدم لبعض الانس لمن امرهم سلطانهم بخدمته الکاتب معه منه وھم کارھون طاعته۔

پس نچلے طبقے والے جنی کسی آدمی کے تابع اس لیے ہو جاتے ہیں کہ اوپر طبقہ والا جنی ان کو اس کا حکم دیتا ہے، ٹھیک اس کی مثال ایسی ہے کہ بعض آدمی دوسرے آدمی کی خدمت اپنے بادشاہوں کے حکم سے کرتے ہیں یعنی شاہی فرمان دیکھ کر جو حکم اسے دیا جاتا ہے اسے بجالاتا ہے اگرچہ دل سے اسے پسند نہ کرتا ہو۔

شیخ الاسلام کا یہ بیان بھی ہے کہ بعض تحتانی طبقہ کے جن اوپر والے طبقہ کے جنی کا خط تو لے لیتے ہیں جس میں اس کو حکم دیا جاتا ہے کہ تم فلاں انسی یعنی آدمی کے حکم کی تعمیل کرو، لیکن

لا یطیعونه وقد یقتلونه او یمرضونه (ص۲۶۳)

جنی باوجود اس کے اس آدمی کا تابع نہیں بنتا بلکہ الٹے اسی کو قتل کر دیتا ہے یا بیمار ڈال دیتا ہے۔

شیخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "جنات" عموماً تاریکی کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ویران مقامات سے ان کو خاص دلچسپی ہوتی ہے یا ایسے مقامات جہاں نجاست اور گندگی رہتی ہو ان کو زیادہ محبوب ہوتے ہیں۔ قرآن میں مِن شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ (یعنی پناہ مانگتا ہوں رات کی تاریکی سے جب چھا جائے) کے جو الفاظ وارد ہیں ان کو نقل کر کے شیخ نے لکھا ہے کہ ایک وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ اس وقت شیاطین الجن زیادہ تر پھیل جاتے انہوں نے شیاطین الجن کے مقامات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

المساجد المهجورة والمشاهد والمقابر والحمامات۔ (ص۲۶۵)

غیر آباد مسجدوں یا زیارت گاہوں مقبروں اور حماموں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اور یہ حال تو شیاطین الجن کا تھا یعنی جنوں میں جو شریر اور بدمعاش افراد ہوتے ہیں لیکن عمومی طور پر نوع جنی میں سب کی حالت یہی نہیں ہوتی بلکہ شیخ الاسلام کا دعویٰ ہے جسے انہوں نے مختلف الفاظ میں دہرایا ہے کہ عقائد و اعمال کے لحاظ سے جتنی قسمیں آدمیوں میں پائی جاتی ہیں تقریباً یہی حال جنوں

کا بھی ہے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان رسالت کے بعد جیسے انسانوں میں مختلف طبقات پیدا ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بعینہٖ یہی صورت جنوں میں بھی پیش آئی اسی بنیاد پر فرماتے ہیں کہ،

والانس معه اما مومن به واما مسلم له واما مسالم له اما خائف منه كذلك الجن منهم المومن به ومنهم المسلم له مع نفاق ومنهم المعاهد المسالم لمومني الجن ومنهم الحربي الخائف من المومنين (ص ۲۶۲)

اور انسانوں کے تعلقات کی مختلف نوعیت جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے یعنی بعض آدمی تو ایسے ہیں کہ جنہوں نے آپؐ کو مان لیا ہے اور آپ کی رسالت پر ایمان لے آئے ہیں اور بعض ان میں ایسے ہیں جنہوں نے سر اطاعت آنحضرتؐ کے سامنے خم کر دیا پھر ان میں بعضوں نے صلح کی راہ اختیار کی اور بعض آپ سے خوف زدہ ہیں بجنسہٖ یہی حال جنیوں کا بھی ہے یعنی ان میں بھی کچھ لوگ مؤمن ہیں اور بعض ان میں بظاہر مطیع ہیں مگر دل میں نفاق رکھتے ہیں بعضوں نے معاہدہ کر کے مسلمان جنوں سے صلح کر لی ہے اور بعض ان میں حربی ہیں، جو ایمان لانے والے جنیوں سے ڈرتے رہتے ہیں۔

اسی جنی تقسیم کے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:۔

فالمسلمون منهم يعاونون الانس المسلمين كما يعاون المسلمون بعضهم بعضاً والكفار مع الكفار۔ (ص ۲۶)

پھر جنیوں میں جو مسلمان ہو چکے ہیں وہ مسلمان آدمیوں کی مدد کرتے ہیں جیسے انسی مسلمان باہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اسی طرح جنیوں میں جو کافر ہیں وہ کافر انسانوں کی مدد کرتے ہیں،

اور صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ باوجود مسلمان رہنے کے جیسے انسانوں میں بعض لوگ

بدعات میں یا فسق وفجور میں مبتلا رہتے ہیں کچھ اسی قسم کی کیفیت مسلمان جنات کی بھی ہوتی ہے یعنی باوجود مومن یا مسلم ہونے کے بدعات اور فسق وفجور میں ان کے بعض افراد جنی مبتلا رہتے ہیں اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ جب مسلمانوں اور کافروں کا مقابلہ ہوتا ہے تو اس وقت مسلمان جنیوں کا وہ گروہ جو فسق وبدعت میں مبتلا ہوتا ہے کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد کرتا ہے ان کے الفاظ ہیں کہ :۔

وقد یجتمع کفار ومسلمون ومبتدعة وفجار فیؤید ھؤلاء بالخوارق تعینھم علیھا الجن والشیاطین ولکن جنھم وشیاطینھم اقرب الی الاسلام فیترجحون بھا علی اولئك الکفار

کبھی کافروں اور مسلمانوں کی جب مٹ بھیڑ ہوتی ہے اور مسلمانوں میں بدعتی لوگ اور فاسق وفاجر افراد بھی شریک ہوتے ہیں تو جنیوں میں فاسقوں اور بدعتیوں کے افراد غیر معمولی خوارق اور طریقوں سے ان مسلمانوں کی مدد کرتے ہیں لیکن جنیوں کے یہ افراد اسلام سے زیادہ قریب ہوتے ہیں اسی لیے کافروں پر مسلمانوں کو وہ اپنی امداد میں ترجیح دیتے ہیں

اور شیخ نے صرف یہ دعویٰ ہی نہیں کیا ہے بلکہ ان کے زمانہ میں مسلمانوں اور تاتار کے مغل کفار سے جو معرکے ہوئے ہیں ان معرکوں میں جیسا کہ معلوم ہے خود ابن تیمیہ بھی براہ راست شریک رہے ہیں غالباً ان ہی معرکوں کا تجربہ ہے جسے انہوں نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ

مثل ما یجری للاحمدیة وغیرھم مع عباد المشرکین النجشیة تدام التتار کانت خوارق ھولاء اقوی لکونھم کانوا اقرب الی الاسلام

(صنا)

مثلاً احمدیہ گروہ اور ان کے ساتھ بخشیہ طبقہ کے لوگ (جو بظاہر اسلام کی طرف منسوب ہیں) ان کا مقابلہ جب تاتار کے کفار کے ساتھ ہوا تو یہ دیکھا گیا کہ (مسلمانوں کے ان بدعتی فرقوں) کی طرف سے جن غیر معمولی اُمور کا ظہور ہوتا تھا وہ تاتاریوں کے غیر معمولی خوارق سے زیادہ قوی ہوتے تھے کیونکہ بہر حال اسلام سے (بدعتیوں کے یہ فرقے) زیادہ قریب

انہوں نے اس سلسلہ میں مختلف مقامات پر اس کی بھی تفصیل کی ہے کہ انسی افراد کو "جنات"

کس قسم کی تکلیفیں پہنچاتے ہیں،

فکثیر من الناس تقتلہ الجن کما یصرعونھم والصرع لاجل الزنا وتارۃ لیقولوت انہ اذاھم امابصب نجاستہ علیھم واما بغیر ذالک فیصرعونہ صرع عقوبۃ وانتقام وتارۃ لیفعلون ذلک عبثا کما یعبث شیاطین الانس بالناس (ص۲۶۴)

بہت سے آدمیوں کو جن قتل کر دیتے ہیں اور کبھی ان پر مسلط ہوتے ہیں اور جنیوں کی یہ تسلیط کبھی زنا کی وجہ سے ہوتی ہے کبھی جنی کہتے ہیں کہ جس شخص پر وہ مسلط ہوتے ہیں اس نے ان پر گندگی اور نجاست ڈال دی تھی یا اس کے سوا دوسرے اسباب بیان کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ کسی آدمی پر مسلط ہو جاتے ہیں گویا یہ تسلیط ان کی سزا کے طور پر ہوتی ہے یا بطور انتقام کے اس پر سوار ہو جاتے ہیں کبھی بلا وجہ جنی کسی آدمی کو ستاتا ہے جیسے بعض پاجی آدمی کسی دوسرے آدمی کو بلا وجہ دکھ دیتا ہے اور اس سے کھیلتا ہے،

اس کے بعد انہوں نے جنات کی طبعی خصوصیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

والجن اعظم شیطنۃ واقل عقلا واکثر جھلا (ص۔)

جنیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انسانوں سے ان کی شیطنت اور شرارت زیادہ بڑھی ہوئی ہے ان میں عقل بھی کم ہوتی ہے اور جہالت بہت گنوارپن جنوں میں زیادہ ہوتا ہے۔

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

والجنی قد یحب الانسی کما یحب الانسی الانسی وکما یحب الرجل المرأۃ والمرأۃ الرجل ویغار علیہ

جنی کبھی کسی آدمی سے محبت بھی کرتا ہے اسی طرح محبت کرتا ہے جیسے ایک آدمی دوسرے آدمی سے محبت کرتا ہے یعنی مرد

یخدمہ باشیاء واذا صار مع غیرہ فقد یعاقبہ بالقتل وغیرہ۔ (ص۲۶۴)

کبھی عورت سے عشق کرتا ہے یا عورت مرد سے اور جنیوں پر بھی اپنی محبت میں غیرت کا جذبہ غالب ہو جاتا ہے (یعنی رقیبوں سے بدلہ لیتے ہیں) اور اپنے محبوب کی جنی خدمت بھی کرتا ہے مگر جب اپنے اسی محبوب کو دوسرے کے ساتھ پاتا ہے تو اس غیر (رقیب) کو سزا دیتا ہے خواہ قتل ہی کر دیتا ہے یا کوئی دوسری قسم کی سزا دیتا ہے۔

ان ساری باتوں کو نقل کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں کہ

کل ھذا واقع

یہ ساری باتیں واقعات ہیں جو واقع ہوتے رہتے ہیں!

جیسا کہ میں پہلے بھی نقل کر چکا ہوں کہ شیخ الاسلام کے تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ان چیزوں کا ذاتی تجربہ خود ان کو بھی حاصل تھا اسی لیے اتنے وثوق کے ساتھ ان امور کی واقفیت کا دعویٰ کرتے ہیں بعض موقعوں پر انہوں نے اس کی ترکیب بھی لکھی ہے کہ جنات کے ان اثرات سے حفاظت یا نجات کا کیا طریقہ ہے سب سے پہلے عام کلیہ تو انہوں نے یہی لکھا ہے یعنی اہل الایمان والتوحید اہل القلوب المنورۃ کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں کہ

شیاطین الجن یھرب منہم (ص۲۶۵)

یعنی شریر اور پاجی جن ان لوگوں سے دور بھاگتے ہیں

انہوں نے بیان کیا ہے کہ خود ان جنیوں نے اقرار کیا ہے کہ

انہم لا یمکنہم ان یظہروا ھذہ الخوارق بحضرۃ اھل الایمان والقرآن ویقولون احوالنا

جن غیر معمولی کرشموں کو وہ کر دکھاتے ہیں ان کو ذہ ارباب ایمان اور صاحب قرآن کے سامنے ظاہر نہیں کر سکتے کہتے ہیں کہ شریعت

لا تظهر قدام الشرع والکتاب والسنۃ انما تظہر عند الکفار والفجار۔ (ص ۲۶۵)

اور کتاب (قرآن) سنت (حدیث) کے سامنے ان کے خاص حالات ظاہر نہیں ہو سکتے جیسے اپنے ان کرشموں کو وہ کافروں اور فساق و فجار کے سامنے ظاہر کرتے ہیں

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ :

فھؤلاء الشیاطین اذا کانوا مع جنسھم الذین لا یھابونھم فعلوا ھذہ الامور واما اذا کانوا عند اھل ایمان وتوحید وفی بیوت اللہ التی یذکر فیھا اسم اللہ لم یجترئوا علی ذلک بل یخافون الرجل الصالح اعظم مما تخافہ فجار الانس (ص ۲۶۵)

تو جنیوں کے شریر افراد اور ان میں جو شیاطین ہیں، جب انسانوں میں سے اپنے جیسے آدمیوں کے سامنے ہوتے ہیں تو ان سے وہ خوف نہیں کھاتے، اسی لیے وہ سارے کرشمے ان کے سامنے دکھاتے ہیں، مگر جب ایمان اور توحید والوں کا سامنا ہوتا ہے اور ان گھروں میں جن میں اللہ کا نام بلند کیا جاتا ہے اس وقت ان کرشمہ پردازیوں کی جسارت نہیں کر سکتے بلکہ مردِ صالح سے جنی شیطان جتنا ڈرتا ہے اتنا ڈر تو فاجر و فاسق آدمی کے دل میں بھی لوگوں کا نہیں پایا جاتا۔

اسی سلسلہ میں اپنے ذاتی تجربات ہی کی بنیاد پر یہ بھی لکھا ہے کہ :-

فیھم من یخرج بالذکر والقرآن وفیھم من یخرج بالوعظ والتخویف وفیھم من لا یخرج الا بالعقوبۃ کالانس۔ (ص ۲۶۵)

ان شیطانی جنیوں کو کبھی اللہ کے ذکر سے نکالا جاتا ہے کبھی قرآن پڑھ کر، نیز ان کو وعظ نصیحت کر کے بھی نکالا جاتا ہے کبھی دھمکیوں سے بھی یہ لوگ جاتے ہیں مگر ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو سزا پائے بغیر نہیں ٹلتے جیسے بعض آدمیوں کی حالت بھی یہی ہوتی ہے۔

غالباً (عقوبت) سزا سے مراد ان کی وہی ہے جس کا ذکر دوسرے مقامات میں انہوں نے کیا ہے مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں :-

وھذہ الاحوال الشیطانیۃ تبطل او تضعف اذا ذکر اللہ و توحیدہ وقرأت قوارع القرآن لاسیما آیۃ الکرسی فانھا تبطل عامۃ ھذہ الخوارق الشیطانیۃ - (ص ۲۶۷)	اس قسم کے شیطانی حالات کا اس وقت ازالہ ہوتا ہے یا یہ اس وقت کمزور پڑتے ہیں جب اللہ کا ذکر کیا جائے اور اس کی توحید کا اعلان کیا جائے اور قرآن کے قوارع (زانیا نے) ان کے سامنے پڑھے جائیں خصوصاً آیۃ الکرسی سے تو اس قسم کے شیطانی بکھیڑوں کا عموماً ازالہ ہوجاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی خاص خاص آیتوں کا شیاطین الجن پر خاص اثر مرتب ہوتا ہے اور ان کے سننے سے ان کو اتنی تکلیف پہنچتی ہے کہ بھاگ جانے پر مجبور ہوجاتے ہیں اسی لیے ان قرآنی آیتوں کا نام "قوارع القرآن" رکھا گیا ہے ان سے جنوں کی ٹپائی کا کام لیا جاتا ہے اس باب میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیۃ الکرسی والی آیتیں بہت زیادہ زود اثر اور تاثیر میں تیز ہیں شیخ نے علاوہ آیۃ الکرسی کے دوسری جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ :-

فاھل الاخلاص والایمان لاسلطان لہ علیھم ولھذا یھربون من البیت الذی تقرأ فیہ سورۃ البقرۃ ویھربون من قرأۃ آیۃ الکرسی وآخر سورۃ البقرۃ وغیر ذالک من قوارع القرآن (ص ۲۶۴)	ارباب اخلاص وایمان پر ان جنیوں کے غلبہ پانے کی کوئی راہ نہیں ہے اسی لیے وہ اس گھر سے بھاگتے ہیں جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے اور آیۃ الکرسی کی تاثیر بھی یہی ہے۔ یہی اثر سورۂ بقرہ کی آخری آیتوں کا بھی ہے اور ان کے سوا وہ ساری آیتیں جن کو قوارع القرآن کہتے ہیں۔

جس سے معلوم ہوا کہ سورۂ بقرہ مسلّم اس باب میں ایک کارگر نسخہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی سورہ کی آیتیں (آیۃ الکرسی) یا آخر سورۂ بقر کی بھی یہی خاصیت ہے لیکن منحصر قوارع القرآن ان ہی آیتوں میں نہیں

ہیں بلکہ دوسری آیتیں جن کے متعلق ارباب تجربہ نے لکھا ہے کہ اس راہ میں مفید ہیں مثلاً افحسبتم انما خلقناکم کی آیت انت خیر الراحمین تک جس کے متعلق حدیثوں میں بھی آیا ہے کہ پہاڑ پر بھی پڑھا جائے تو وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔

شیخ نے اسی سلسلہ میں مختلف حیثیتوں سے مختلف مقامات میں ان فوائد کی بھی فہرست دی ہے جو مسخر کرنے کے بعد مسخر ہونے والے جنات سے لوگ اٹھاتے ہیں مثلاً ایک موقع پر لکھتے ہیں :۔

هم يصعدون بهم في الهواء ويدعون المدن والحصون بالليل والابواب مغلقة ويدخلون على كثير من رؤساء الناس (ص ۲۶۶)	اپنے تابع کرنے والوں کو جنی ہوائیں لے کر اڑتا ہے اور ایسے شہروں یا قلعوں میں ان کو پہنچا دیتا ہے جن کے دروازے بند ہوتے ہیں اور امراء و رؤساء کے سامنے ان کو لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے (جن کے سامنے عام حالات میں پہنچنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی)

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

ثم الذي يخدمونه تارة يسرقون له شيئاً من اموال الناس مما لم يذكر اسم الله عليه ويأتونه اما بطعام او بشراب واما لباس واما نقد واما غير ذلك وتارة يأتونه في المفاوز بماء عذب وطعام وغير ذلك ۔ (ص ۲۶۳)	پھر یہ جن لوگوں کے تابع ہو کر ان کی خدمت کرتے ہیں، تو کبھی لوگوں کے مال سے کچھ حصہ چرا کر ان کو پہنچاتے ہیں، مگر (اسی مال سے چرا سکتے ہیں) جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اسی طرح ان کے سامنے کھانے پینے پہننے کی چیزیں لا کر ان کو دیتے ہیں، کبھی چٹیل صحرا و بیابان میں آب شیریں و کھانا لا کر حاضر کرتے ہیں، یا ان کے سوا، دوسری چیزیں،

"المخدومین" سے مراد

بہرحال "جنات" کو مسخر کر کے اسی قسم کے خدمات لینے والوں کا نام اصطلاحاً "المخدومین" ہے، ابن تیمیہ اس قسم کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی کتاب میں

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

بل من طوائف "المخدومیت" من یکونون کلهم من هذا الباب کالبوئ الذی للترك واکثر المولهین من هذا الباب۔
(ص ۲۶۶)

مخدوموں کے گروہ میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے سامنے یہ ساری باتیں پیش آتی ہیں اور یہ مخدوموں کا طبقہ ایسا ہی ہے جیسے ترکوں میں بوئی ہوتے ہیں اور اکثر مولہ (یعنی جو اپنے اوپر بے خودی طاری کرتے ہیں) ان کی یہی حالت ہوتی ہے۔

اس نظریہ کا کراماتِ صوفیہ پر بے محابا استعمال

یہی ہے نظریہ "مخدومیت" کا جسے حافظ ابن تیمیہ نے صوفیائے کرام کے عام کرامات کے مقابلہ میں بے محابا استعمال کیا ہے۔ عموماً اس گروہ کی طرف ایسی باتیں جہاں منسوب کی گئی ہیں اور ان کو ان کی خدارسیدگی کی دلیل کی حیثیت سے لوگوں نے استعمال کیا ہے، ابن تیمیہ "مخدوم" کے لفظ سے سب کی تردید کر دینے کے عادی ہیں، اس سلسلہ میں انہوں نے بعض دلچسپ لطیفوں کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً بعض صوفیوں کے متعلق جو یہ مشہور ہے کہ دیکھنے والوں نے انہیں عرفات کے میدان میں دیکھا حالانکہ اس زمانے میں عرب سے سیکڑوں میل دور اپنے وطن میں موجود تھے۔ ابن تیمیہ اس کا انکار نہیں کرتے مگر اس کی توجیہہ میں بے دھڑک فیصلہ کرتے ہیں کہ یہ سارے "جناتی کرشمے" ہیں یعنی جن اڑا کر اس قسم کے لوگوں کو عین وقت پر عرفات کے میدان میں پہنچا دیا کرتے ہیں، ان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ جنوں کا یہ عمل بعض دفعہ اس طریقہ پر ظہور پذیر ہوتا ہے کہ عرفات پہنچنے والے کو بھی اس کی خبر نہیں ہونے پاتی کہ وہ آخر وہاں اچانک اتنے قلیل عرصہ میں کیسے پہنچ گیا، لکھتے ہیں:۔

والذین تحملهم الجن وتطیرهم من مکان الی مکان اکثرهم لا یدری کیف حمل بل یحمل الرجل الی عرفات ویرجع وما یدری کیف حملته

اور جنی جن لوگوں کو لاد کر اور اڑا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جو پہنچا دیتا ہے تو اکثروں کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیسے اٹھایا گیا بلکہ اس شخص کو جنی اٹھا کر عرفات کے میدان میں لے بھی آتا ہے اور واپس بھی لے جاتا ہے لیکن اس

الشیاطین۔ (ص ۲۵۹) آدمی کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ شیاطین نے اس کو کیسے اٹھایا۔

اس مقام پر مسائل شریعت سے ناواقفیت کا ایک دلچسپ الزام اس قسم کے صوفیوں پر انہوں نے عائد کیا ہے خود ان ہی کے الفاظ میں اس کو سنیئے، فرماتے ہیں:۔

قد یقف بعرفات من غیر احرام ولا اتمام مناسك الحج وقد یذهبون به الی مكة ویطوف بالبیت من غیر احرام اذا حاذی المیقات وذالك واجب فی احد قولی العلماء ومستحب فی الآخر فیفوته المشروع (ص ۲۵۹)

(یہ بیچارہ صوفی) عرفات کے میدان میں احرام باندھے بغیر اسی صورت میں وقوف کرتا ہے اور حج کے دوسرے مناسک کی تکمیل کا بھی موقع اس کو نہیں ملتا، اسی طرح یہ جنی خادم اپنے مخدوم کو اڑا کر کبھی مکہ پہنچا دیتا ہے پھر وہ بیت اللہ کا احرام باندھے بغیر گزر جاتا ہے حالانکہ میقات پر پہنچنے کے بعد احرام کا باندھنا بعض علماء کے نزدیک واجب ہے اور بعضوں کے نزدیک مستحب ہے بہرحال شریعت کے قانون کی تعمیل کا موقع ضائع ہو جاتا ہے۔

انہوں نے اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

قد یستغیث المشرك لشیخ له غائب فیحکی الجنی صوته لذالك الشیخ حتی یظن انه سمع صوت ذلك المرید مع بعد المسافة بینهما ثم ان الشیخ یجیبه فیحکی الجنی صوت الشیخ للمرید حتی یظن ان شیخه سمع صوته و

کبھی شرعی عقیدہ رکھنے والا آدمی اپنے شیخ کو فریادرسی کے لیے پکارتا ہے حالاں کہ شیخ اس کا موجود نہیں ہوتا بلکہ غائب ہوتا ہے۔ اس وقت جنی اس شخص کی آواز کی نقل بنا کر سنا دیتا ہے پھر جب شیخ جواب دیتا ہے تو یہی جنی شیخ کی آواز کو اس کے مرید تک پہنچا دیتا ہے اور اسی سے

اجابہ۔ (ص۲۷۴) مرید کو مغالطہ ہوجاتا ہے کہ واقعتاً اسی کی آواز سن کر شیخ نے جواب دیا گویا پیر و مرید کے درمیان واسطہ کا کام یہ جنی دیتا ہے۔

اسی نوعیت کی دوسری چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں :-

وقد یحصل للمرید من یؤذیہ فید فعہ الجنی ویخیل للمرید ان الشیخ ھو دفعہ وقد یضرب الرجل بحجر فیدفعہ عنہ الجنی ثم یصیب الشیخ بمثل ذلک حتی یقول انی القیت عنک الضرب وھذا اثرہ فی وقد یکونون یاکلون طعاماً فیصور نظیرہ للشیخ ویجعل یدہ فیہ ویجعل الشیطان یدہ فی طعام اولئک حتی یتوھم ان ید الشیخ امتدت من الشام الی مصر وصارت فی ذلک الاناء (ص۲۷۴)

کبھی مرید کے سامنے کوئی ایذا پہنچانے والی شئے ظاہر ہوتی ہے اور جنی اس کو دفع کردیتا ہے مگر اس طور پر کہ مرید اس شبہہ میں پڑ جائے کہ اس کے پیر ہی نے اس موذی کا ازالہ کیا، اسی طرح کسی آدمی پر کوئی پتھر چلاتا ہے۔ جنی اس پتھر کو روک لیتا ہے اور اس کے بعد پیر بھی اسی پتھر کو چلا دیتا ہے اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرید سے پیر کہتا ہے کہ دیکھ تجھ پر جو پتھر چلایا گیا تھا اسے میں نے روک لیا اور اس کی وجہ سے یہ نشان مجھ میں پایا جاتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ کھانا کھاتے ہوتے ہیں کہ ان میں جنی شیخ کی شباہت اختیار کرکے شریک ہوجاتا ہے اور برتن میں ہاتھ ڈالتا ہے (چونکہ شیخ وہاں نہیں ہوتا اس لیے) لوگ اس وہم میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ شیخ نے مصر سے بیٹھے بیٹھے شام تک ہاتھ پھیلا دیا تا آنکہ شیخ کا ہاتھ اس کھانے کے برتن تک پہنچ گیا۔

اور یہی ہے " نظریۂ مخدومیت " کے استعمال کی وہ عجیب و غریب وسعت جسے میں نے شروع میں

عرض کیا تھا کہ ابن تیمیہ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

انہوں نے ان ہی امور تک اپنے نظریہ کے استعمال کو محدود نہیں کیا بلکہ اس قسم کی باتیں جو عموماً مشہور ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں سیارے کی روحانیت عمل کے زور سے مسخر کی ہے ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

والذین یدعون الکواکب تتنزل علیہم اشخاص یسمونہا بروحانیۃ الکواکب دھو شیطان تنزل علیہ لما اشرک لیغویہ کما تدخل الشیاطین الاصنام۔ (ص ۲۷۴)

(اور جو لوگ دعوی کرتے ہیں کہ ستاروں سے ان پر نازل ہوتے ہیں کہتے ہیں کہ کوکب (ستارے) کی روحانیت ان پر اترتی ہے یہ بھی دراصل شیطان ہی ہوتا ہے جو ان پر اترتا ہے شرک کی وجہ سے تاکہ اس مشرک کی راہ مارے۔ جیسے گمراہ کرنے کے لیے بتوں کے اندر بھی شیاطین الجن داخل ہو کر (لوگوں کو مغالطہ میں مبتلا کرتے ہیں)

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر انہوں نے تو خضر علیہ السلام[1] اور ان کی ملاقات کے جو قصے مسلمانوں میں مشہور ہیں اور مختلف بزرگوں کی طرف ان قصوں کو منسوب کیا گیا ہے ابن تیمیہ نے ان قصوں پر بھی بے محابہ "مخدومیت" کے اسی نظریہ کا حربہ چلا دیا ہے لکھتے ہیں:۔

---

[1] خضر علیہ السلام کا وجود بھی ان مسائل میں ہے جن میں مُلّا اور صوفی کا بھی جھگڑا پایا جاتا ہے اور مولویوں یعنی علمائے ظاہر میں بیسیوں اختلافی نقاط ان کے متعلق کتابوں میں ملتے ہیں پہلی بحث تو ان کے نسب نامہ میں ہے۔ حضرت آدمؑ کے براہِ راست صاحبزادے تھے یہاں سے لے کر اس حد تک کہ وہ فرعون کے نواسے تھے یعنی فرعون کی لڑکی جو ایمان لے آئی تھی اس سے پیدا ہوئے تھے بعضوں نے لکھا ہے کہ والد ان کے ایرانی اور والدہ یونانی تھیں بعضوں نے بالعکس بھی دعویٰ کیا ہے پھر یہ کہ وہ نبی تھے یا ولی تھے نبی تھے یا مرسل بھی تھے یا صرف نبی تھے اور آخری نزاع ان کی حیات و موت کے متعلق ہے۔ علماء ظاہر میں امام بخاری اس گروہ کے گویا امام ہیں جو ان کی وفات کے قائل ہیں لیکن نووی نے تہذیب الاسماء میں لکھا ہے کہ قال الاکثرون من العلماء انہ حی موجود بین اظہرنا وذلک متفق علیہ عند الصوفیۃ واہل الصلاح والمعرفۃ وحکایتہم فی رویتہ والاجتماع

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وکذلک یاتی کثیرا من الناس فی مواضع ویقول انہ الخضر فاعتقد انہ الخضر انما کان جنیا من الجن۔ (ص۲۷۳)

اور یہی حال ان قصوں کا ہے جو کہا جاتا ہے کہ بعض مقامات میں بعض لوگوں کے پاس خضر آئے تھے یعنی وہ باور کراتا ہے کہ میں خضر ہی ہیں حالانکہ درحقیقت جنیوں ہی میں سے وہ کوئی جنی ہوتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ بہ والاخذ عنہ وسوالہ وجوابہ ووجودہ فی المواضع الشریفۃ ومواطن الخیر اکثر من ان تحصی واشہر من ان یذکر (یعنی اکثر علماء کا یہی خیال ہے کہ خضر علیہ السلام زندہ ہیں اور ہم ہی لوگوں میں ملے جلے ہیں، صوفیہ کا تو ان کے زندہ رہنے پر اتفاق ہے ارباب صلاح و معرفت یہی کہتے ہیں، ان کے دیکھنے اور ان سے ملاقات سوال وجواب کے قصے اور یہ کہ مقدس پاک مقاموں پر وہ پائے جاتے ہیں۔ یہ قصے حد شمار سے خارج ہیں، حافظ ابو عمرو بن الصلاح نے بھی اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ ھو حی عند جماھیر العلماء والصالحین والعامۃ منہم وانما شذ بانکارہ بعض المحدثین (یعنی جمہور علماء کے خیال کے مطابق وہ زندہ ہیں صالحین اور عوام کا بھی یہی خیال ہے البتہ عام خیال سے ہٹ کر بعض محدثین نے اس کے برخلاف دعویٰ کیا ہے) ابن تیمیہ نے ان کے جنی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اگرچہ یہ نیا دعویٰ ہے لیکن ماوردی کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے اصابہ میں نقل کیا ہے کہ انہ ملک من الملائکۃ یتصور فی صورۃ الآدمیین ص۱۱۶ ج ۱۔ یعنی خضر در اصل ایک فرشتہ ہیں جو آدمیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ نے انفاس العارفین میں لکھا ہے کہ خضر علیہ السلام کا ظہور بعض لوگوں کے سامنے جو ہوتا ہے۔ از نیرنگہائے عالم مثال است ص۱۱۴ انہوں نے لکھا ہے کہ انبیاء و اولیاء مثالی وجود اختیار کر کے ظاہر ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ انہوں نے وفات وحیات ہی کے قصہ کو اس طرح ختم کر دیا، باقی شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ خضر کا چرچا اسلام کی ابتدائی صدیوں میں نہیں پایا جاتا۔ یہ دعویٰ بھی محل نظر ہے وھب بن منبہ جو پہلی صدی ہجری کے آدمی ہیں ان کی کتاب "المبتدا" سے حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ ان کے زمانے میں بھی لوگ خضر علیہ السلام کے دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اصابہ ص۱۱۷ ج ۱۔ اس سلسلہ میں آثار اور حدیثوں کا جو مجموعہ پایا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر نے سب کو اصابہ میں جمع کر دیا ہے تفصیل کے لیے اصابہ دیکھو۔۱۲

انہوں نے اس سلسلہ میں یہ عجیب بات لکھی ہے کہ :-

حتی انہ یاتی الیھود والنصاری[1] ولیقول انہ الخضر والیھود کنسۃ معروفۃ بکنیسہ الخضر وکثیر من کنائس النصاری یقصدھا ھذا الخضر والخضر الذی یاتی ھذا الشخص غیر الخضر الذی یاتی ھذا ولھذا یقول من یقول منھم لکل ولی خضر وانما ھو جنی معہ۔ (ص۲۷۲)

یہاں تک کہ خضر تو یہود و نصاریٰ کے پاس بھی آتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ میں خضر ہوں، یہودیوں کا ایک کنیسہ ہے جو "کنیسہ خضر" ہی کے نام سے موسوم ہے، اسی طرح عیسائیوں کے بیسیوں گرجے ہیں جہاں یہ خفیہ پہنچتے ہیں۔ (بلکہ یہ بھی ہوتا ہے) اس شخص کے پاس جو خضر ہوتا ہے وہ اس خضر سے جدا ہوتا ہے جو دوسرے کے پاس آیا تھا اسی قیاس میں (یعنی صوفیوں میں) بعض کہتے ہیں کہ ہر ولی کے لیے الگ خضر ہوتا ہے درحقیقت وہ جنی ہوتا ہے جو اس شخص کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ

ومن یری اذا زار بعض قبور الانبیاء والصالحین ان صاحب القبر قد خرج الیہ فیظن انہ صاحب القبر ذلک النبی او الرجل الصالح وانما ھو شیطان اتی فی صورتہ ان کان یعرفھا والا اتی فی صورۃ انسان وقال انہ ذالک المیت۔ ص۲۷۳

یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبروں یا اللہ کے نیک بندوں کی قبر کی زیارت کے وقت انہوں نے دیکھا کہ قبر والے صاحب قبر سے نکل آئے اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ واقعی وہ صاحب قبر ہی ہے یعنی وہی پیغمبر یا دینی نیک مرد ہیں جو اس قبر میں دفن ہیں۔ (یہ واقعہ نہیں ہوتا) بلکہ وہ شیطان ہوتا ہے جو صاحب قبر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اگر دیکھنے والا ان کو پہچانتا ہو ورنہ کسی آدمی کی شکل میں ظاہر ہو کر دیکھنے والے کو باور کراتا ہے میں وہی مرنے والا

آدمی ہوں (جو اس قبر میں دفن ہے)

صوفیائے کرام کی طرف جس جس قسم کی کرامتیں اور خوارق عادات اس زمانہ میں منسوب تھیں یا اس وقت منسوب ہیں، ابن تیمیہ نے ان کے تمام گوشوں کو اپنی اس "مخدومیت" کے نظریہ سے بھر دیا ہے اس راہ میں ان کے غلو کی انتہا یہ ہے کہ دوسروں ہی کے متعلق نہیں بلکہ اپنی مشہور کتاب "المنطق" میں اسی قسم کے مسائل کے سلسلہ میں جہاں تک مجھے یاد آتا ہے[1] انہوں نے لکھا ہے کہ

"خود میرے متعلق (یعنی اپنے متعلق ابن تیمیہ کہتے ہیں) بعض لوگوں نے آکر یہ بیان کیا کہ جن دنوں میں قید خانہ میں تھا اس نے مجھے قید خانہ کے باہر دیکھا بلکہ ملاقات کی"

شاید یہ بھی لکھا ہے کہ بعضوں نے عرفات میں دیکھنے کا دعویٰ میرے متعلق ایسے زمانہ میں کیا جب میں حج کے لئے نہیں گیا تھا بلکہ غالباً قید خانہ میں تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس قسم کی روایتوں کے بیان کرنے والوں کو میں نے یہی جواب دیا کہ کوئی جنی شیطان ہوگا جو میری شکل و صورت اختیار کر کے تجھے مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہتا تھا، جس کے معنی یہی ہیں کہ خود اپنی کرامتوں پر بھی انہوں نے اسی "مخدومیت" کے نظریہ کی چادر اڑھا دی ہے۔ ظاہر ہے کہ غلو کی یہ انتہائی اور آخری مثال ہو سکتی ہے[2]۔ اس باب میں ان کی کتابوں میں اور بھی بیسیوں باتیں پائی جاتی ہیں لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ ابن تیمیہ کے نظریہ "مخدومیت" اور اس نظریہ کی وسعت دامانیوں کا جو حال ان کے نزدیک تھا اس کا اندازہ کرنے کے لئے غالباً مذکورہ بالا مواد جو ان ہی کی کتاب سے ان ہی کے الفاظ میں اخذ کیا گیا ہے۔ کافی ہے۔

---

[1] یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔ ایک زمانہ میں مولانا حمید الدین فراہی کے حکم سے فقیر اس کی نقل کر رہا تھا، اس وقت ان کی اس کتاب میں اس بیان کو دیکھا تھا۔ بجنسہٖ الفاظ یاد نہیں رہے لیکن حاصل یہی تھا۔

[2] لیکن اس کی دوسری سمت کا غلو بھی کچھ کم خطرناک نہیں بلکہ بدفہم کو شرک تک پہنچا سکتا ہے۔ اس معاملہ میں حق اور عدل کی بات وہ ہے جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک ایسے ہی موقع پر فرمائی۔
ہوا یہ تھا کہ حکیم الامت کے ایک معتقد نے علی گڑھ کی نمائش میں دکان لگائی۔ ایک روز قلب میں کچھ گھبراہٹ محسوس ہوئی تو انہوں نے قبل از وقت سامان صندوقوں میں بند کرنا شروع کیا ایسے میں وہاں آگ لگ گئی۔ ان کو پریشانی ہوئی کہ ایسے وزنی صندوق اکیلے کیوں کر اٹھائیں گے! اسی فکر کے عالم میں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

—— (بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ——

دیکھا کہ مولینا تھانوی آرہے ہیں اور فرمارہے ہیں کہ جلدی کرو۔ چنانچہ شیخ و مرید نے پکڑ کر سارا سامان دوکان سے نکال لیا جب سب سامان منتقل ہو چکا تو حضرت شیخ وہاں موجود نہ تھے اور در حقیقت اس وقت حکیم الامت تھانہ بھون ہی میں تھے جب مرید نے اس حیرت انگیز واقعہ کی اطلاع حضرت شیخ کی خدمت میں کی تو ارشاد ہوا:-

مجھ کو اس کی کچھ خبر نہیں البتہ بعض اوقات حق تعالیٰ کسی کی دستگیری اور اعانت اس صورت میں فرماتے ہیں کہ کسی لطیفۂ غیبیہ کو مانوس شکل میں ظاہر فرما دیا اور اس کے ذریعہ اس کا کام بنوا دیا اور خود اس شکل والے کو کچھ خبر نہیں ہوتی۔"

یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ اشرف السوانح میں درج ہے۔ فقط

(غ۔م)

مجالسِ اشیخین

یا

دل کا چین

فہرست مجالس الشیخین

مجالس شیخ اکبر قدس سرہ

مجالس مولینا روم قدس سرہٗ

مجلس (۱۷) ہم جنسی میں عجیب جاذبیت ہے۔
شیطان کی طرف انسان کیوں جھکتا ہے؟
علاجِ حسد
انبیاء کی طرف کون جھکتے ہیں؟
" (۱۸) قربِ حق کی دو قسمیں
" (۱۹) "الم نشرح" کی توضیح
" (۲۰) راہِ صفا کی جفاؤں کی حقیقت
" (۲۱) حدیث "جف القلم" کی انوکھی تعبیر
" (۲۲) اللہ والوں پر اللہ کی محافظت!
" (۲۳) حرص و طمع آدمی کو اندھا کر دیتی ہے۔

نوٹ:۔ پہلے ایڈیشن میں مجالسِ شیخین کی ترتیب تاریخ وار ترتیب کے ساتھ چھپی تھی۔ اور "ش" اور "م" کے اشارہ سے شیخ اکبرؒ اور مولانا رومؒ کی مجالس کے فرق کو ظاہر کر دیا تھا، اب اس ایڈیشن میں پہلے شیخ اکبر قدس سرہٗ کی پوری مجالس اور پھر عارف رومی قدس سرہٗ کی پوری مجالس یکجا کر دی گئی ہیں۔ ناظرین اس میں زیادہ سہولت و افادیت پائیں گے۔

(غ۔م)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

مدت سے خاکسار کا یہ دستور رہا ہے کہ علاوہ قرآن مجید کے دل جب کبھی پریشان ہوتا ہے تو مثنوی معنوی یا فتوحات مکیہ ابن عربی کا مطالعہ بغیر کسی ترتیب کے شروع کر دیتا ہوں کل سے یہ خیال ہو رہا ہے کہ دونوں بزرگوں کی حضوری میں جن باتوں سے دل متاثر ہوتا ہے ان کو روزانہ اپنے الفاظ میں قلمبند کر لیا کروں اور متفرق مطالعہ سے حاصل شدہ یہ چیزیں جب کافی مقدار میں جمع ہو جائیں تو انہیں کتابی شکل میں چھاپ دیا جائے یا بالاقساط کسی ماہنامہ میں شائع کرا دیا جائے

"مجالس الشیخین" یا "دل کا چین"

اپنی اس کتاب کا نام رکھتا ہوں، یہی نام اس وقت قلب میں بغیر کسی قصد و ارادے کے ڈالا گیا۔

"ان مجالس کی ترتیب کا مقصد"

زیادہ مقصود ان مجالس سے یہ ہے کہ آج کل تو میرا ایک گاؤں اور وہ بھی ایسے گاؤں میں آ کر مقیم ہو گیا ہوں، جہاں شریف مسلمانوں کے صرف دو خاندان باقی رہ گئے ہیں ان کے سوا عام ہنود اور عام طبقہ کے کچھ مسلمان ہیں ان سے کسی قسم کی ایمانی گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملتا نہ سننے سنانے کا، اور حال یہ ہے کہ شہروں میں بھی اس قسم کی مجلسیں میسر نہیں آتیں، جہاں جائیے بس اخباروں کی خبروں کا تذکرہ اور ان ہی خبروں سے نکالے ہوئے ناقص نتائج سے مسرت یا غم کی پیدائش کا سلسلہ جاری ہے لیکن زندگی کے اس خواب کی تعبیر نہ کوئی جاننا چاہتا ہے نہ وہ خود سوچتے ہیں اور نہ دوسروں کی سننا چاہتے ہیں ایسی صورت میں چارۂ کار بجز اس کے سوا اور کیا ہے کہ گزرے ہوئے بزرگوں کی مجلسوں میں حاضری کی ایک صورت

اس تدبیر سے نکل آئی ہے، اَللّٰھُمَّ نَسئَلُکَ ان یرزقنی فوائدھا ولا تحرمنی عن عوائدھا۔

اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا میسر آسکتی ہے کہ حق تعالیٰ کے کلام پاک اور حق تعالیٰ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام کے سننے اور سمجھنے کے مواقع اور اس لئے اس کوردہ گاؤں میں مولانا معنوی اور شیخ اکبر کی برکات سے محض اپنے فضل و کرم سے مستفید ہونے کا موقع مہیا فرما دیا ہے۔ فالحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔

مارچ ۱۹۵۰ء

گیلانی (بہار)

"کہف الایمان"

مجالسِ شیخ اکبرؒ قدس سرہٗ

(۱) فلسفۂ مصیبت | (فتوحات ص۴۶۵ ج ۲) بعد نماز جمعہ تاریخ ۱۷ ۳/۵ فتوحات کی مجلس میں حاضری میسر آئی۔ ارشاد ہوا :-

”جنّت کی زندگی میں ہر لمحہ ہمارے حواس آگے ان کی لذّتیں نت نئی شکل میں پیش ہوتی رہیں گی مگر خود دنیا میں بھی یہی حال ہے، لوگ چاہتے ہیں کہ امن کی حالت مسلسل باقی رہے درمیان میں خوف نہ پیدا ہو حالانکہ لذت تو آتی ہے جو خوف کے بعد ہو، بلکہ زندگی کے اس راز سے اگر لوگ واقف ہو جائیں کہ ہمارے سامنے ہر لمحہ نئی کیفیتیں پیش ہو رہی ہیں تو دنیا کی چیزوں سے اکتاہٹ کی کیفیت قلوب میں پیدا نہ ہو،

پھر فرمایا کہ :-

” اس میں بھی دکھ والوں کے لیئے رحمت ہے ان کو اگر محسوس کرا دیا جائے کہ جس دکھ میں وہ مبتلا ہیں ہر لمحہ اس میں تجدید ہوتی رہتی ہے تو مصیبت کا احساس ان میں زیادہ شدّت پذیر ہو جائے گا۔

شیخ نے پھر فرمایا کہ :-

” جہنم میں اگر دکھ سہنے والوں پر یہ راز کھول دیا جائے گا اور ہر آن اُن کو محسوس ہوگا کہ نئے عذاب اور نئے دکھ میں مبتلا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

یہ بھی ارشاد ہوا :-

” یقین کی آنکھ جن کی کھل گئی ہے اور اپنی اسی آنکھ سے وہ چیزوں کو دیکھ رہے ہیں یہی عارفین کا طبقہ ہے۔ ان پر زندگی کا یہی دنیاوی دور آخرت والے دور کی شکل اختیار کر لیتا ہے بظاہر گو وہ دنیا میں ہوتے ہیں لیکن حکماً آخرت میں ہیں اور گو

مکان کے لحاظ سے دنیا میں ہیں مگر مکانۃ اور درجہ کے لحاظ سے آخرت میں ہیں۔

اسی مجلس میں یہ بھی ارشاد ہوا :-

فقر و غنا

" فقر افضل ہے یا غنی ؟ یہ ایک مہمل سوال ہے ، کیونکہ دونوں جامع ہی نہیں ہے۔ غنا صرف رب العالمین کے لیے ہے اور فقر بندے کے لیے پس یہ سوال ایسا ہی ہے کہ کوئی پوچھے خدا افضل ہے یا بندہ

اور فرمایا :-

سوال ہی استعدادِ فہم جواب کی دلیل ہے

علم کے متعلق سوال کرنے والوں سے جواب میں محض یہ کہنا کہ تمہاری سمجھ سے بات اونچی ہے، صحیح نہیں ہے ۔ سائل سوال کر ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس سوال کے جواب کے قبول کرنے کی صلاحیت اس میں نہ ہو، البتہ جواب مختلف سطح سے تعلق رکھتا ہے اب یہ جواب دینے والے کی قابلیت پر موقوف ہے کہ وہ دیکھ سکے کہ سائل کی رسائی جواب کی کس سطح تک ممکن ہے شیخ نے اس سلسلہ میں اس حدیث کو پیش کیا ہے کہ جب اعرابی نے پوچھا کہ جنت میں کپڑے بنے جائیں گے یا کیسے پیدا ہوں گے ؟ صحابہ ہنس پڑے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی اور اعرابی کو خبر دی کہ جنت کے درختوں میں ایسے پھل ہوں گے جن سے بنے بنائے کپڑے نکل آیا کریں گے ۔

اسی سلسلہ میں شیخ نے

سورۂ والضحیٰ کی ان آیتوں کی طرف توجہ دلائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو منع کیا گیا کہ سائل کو نہ جھڑکئے۔ اس کا تعلق وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى سے ہے شیخ نے ضالاً کا ترجمہ متحیراً کیا ہے اور فاما الیتیم فلا تقھر کا تعلق الم یجدک یتیما سے بتایا ہے ۔

(۲) مشاہدہ اور مکاشفہ کا فرق

۵ اپریل ۱۹۵۰ء شیخ اکبر کی مجلس میں حاضری کی سعادت میسر آئی مگر آج ان کی باتیں بہت بلند تھیں۔ مشاہدہ و مکاشفہ کے فرق کو بیان کر رہے تھے میری سمجھ میں یہی آیا کہ حسی معلومات کے علمی تعلق کو وہ مشاہدہ کہتے ہیں اور محسوسات سے جو بات سمجھ میں آئی ہے اسی کا نام انہوں نے مکاشفہ رکھا ہے، مثال بھی دی ہے کہ بات سنتے ہو۔ بات

سمعی مشاہدہ کی چیز ہے لیکن بات سے جو چیز سمجھ میں آئی ہے وہ مکاشفہ ہے۔

شیخ نے فرمایا کہ :-

مشاہدہ کا تعلق ہمیشہ محسوسات سے ہوتا ہے خواہ کسی حس سے ہو، لمسی سمعی بصری شمی، ذوقی (یعنی ذائقہ) سے تعلق رکھنے والے تو مشاہدات ہے اور مکاشفہ کا تعلق ہمیشہ معانی سے ہوتا ہے۔

پھر آگے انہوں نے فرمایا کہ مکاشفہ والی چیز مشہودات کی امانت ہوتی ہے پھر ان تودوا الامانات الیٰ اھلہا وغیرہ کی شرح فرمائی مگر کوئی خاص چیز جس کا تعلق دل سے ہو اس مجلس میں اپنی نارسائی کی وجہ سے میسر نہ آئی۔ ہاں وماغی فوائد حاصل ہوئے۔

(۳) اہلِ ایمان کے عذاب کی نوعیت

۶ اپریل ۱۹۵۰ء شیخ کی مجلس فتوحات میں حاضر ہوا ارشاد ہو رہا تھا کہ اہل ایمان کے عذاب کی نوعیت کیا ہے؟ آپ کا جو عام طریقہ ہے تقریر اسی خصوصیت کے ساتھ شروع ہوئی۔ تمہیداً فرمایا گیا کہ یہ آدمی کی روح درحقیقت عاقل۔ بالغ۔ عارف۔ مومن بن کر پیدا ہوئی "مومن" سے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور توحید کا علم اس کو حاصل تھا قرآن میں فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا اور حدیث میں کل مولود یولد علی الفطرۃ کا یہی مطلب ہے درمیان میں فأبواہ والی حدیث کا ذکر کرتے ہوئے نکتہ کہتے چلے گئے ہیں کہ گو یتیم کا باپ نہیں ہوتا لیکن باپ کی جگہ جس کے بھی زیر پرورش ہوتا ہے وہی اس کا باپ ہوا۔ پھر رقعہ میں مقداری وسعت نہیں اس پہ شیخ نے بیان دیا اور وہی مشہور تقریر کی کہ امتداد کی صورت میں علم وجہل کا مختلف جزیں جمع ہو جانے کا احتمال پیدا ہوگا حالانکہ بداہتہً آدمی پاتا ہے کہ معلوم معلوم ہے اور مجہول مجہول۔ بہرحال اگر اپنی ذات کا شعور روح کو نہ ہو تو حق تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار وہ کیسے کر سکتی تھی، الغرض آدمی کی اصل حقیقت اس کی روح ہی ہے پھر اس روح کو کسی بدن سے متعلق کر دیا جاتا ہے جس کے ساتھ روح کا استقرائی تعلق ہوتا ہے اور اس کی ملک میں بدن بدن کے اعضاء دے دیئے جاتے ہیں اسی بدن میں کچھ قوتیں اور آلات بھی ودیعت کر دیئے گئے ہیں جن میں بعض حسی اور بعض معنوی قوتیں ہیں، روح کو پھر حکم دیا کہ ان ہی بدنی قویٰ کی راہ سے علم حاصل کرے اور ان قوتوں کو ان حدود کا پابند ہو کر استعمال کرے۔

پھر ان آلات بدنی کے مختلف مراتب اور ان کی مختلف نوعیتیں ہیں معنوی قویٰ سب کامل و مکمل ہیں بجز ایک خیالی قوت کے کہ یہ عریب بطرتاً کمزور پیدا ہوتی ہے اور حسی قوتیں بھی کمزور ہیں ان دونوں یعنی خیالی اور حسی قوتوں کو جسم کا تابع بنا دیا گیا جسم جس حد تک بڑھے گا اور بڑا ہوگا ان قوتوں میں بھی اضافہ ہوگا (اس سلسلہ میں خیالی قوت کی ہمہ گیری پر شیخ نے کچھ باتیں فرمائیں کہ سامعہ باصرہ الغرض ہر حاسہ سے معلومات کو لینے کی اس میں صلاحیت ہے اور ان معلومات پر قوت مفکرہ اور قوت واہمہ عمل کرتی ہے۔

بہرحال شیخ نے فرمایا کہ روح ان قویٰ سے جو استفادہ میں تابع جسم کی نہ ہوتی تو پیدا ہونے کے ساتھ ہی ہر شخص مکلف ہو جاتا مگر جسم کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے تکلیف کے لیے عمر کی ایک مدت مقرر کر دی گئی ہے۔ شیخ کے نزدیک سات سال کی عمر سے تکلیف کی مدت شروع ہو جاتی ہے ورثا لونی مطالبہ کے لیے بلوغ کی شرط لگائی ہے مگر پھر بھی قتل جو بچپن میں ہوا ہو اس کو بلوغ کی حد تک قید کیا جاتا ہے اور ولاۃ مقتول کے مطالبہ پر قتل کیا جاتا ہے۔

پس خلاصہ یہ ہے کہ بچپن کے خیر و شر کا نتیجہ بھی سامنے آتا ہے خیر کا پھل تو آخرت میں ملتا ہے اور شر کا صرف دنیا میں۔

اس کے بعد شیخ نے فرمایا کہ

ومن عذاب المومن ما سلط الله علیھم من اصحاب الاھواء والکفار من الاسر والعذاب والاسترقاق والقتل فی الدنیا کل ھذا ایکفول ھفوات وزلات نفسیۃ وحسیۃ علی قدر ما وقع منھم۔

ایمان والوں کے عذاب ہی کی شکلیں ہیں کہ بدعقیدہ لوگوں اور اہل کفر کو ان پر مسلط کر دیا جاتا ہے یعنی ان کے قیدی بنا دیئے جاتے ہیں دکھ ان کی طرف سے پہنچتا ہے غلام ان کے بنا دیئے جاتے ہیں اور ان کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں یعنی دنیا میں ان سزاؤں کے شکار ہوتے ہیں مگر یہ سب اہل ایمان کی یاوہ گوئیوں اور نفسانی و حسی لغزشوں کی سزا ہوتی ہے۔

پھر شیخ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ کفار جو کچھ کرتے ہیں وہ

الا لاجل ایمانہم — یعنی ایمان ہی کی وجہ سے دشمنی کرتے ہیں

آیت قرآنی

ویخرجون الرسول وایاکم ان تومنوا باللہ ربکم۔ ومانقموا منہم الا ان یؤمنوا باللہ۔ — نکالتے ہیں رسول اور تم کو اس وجہ سے کہ تم نے مانا ہے اللہ اپنے اپنے پوسنے والے کو نہ بدلہ لیا انہوں نے مگر اسی بات کا کہ تم نے اللہ کو مانا ہے۔

یہ بھی فرمایا کہ ومن یقتل مومنا متعمدا کا ایک مطلب یہ بھی کہا گیا ہے کہ مومن کو ایمان کی وجہ سے جو قتل کریگا۔ اس کی سزا بیان کی گئی ہے۔

ای قصد قتلہ لایمانہ (ص۹۱۴ ج ۲) — یعنی مومن کے ایمان کی وجہ سے جو قتل کرے۔

پس تین باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) بچپن کے اعمال بد کی سزا اسی زندگی میں مومن کو ملتی ہے۔

(۲) اور اہل ایمان کو بداعمالی کی سزا کفار سے مغلوبیت و تباہی و بربادی سے اسی دنیا میں پہنچتی ہے۔

(۳) مسلمانوں کو غیر مسلموں سے اجتماعی مصائب جو پہنچتے ہیں اس کی وجہ بھی ایمان ہوتا ہے۔

(۴) جسد و روح

۵ ستمبر ۵۰ء آج شیخ اکبر کی مجلس میں حاضری کی برکت حاصل ہوئی۔ فرماتے تھے ہمارے اجسام کیا ہیں ہماری روحوں کے یہ تابوت اور ان کی یہ قبریں ہیں، اور اسی لیے ان قبور نے روح کے مشاہدے سے آدمی کو محروم رکھا ہے مگر جب اس قبر کو چھوڑ کر روح جدا ہو جائے گی اور یہ جدائی انفعالی نہیں ہوتی بلکہ فنا کی جدائی ہوتی ہے پس جب اجساد کے مشاہدے سے روح فنا ہو جائے گی، یعنی توجہ اجساد کی طرف روح کی نہ رہیگی تو بینائی کی ذاتی صفت چونکہ روح میں ہے اسی قوت سے وہ اپنی ذات کا مشاہدہ کرے گی اور اب اپنے نفس کی معرفت آدمی کو حاصل ہوگی تب اس سے اپنے رب کی معرفت کو روح پائے گی۔

شیخ نے فرمایا:-

"پس اسوقت تو اپنی ذات اور رب کی ذات کا علم یقین ہے کہ اس علم یقین سے

جسد کو چھوڑ کر آدمی یقین کی آنکھ سے اپنے آپ کو اور اپنے رب کو پائے گا اسی
کو "عین الیقین" کہتے ہیں پھر جب اپنی قبر میں آدمی واپس ہو جائے گا تو اس یقین کو
حاصل کرے گا جس کا نام حق الیقین ہے۔ الحاصل علم الیقین سے عین الیقین کی
طرف اور عین الیقین سے حق الیقین کی طرف آدمی منتقل ہوگا، جسد کو چھوڑنے کے بعد
اپنی ضریح میں جب منتقل ہوتا ہے تو اس وقت "علم الیقین" کی طرف واپس نہ ہوگا۔

(صہ ۵۱۲ ج ۳)

لطیفہ:۔ قیامت کے دن انسان کا "کالفراش المبثوث" ہونا اور پہاڑوں کا "کالعہن المنفوش" ہونا، اس سے لوگ دہشت ناک منظر کو اپنے اندر پیدا کرتے ہیں حالانکہ رحمت الٰہیہ چونکہ ہر چیز میں بکھری ہوئی ہے تو اسی رحمت کے ظہور کی شکل انبعاثِ[۱] انسانیت ہوگی اور سخت پہاڑ کا روئی کے گالے جیسا نرم ہو جانا اسی رحمت کے ظہور کا ایک رنگ ہے۔ جو حد سے زیادہ نرم ہے۔ (صہ ۵۱۲)

(۵) انواع انسانی اور ہر ایک کی حیثیت

آج شیخ محی الدین بن عربی کی مجلس میں حاضر ہوا شیخ حسب دستور کچھ فرما رہے تھے۔ ان کی بہت سی باتیں جیسا کہ قاعدہ ہے خود ان ہی کے مصلیٰ تک محدود رہتی ہیں البتہ کچھ سمجھ میں آئیں، فرما رہے تھے ـــــ (۱) اجسام اور اجساد میں فرق ہے، جسم تو وہی ہے جسے سب جسم کہتے ہیں، خواہ رنگین ہو یا بے رنگ شفاف ہو، یا کثیف، لیکن جسد دراصل ان سانچوں کا نام ہے جن میں ارواح کا تمثل بحالت بیداری اور بحالتِ خواب ہوتا ہے۔ خواب میں آدمی اپنے آپ کو مختلف حالتوں میں پاتا ہے اور ان کو محسوس کرتا ہے کہ جسم ہیں حالانکہ وہ جسم نہیں ہیں،

(۲) پھر نوع انسانی پر مجموعی حیثیت سے شیخ نے نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت تو وہی ہے جو کسی انسانی جسد کے ساتھ نفس ناطقہ کو ہوتی ہے اور دوسرے انبیاء کی حیثیت ان روحانی قوتوں کی سی ہے جو آدمی میں پائی جاتی ہیں، ان کے بعد اولیاء کا درجہ ہے جو ورثہ کہلاتے ہیں ان کی حیثیت وہی ہے جو حواس خمسہ کی جسد انسانی میں ہوتی ہے اور ان کے سوا دوسرے انسانی افراد کو سمجھو کہ حیوانی روح کی

---

[۱] انسانیت کا اٹھ کھڑا ہونا۔

حیثیت کہتے ہیں جس سے جسم کے نشو و نما کا تعلق ہے

(۳۱) اس وقت جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں موجود نہیں ہیں یوں سمجھو کہ عالم پر نیند کی کیفیت طاری ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی روپوشی کی وجہ سے یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ عالم پر موت طاری ہو گئی ہے بلکہ نیند کی کیفیت طاری ہے، جیسے نیند میں آدمی کی روح کی جو حالت ہوتی ہے وہی حال اس وقت رسول اللہ علیہ وسلم کا ہے، قیامت کے دن تک یہ نیند طاری رہیگی اور قیامت روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیداری کا نام ہے اور آپ کی ناسوتی پیدائش سے پہلے یوں سمجھنا چاہیئے کہ عالم کی حیثیت اس بچے کی تھی جو ماں کے پیٹ میں پرورش پا رہا ہو، پس قیامت میں روح عالم جب جاگ اٹھے گی، تو عالم اپنے سارے اعضاء کے ساتھ جاگ اٹھے گا جس میں اہل النار بھی ہوں گے پس وہ نہ زندہ ہوں گے نہ مردہ اور ملائکہ کی مثال ان خیالی صورتوں کی ہے جنہیں اپنے خیال میں آدمی پاتا ہے اور یہی حال جن کا بھی ہے۔ (صفحہ ۲۴۸ ج ۲)

حضور اکرم کی امت دعوت بھی دوسری امتوں سے بہتر ہے

کسی ضرورت سے کتاب بند کر کے چلا گیا پھر آ کر کھولی مگر اب کے شیخ کو دوسری گفتگو میں مشغول پایا، فرما رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رعل ذکوان پر جب بددعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ـ کیوں؟ اسی (منع کرنے سے) سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ کی امت اجابت ہی نہیں بلکہ امت دعوت بھی دوسری امتوں سے بہتر ہے۔

شیخ نے فرمایا کہ

بجائے بددعا کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان یدعوالھم بالتوفیق والھدایۃ چنانچہ یہ رسول اللہ علیہ وسلم جو اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔ کی دعا اسی لیے فرماتے تھے، شیخ نے کہا کہ

شرک کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت کے کفار ماخوذ تو ضرور ہوں گے اور جہنم میں بھی جائیں گے ولکن مواخذتہ ایاھم فیھا لطف الٰہی لا یستوی فیہ مشرک غیر ھذہ الامۃ بمشرکھا۔

(ترجمہ) لیکن اس کے مواخذہ میں بھی لطف الٰہی کا ایک پہلو یہ ہوگا کہ جہنم میں اس کے (امت دعوت) مشرک کی برابری غیر امت کے مشرک کو حاصل نہ ہوگی ـــ (یعنی محمدی امت دعوت کے مشرک کا عذاب نسبتاً ہلکا ہوگا)۔

آگے فرمایا کہ

اعرف ذلک اللطف ولا اصرح بہ کما ذکر صلی اللہ علیہ وسلم فیمن اصابتہم
النار فی ہذہ الامۃ بذنوبہم بل من الامم ان اللہ یمیتہم فیہا
اماتۃ الحدیث۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس

المومن منہم بایمانہ والکافر منہم بکفرہ ہما خیر من کل مومن۔

من غیر ہذہ الامۃ وکافرہ (ص ۱۷۹ ج ۳)

شیخ کے اپنے الفاظ اس سلسلہ میں یہ ہیں کہ

لما اشتد قیامہ فی اللہ وغیرتہ علی الحق فی قصۃ رعل وذکوان وعصیۃ جعل
یدعو علیہم فی کل صلوۃ شہرا وہو القنوت فاوحی اللہ تعالیٰ الیہ فی ذلک
لما علم من اجابۃ ایاہ اذا دعاہ فی امرہ ونہاہ عن الدعاء علیہم ابقاء لہم
ورحمۃ بہم فقال وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین ای لترحمہم الخ

(۶) ترکِ اسباب بندہ کی حقیقت کے منافی اور حکمِ خداوندی کے خلاف ہے

۲۳ دسمبر سنہ ۵۰ء جی چاہا کہ شیخ اکبر کی خدمت میں بھی آج حاضری دیجیے۔ فرماتے ہیں:-

بندہ مقید ہے مطلق نہیں ہو سکتا اور خالق مطلق ہے اپنی مرضی سے چاہے تو قیود اپنے اوپر عائد کرلے
کتب علی نفسہ الرحمۃ میں دیکھو کہ خود رحمت کو اپنی مرضی سے اس نے اوپر واجب کرلیا لیکن غریب مقید بندہ
کی قید تو دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ خود مطلق ہونا چاہے تو نہیں ہو سکتا اور اطلاق کے معنی یہ ہوں گے کہ خود
غائب ہو جائے۔ اسی طرح ایفاء عہد کو بندے کے ایفاء عہد کے مقابلہ میں حق تعالیٰ نے خود مقید فرمایا ہے۔
فرمایا اوفوا بعہدی اوف بعہدکم پس ذاتِ حق تو مطلق ہے لیکن اس کے صفات میں تقیید کا رنگ ہے
مالک مملوک کے بغیر، رب مربوب کے بغیر، الٰہ مالوہ کے بغیر ناقابلِ فہم ہے۔ یہ کہنا ہے کہ بندہ چونکہ
سبب سے اصل مقصود پیدا ہوا ہے اس لیے بغیر سبب کے وہ جی نہیں سکتا عالم کو اسباب کی زنجیر میں جکڑا
ہوا جو پیدا کیا گیا ہے اسی لیے کہ بغیر سبب کے غریب انسان رہ نہیں سکتا خوشہ کھیتی میں کھیتی زمین اور بارش

سے بندھی ہوئی ہے۔ استسقاء کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ منجملہ اسباب کے ایک سبب یہ بھی ہے اسی لیے اسباب سے ترک تعلق کا حکم نہیں دیا گیا کہ بندے کی حقیقت کے منافی ہے۔ ہاں! ایک سبب کو چھوڑ کر دوسرے سبب کو اختیار کر سکتا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا "انا سببك فعلی فاعتمد، و توکل" شیخ نے فرمایا کہ اسباب کا ثابت کرنے والا ہی آدمی ہے کیونکہ اسباب سے قطع نظر کرنے والا اپنے رب کو کیسے پا سکتا ہے عرف نفسہٗ سے عرف ربہٗ کا نتیجہ سبب ہی کے تعلق پر تو مبنی ہے۔

بلکہ جن چیزوں کی پیدائش کا ذریعہ جن اسباب کو حق تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے، ان سے قطع نظر کر کے اقدام کرنے والا شیخ نے فرمایا بڑا بے ادب ہے گویا اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ "والی" سے سرتابی کرتا ہے ومن ترك ما قرره الحق فهو منازع لا عبد وجاهل لا عالم وہ جو ترک اسباب پر گفتگو کرتے ہیں جو لکھا ہے کہ پیاس لگی تو پانی کی طرف دوڑتے نہیں، بھوک لگی تو روٹی کی طرف لپکتے نہیں بڑے محتاط ہوئے تو خود روٹی منہ میں نہیں ڈالتے بلکہ دوسرا ڈالتا ہے مگر چباتا خود ہی ہے پھر ترک اسباب کا ہذیان، ہذیان کے سوا اور کیا رہا۔ کم از کم سانس لینے سے تو کوئی بچ نہیں سکتا یہ بھی تو سبب ہی ہوا کہ سانس نہ لے اور مر جائے تو خودکشی کا مجرم بن کر جہنم جائے اور یہ سارے اسباب ہی کے تو حصے (انواع) ہیں۔

کیا تارک اسباب عبادت ہی چھوڑ دیں گے؟ جوش میں فرمایا:۔

فقد القيت بك على مدرجة الحق واثبت لك الطريق التي وضعها الله للعبادة۔ (ص ۹۶، ج ۳)

(۷) اسباب پر بھروسہ شرک خفی ہے!!!

۲۶ ستمبر ۱۹۵۰ء شیخ اکبر کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی جو کچھ فرما رہے تھے اس میں بعض دلچسپ باتیں میسر آئیں۔ فرمایا:۔

(۱) حق تعالیٰ نے اسباب کو پیدا کیا جن کی حیثیت گویا حجاب کی ہے جس نے ان کو حجاب سمجھا وہ ان ہی اسباب کی راہ سے حق تک پہنچا اور جس نے ان ہی اسباب کو رب بنا لیا وہ محروم ہوا۔ عربی کا فقرہ بڑا بلیغ تھا وهي (الاسباب) توصل اليه (الى الله تعالىٰ) كل من لم يتخذها حجابا، وهو يلقيه عند كل من اتخذها اربابا۔

اور فرمایا کہ،

شرک خفی جانتے ہو کیا ہے؟ اسباب پر بھروسہ یعنی اسباب جب سامنے ہوں تو دل ٹھکانے رہے اور نہ ہوں تو گھبرا اٹھے۔

فرمانے لگے کہ

"مومن" کی یہ سب سے بڑی دینی مصیبت ہے قرآنی آیت وما یومن اکثرھم باللّٰہ الا وھم مشرکون (سورہ یوسف) کی تلاوت فرماتے ہوئے شیخ نے کہا کہ، باب الاشارہ سے کہتا ہوں کہ اس میں شرک خفی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ایمان کے ساتھ جمع ہوتا ہے۔ واللّٰہ اعلم!

پھر تقریر کی کہ

مراد اس آیت میں اگر شرک سے شرک جلی ہو، تو ایمان کے ساتھ جمع کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ شرک جلی تو یہ ہے کہ غیر اللہ کو الٰہ بنانے میں خالق تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا جائے یہاں شیخ کے کلام میں کچھ گنجلک ہے (ص۵۹۳ ج ۴ میں دیکھ لینا چاہیئے) پھر حضرت معاذؓ والی حدیث کا ذکر کرتے ہوئے بڑی دقیق بات فرمائی:۔

اس میں ارشاد ہوا ہے کہ" ان یعبدوہ ولا یشرکوا بہ شیئاً، شیئ کا لفظ عام ہے اس لیے شرک خفی وجلی دونوں کو شامل ہوا، وعدہ یہ کیا گیا ہے کہ اس کی جزا یہ ہے کہ اذا فعلوا ذلك ان لا یعذبہم

شیخ نے کہا کہ

اسباب پر اعتماد اور بھروسہ کرنے والے اسی دنیا میں عذاب میں مبتلا رہتے ہیں بایں طور کہ اسباب جب تک سامنے رہتے ہیں تو اس تکلیف میں رہتے ہیں کہ اگر یہ غائب ہو گئے تو کیا ہو گا! اور جب غائب ہو جاتے ہیں تو اس وقت کی اذیت ظاہر ہی ہے۔

فرمایا کہ:۔ فھم معذبون علی کل حال فی وجود الاسباب وفقدھا — ہر حال میں دکھ اٹھاتے ہیں اسباب ہوں جب بھی نہ ہوں جب بھی۔

مگر جس نے شرک سے دل کو پاک کر لیا اور اسباب میں سے کوئی سبب اس کے خیال میں حق تعالیٰ کا شریک باقی نہ رہا تو بخیت (مطمئن) ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اسباب کا وجود اور عدم دونوں اس کے لیے برابر ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا بھروسہ جس پر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے جس کی صفت ہی یہ ہے کہ جہاں سے سان و گمان بھی نہ ہو وہاں سے چیزوں کو سامنے لائے وھو اللہ قادر علی تبیان اموره من حیث لا یحتسبون قرآن کی آیت بھی ہے ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب

تقویٰ معلوم کرنے کی علامت شیخ نے فرمایا کہ:-

"تقویٰ" کا تحقق آدمی میں ہوا ہے یا نہیں اس کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ روزی ایسی جگہ سے آنے لگے جہاں سے گمان بھی نہ ہو۔ اور جب تک ان ہی راہوں سے روزی ملتی ہے جہاں سے گمان ملنے کا ہو تو ابھی "تقویٰ" کی علامت اس میں قائم نہیں ہوئی ہے۔

شیخ نے اس کے بعد تنبیہ کی کہ

میرا مطلب یہ نہیں کہ اسباب کی راہ سے طلب وجستجو رزق کی لوگ ترک کر دیں کیونکہ اسباب کو تو حق تعالیٰ نے مقرر کیے ہیں۔ حق تعالیٰ کے مقررہ قانون سے اعراض تو خود خدا سے سرکشی ہے (کسی مجلس کے مذاکرہ سے یہ نقل کر رہا ہوں) بلکہ مقصد یہ ہے کہ دل کو دیکھے کہ اعتماد اور بھروسہ اس کا کس پر ہے، اللہ پر ہے یا اسباب پر ہے؟ یہ ایک ذہنی باطنی کیفیت ہے، ہر شخص اپنے باطن کے حال سے خود آگاہ ہے۔

اسباب کے وجود و عدم کا برابر ہو جانا تکمیل ایمان کی نشانی ہے شیخ نے فرمایا کہ:

مجھے نیند آ گئی خواب سے بیدار ہوا تو دو شعر جن سے پہلے میں واقف نہ تھا زبان پر جاری پائے۔

لا تعتمد الا علی اللہ	فکل امر بید اللہ
وھذہ الاسباب حجابہ	فلا تکن الا مع اللہ

بہرحال دل کو ٹٹولو اگر اسباب پر اس کا بھروسہ پاتے ہو تو اپنے ایمان کو چاہیئے کہ تم متہم کرو اور سمجھ لو کہ تم وہ آدمی نہیں اور اگر اسباب کا وجود و عدم تمہارے دل کے سامنے برابر ہو گیا ہو تو میں بشارت دیتا ہوں کہ ایسا مومن جو کسی کو اللہ کے ساتھ شریک نہیں کرتا وہ تم اب ہو گئے ہو۔ یعنی وما یومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون والے زمرہ سے تم خارج ہو گئے ہو اور بجائے اکثریت کے اقلیت میں آگئے ہو اس کے بعد اگر رزق لا یحتسب تمہارے سامنے آنے لگے تو مبارک ہو کہ تم "متقین" کی جماعت میں داخل ہو گئے!!

لطیف نکتہ اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ عادی اسباب کی راہ سے بھی روزی اگر مل رہی ہو مگر دل میں یہ احساس ہو کہ یہ روزی ان اسباب سے مجھے نہیں ملتی، تو تم نے سمجھا کہ یہ روزی کیا ہو گئی؟ جہاں سے گمان ملنے کا تھا وہاں سے نہیں مل رہی ہے۔ پس تم عادی اسباب سے روزی پاتے ہوئے اپنی اس قلبی کیفیت کی وجہ سے متقی باقی رہے۔ شیخ نے اس موقع پر "تقویٰ" کا ایک نیا مطلب اپنے مذاق کے مطابق بیان کیا کہ " اسباب پر اعتماد قائم ہو" حق تعالیٰ متقی کے قلب کو اس غلط اعتماد سے بچا لیتے ہیں یعنی وقایہ کرتے ہیں، وہ تقویٰ کا مادہ ہے۔ (ص ۵۹۴ ج ۴)

(شیخ کے بیان سے ذہن منتقل ہوا کہ وما یومن اکثرھم باللہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو خالق ماننے والوں میں بہت سے لوگ مشرک رہ جاتے ہیں یہ مراد نہیں ہے کہ الٰہ واحد ماننے والے بھی مشرک ہوتے ہیں فرخ الاختلاج)

(۸) قرآن کی جسمانی صورت کا نام محمد بن عبداللہ ہے

۶ نومبر ۱۹۵۰ء شیخ اکبر کی مجلس سعید میں مدت کے بعد آج حاضری سے برکت اندوز ہوا فرما رہے تھے قرآن میں ارشاد ہوا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ انک لعلی خلق عظیم اور حضرت عائشہ والی روایت میں ہے کان خلقہ القرآن (رسول اللہ کا خلق قرآن تھا) دونوں جگہ بجائے اخلاق کے "خلق" کا مفرد لفظ اسی لیے استعمال کیا ہے کہ تمام مکارم اخلاق کی جامع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک تھی پھر دیکھو قرآن کی صفت بھی "عظیم" قرآن ہی میں بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ کے خلق کی صفت بھی "عظیم" ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ " قرآن رسول اللہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن ہیں"

شیخ کے الفاظ تھے:-

فلا فرق بین النظر الیہ (قرآن) و بین النظر الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
(یعنی قرآن کا دیکھنا اور رسول اللہ کا دیکھنا ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں ہے)

فرمایا کہ :-

قرآن کو جسمانی صورت عطا کی گئی اسی کا نام محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہے۔

فرمانے لگے کہ :-

قرآن کلام اللہ اور کلام اللہ، اللہ کی صفت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی صفت ٹھہرے اسی لیے تو قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ اور یہ کہ ما ینطق عن الھویٰ۔

پھر درمیان میں کچھ آیت قرآنی ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطئا واقوم قیلا کے متعلق بعض اشارے شیخ نے کیے ہیں جن کا ذکر بعد کو کروں گا اس معترضہ جملہ کے بعد شیخ نے کہا۔

قرآن جب تک موجود ہے رسول اللہ موجود ہیں | قرآن جب تک موجود ہے اس وقت تک یہ خیال غلط ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے روپوش ہو گئے اور یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ آپ کی وارث "امت" میں قرآن کو جو اپنا "خلق" جس حد تک بنا رہا ہے گویا اس کی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر سے مبعوث ہوئے اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ رہنا یہی ہے۔ کہ آپ کی سُنّت زندہ کی جائے اور جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ کیا اس نے ساری انسانیت کو زندہ کیا کیونکہ انسانیت کاملہ کی مظہر اتم آپ ہی کی ذات مبارک ہے۔ فانہ مجموع الاتم و امین ناصح الاکمل۔

قرآن میں رات کے ناشئۃ کے متعلق جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "قیل" یعنی گفتگو کے لحاظ سے وہ "اقوم" ہے تو قرآن سے زیادہ مستحکم شئے اور کیا ہو سکتی ہے اور "وطاء" کے معنی اگر "تمہید" ہو تو قرآن ظاہر ہے جو جامع الکتب ہے ساری آسمانی کتابوں کا خلاصہ اور ان کے آخری ایڈیشن ہی کا نام تو قرآن ہے اور وطاء کے معنی اگر ثبات کے ہوں تو قرآن سے زیادہ ثابت و برقرار رہنے والی چیز اور کیا ہو

سکتی ہے کیونکہ ساری کتابیں آسمانی اس سے منسوخ ہوئیں اور وہ منسوخ نہ ہوا نیز جو کچھ آسمانی کتابوں میں تھا قرآن میں وہ بھی ہے اور جو ان کتابوں میں نہ تھا وہ بھی ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ سارے کمالات تھے جو تمام پیغمبروں کو عطا کیئے گئے۔ اور ایسے کمالات بھی موجود ہیں جو دوسروں میں نہ تھے اور یہی حال آپ کی اُمت کا بھی ہے کہ ساری اُمتوں کو جو کچھ ملا وہ بھی ان کو ملا اور جس سے دوسری اُمتیں محروم ہیں اُمتِ محمدیہ اس سے بھی سرفراز ہوئی۔

نماز میں شہود حق کا طریقہ | شیخ نے یہ بھی فرمایا کہ :-

نماز میں شہود حق تعالیٰ کی کوشش بمعاونت حق کی جاتی ہے بندہ عمل کا ڈھانچہ اور قالب تیار کرتا ہے اور شہود حق سے اس قالب میں روح پیدا ہوتی ہے ایاک نستعین کا ایک مطلب یہ بھی ہے۔

یہ بھی فرمایا کہ :-

حیات جو معفنات (سڑنے گلنے والی چیزوں) میں طبیعت پیدا کرتی ہے تو صرف احساس کا ظہور اس حیات سے ہوتا ہے لیکن جس حیات سے عمل صانع کی قوت پیدا ہو یہ الٰہی روح ہے۔

ایک نکتہ یہ بھی ارشاد ہوا کہ

نماز میں بندے کے سامنے نہ اپنی ذات رہنی چاہیئے اور نہ اس کا خیال کہ خدا نے اپنی صفات پر اس کو پیدا کیا ہے کہ اسی خیال سے "کبریائی" کا جذبہ آدمی میں ابھرتا ہے۔

(۹) محسنین کا اجر ضائع نہ ہونے کی توضیح | ۱۳ نومبر ۱۹۵۰ء شیخ ابن عربی کی مجلس قدس میں حضور کا شرف حاصل ہوا قرآنی آیت ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین کے متعلق فرمارہے تھے اور خاص حال میں فرمارہے تھے ساری گفتگو کا احاطہ دشوار ہے تاہم اپنی سمجھ میں جو بات آئی وہ یہی تھی کہ عمل کا احسان جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یہ ہے کہ عمل کے وقت حق تعالیٰ کے حضور کا احساس بندے میں پایا جائے خواہ یہ احساس ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے یا وہی گویا اللہ کو دیکھ رہا ہے۔

شیخ نے فرمایا کہ :-

بندے کی حیثیت سمجھو کہ مادّہ اور ہیولیٰ جیسی ہے گویا وہ مٹی ہے اور عمل کی حیثیت صورت کی ہے مثلاً مٹی کو پرندے کی شکل عطا کی جائے اور حضورِ احسانی کی حیثیت روح کی ہے یعنی مٹی سے بنے ہوئے پرندے میں روح پھونک دی گئی جیسا اس شکل میں عمل کا صدور بندے سے ہوتا ہے تو اب یہ جیتی جاگتی "شے" بن جاتی ہے اور قرآن کی مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے عمل کا اجر ضائع نہیں ہوتا یعنی ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

شیخ نے کہا کہ

یہ زندہ جیتا جاگتا عمل ہمیشہ عامل کے لیے استغفار کرتا رہتا ہے۔

آگے شیخ نے کہا کہ۔

من عمل عامل منکم من ذکر او انثیٰ بعضکم من بعض اس کے متعلق بھی "لا یضیع" کی اطلاع دی گئی ہے پس معلوم ہوا کہ "روح" یعنی احسان کے بغیر بھی حق تعالیٰ عامل کے عمل کو باقی رکھتے ہیں خواہ اچھا عمل ہو یا بُرا اسی لیے جب تائب توبہ کرتا ہے تو اس کے ہیئات اور بُرے اعمال کو حسنات کا قالب عطا کر دیا جاتا ہے۔

کل ماسوی اللہ حق تعالیٰ کا عرش ہے | ابھی یہ تقریر مکمل نہیں ہوئی تھی کہ کسی ضرورت سے کتاب بند کرنی پڑی صفحہ بھی یاد نہ رہا مجبوراً دوسری جگہ سے مضمون لینا پڑا دیکھو ص ۲۱۲ ج ۴۔ عرش پر گفتگو ہو رہی تھی۔ فرمایا کہ :-

ہمارے شیخ المعربی قرآنی آیت الرحمٰن علی العرش استویٰ کی تلاوت کرتے ہوئے "العرش" کے لفظ پر ٹھہر جاتے اور استویٰ لہ ما فی السماوات وما فی الارض وما بینہما وما تحت الثریٰ کی تلاوت اس کے بعد کرتے، کہا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے کل ما سوی اللہ حق تعالیٰ کا عرش ہے بکل شیٔ محیط کا مطلب بھی یہی ہے، ہر شے پر وہ مستوی ہے اور شانِ احاطت و علوِ حقیقی اسی کی ذات غنی و حمید کو ثابت ہے۔

...ینی بڑائی کا خیال بھی مہلک ہے۔ شیخ نے فرمایا :-
جن لوگوں کے قلوب میں علو کی جھلک پائی گئی اس کا منشا رحق تعالیٰ کا بھی نفاتی
علو ہے۔ مثلاً ان فرعون علا فی الارض یا تلک الدار الاخرۃ نجعلھا للذین
لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا سمجھنے کی بات یہ ہے کہ علو نہیں بلکہ
علو کا ارادہ بھی دارالاخرۃ کی عیشۃ راضیۃ سے آدمی کو محروم کر دیتا ہے خواہ اس
ارادے کو چاہنے والوں کو کامیابی حاصل ہو یا نہ ہو پس نتیجہ یہ ہوا کہ بندوں کا کام
یہ ہے کہ وہ اس واقعہ کا احساس اپنے اندر زندہ رکھے کہ وہ عبدیت اور بندگی
کے مقام پر ہے۔ علو میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے جو اس احساس کو اپنے اندر
بیدار رکھے گا، دوسری زندگی میں اس کو علو کا مرتبہ عطا کیا جائے گا۔

(۱۰) تحقیق کرامت ۹ جنوری ۱۹۵۱ء بہت دنوں کے بعد شیخ اکبر کی مجلس کا خیال آیا
حاضری آسان کی گئی کرامت پر گفتگو فرما رہے تھے۔ ذکر یہ تھا کہ اولیاء
کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جن سے کرامتیں ظاہر نہیں ہوتیں جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں بعض تو ان میں ایسے
ہوتے ہیں کہ مرتبہ حق تعالیٰ کے ہاں ان کا گو بلند ہوتا ہے مگر خرق عوائد کی قدرت ان کو عطا نہیں ہوتی اور
ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں قدرت تو اس کی مل جاتی ہے لیکن اظہار نہیں کرتے۔
پھر فرمانے لگے :-

ابوالسعود بن شبلی انہی بزرگوں میں تھے خود فرماتے تھے کہ ایک سال سے یہ قوت مجھے
عطا ہوئی ہے مگر اس کو استعمال نہیں کرتا۔ ابن شبلی کا بیان تھا کہ میری طرف سے حق تعالیٰ
سب کچھ کرتے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ پھر آپ کا کام کیا رہ گیا ہے تو بولے صرف دو
کام پنجوقتہ نماز اور موت کا انتظار مثال ہماری اس مرغی کی ہے جس کا منہ دانے
چگنے میں لگا ہوا ہے اور ٹانگ چلنے میں۔

شیخ نے پھر اپنا حال بیان کیا کہ :-

ان سطروں کو جب میں قلم بند کر رہا تھا تو دل میں آواز آئی حق نے سر میں خطاب کیا۔
مجھے جس نے وکیل بنا لیا اس نے اپنے معاملات کے انصرام پر مقرر کیا بس اس کو حق ہے کہ

مجھ سے دریافت کرے اور میرا کام ہے کہ حساب اس کو سمجھاؤں۔

شیخ نے کہا کہ

بات ہی الٹ جاتی ہے اور مراتب معکوس ہو جاتے ہیں جن بندوں کو اللہ تعالیٰ چن لیتے ہیں ان کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں۔

شیخ نے اسی موقع پر ایک فلسفی کا قصہ جو ان کے سامنے گزرا تھا بیان کیا کہ نبوت و معجزات کا منکر تھا نار ابراہیم کی تاویل غضب نمرود سے کرتا تھا۔ ایک صاحب بیٹھے تھے انگیٹھی رکھی تھی، موسم سرد تھا انگیٹھی سے انگارہ نکال کر فلسفی کے کپڑے پر ڈال دیا اور فلسفی انگارے کو الٹتا پلٹتا رہا۔ ہاتھ نہ جلا پھر انگارے کو انگیٹھی میں ڈال دیا۔ اور کہا کہ اب نکالو، ہاتھ فلسفی کا جلنے لگا۔ تب بولے کہ دیکھا تم نے آگ خود کچھ نہیں کرتی بلکہ حکم کی تابع ہے۔

اسی مجلس میں شیخ نے فرمایا کہ:۔

الحلاج وغیرہ پر جن علماء نے فتویٰ دیا تھا وہ ماجور تھے اور یہ بھی کہا کہ تکلیفی عقل جب تک باقی ہے شریعت کے قانون سے کوئی مستثنیٰ نہیں رہ سکتا۔ اگر شخصی معاملہ کسی کے ساتھ کیا گیا بھی ہو۔ جیسے اہل بدر کے ساتھ کیا گیا تو اس کا نتیجہ آخرت میں ظاہر ہوگا دنیا میں تو شریعت کا قانون سب پر نافذ ہوگا۔ (صفحہ ۴۶ ج ۲)

تحقیق "تفکر" ضرورت سے کتاب اس مقام پر بند کرنی پڑی۔ شیخ نے "فکر" پر دلچسپ تقریر کی ایک چیز سے پار ہو کر دوسری چیز تک پہنچنا۔ شیخ نے دعویٰ کیا ہے کہ یہی فکر کا مطلب ہے صنف بشری کی اس کو خصوصیت شیخ نے قرار دیا ہے۔

فرمانے لگے کہ:۔

موجودات میں غور و فکر اس لیے کرنا کہ خود وہ کیا ہیں، یا کن حقائق پر مشتمل ہیں آدمی اس کا مکلف نہیں ہے۔ بلکہ کس چیز پر وہ دلالت کر رہے ہیں اور ان سے راہ نمائی کس مسئلہ کی طرف ہوتی ہے موجودات کے متعلق یہی فکر مطلوب ہے پھر قرآنی آیت یتفکرون فی خلق السمٰوات کو پیش کر کے فرمایا کہ "سماوات وارض" کی آفرینش فکر کرنے والوں کو اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ جس کا علم ان کو پہلے سے نہ تھا قرآن

ہیں اسی کو ان کی زبان سے ادا کرایا گیا ہے۔ یعنی "ھذا باطلا" (رہے نتیجہ اے پروردگار تو نے اس کو نہیں پیدا کیا ہے) پھر یہی فکر شیخ فرماتے ہیں ان کے مشاہدے کے سامنے جہنم کو لے آئی اسی لیے "فقنا عذاب النار" سے پناہ چاہی گئی۔

(۱۱) تحقیق "منزل" و "منزلت"

۲۷ فروری ۱۹۵۱ء شیخ محی الدین ابن عربی کی مجلس اُنس و معرفت کا خیال آیا۔ حاضر ہوا آج "منزل اور "منزلت"، مکان اور مکانت کے فرق کو بیان کرتے ہوئے شیخ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض عرفان انگیز باتیں سنائیں منزل اور مکان سے مراد شیخ نے فرمایا کہ حسی مقام ہے۔ اور معنوی مدارج کی تعبیر، شیخ نے کہا کہ میں منزلت اور مکانت۔ کے الفاظ سے کرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسی مقامات جن کا آخرت میں مشاہدہ کرایا جائے گا آنکھوں سے لوگ ان کو دیکھیں گے، شیخ نے فرمایا کہ دوسرے عالم میں یہ وہی مقامات ہیں جو حق تعالیٰ کے بساط قرب اور مقعد صدق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا جائے گا اور زور دعام یعنی حق تعالیٰ اپنی زیارت جس بڑے دن کرائیں گے اس تجلی کے موقع پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند مقام کا معائنہ دیکھنے والوں کو کرایا جائے گا، رہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منزلت یعنی آپ کا معنوی مرتبہ شیخ نے فرمایا اس کے ظہور کا محل علم ہے جب تک خود حق تعالیٰ ہی اس سے لوگوں کو واقف نہ کریں کوئی آپ کے معنوی مرتبہ کو جان نہیں سکتا۔

مقام محمود شیخ نے اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ "مقام محمود" بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص مقام ہے۔ فرشتوں اور فرشتوں کے سوا گناہ گار بندوں کے لیے شفاعت کی اجازت جن لوگوں کو دی جائے گی ان ہی کی شفاعت کے دروازے کی تعبیر "مقام محمود" کے لفظ سے کی گئی ہے۔ سب سے پہلے اس دروازے کو رسول اللہ کھولیں گے اسی لیے یہ آپ ہی کا مقام خاص ہے آپ کے طفیل میں دوسروں کو بھی موقعۂ شفاعت ملے گا۔

مقام الوسیلہ پھر اسی طرح "الوسیلہ" بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ایک مقام کا نام ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ یہ وہ جگہ ہے جس سے اوپر کوئی جگہ کسی کے لیے نہیں ہے اسی کے ساتھ کہنے لگے کہ یہ "الوسیلۃ" کا مقام عجیب بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی اُمت کے سوال اور طلب پر

عطا کیا جائے گا یعنی اُمت پر سعادت کی جو راہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کھلیں اس احسان کے زیر اثر امت حق تعالیٰ سے طلب کرتی ہے[1] کہ اس کے پیغمبرؐ کو "الوسیلہ" کا مقام عطا فرمایا جائے گویا امتنان و تشکر کی ایک عملی شکل ہے جو امت کی طرف سے پیش ہوگی۔

تشکلِ اعمال | پھر شیخ ایک دلچسپ بیان میں مشغول ہوئے واللہ اعلم بالصواب اپنے کشف سے یہ باتیں کر رہے تھے یا قرآن و حدیث کے کلیات سے ان نتیجوں کو انہوں نے پیدا کیا تھا۔ بہرحال یہ فرماتے تھے کہ دوسرے عالم میں پہنچنے کے بعد ایک دلچسپ تماشا پیش ہوگا یعنی سارے اختیاری اعمال و افعال خواہ نیکو کاروں کے ہوں، یا بدکاروں کے، دیکھا جائے گا کہ انہوں نے جسدی قالب اختیار کر لیا ہے اور جن سے یہ اعمال صادر ہوئے ہیں ان کو وہ اچھی طرح جانیں گے اور پہچانیں گے بھی، اعمال و افعال کے جسدی قالب میں بھی حق تعالیٰ کی طرف سے اس کا تقاضا پیدا ہوگا کہ جن لوگوں سے وہ صادر ہوئے ہیں ان کو تلاش کریں اور جستجو و تلاش کے اس تقاضے کی تکمیل میں بڑی سرگرمی ان سے ظاہر ہوگی پھر نیکو کاروں کے اعمال و افعال کے جسدی قالبوں کو دیکھا جائے گا کہ ان کے داہنی طرف ایک راستہ کھلا ہوا ہے اسی راستہ پر وہ چل پڑیں گے چلتے ہوئے وہ ان لوگوں تک پہنچ جائیں گے جن سے وہ صادر ہوئے تھے جن سے جو عمل اور فعل صادر ہوا ہے، ان کو ان کا فعل و عمل پہچان لے گا، اور ان کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔ تب عمل کرنے والے اُن پر سوار ہو جائیں گے جو رحمت حق کے مرکز تک اپنے عمل کرنیوالوں کو پہنچا دیگا۔

شیخ نے کہا کہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ نظارہ بدکاروں اور ان کے اعمال و افعال کا ہوگا جسدی قالب اختیار کرنے کے بعد بدکاروں کے یہی اعمال و افعال اپنے آگے بجائے کسی ایک راستہ کے طرح طرح کی گلیاں اور کوچوں کو پائیں گے جن میں بعض بعض سے پھوٹ پھوٹ کر مختلف سمتوں کی طرف دکھائی دیں گے کہ وہ چلے گئے ہیں۔ اعمال و افعال کے ان جسدی قالبوں کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ کس راستہ کو دھریں اور کدھر جائیں تاکہ جن سے وہ صادر ہوئے ہیں ان تک پہنچ جائیں۔ شیخ نے فرمایا کہ راستوں کی یہ گوناگوں اور ان کی پیچیدگیوں کا مطلب تم نے سمجھا کیا ہے؟ خود کہنے لگے کہ یہ حق تعالیٰ کی شان رحمت

---

[1] اذان کے بعد کی دعا میں ہم حق تعالیٰ سے عرض کرتے رہتے ہیں:-

اللّٰھمّ اٰت محمدا الوسیلۃ والفضیلۃ وابعثہ مقاما محمودا۔ اے اللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو الوسیلہ اور الفضیلہ عطا فرما اور "مقام محمود" پر مبعوث فرما۔

کے ظہور کی ایک شکل ہوگی جن سے بدکار اور شقی بھی محروم نہیں ہیں، بہرحال جب پتہ نہ چلے گا کہ کدھر جائیں اور کس گلی کو چلنے کے لیے اختیار کریں تب اعمال و افعال کے یہی جسدی قالب حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں گے۔ دعاء اور ذکر میں مشغول ہونے کے بعد پھر ان ہی گلیوں میں وہ پھیل جائیں گے پھر جن سے ان اعمال و افعال کا صدور ہوا۔ بعض تو ان میں ایسے ہوں گے کہ ان کے پانے میں ان کے اعمال و افعال کے جسدی قالب کبھی کامیاب نہ ہوں گے اور بعض بھٹکے بھٹکاوے ان لوگوں تک پہنچ جائیں گے جن سے وہ صادر ہوئے تھے ان کو وہ پہچان لیں گے یہ ملاقات ان کی بالکل اتفاقی اور اچانک ہوگی۔ دیکھنے کے ساتھ ہی لپٹ پڑیں گے اور جن سے وہ صادر ہوئے ہیں ان سے کہیں گے تمہاری جستجو میں ہم بہت پریشان و حیران ہوئے تم نے تو ہمیں تھکا تھکا مارا اور کہیں گے تو لو اب جھکو اپنی پیٹھ پر ہمیں سوار کر لو۔ وہ سوار ہو جائیں گے اور بالآخر اللہ کی رحمت سے ان کا بھی کبھی نہ کبھی ٹھکانہ[1] بن ہی کر رہے گا۔

جیسا کہ دستور ہے اس کے بعد شیخ نے ذرا زیادہ بلند گفتگو شروع کی۔ جب تک صوفیہ کی علمی اصطلاحوں سے صحیح واقفیت نہ ہو اس کا سمجھنا دشوار ہے اس لیے اس حصہ کو ترک کر کے جب سادہ گفتگو شیخ نے شروع کی اسی کو قلم بند کرتا ہوں۔ اس خاص گفتگو کے بعد فرمانے لگے کہ

سیادت رسول اکرمؐ ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام چونکہ سیادت اور سرداری ہے یعنی آدم کی ساری اولاد کے آپؐ سید و سردار ہیں اور سب آپ کے ماتحت اور پیچھے چلنے والوں میں ہیں تو اسی سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ آپ کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ رعایا حاکم سے کیا مقابلہ کرے گی چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیادت اور پیشوائی و سرداری کا یہ اعزاز اسی زمانہ میں عطا فرمایا جا چکا تھا جب حضرت آدم ابھی کیچڑ اور پانی یعنی "بین الماء والطین" تھے اسی سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ دنیا میں جو بھی کسی قانون اور آئین کے ساتھ اٹھایا گیا خواہ وہ قانون الٰہی ہو یعنی وحی پر اس کی بنیاد قائم ہو یا عقل و فکر کی راہ سے تیار ہوا ہو ہر ایک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے امداد ملتی رہی ہے۔ اور پہلا شخص جو اس امداد سے

---

[1] شیخ کا مشہور مذہب ہے کہ جہنمی جہنم میں رہتے رہتے بالآخر ایک ایسے حال تک پہنچ جائیں گے کہ بجائے تکلیف کے جہنمی زندگی سے ان کو ایک قسم کی مناسبت پیدا ہو جائے گی۔ گویا بجائے الیم کے آخر میں شیخ کے نزدیک جہنمی زندگی صرف "عذاب مبین" کی شکل بن کر رہ جائیگی یعنی ذلت و خواری کی زندگی میں بسر کرنے کی عادت ہو جائیگی۔ بہرحال شیخ کے اسی خیال سے اس آخری فقرے کا تعلق ہے۔ ۱۲

مستفید ہوا وہ خود حضرت آدم علیہ السلام ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ خلیفہ بنائے گئے۔ حضرت آدم کو اسمار کے علم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خصوصیت سے امداد فرمائی تھی جس کا اظہار "اوتیت جوامع الکلم" (مجھے جوامع الکلم دیا گیا) کے الفاظ میں فرمایا تھا۔ حضرت آدمؑ کے بعد خلفاء کا سلسلہ جاری رہا تاآنکہ وہ وقت بھی آگیا جو جسمانی قالب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا وقت تھا۔ اور اس قالب میں ظہور کی ضرورت اس لیے ہوئی تاکہ آپ کا جو پیغام روحانی وجسمانی دونوں دائروں میں ہے وہ ظاہر ہو جائے۔ جب جسمانی قالب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو گویا یوں سمجھو آفتاب نکل آیا۔ سارے ستاروں کی روشنی آفتاب کی روشنی کے سامنے ماند پڑ گئی بلکہ آفتاب ہی کی روشنی میں ان کی روشنیاں گویا کھپ گئیں اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ سے پہلے "شریعت" کو جن لوگوں نے پیش کیا تھا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہونے کی حیثیت سے پیش کیا تھا، اسی لیے جب وہ خود صاحب شریعت تشریف لے آئے تو جس حکم کو چاہا رکھا جسے چاہا منسوخ کر دیا اور گو انسانی اور ناری (یعنی جنی) ہستیاں سب آپ ہی کی اُمت ہیں خواہ آپ سے پہلے پیدا ہوئی ہوں لیکن جسمانی قالب میں جن لوگوں کے اندر آپ ظاہر ہوئے ان کو ایک قسم کی خصوصیت اُمت ہونے میں حاصل ہوئی اور اسی خصوصیت کی بنیاد پر "خیر امت" وہ قرار پائے کیونکہ ان لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روحانی وجسمانی دونوں بشارت کے لحاظ سے ظاہر ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی بشارت میں ظاہر ہونے سے پہلے آپ کی شریعت جن لوگوں نے نیابتاً پیش کی تھی ان کا جو مقام اور درجہ ہے یہی مقام اور یہی درجہ آپ کی اس اُمت کو حاصل ہوا جس میں جسمانی وروحانی دونوں بشارتوں کے لحاظ سے آپ ظاہر ہوئے، اجتہاد سے نتائج پیدا کر کے "شریعت" کی تفصیل وتشریح کا اختیار اس اُمت کے علماء کو جو دیا گیا ہے اس میں وہی رنگ "تشریع" کا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے پیغمبروں کی خصوصیت ہے۔

مجتہد کا نتیجۂ اجتہاد حق ہی ہوتا ہے! شیخ نے اس موقعہ پر ایک عجیب بات کہی کہ اجتہاد کی شرعی اجازت علماء اسلام کو جب مل چکی ہے تو اپنے اجتہاد میں جن نتیجوں تک وہ پہنچیں گے اسی اجازت ہی کی بنیاد پر تو پہنچیں گے پھر ان کے غلط ہونے کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ بلکہ جس نتیجہ تک جو مجتہد بھی پہنچا ہے اس لیے حق ہے کہ حق کا مطلب ہی اس بنیاد پر ہے کہ اجازت یافتہ مجتہد اس نتیجہ تک پہنچا ہے

رہا حدیثوں میں جو آیا ہے کہ مجتہد کبھی غلطی کرتا ہے تو اس غلطی کا تعلق ان نتیجوں سے ہے جن کے متعلق پیغمبر فیصلہ کر چکے ہوں اور مجتہد کو اس فیصلہ کی خبر نہ تھی۔ اس نے اجتہاد سے کام لیا اور اتفاقاً ایسے نتیجہ تک پہنچا جو اس کے فیصلہ کے خلاف تھا اور اسی کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ باوجود غلطی کے اجتہاد کا ثواب اس کو پھر بھی ملے گا۔[1]

ہبوط آدم پاداش جرم نہیں کام کی بات شیخ کی مجلس میں آج یہ بھی ہاتھ آئی، سلسلہ گفتگو میں حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر پر پہنچ کر فرمانے لگے کہ زمین میں ہبوط اور اترنے کا حکم ان کو جو دیا گیا تو یہ دیکھ کر کہ جرم کے ارتکاب کے بعد یہ حکم چونکہ ان کو دیا گیا تھا عموماً یہ خیال کر لیا گیا کہ یہ جرم کی سزا ان کو دی گئی۔ شیخ نے فرمایا کہ مگر میں پوچھتا ہوں کہ آدمؑ جن کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی مٹی ہی کے کرے میں ان کا پہنچنا جلاوطنی کی سزا ہوئی۔ یا اپنے وطن کی طرف واپسی کی یہ شکل ہے؟ اور ہے بھی کچھ یہی بات آخر جرم کے متعلق جب قرآن ہی میں "فتاب علیہ" (یعنی خدا نے آدم کی توبہ قبول کی) کی خبر دی گئی بلکہ سورۂ طٰہٰ میں توبہ کے ساتھ "ثم اجتباہ ربہ" (چن لیا آدم کو خدا نے) کی اطلاع بھی موجود ہے تو معاف شدہ جرم کی سزا کے معنی کیا ہو سکتے ہیں؟ نیز قصور تو آدم نے کیا تھا پھر ارضی زندگی اگر سزائی زندگی ہے تو ان کی اولاد بے چاری سے کب جرم سرزد ہوا تھا۔ جو اس ناکردہ جرم کی سزا بھگت رہی ہے) شیخ نے فرمایا کہ آدم کا وطن زمین کا کرہ بنایا جائے گا۔ علاوہ اس بات کے کہ اسی زمین کی مٹی سے وہ پیدا ہوئے تھے یوں بھی "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" (میں زمین پر خلیفہ بنانیوالا ہوں) کے الفاظ میں جس ارادہ کا اظہار حق تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے کیا تھا اس سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے کہ زمین کی خلافت کسی جرم کا نتیجہ نہ تھی۔

---

[1] عام کتابوں میں اجتہادی نتائج کے متعلق لکھا ہوا ہے کہ اختلاف کی صورت میں کوئی ایک ہی ان میں حق ہو سکتا ہے۔ لیکن ارباب تحقیق کے نزدیک صحیح مسئلہ وہی ہے جو شیخ نے فرمایا، ہاں! خطا و صواب کے متعلق شیخ نے جو خیال ظاہر کیا ہے بعض علماء بجائے اس کے یہ کہتے ہیں کہ کسی واقعہ کی تحقیق مثلاً جس پر چوری کا دعویٰ کیا گیا وہ چور ہے یا نہیں اس حدیث کا تعلق اسی قسم کے مقدمات سے ہے جن میں دو اجر حاکم کو اس وقت ملیں گے جب چوری کی سزا اسی کو دی جو واقع میں چور تھا اور اجتہادی غلطی سے جو چور نہ تھا اگر فیصلہ اس کے چور ہونے کا حاکم دے تو ایک اجر کا مستحق ہو گا۔ ۱۲

(۱۲) شیخ اکبرؒ کے چند اکابر

۲؍شوال ۶۳۷ھ عید کی ملاقات کے لیے شیخ اکبرؒ کی خدمت میں حاضری کی آرزو پیدا ہوئی۔ فرما رہے تھے۔

"میں اسپین (اندلس) کے شہر اشبیلیہ میں جب تھا تو وہاں چند خاص بزرگوں سے ملاقات ہوئی ایک ان میں ابو یحییٰ صنہاجی تھے ظاہری بینائی سے محروم تھے۔ شہر میں زبیدی مسجد میں مقیم تھے ان کی خدمت میں اس وقت تک رہا جب تک کہ ان کی وفات نہ ہوئی۔ وفات میرے سامنے ہوئی۔ شہر کے باہر پہاڑی پر ایک بلند جگہ تھی ان کے مدفن کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کیا گیا۔ پہاڑی کی اس چوٹی پر ہمیشہ تند و تیز ہوا چلتی رہتی تھی لیکن ہم لوگ جب جنازہ لے کر پہنچے راستہ میں تو خاصی دشواری ہوئی چڑھائی کی وجہ سے بھی اور ہوا کی شدت کی وجہ سے بھی لیکن جوں ہی پہاڑ پر پہنچ کر لوگ قبر کھودنے میں مصروف ہوئے ہوا اچانک بند ہو گئی۔ اس وقت تک بند رہی جب تک دفن سے ہم لوگ فارغ نہ ہوئے تھے ادھر فراغت سے ہم لوگ واپس ہونے لگے پھر وہی جھکڑ کا زور بندھا۔ لوگوں کو اس قدرتی کرشمہ پر تعجب ہوا۔

ان ہی لوگوں میں ایک صاحب صالح بربری بھی تھے اور ایک صاحب کا نام عبداللہ الشرقی تھا ایک اور بزرگ ابوالحجاج یوسف شبرلی تھے۔

صالح بربری شہر اشبیلیہ کی مسجد الرطندہ میں مقیم تھے۔ چالیس سال تک اسی مسجد میں ان کا قیام رہا۔ ابو عبداللہ الشرقی کا حال بھی عجیب تھا میں نے ان کے متعلق عجیب باتوں کا مشاہدہ کیا ایک مکان جس میں وہ رہتے تھے پچاس سال تک وہ اسی میں رہے لیکن اس عرصہ میں چراغ اس گھر میں کبھی نہ جلا۔ ابوالحجاج یوسف، اشبیلیہ ضلع کے مشرقی سمت کی ایک آبادی شبرل میں رہتے تھے۔ یہ ان لوگوں میں تھے جو پانی پر چلتے تھے۔ روحوں سے ان کی ملاقات ہوتی تھی ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع مجھے براہ راست میسر آیا۔

شیخ نے آج فرمایا کہ اپنی کتاب "الدرۃ الفاخرہ" میں ان بزرگوں کا حال میں نے لکھا ہے۔ اس کتاب میں ان ہی بزرگوں کا تذکرہ میں نے کیا ہے جنہوں نے آخرت کی راہ مجھے دکھائی۔ یہ چاروں صاحب ان ہی بزرگوں میں تھے۔

شیخ نے فرمایا کہ قرآنی آیت "یدبر الامر، یفصل الآیات" (اللہ تعالیٰ ہی ہر کام کو ٹھیک کر رہے ہیں اور نشانیوں کو کھولتے رہتے ہیں۔) ان بزرگوں کا تعلق اسی قرآنی آیت سے تھا۔

ہر ذرہ کائنات "آیۃ اللہ" ہے فرمانے لگے کہ آیات اور نشانیوں کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ ہیں جو کبھی کبھی عادت اور دستور عام کے برخلاف ظاہر ہوتی ہیں، عوام الناس صرف ان ہی کو "آیات" خیال کرتے ہیں۔ مگر جن بزرگوں کا میں نے ابھی ذکر کیا ان کے نزدیک آیات، قدرت کے ان ہی غیر معمولی مظاہر کا نام نہ تھا۔ بلکہ جو کچھ بھی یہاں ہے سب ان کے نزدیک آیات اور نشانیاں ہی نشانیاں " فالعالم کله عندهم بالآیات " (یعنی سارا عالم ان کے نزدیک (حق تعالیٰ) کے کھلے کھلے پتے اور نشانات ہیں) ورنہ عوام تو صرف غیر معمولی نشانیوں ہی کو آیات اللہ قرار دیئے ہوئے ہیں۔

شیخ نے فرمایا کہ عام آیات اور نشانیوں کے متعلق یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر ایک کے لیے وہ آیات معین ہیں خود قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان میں ان لوگوں کے لیے آیات ہیں جو عقل والے ہیں اسی طرح قرآن میں بعض نشانیوں کے متعلق فرمایا گیا کہ ان کو آیات وہی سمجھتے ہیں جو اولوا الالباب یعنی مغز والے ہیں بعض کے متعلق فرمایا گیا جو اولی النہیٰ ہیں، ان ہی کے لیے آیات ہیں،

اسی طرح قرآن میں آیات للمومنین، آیات للعالمین، وغیرہ جو الفاظ ہیں ان فروق کو سمجھنا چاہیئے لوگ اس نکتہ سے عموماً غافل ہیں مثلاً جہاں فرمایا گیا کہ عالمین کے لیے آیات ہیں۔ اس سے مراد میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ ہر وہ چیز ہے جو عالم کا مصداق بن سکتی ہے۔

(۱۳) ذات و صفات الٰہی کا ادراک ناممکن ہے

شیخ محی الدین ابن عربی کی مجلس فتوحات میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

فرماتے تھے کہ ذرا دیکھنا اس شخص کو جو عالم کی کسی معمولی سی چیز کی ذات کی تحقیق سے معذور ہے وہی حق سبحانہٗ کی ذات و صفات کے متعلق عقلی تیر چلاتا ہے حالانکہ اسی سے ذرا دریافت کرو کہ تمہارا بدن جو نظر آ رہا ہے اس میں دیکھنے، سننے، سونگھنے کی قوتوں کے ماسوا کوئی مزید چیز بھی تمہارے اندر ہے جو ان صفات کا منشاء ہے کیا وہ جوہر ہے؟ عرض ہے؟ ایک ہے؟ چند ہے؟ شرط یہ رکھو کہ جواب عقلی دلائل کی روشنی میں دے۔ یقین مانو! کہ کسی پہلو کو عقلاً وہ متعین نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ مسئلہ کہ مرنے کے بعد روح باقی رہتی ہے یا معدوم ہو جاتی ہے محض عقل کے سہارے پر اس کا بھی قطعاً کوئی متعین جواب نہیں مل سکتا۔ شیخ نے فرمایا کہ اور باتیں بنانے والے اس سلسلہ میں عقلی باتیں جو بناتے ہیں سب قابلِ اعتراض ہیں۔ اس صحیح بنیاد کسی کی نہیں ہے۔ عربی کے الفاظ شیخ کے یہ تھے " کل ما اتخذ دلیلاً فی ذلک

مدخول لا یقوم علی ساق"

صحیح راہ محض اتباعِ شریعت ہے | شیخ نے فرمایا کہ صحیح طریقہ اس راہ میں یہی ہے کہ عقل سے مایوس ہوکر شریعت کا دامن تھام لیا جائے اور دانشمند وہی ہے جو اپنے اوقات عزیز کو ان ہی باتوں میں صرف کرتا رہے۔ جن کا مطالبہ اس سے کیا گیا ہے اور جن کی تعمیل و تکمیل کا وہ ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ فرمایا:۔

فان المدۃ یسیرۃ والانفاس	وقت بہت کم ہے اور ہر سانس جو چلی جارہی
نفائس وما مضی منہا لا یعود۔ ۱۱۲/۳	ہے قیمتی ہے۔ جو گزر گئی پھر واپس نہ ہوگی۔

پس (شریعت نے ہمیں جو کچھ بتایا ہے وہ یہی ہے) کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ الٰہ ہے اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔

ماہیت ذاتِ الٰہی کا کھوج ایمانی راہ سے دوری ہے | پھر فرمایا:۔

اے اللہ کے دوست کبھی اللہ تعالیٰ کی ماہیت یعنی وہ کیا ہے، اس کی کیفیت یعنی وہ کیسا ہے؟ اس کی کمیت یعنی وہ کتنا بڑا ہے، لمبا ہے چوڑا ہے؟ ان سوالوں کو ہرگز ہرگز اپنے دل میں نہ اٹھانا۔ اگر ایسا کروگے تو جن باتوں کے ذمہ دار اور مکلف بنائے گئے ہو، ان سے ہٹ جاؤگے اور چاہیئے کہ ایمان کی راہ اختیار کرو اور حق تعالیٰ نے جو باتیں تم پر فرض کی ہیں ان کی تعمیل کرو اور صبح و شام اللہ کی یاد میں لگے رہو۔ اور تمہیں تسبیح و تہلیل کے جو الفاظ بتائے گئے ہیں انہیں دھراتے رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ ہاں اگر ایسا کرتے رہوگے تو اللہ اپنے علم سے تمہیں جو کچھ دینا چاہیں گے دیں گے چاہیئے کہ اپنی عقل، اپنے دماغ کو حاضر رکھو اور جو وہاں سے ملے اس کو قبول کرنے کے لیے تیار رہو۔ یہی کام کی بات اور نفع بخش طریقہ ہے۔ یہی وہ نور اور روشنی ہے جس سے اللہ تعالیٰ دلوں کو زندہ فرماتے ہیں۔ جب یہ نور تمہارے اندر چمک اٹھے گا اور اسی کے ساتھ چلتے پھرتے رہوگے تو شکوک و شبہات تمہارے خود بخود چھٹتے چلے جائیں گے جو عقلی گورکھ دھندوں میں پھنسنے والوں کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ نور کا ظہور جس جگہ پر ہوتا ہے تاریکی وہاں سے خود بخود بھاگ جاتی ہے۔

غور کرنا چاہیئے کہ عقلی دلائل سے بھی واقعی دلوں میں اگر نور پیدا ہوتا ہے تو پھر شکوک و شبہات باقی کیوں رہتے ہیں۔ یاد رکھو کہ نور سے تو تاریکی کا ازالہ ہوتا ہے لیکن تاریکی سے نور کا ازالہ ضروری

نہیں ہے۔

الحاصل متکلمین کا طریقہ کہ ذات وصفات حق کے متعلق عقلی راہوں سے باتیں کرتے ہیں ان سے نہ نور پیدا ہوتا ہے نہ روشنی۔

شیخ نے اس کے بعد معتزلہ اور متکلمین کے مختلف طبقات کا ذکر کرکے فرمایا کہ باہم ان ہی میں اختلاف نہیں ہے بلکہ ہر فرقے کے ائمہ بھی مختلف مسائل میں جن کی حیثیت اصولی ہوتی ہے مختلف نظر آتے ہیں۔ مگر دیکھنا، حضرات انبیاء اور رسل علیہم السلام اوّل سے آخر تک اصولی امور میں ایک دوسرے کے ہمنوا ہیں۔ اگر ان میں اختلاف ہوتا ہے تو معمولی مولویوں کے معتقدوں نے ان کی باتیں جیسے نقل کی ہیں چاہیئے تھا کہ پیغمبروں کی امتیں بھی اپنے اپنے پیغمبر کے خاص خاص اختلافی نظریات کو نقل کریں لیکن ایسا نہیں ہوا۔

متکلمین اور متبعین کا فرق فرمایا کہ ارباب تقویٰ، اہل کشف جو انبیاء علیہم السلام کے صحیح پیرو ہیں ان کا حال بھی یہی ہے بس —— اے بھائی! قرآن میں جو فرمایا گیا ہے کہ غیر اللہ کی طرف سے قرآن اگر اترتا تو اس میں اختلاف ہوتا اسکی وجہ یہی ہے کہ فکر ونظر والوں کا حال ہر وقت ایک جیسا نہیں ہوتا کبھی سوچتے ہیں اور ایک نتیجہ تک پہنچتے ہیں اور پھر غور کرتے ہیں تو بالکل مخالف نتیجہ ان کے سامنے آتا ہے لیکن نور اللہ میں چلنے والے کی حالت یہ نہیں ہوتی۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ افکار وخیالات ہر شخص کے اس کے شخصی مزاج کے تابع ہوتے ہیں مزاجوں میں چونکہ اختلاف ہے اس لیے فکری ونظری نتائج میں بھی اختلاف کا ہونا ضروری ہوا۔

(۱۴) زندگی کے حالات کے مطابق موت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں

۱۱ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ، کل بقرعید کی نماز ہوئی آج جمعہ کا دن ہے۔ جی چاہا کہ شیخ اکبر کی مجلس میں پہنچنے کا شرف حاصل کیا جائے۔ فرما رہے تھے کہ:

آدمی کا جو حال موت سے پہلے ہوتا ہے اسی حال کے مطابق موت کے بعد آثار کا ظہور ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو صرف بندہ بن کر جیتا ہے تو آخرت میں وہی مطلق العنان بادشاہ بن کر نمایاں ہوتا ہے اسی طرح دنیا میں بادشاہی اور مالک بننے کا شعور جس میں قائم رہتا ہے خواہ اپنے ہاتھ پاؤں، ناک، کان وغیرہ اعضاء ہی کا مالک وہ اپنے کو کیوں نہ سمجھتا ہو، تو اس کا اثر آخرت میں محسوس کریگا

یعنی اسی حد تک آخرت کی زندگی میں ملک سے وہ اپنے آپ کو محروم پائے گا۔

پس اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ آخرت میں سب سے زیادہ عزت والا وہی ہوگا جو دنیا کی زندگی میں حق تعالیٰ کے آگے انتہائی ذلت۔ بے پڑا ہوا ہے۔ یعنی واقع میں خدا کے سامنے اپنی ذلت کا احساس مسلسل اس میں زندہ رہے۔ اسی طرح آخرت میں اس سے زیادہ ذلیل اور خوار کوئی نظر نہ آئے گا جو دنیا میں عزت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ کر مرا ہو۔ شیخ نے فرمایا مطلب میرا یہ نہیں ہے کہ یہاں جو بادشاہ بن کر رہا وہ آخرت میں ذلیل بن کر اٹھے گا بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنی عزت اور برتری کا خبط جس میں سمایا ہوا اس کے سامنے یہ صورت آخرت میں پیش آئے گی اور ذلت کے سلسلہ میں بھی یہی مطلب ہے کہ دل میں اپنی ذلت کا احساس ہو (ورنہ دل میں فرعونیت کا مالیخولیا ہو اور بظاہر لوگوں کے سامنے جو بادر کراتا پھرتا ہو کہ میں تو ذلیل ترین مخلوق اپنے آپ کو سمجھتا ہوں (اس کی ذلت ذلت نہیں ہے)

اسی طرح دنیا میں ممکن ہے کسی علاقہ میں بادشاہی کا اقتدار کسی کو حاصل ہو لیکن دل میں حق تعالیٰ کے سامنے بجز ایک ذلیل ترین بندے کے اپنے آپ کو وہ اور کچھ نہ سمجھتا ہو۔ (تو آخرت میں ایسے بادشاہ کے لیئے بادشاہی ہے۔)

الغرض دنیا میں حق تعالیٰ نے بندے کو کس مقام پر رکھا ہے دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے بلکہ اندر میں اس کے احساس کی نوعیت کیا ہے۔ حق تعالیٰ کے مقابلہ میں ذلت و خواری، محتاجی و مسکنت کے احساس کے ساتھ اپنی سانس زمین کے خاکی کُرّے پر پوری کرے گا وہ دوسری زندگی میں عزت ہی عزت پائے گا۔ اور یہاں کی زندگی میں اپنی برتری کا جنون جس حد تک جس میں زیادہ ہوگا اسی پیمانے پر آخرت کی زندگی میں اپنی کہتری اور خواری کا مشاہدہ اس کو کرایا جائے گا۔

شیخ نے فرمایا کہ میں نے جو یہ کہا کہ ذلت کے احساس کے ساتھ مرنے والا مرنے کے ساتھ اپنی عزت کو اپنے آگے پائے گا اس کا تماشہ بعض لوگوں کو موجودہ زندگی میں بھی کرایا گیا ہے۔

شیخ عبدالکریم ابن ہوازن القشیری نے اپنی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک آدمی اپنی قبر میں دفن کیا جا رہا تھا جب دفن کرنے والے نے کفن کو کھول کر چاہا کہ مردے کے گال سے کپڑے کو ہٹا کر مٹی پر رکھ دے کہ اچانک مردے کی زبان سے آواز آنے لگی۔

"ارے یہ کیا کر رہے ہو جس نے مجھے عزت بخشی ہے اسی کے آگے مجھے ذلیل کر رہے ہو"

شیخ نے فرمایا کہ مجھے خود اپنے رفیق عبداللہ الحبشی کے متعلق یہ مشاہدہ کرایا گیا ہے کہ غسال جس وقت ان کو غسل دینے لگا تو باوجود مردہ ہونے کے سنا گیا کہ غسال سے کہہ رہے تھے کہ "ہاں بس مجھے نہلاؤ" موت کے بعد زندگی کے ان آثار کا جو تجربہ کبھی کبھی کرایا گیا ہے تو شیخ نے فرمایا کہ یہ اس زندگی کا مدار نہیں ہوتا جس سے مردہ محروم ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہ عام زندگی جس کی وجہ سے ساری کائنات حق تعالے کی تسبیح و تہلیل میں مشغول ہے، مردہ سے زندگی کے ان مظاہر کا ظہور اسی عام زندگی کا ثمرہ ہے۔

شیخ نے فرمایا کہ تجربہ تو اس کا بھی کیا گیا ہے کہ عبادت کے اس خلوت خانہ کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ باہر سے آ کر کوئی ان کی مشغولیت میں خلل انداز نہ ہو۔ تو دیکھا گیا کہ اس قسم کے خلوت خانے میں عبادت گزار کے مر جانے کے بعد بھی اس خیال اور ہمت کا اثر باقی رہتا ہے۔ پھر شیخ ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے خلوت خانے کے متعلق یہ قصہ شیخ نے سنایا کہ شیخ جس حجرے میں عبادت فرماتے تھے اس کا نام بھی انہوں نے "بیت الابرار" رکھ دیا تھا۔ شیخ ابو یزیدؒ کی وفات ہو گئی تو لوگوں نے حضرت کی اس عبادت گاہ کو محفوظ کر دیا۔ اتفاق کی بات کہ ایک شخص بحالت جنابت اسی حجرے میں شب باش ہوا دیکھا کہ اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی حالانکہ وہاں پر آگ نہ تھی سونے والا اپنے جلتے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر جاگا، اور اس واقعہ کے بعد مسلسل یہ دیکھا گیا کہ جب کبھی اس حجرے کے ساتھ بے ادبی کسی سے صادر ہوتی کوئی نہ کوئی بات ظاہر ہوتی۔

بہر حال شیخ نے فرمایا کہ دیکھو اس حجرے میں شیخ ابو یزید بسطامیؒ اپنی زندگی میں چاہتے تھے کہ کوئی آدمی اس میں داخل ہو کر خلل انداز نہ ہو۔ اب اس کا اثر وفات کے بعد بھی باقی رہا۔

شیخ نے ثابت البنانی کے واقعہ کا ذکر کیا جو زندگی میں آرزو کرتے تھے کہ مرنے کے بعد ان کو قبر میں نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ جب مرے تو قبر میں ان کو نماز پڑھتے ہوئے پایا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات میں نماز پڑھتے ہوئے قبر میں دیکھا۔

اسی سلسلہ میں شیخ اپنے والد مرحوم کا بھی ذکر فرمانے لگے ارشاد فرمایا کہ اس قسم کے لوگوں کو عموماً موت کی حالت میں پایا گیا ہے کہ چہرے کو ان کے دیکھئے تو زندہ معلوم ہوں، لیکن نبض پر ہاتھ رکھیئے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ مر چکے ہیں دیکھنے والا حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ موت اور حیات دونوں کے آثار ایک ہی شخص سے کیسے ظاہر ہو رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ میں نے والد رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دیکھا کہ کچھ اسی قسم کا معاملہ

کیا گیا ہم نے ان کو دفن تو کر دیا لیکن ان کا چہرہ چونکہ بالکل ایک جیتے جاگتے آدمی کا معلوم ہوتا تھا اس لیے دل میں خیال گزرتا تھا واقع میں ان کی وفات ہوئی بھی ہے یا نہیں کیونکہ چہرہ تو زندوں کا سا تھا لیکن ان کی نبض قطعاً ساکن ہو چکی تھی اور جیسے بے جان لاشہ میں سانس نہیں چلتی ان کی سانس بھی ختم ہو چکی تھی۔

پھر ذکر اس کا فرمانے لگے کہ والد مرحوم نے وفات سے پندرہ دن پیشتر مجھے اپنی وفات کے واقعہ سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ بدھ کے دن میرا انتقال ہوگا۔ اور یہی ہوا بھی۔ شیخ نے کہا کہ والد مرحوم کی وفات کا واقعہ جس دن پیش آیا یہ عجیب بات ہے کہ مرض کی شدت کی وجہ سے (نشست و برخاست سے معذور تھے) مگر اس دن جس دن مرنے والے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے کوئی تکیہ وغیرہ بھی پیٹھ کے پیچھے نہ رکھا۔ پھر مجھ سے کہنے لگے کہ میرے بچے! آج میرے کوچ کا دن ہے اور "ملاقات کا" شیخ نے کہا کہ والد سے میں نے عرض کیا کہ "اس سفر میں حق تعالیٰ آپ کے لیے امن و سلامتی کے ضامن ہیں اور آپ کی ملاقات بابرکت ملاقات ہوگی" میرے اس جواب نے والد کو خوش کیا۔ اور دعا دیتے ہوئے فرمایا کہ میرے لڑکے خدا تجھے جزائے خیر عنایت فرمائے۔ تم جو باتیں کیا کرتے تھے میں ان کو سنتا تو تھا مگر سمجھتا نہ تھا اور بعض باتوں کے متعلق دل میں انکار پیدا ہوتا تھا لیکن اب تو ان ہی باتوں کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ شیخ نے فرمایا کہ وہ یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ اچانک ان کی پیشانی پر ایک سفید سی روشنی چمک اٹھی۔ اس کا رنگ ان کے باقی بدن کے رنگ سے بالکل مختلف تھا اس میں چمک دمک تھی اور وہ جگمگا رہا تھا والد کو اپنی پیشانی کے اس نور کا شعور بھی تھا۔ پھر یہی روشنی آہستہ آہستہ پھیلنے لگی پہلے چہرے پر پھیلی پھر بتدریج سارے بدن کو روشنی نے ڈھانک لیا[ل]۔ اس حال کو دیکھ کر شیخ نے کہا کہ والد کے دونوں ہاتھوں کو میں نے بوسہ دیا اور ان سے رخصت ہوگیا اور عرض کیا کہ آپ کی وفات کی خبر آئے اس سے پہلے میں جامع مسجد چلا جاتا ہوں، والد نے فرمایا اچھا تم جاؤ مگر اس کا انتظام کر دو کہ کوئی غیر آدمی اس وقت میرے سامنے نہ آنے پائے۔ پھر اپنے گھر کے لوگوں کو اور لڑکیوں کو والد نے اپنے پاس بلا لیا۔

[ل] چودھویں صدی کے مجدد حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ کی وفات کے وقت بھی دیکھا گیا کہ حضرت کی انگلیوں کے درمیان موتی کی طرح کوئی نورانی چیز وفات کے وقت جو لوگ بالیں مبارک پر موجود تھے انہوں نے اس کا مشاہدہ کیا تھا۔ (مناظر احسن گیلانیؒ)

جب ظہر کا وقت ہوا تو مسجد ہی میں ان کی وفات کی خبر مجھے پہنچائی گئی۔ میں اسی وقت مسجد سے گھر آیا اور ان کو اسی حال میں پایا کہ چہرے سے تو زندہ معلوم ہوتے تھے لیکن نبض ساکن، ایسا حال تھا کہ دیکھنے والا شک میں مبتلا ہو جائے اسی حال میں ان کو دفن کرنا پڑا۔ ان کے جنازے میں بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ آخر میں شیخ نے فرمایا کہ بھائی! اللہ میاں کی دین ہے۔ جسے چاہیں اپنی رحمت کے ساتھ مختص فرمائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایسے آدمیوں کی موت اور زندگی برابر ہوتی ہے۔

(۱۵) اخلاقی رذائل کا امالہ مقصود ہے نہ کہ ازالہ

۲۵ ستمبر ۱۹۵۱ء خیال "مجلس فتوحات" کا آیا۔ شیخ کے فتوحات آج بہت دلچسپ تھے

فرمار ہے کہ اخلاق و رذائل مثلاً حرص و حسد وغیرہ جیسے صفات سمجھے جاتے ہیں کہ برے ہیں اور ان سے پرہیز کرنا چاہیے لیکن اُمّتِ محمدیہ کو جو تعلیم دی گئی ہے اس میں فقط ان صفات کے طریقۂ استعمال اور مصرف کو بدل کر ان سے بھی مسلمانوں کو نفع اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً سمجھا رہے تھے کہ حرص اور لالچ کی صفت کی لوگ مذمت کرتے ہیں لیکن اگر حرص اور لالچ کے اسی جذبہ کو علم کے حاصل کرنے میں جو استعمال کرے گا کیا کسی حیثیت سے بھی وہ قابل مذمت ٹھہر سکتا ہے؟ بلکہ برعکس اس کے ستائش اور تعریف ہی کا مستحق ہو گا۔ یہی حال حسد اور جاہ کے جذبہ کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث لاحسد الا فی اثنین رجل آتاہ اللہ علما فھو یبثہ فی الناس و رجل آتاہ اللہ مالا فھو ینفقہ فی سبیل اللہ (یعنی دو ہی آدمی ایسے ہیں جن سے حسد کرنا جائز ہے۔ ایک تو وہ جسے اللہ نے علم عطا کیا ہو اور وہ اس علم کو لوگوں میں پھیلاتا پھرتا ہے اور دوسرا وہ جسے اللہ نے مال دیا اور وہ اللہ کی راہ میں اس مال کو خرچ کر رہا ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کو دیکھ کر ان ہی جیسے بننے کی کوشش کرنا یہ حسد کے جذبہ کا صحیح استعمال ہے۔

شیخ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو خدا نے سمجھ عطا کی ہے انہوں نے اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بات صرف ان دونوں مثلوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ انسانیت میں بلندی اور برتری جن چیزوں سے پیدا ہوتی ہو ان کے حاصل کرنے میں آگے بڑھ جانے کے جذبہ کو جتنا زیادہ ابھارا جائے گا جتنی کہ سب کو پیچھے چھوڑ آگے بڑھ جانے کا ان امور میں جو ارادہ کرے گا وہ تعریف ہی کا مستحق ٹھہرے گا۔

شیخ نے فرمایا کہ "تخلقوا باخلاق اللّٰہ" (یعنی اللہ کے اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرو) اس روایت میں اگر غور کیا جائے تو اس میں بھی اشارہ گویا اسی طرف کیا گیا ہے کہ کمالات کا جو آخری سرچشمہ ہے یعنی حضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ نے خود اپنے آپ کو بھی بندوں کے سامنے اس لیے پیش کیا ہے کہ اس کے کمالات سے قریب تر ہونے کی لوگ کوشش کریں، قرآن مجید میں اس قسم کا ذکر فرماتے ہوئے کہ تم کو عفو اور درگزر سے کام لینا چاہیئے۔ عموماً فرمایا گیا ہے کہ خدا بھی تو عفو اور درگزر سے کام لیتا ہے وہ بھی تو غفور و رحیم ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے، گویا مقابلہ کے میدان میں بندوں کے سامنے حق سبحانہٗ تعالیٰ نے خود اپنے آپ کو پیش کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ وسیع میدان مقابلہ کے اس جذبہ کے لیے اور کیا مل سکتا تھا۔ (جو استعمال کی خرابی کی وجہ سے حسد جیسے رذیلہ کے نام سے بدنام ہو رہا ہے۔ سچ پوچھو تو اس کے صحیح استعمال کے بعد اس سے زیادہ قیمتی عنصر انسانی سرشت میں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔)

شیخ نے فرمایا کہ مذکورۂ بالا روایت "تخلقوا باخلاق اللّٰہ" (اللہ کے اخلاق و صفات کو اپنے اندر پیدا کرو) اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اللہ کے بندوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے کہ ترقی کرتے ہوئے حق تعالیٰ کی تخلیقی صفت یعنی کن کے ذریعے سے چیزوں کو پیدا کرنے کی قدرت جو حق تعالیٰ میں پائی جاتی ہے اس کمال تک پہنچنے میں وہ کامیاب ہوئے۔ حالانکہ خدائی کمالات میں یہ کمال آخری کمال ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ (جنت کی زندگی میں اللہ کے نیک بندوں میں یہ کمال ظہور پذیر ہوگا۔) الغرض بقول شیخ

لولا الحسد ما تمحل القوم فی تحصیل ھذا المقام۔ (ص ۱۷۸، ج ۲۔) — اگر حسد کا یعنی مقابلہ کا جذبہ آدمی میں نہ ہوتا تو لوگ کن کے اس مقام تک پہنچنے کی کوشش نہ کرتے۔

انسان کامل یعنی جنتی انسان کو کن فیکون کی قوت عطا ہوگی، اس مسئلہ کو مختلف طریقہ سے شیخ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ قرآنی آیات مثلاً یہی کہ لکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون (اس جنت میں تمہارے لیے وہ سب کچھ ہے جیسے تم چاہو گے اور اس میں وہ بھی ہے جسے تم مانگو گے) یا اہل جنت کی طرف قرآن میں منسوب کیا گیا ہے کہ "قدروھا تقدیرا" (جنت والے پیمانہ ان ظروف کا جن میں پئیں گے خود مقرر کریں گے) اور "یفجرونھا تفجیرا" (جاری کریں گے جنت کی نہروں کو پھوڑ کر) ان ہی مجمل آیتوں کی تفسیر ایک روایت میں جو کی گئی ہے۔ شیخ نے اسی روایت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

" خبر میں آیا ہے کہ جنّت والوں کے پاس خدا کا فرشتہ آئے گا پہلے حاضر ہونے کی اجازت حاصل کرے گا۔ اوران کے پاس پہنچکر ایک مکتوب حوالے کرے گا یہ مکتوب خالق کائنات کی طرف سے اہل جنت کے نام ہوگا جس میں سلام کے بعد لکھا ہوگا کہ خدائے حیّ وقیوم کی طرف سے جو کبھی نہ مرے گا یہ خط ہے بنام ان لوگوں کے جو حیّ (زندہ) اور قیوم ہو چکے ہیں اور کبھی نہ مریں گے اما بعد (بس معلوم ہو کہ) میں جس چیز کو کہتا ہوں کہ وہ ہو جائے۔ وہ ہو جاتی ہے (یعنی کن کہتا ہوں فیکون پس وہ ہو جاتی ہے) اوراب تم کو بھی میں یہی بنا دیتا ہوں کہ جس شے کو کن کہو گے وہ ہو جائے گی "

اصل عربی عبارت اس نامہ الٰہی کی شیخ کے بیان کے مطابق یہ ہوگی۔

" من الحی القیوم الذی لا یموت الی الحی القیوم الذی لا یموت اما بعد فانی اقول للشئ کن فیکون وقد جعلتك الیوم تقول للشئ کن فیکون" (ص ۳۸۸ ج ۳)

شیخ نے فرمایا کہ اس خط کی عبارت کو نقل کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ (اس خط کو پانے کے بعد) جنّت والوں میں سے جو بھی کسی چیز کو کن کہے گا تو اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ فوراً وہ چیز ہو جائے۔

شیخ نے فرمایا کہ "شئ" کا لفظ عام ہے۔ اس سے زیادہ عام لفظ عربی میں کوئی نہیں جنّت میں انسانی قوّت ترقی کر کے کہاں تک پہنچ جائے گی۔ اس کا اندازہ کرنا چاہیئے۔

اسی کے ساتھ کہنے لگے کہ اہل اللہ کا یہ اتفاقی ذوق ہے (یعنی تجربہ کر کے وہ اس کا مزہ چکھ چکے ہیں) کہ موجودہ زندگی میں بھی یکسوئی کا ملکہ آدمی میں جب پیدا ہو جاتا ہے ایسی یکسوئی کہ آدمی ایک بسیط ذات بن جائے تو جس کام پر اپنی ہمت کو وہ متمرکز کرے گا۔ وہ ہو کر رہتا ہے۔

الغرض خیالی طور پر ہم میں ہر شخص اس قدرت کو اپنے اندر جو پاتا ہے کہ جس چیز کا بھی خیال کرے وہ عالم تخیّل میں اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے لیکن اس کی اس خیالی مخلوق سے دوسروں کے حواس تو کیا متاثر ہوں گے خود پیدا کرنے والے کی آنکھیں بھی اس کو نہیں دیکھ پاتیں بلکہ صرف ذہنی احساس کا تعلق ان خیالی مخلوقات کے ساتھ قائم رہتا ہے گویا کن فیکون کی قوّت کا ایک ضعیف درجہ آدمی میں

بتدأً پایا جاتا ہے پھر عالم کی حقیقی تخلیقی قوت یعنی حق سبحانہٗ تعالیٰ کے ساتھ ربط پیدا کرتے ہوئے بالآخر اپنی اس قوت کو ارتقاء کے اس نقطہ تک پہنچا پایا جاتا ہے جس کا تجربہ جنّت میں لوگوں کو کرایا جاتا ہے کہ جس چیز کو بھی حکم دیں گے کہ ہو جا وہ اس کے سامنے واقعی موجود ہو جائے گی۔ یہی مطلب ہے کہ آدمی کو حق تعالیٰ کی طرف سے کن فیکون کی قوت جنّت میں عطا ہو گی۔

سچ پوچھئے تو زندگی کے موجودہ عبوری دَور کے چند سالوں کو خدا کی مرضی کے مطابق بسر کرنے میں کامیاب ہونے والے آئندہ زندگی میں خدا اور خدا کے قوانین کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتے ہوئے پائیں گے یعنی نفس راضیہ کے متعلق قرآن میں بشارت دی گئی ہے کہ وہ "مرضیہ" بن جاتا ہے۔ یا "رضوا عنہ" (اللہ سے جو راضی ہو گئے) اپنے سامنے "رضی اللہ عنہم" (راضی ہو گیا اللہ ان سے) کے نتیجے کو پائیں گے تو ان ساری باتوں کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ جنتی زندگی میں جس چیز کا بھی ارادہ کیا جائے گا اس کو حق تعالیٰ پیدا کرتے رہیں گے۔ کن فیکون کی قوت جنّت والوں کو مل جائے گی اس کا مآل اور "راضیۃ مرضیہ" کا جو مفاد ہے بتایا جائے کہ دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ آخر کن فیکون کی قوت جنّت والوں کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے تو عطا ہو گی پس جو کچھ بھی ہو گا حق تعالےٰ ہی کی داد اور اسی کی عطا کی ہوئی قوت ہی کا تو وہ رہین منت ہو گا۔

(۱۶) توبۂ آدمؑ!

۲۶ ستمبر ۱۹۵۱ء "مجلس فتوحات" ہی کی طرف دل آج بھی کھنچا، پہونچا گفتگو "توبہ" پر فرمارہے تھے،

قصۂ آدم میں قرآنی آیت "فتلقّیٰ اٰدم من ربہ کلمات فتاب علیہ" وغیرہا آیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بعض عجیب نکات کی طرف شیخ نے توجہ دلائی، کہنے لگے کہ آدم علیہ السلام کے دل میں حق تعالیٰ کی طرف سے جو باتیں ڈالی گئیں یعنی جن کلمات کی تلقی آدم کو اپنے رب سے ہوئی ظاہر ہے کہ یہ کلمات حضرت آدم علیہ السلام کی وہ دعا تھی جو قرآن میں آدم علیہ السلام کی طرف بایں الفاظ منسوب کی گئی ہے یعنی آدمؑ نے کہا:-

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین۔ (القرآن الحکیم)

ہمارے پروردگار ہم نے آپ پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور رحم نہ فرمائے گا تو ہم یقیناً ہو جائیں گے ان لوگوں میں جو خسارے کے شکار ہوئے۔

قابل غور پہلی بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی دعاء کے متعلق " فتاب علیہ" یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے آدم کی توبہ قبول ہونے کی خبر دی جا رہی ہے تو پھر آدم کو زمین پر اتر جانے کا یعنی اھبطوا کا جو حکم دیا گیا اس حکم کو آدم کی لغزش کی سزا ہم کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ قرآن ہی میں دوسری جگہ ہے " ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ" (پھر چن لیا آدم کو اس کے رب نے اور اس کی توبہ قبول کی) جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دعاء کے بعد آدم علیہ السلام اجتباء کی نعمت سے بھی سرفراز ہوئے۔ پھر جس کی توبہ قبول کی گئی اور اجتباء کی نعمت سے نوازا گیا۔ اسی کے متعلق یہ خیال کہ اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لیے آدم کو زمین پر اترنا پڑا، بجز منطقی تضاد کے اور کیا ہے۔ گویا آدم کی نہ توبہ ہی قبول ہوئی اور نہ اجتباء کا شرف بخشا گیا۔ شیخ نے فرمایا اسی بناء پر میرا خیال تو یہی ہے کہ اتر جانے کے حکم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے درجہ اور مرتبے سے آدم علیہ السلام کو محروم کر کے تنزل کی سزا دی گئی۔ بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کی منتقلی سے زیادہ اھبطوا کا مفاد اور کچھ نہیں نکلتا۔ "فھو ھبوط مکان لا ھبوط رتبۃ"

اسی طرح آدم علیہ السلام کی دعا میں غور کرو، عام طور پر علماء رسوم (یعنی مولوی لوگ) کہتے ہیں کہ توبہ میں جرم کے اعتراف و اقرار کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آئندہ اس جرم سے باز رہنے کا عزم اور پختہ ارادہ بھی کیا جائے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آدمؑ کی اس دعا میں جرم کے اعتراف و اقرار اور دعاء کے سوا عزم والے جزء کا سراغ کسی لفظ سے ملتا ہے؟ یقیناً اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ آئندہ اس جرم کا اعادہ مجھ سے نہ ہوگا، " اس کا پختہ ارادہ کرتا ہوں" خدا کے سامنے اس قسم کے دعاوی میں مجھے تو کچھ بے ادبی کی بو محسوس ہوتی ہے[1]۔ اور کون جانتا ہے کہ آئندہ اس کے ساتھ کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں۔ بالفرض کشفاً کسی کو معلوم بھی ہو جائے کہ اس جرم کا اعادہ مجھ سے نہ ہوگا تو جو بات واقع ہونے والی ہو اس کے متعلق عزم کا اظہار بے معنی ہے اور اس کا علم ہو کہ خواہ کچھ بھی کریں لیکن بہر حال جرم کا اعادہ ہم سے ہو کر رہے گا تو اس اٹل تقدیری فیصلہ کے مقابلہ میں بھی عزم کا اظہار لا حاصل ہے۔ (ص ۱۸۵ ج ۲)

---

[1] یہاں حضرت شیخ سلب ارادہ کی کیفیت سے مغلوب نظر آتے ہیں، ورنہ لفظ "ظلمنا" میں تو اپنے ارادہ کا اثبات و اقرار صاف موجود ہے۔ اور اس بناء پر اس کی اصلاح کا عزم گستاخی نہیں بلکہ توبہ کی شرط لازم بن جاتا ہے، واللہ اعلم (غ۔م)

مجالسِ مولٰنا رومؒ قدس سرہٗ

(۱) اسرارِ توبہ

۱۹ر مارچ ۱۹۵۰ء گیلانی (بہار) عارف معنوی کے دربار میں حاضری کی سعادت میسر آئی ارشاد ہوا، قصہ بیان فرمانے لگے مکتب خانہ میں بچہ پڑھ رہا تھا قل ارءیتم ان اصبح ماءکم غورا فمن یاتیکم بماء معین (کہو! اگر تمہارا پانی سُک جائے تو تمہارے لیے بہتے پانی کو کون لائے) راستہ سے ایک فلسفی منطق باز ذلیل و خوار گزر رہا تھا۔ قرآنی سوال کے جواب میں بولا، کدال اور سبل سے کھود کر پانی کو نکال لوں گا (یعنی سائنس کے زور سے اس مشکل کو حل کروں گا) رات ہوئی خواب میں فلسفی نے دیکھا کہ ایک شیر مرد سامنے کھڑا ہے اور اس نے کھینچ کر اس فلسفی کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ ایسا طمانچہ کہ دونوں آنکھیں فلسفی کی بہہ گئیں اور شیر مرد پوچھ رہا ہے یعنی:۔ گفت زیں دو چشمہ چشم اے شقی با تبر نورے بیار ار صادقی

صبح بیدار ہونے کے بعد فلسفی کو محسوس ہوا کہ واقعی اس کی دونوں آنکھیں اندھی ہو گئی ہیں، قصہ ختم ہو گیا، آگے مولانا نے فرمایا:۔

چاہتا تو اس پانی کو بھی وہ واپس لا سکتا تھا لیکن اس چشمہ کا پانی کدال اور پھاوڑے سے نہیں بلکہ استغفار اور توبہ کی راہ سے واپس ہو سکتا تھا، مگر افسوس کہ فلسفی استغفار اور توبہ کی سائنس سے جاہل تھا یا جاہل کر دیا گیا تھا،

ارشاد ہوا کہ:۔

توبہ و استغفار کا ذوق بھی ہر شخص کو میسر نہیں آتا۔ فرمایا کہ بدکرداری اور سرکشی و انکار کی سزا آدمی کو یہ ملتی ہے کہ توبہ کی راہ اس کے دل پر بند کر دی جاتی ہے۔

زشتیٔ اعمال و شومیٔ جحود راہ توبہ بر دل او بستہ بود

فرمایا:۔ نیاز و اعتقاد کی قوت میں جیسے یہ اثر ہے کہ محالات کو بھی ممکن بنا دیتی ہے،

آگ باغ بن جاتی ہے۔ بجنسہ بداعتقادی وبدکرداری کا الٹا اثر یہ ہوتا ہے کہ سونا چھوئے تو مٹی ہو جائے اور صلح کا ارادہ کرے تو جنگ پیدا ہو۔

ہم چنیں برعکس آں انکار مرد   مس کند زر را و صلحی را نبرد

فرمایا کہ:۔

زشتی اعمال واعتقاد سے دل پتھر بن جاتا ہے پتھر کو جوت کر غلہ نہیں اگایا جاسکتا۔ ہاں! شعیب جیسے پیغمبروں میں اتنا زور ہوتا ہے کہ پہاڑ کو خاک بنا دیتے ہیں ایسی خاک جس میں کھیتی اگائیں۔ سنگین دلوں کو چاہیئے کہ شعیبی رنگ کا آدمی ملے تو اپنا دل اس کے سپرد کر دیں۔

پھر فرمایا:۔

فلسفی نے بھی سجود عاکی تھی مگر اس کی دعا،، مسخ،، کو کھینچ کر لائی، اچھی قابل کشت مٹی کو بھی اس نے سنگ ریزہ کا میدان بنا دیا۔ بہرحال ہر دل میں ذوق سجدہ پیدا ہو، ہر کام کی مزدوری رحمت میں ملے یہ قدرت کا دستور نہیں فلسفی نے جو محنت کی تھی اس محنت کا صلہ یہ ملا کہ غریب سجدے کی توفیق سے محروم ہو گیا۔

مولٰنا نے پھر ،،توبہ،، کے متعلق تنبیہہ فرمائی کہ ،، توبہ کرلوں گا ،، اس بھروسہ پر گناہ کا ارتکاب جو کرے گا وہ توبہ سے محروم کر دیا جائے گا۔ فرمایا کہ اس قسم کا گستاخ آدمی گناہ کے بعد منہ سے توبہ و استغفار کے الفاظ نکالے لیکن نہ اس کی توبہ، توبہ ہے اور نہ اس کا استغفار، استغفار ہے۔

فرمایا:۔

توبہ کی حقیقت اپنے ساتھ کچھ علامتوں کو رکھتی ہے جیسے بارش سے پہلے بجلی کڑکتی ہے بادل گرجتے ہیں اسی طرح حقیقی توبہ کرنے والے پر گریہ طاری ہوتا ہے، چلاتا ہے، شور کرتا ہے تو غضب الٰہی کی آگ اسی توبہ کی بارش سے بجھ سکتی ہے

تانبا شد برق دل آب دو چشم   کے نشنید آتش تہدید و خشم

بجلی کی کڑک اور بادل کے گرج میں جو بارش ہوتی ہے اسی بارش سے کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں باغ

ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔

پھر مولانا کی توجہ دوسرے مسئلہ کی طرف ہو گئی فرمانے لگے۔

توحید افعالی ان ہرے بھرے کھیتوں، باغوں کو دیکھتے ہو، فاختہ کوکو کر رہی ہے ہر بلبل چہچہا رہی ہے، لالہ دمک رہا ہے، پھول مہک رہے ہیں،

از کجا آوردہ اندیں علہا — من کریم و من رحیم کلہا

فرمایا:۔

یہ ساری لطافتیں جن کا نظارہ کر رہے ہو، کیا ہیں؟ کسی کا پتہ ہی تو دے رہی ہیں۔

آں لطافتہا نشان شاہدیست

مگر ان چیزوں پر اس نقطۂ نظر سے ہر شخص کی نگاہ نہیں پڑتی، بادشاہ کو جس نے دیکھا وہی ان کی نشانیوں کو پہچانتا ہے، بادشاہ دکھایا گیا تھا، جس کے اندر اس کی یاد رہ گئی ہے وہی مست الست بنا ہوا ہے۔

فرمایا:۔

خواب میں کسی کے ایک صاحب آئے اور بتایا کہ کل تم سے ملوں گا فلاں فلاں نشانیوں سے تم مجھے پہچان لوگے مگر اس خواب کا ذکر کسی سے نہ کرنا، صبح ہوئی خواب دیکھنے والا گلی گلی کوچہ کوچہ میں ڈھونڈھنے لگا، اس کی حرکتوں پر بعضوں کو تعجب بھی ہوتا، بتائی ہوئی نشانیوں کے ساتھ جسے ڈھونڈ رہا تھا اچانک وہ سامنے آگیا، سامنے آنا تھا کہ یہ اس سے لپٹ پڑا، چیخ مار کر بیہوش ہو گیا۔ دیکھنے والے متحیر تھے کہ اس غریب کو کیا ہو گیا۔ مگر ؎

ایں نشانِ زرق او باشد کہ دید — آں دگر را کے نشاں آید پدید

الحاصل کائنات اور اس کا ذرہ ذرہ "مست روز الست" کے لیے ایسا ہی ہے جیسا مچھلی کے لیے پانی، — ماہی بیچارہ را پیش آمد آب — ایں نشانہا "تلک آیات الکتاب"

مچھلی پانی میں پہنچ گئی، قرآن میں بتانے والے نے اپنی نشانیاں بتائی ہیں۔ ان نشانیوں سے جو اس کو ڈھونڈھے گا پائے گا۔ (دفتر دوم)

(۲) خدائی امتحان کیوں ہے

بعد مغرب حضرت مولینا کی مجلس میں حاضر ہوا۔ ارشاد ہو رہا تھا۔

ایک دن مرتضیٰ علیہ السلام سے ایک پاجی نے پوچھا اور اس وقت حضرت ایک کوٹھے پر تھے جو کافی بلند تھا۔ پاجی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کے محافظ و نگراں ہیں، حضرت نے فرمایا کیوں نہیں؟ بچپن بلکہ آدمی جب نطفہ کی شکل میں رہتا ہے اسی وقت سے وہ بندوں کی حفاظت و نگرانی کرتا چلا آرہا ہے۔ (ورنہ ان نازک منزلوں سے گزر کر آدمی بن سکتا ہے؟ (مناظر احسن گیلانی))

تب پاجی نے کہا کہ تو پھر براہ مہربانی اس کوٹھے سے اپنے آپ کو نیچے گرائیے دیکھیں آپ کی حفاظت آپ کا خدا فرماتا ہے؟ دعویٰ آپ کا مدلل ہو جائے گا۔

جواب میں حضرت مرتضیٰ علیہ السلام نے فرمایا، بے وقوف! چپ رہ تو نے بڑی جرأت سے کام لیا، کہیں اسی جرأت کے تم شکار نہ ہو جاؤ! اور اس کو سمجھانے لگے کہ بھائی! اپنے مالک کا امتحان بندہ سے؟ بندہ کو اس کا حق کس بنیاد پر حاصل ہے؟ ارے احمق (کچ وکول) کس کا پتہ ہے کہ اپنے مالک کا امتحان لے۔ ہاں! خدا اپنے بندے کا امتحان لے تو وہ اس کا جائز حق رکھتا ہے۔

یہ مطلب خدا کا امتحان سے نہیں ہوتا کہ جس چیز کو وہ نہیں جانتا امتحان کر کے اس کو معلوم کرے بلکہ ؎ تا بما، ما را نماید آشکار — کہ چہ داریم از عقیدہ در سرار

یعنی آدمی خود اپنے باطنی حال سے واقف نہیں ہوتا بہت سی غلط فہمیوں میں اپنے متعلق خود مبتلا رہتا ہے امتحان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے باطنی حال سے وہ خود آگاہ ہو جائے "تا بما، مارا نماید آشکار" چاہتا ہے کہ خود اپنے آپ پر ہم جو کچھ ہیں ظاہر ہو جائیں۔

بہر حال حق تعالیٰ کے متعلق یہ کتنی بڑی گستاخی ہوگی کہ کوئی خدا کے سامنے کھڑا ہو کر کہے، لیجیے میں آپ کے فلاں حکم کو توڑتا ہوں اور امتحان لیتا ہوں کہ آپ میں حکم کا کمال کتنا ہے؟ یہ خیال کر کے جو گناہ کا ارتکاب کرتا ہے یعنی خدا کے حکم کو جانچنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ توجیہہ یا گناہ کا عذر اس گناہ سے بھی بڑھا ہوا پاپ ہے۔

پھر مولینا حسب عادت دوسری طرف متوجہ ہو گئے کہ لوگ دوسروں کو جانچتے پھرتے ہیں حالانکہ سب سے

پہلے جانچنے کی چیز اپنے لیے ہم خود ہیں،

امتحانِ خود چو کردی اے فلاں فارغ آئی ز امتحان دیگراں

پھر ارشاد ہوا،

اپنے امتحان سے تم پر اگر ثابت ہو کہ تم مرچ نہیں بلکہ شکر دانہ ہو تو اسی سے تم حق تعالےٰ کے علم کا سراغ لگا سکتے ہو یعنی اگر تم مستحق نہ ہوتے تو "شکر" تم میں پیدا نہ کرتا۔ دانشمند آدمی کبھی موتی کو سنڈاس[1] میں نہیں ڈالتا اور جو عقل رکھتے ہیں وہ بھوسہ میں گیہوں کو نہیں سڑاتے تو حق تعالیٰ جو حکیم و علیم ہیں تجھ میں شکر پیدا نہ کرتے۔

پھر ارشاد ہوا کہ

اسی طرح مرید ہو جانے کے بعد پیر کا امتحان بھی بدبختی ہے بلکہ امتحان لینے والے کا امتحان ہو جاتا ہے کہ یقین کی دولت سے مرید خالی ہے بلکہ تمہارے اندر گستاخی جہالت وغیرہ کے جو جراثیم ہیں وہ پیر کے امتحان سے باہر نکل آتے ہیں،

ارشاد ہوا کہ

ذرّہ پہاڑ تولنے چلا، ترازو اُسے کہاں ملے گی خود اپنے آپ کو ایک پلڑے میں رکھ کر تولے گا۔

چوں نہ گنجد او بمیزان خرد پس ترازوے خرد را بر درد

بہر حال حق تعالیٰ کے امتحان کا وسوسہ بھی دل میں کسی کے آئے تو چاہیے کہ فوراً سر بسجود ہو کر گڑگڑائے کہ اے پروردگار اس گمان اور شک کی بیماری سے مجھے نجات عطا فرمائیے۔

پھر مولٰنا نے ایک مثال بیان کی کہ حق تعالیٰ کے امتحان کا وسوسہ جس کے دل میں ہو وہ سمجھ لے کہ اس کے دین کے صحن میں خروب پیدا ہو گیا ہے۔ خروب کیا ؟ فرمایا کہ داؤد علیہ السلام نے جب مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا ارادہ فرمایا تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو مطلع کیا گیا کہ مسجد کی تعمیر کا کام تم سے نہیں لیا جائے گا، "کیوں پروردگار؟" داؤدؑ نے عرض کی، "تمہارے نغمے پر جانیں گئی ہیں" جواب ملا۔

---

[1] بیت الخلاء

"مگر میں تو مغلوب تھا" داؤد نے عرض کیا" اب اس کی شرح ہونے لگی، فرمایا کہ "مغلوب تھا" معدوم تو نہیں ہوتا بلکہ نسبتاً اسے معدوم کہتے ہیں کہ اپنی خودی سے غائب ہو کر سب سے بڑی ہستی کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ مساوب الاختیار نہیں ہوا بلکہ اختیار کا جو آخری سرچشمہ ہے اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا ؎

منتہائے اختیار آنست خود   کاختیارش گشت ایں جا مفتقد

بلکہ "اختیار" کا مزہ اسی لیے آدمی کو چکھایا جاتا ہے تا کہ اختیار مطلق کی طلب اس میں پیدا ہو جس کے حاصل کرنے کی صورت وہی ہے کہ اپنی "انانیت" کھو بیٹھے۔

پھر فرمایا کہ

لذائذ مشروبات و ماکولات کی لذت ترک لذت سے حاصل ہوئی ہے اگر کسی کے لیے یہ چیزیں بے لذت ہو گئیں تو اسی لیے ہو گئیں کہ لذتی بن کر اس نے اتنا مزہ اڑایا کہ ترک کا موقع نہ مل سکا۔ اسی طرح اختیار کی لذت سے آشنا ہو جانے کے بعد اگر کوئی ترک اختیار کچھ دن کرے تو اب اختیار مطلق کی لذت اس کو حاصل ہو گی بجائے اس کے جو اس مجازی اختیار کو کثرت سے استعمال کرنا شروع کرے گا تو اختیار کی لذت سے محروم ہو جائے گا۔ (دفتر چہارم)

(۳) تقلیدی و تحقیقی علم کا فرق!

۴ ستمبر ۱۹۵۰ء مولانا معنوی کی مجلس میں حاضری کی سعادت میسر آئی آج دو لطیفے ارزانی ہوئے۔ دلقک کا لطیفہ جس نے عفیفہ عورتوں کو چھوڑ کر زن بازاری سے عقد کر لیا تھا کسی بزرگ نے دریافت کیا میاں دلقک تم کو نیک چلن عفیفہ عورت نہیں ملتی تھی جو اس بازاری قحبہ سے تم نے عقد کر لیا۔ مجھ سے کہتے تو ایک خوش کردار زن مستورہ پردہ نشین تمہارے لیے مہیا کر دیتا۔

دلقک نے عرض کیا حضرت والا! کیا عرض کروں اس عقد سے پہلے کتنی پردہ نشین مستورہ عورتوں سے فقیر نے نکاح کیا لیکن سب ہی قحبہ بن کر نکل گئیں تب تھک کر میں نے اس بازاری قحبہ سے معاملہ کر لیا دیکھتا ہوں کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے دلقک نے کہا کہ

گفت نے مستورۂ صالح خواستم   قحبہ گشتند و زغم من کاستم

اس لطیفہ کا ذکر حضرت مولانا نے اپنے اس مشہور شعر کے بعد فرمایا۔ یعنی ؎

از مودم عقل دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

جب عقل پر بھروسہ کیا دھوکا اٹھایا، آخر جنون میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔

دوسرا لطیفہ اسی سلسلہ میں "مست" کا تھا۔ دیوار کے پیچھے پڑا قےکر رہا تھا۔ محتسب نے دھر لیا، ابے کون ہے؟ تو نے کیا پی لی ہے؟ مست نے کہا جو اس گھڑے میں ہے۔ گھڑے میں کیا ہے؟ محتسب نے پوچھا! مست نے کہا جو میں نے پیا ہے، محتسب نے کہا کہ یہ دور والی گفتگو کیا کرتا ہے چل جیلخانے۔ مست نے کہا کہ

گر مرا خود قوت رفتن بدے　　خانۂ خود رفتمے ویں کئے شدے　(صـ۱۵۲)

اسی تاریخ میں دوسری مجلس میں جانے کا شرف حاصل ہوا، بہلول دانا کا قصہ بیان فرماتے تھے، کہ بانس پر چڑھ کر بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے جو کوئی بات پوچھتا تو کہتے جلدی ہٹو میرا گھوڑا کہیں لات نہ رسید کرے۔ ان سے پوچھا گیا کہ اس عقل و دانش کے ساتھ اپنی یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے، فرمایا کہ میاں! اس شہر کے لوگوں کا اصرار ہے کہ میں ان کے شہر کا قاضی بن جاؤں مگر اس دردسری کو کون خریدے۔ اپنے خزانے کو میں نے جنون کے گھوڑے کے نیچے دبا دیا ہے الحمدللہ کہ مجھ میں "شکر" پیدا ہوئی ہے اور شکر سے خود ہی لذت اندوز ہوتا ہوں ۔

کان قندم نیستان شکرم　　ہم زمن می روید و من خورم

بہلول دانا نے کہا کہ میرا علم تقلیدی نہیں ہے تحقیقی ہے۔ تقلیدی علم کے متعلق فرمایا کہ عوام و خواص میں روشناس ہونے کے لیے یہ علم حاصل کیا جاتا ہے اس علم سے غرض یہ نہیں ہوتی کہ ع نُسے کہ تا یابد ازیں عالم خلاص۔ تقلیدی علم والے کی مثال چوہے کی ہے جو اِدھر اُدھر سوراخ کھودتا ہے مگر روشنی سے محروم رہتا ہے۔

بہر حال ایسا علم یا ایسی گفتگو جو تقلیدی ہوتی ہے اس میں جان نہیں ہوتی صرف اپنے خریداروں کے عشق میں ایسا آدمی گھومتا پھرتا ہے، رونق اسی وقت تک اس علم کی رہتی ہے جب تک خریدار اس کے ملتے ہوں، خریدار غائب، علم بھی غائب، پس مناسب یہی ہے کہ ان فانی خریداروں کی تلاش چھوڑ دو اور اس علم کو حاصل کرو جو باقی سے رشتہ ملائے یہ مفلس خریدار کیا خریدیں گے ۔

ایں خریداران مفلس را بہل　　چہ خریداری کند یکمشت گل

گلِ مخر گل را مخور گل را مجو — زانکہ گلِ خوارست دائم زرد رو

پسؔ گلِ خری" سے دست بردار ہو کر" دل خری" میں غرق ہو جاؤ۔ (دفتر دوئم)

(۴) فانی انوار لائق التفات نہیں

۷ ستمبر یوم الجمعہ لعبد الاوراد حضرت مولینا معنوی کی خدمت میں حاضر ہوا دریافت فرمانے لگے کہ بجلی جانتے ہو کس پر ہنستی ہے؟ خود فرمایا ان ہی لوگوں پر جو برق کے نور پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں پھر فرمانے لگے کہ سمندر کے کف پر گھوڑے کو جو دوڑاتا ہے، ڈوبے گا یا پار ہوگا؟ برق کی روشنی میں خط کا پڑھنے والا کیا خط پڑھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے؟

ارشاد ہوا کہ

نورِ حس پر ٹیک لگا کر بیٹھ نہ جانا چاہیے دراصل یہ وہ نور نہیں جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی، بہرحال حق تعالیٰ سے ہٹ کر کوشش کرنے والے کی حالت وہی ہے کہ

بر کفِ دریا فرس را راندن — نامہ را در نورِ برقی[1] خواندن

از حریصی، عاقبت نادیدنست — بر دل و بر عقل خود خندیدنست

دریافت فرمایا گیا کہ

آخر عقل و ہوش رکھتے ہوئے دریا کے پھین[2] پر لوگ گھوڑے کیوں دوڑا رہے ہیں، کیا ان کے پاس عقل نہیں ہے؟

ارشاد ہوا کہ

عقل تو ان کے پاس بھی ہے اور عقل کا اقتضا یہی ہے کہ انجام کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دے۔ مگر ؎

عقل کو مغلوبِ نفس، او نفس شد

---

[1] ہمارے زمانے میں" نورِ برقی" کی نوعیت بدل گئی اب سب کچھ اسی میں پڑھا جاتا ہے۔ مولینا کے عہد میں بادل والے برق کے سوا اور کوئی برقی روشنی نہ تھی آج کا آدمی اس شعر کو پڑھ کر تعجب کرے گا، یہ زمانہ یوں ہی بدلتا رہتا ہے۔ ۱۲

[2] کف۔

فرمانے لگے کہ

موجودہ زندگی لمحہ لمحہ میں مختلف حالات سے جو گزرتی رہتی ہے جانتے ہو اس کا راز کیا ہے؟

فرمایا کہ

ضد سے ضد کی پیدائش کا سلسلہ حالات کی قلابازیوں میں جاری ہے، راز یہ ہے کہ ؎

تاکہ از عسریٰ نہ بینی خوفہا کہ زلیسریٰ بازیابی لطفہا

بائیں طرف سے خوف پیدا ہوتا ہے مگر داہنے جانب سے امید کی توقع مردان خدا کرتے ہیں مقصد یہ ہے کہ "بیم و امید" کے دو پروں سے آدمی اڑے، ایک پر والا پرندہ اڑے گا کہ گر پڑے گا۔ ؎

تا دو پر باشی کہ مرغ یک پرہ عاجز آمد از پریدن یک سرہ

پھر مولانا نے کچھ اشارے میں گفتگو کی۔

ابراہیمی نور اگر ہو تو "نار" میں بھی "گلزار" کو پالیتا ہے اور فانی انوار کے مظاہر پر پاؤں رکھتے ہوئے بالآخر نور الانوار تک پہنچ جاتا ہے ؎

چوں خلیل از آسمان ہفتمین بگذرد کہ لا احب الآفلین

(دفتر دوم)

---

(۵) دنیوی و اخروی سزا کا فرق

۲۳ دسمبر ۱۹۵۰ء بعد نماز عید الاضحیٰ مولینا معنوی کی مجلس مبارک میں حاضری کی آرزو پیدا ہوئی فاتحہ خوانی کا الہام ہوا عمل کیا گیا۔ حاضر ہو گیا فرمارہے تھے۔

خواب میں بُری بھلی باتیں جو دیکھتے ہو قیامت میں یہی باتیں اچانک تمہارے سامنے آجائیں گی مطلب یہ ہے کہ موجودہ زندگی کے خواب میں جو کچھ دیکھ رہے ہو، حشر کی بیداری میں وہی سب سامنے آجائیں گے یہی اس لیے یہ سمجھا رہا ہوں کہ آج کی بدکرداریوں کو یہ سمجھ کر ٹال دینا کہ یہ تو خواب کی باتیں ہیں، صحیح نہیں ہے اس خواب کی ایک تعبیر ہے، موجودہ زندگی کی ہنسی کی تعبیر گریہ کی شکل میں رہیگی! اور یہاں کے رونے دھونے اور آہ و زاری کی تعبیر حشر میں بیداری کے وقت بہ شکل شادمانی نکلے گی۔

جوش میں فرمانے لگے،

اے یوسف کی پوستین پھاڑنے والو! یاد رکھو کہ بھیڑیے کی شکل میں اپنے
آپ کو پاؤ گے جب زندگی اس گہری نیند سے جاگ گئی ہوگی،

یہ تمہارے باطنی اخلاق دراصل مستقل بھیڑیے ہیں جو تمہارے اندر دبے کسے ہوئے ہیں اور تمہاری
بوٹیاں وہ اڑا رہے ہیں پھر یہ الہامی مصرعہ زبان مبارک پر جاری ہوا کہ

ع تو مگو کہ میرم وہ یابم خلاص

موت کیا ختم کر دے گی تمہارے اعمال کے نتائج کو؟ موت کو نجات کا ذریعہ سمجھنے والے موت کی
حقیقت سے ناواقف ہیں (موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟ یہ ایک بے تقصیر شاعر کا کلام ہے۔ مناظر احسن گیلانی)
فرمایا، موت بظاہر تم پر نیند طاری کرتی ہے لیکن تم نے خدانخواستہ اگر خون کیا ہے تو موت کی نیند کے ساتھ
ہی وہ جاگ اٹھتا ہے، قتل کے مجرم کو قصاصاً دنیا میں جو قتل کیا جاتا ہے، یہ جرم کی حقیقی سزا نہیں ہے[1]
بلکہ جرم کی حقیقی سزا کے مقابلہ میں تو یہ کھیل ہے انما الحیٰوۃ الدنیا لہو و لعب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ

کایں جزا لعبے ست پیش آں جزا

مقصود قصاص یہ ہے کہ دوسروں کی ہمت سرد کر دی جائے۔ فتنہ آگے نہ بڑھے لوگوں کو عبرت ہو
مگر یہ سمجھ لینا کہ قتل ہو کر مجرم قتل اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا دھوکہ اور صرف دھوکہ ہے بلکہ اصلی سزا اس کی
اس کے آگے بعد الموت حشر کے وقت نمایاں ہوگی، دنیا والے قصاص کی سزا اور آخرت والی سزا کے فرق
کو ایک دلچسپ مثال سے سمجھایا کہ آخرت والی سزا تو خصی بناتا ہے، اور دنیا کی سزا کی حیثیت ختنہ کی ہے
خصی جسے بنا دیا جاتا ہے اس سے بھی کچھ نکالا جاتا ہے اور کاٹا جاتا ہے اور ختنہ میں کاٹا اور چھچھڑا حلقہ
کا الگ کر دیا جاتا ہے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے دونوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے

آں چوا خصا است وایں چوں ختنہ است

"لا تتفکروا فی الخالق" کا مطلب | پھر قصہ موسیٰ علیہ السلام جو پہلے سے بیان ہو رہا تھا اس کی تفصیل میں

---

[1] بشرطیکہ مجرم اپنے جرم سے تائب نہ ہو بلکہ پکڑ دھکڑ کر اس کو قتل کیا گیا ہو ورنہ اگر مجرم خود تائب ہے اور اجرائے حد کو اپنے حق میں سزائے آخرت سے تحفظ کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتا ہے تو ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا، حدیث شریف میں ایسے تائب کامل صحابی کی مدح آئی ہے۔
(غ-م)

مشغول ہو گئے۔ اس قصہ میں یہ بات عجیب فرمائی ؎

کاں شہے کو می ندید مدیش فاش　　بود با ایشاں نہاں اندر معاش

"معاش" والی زندگی میں خود خدا پوشیدہ ہے جیسے عقل تمہارے کاروبار میں پوشیدہ ہے عقل اور نفس میں فرق یہ ہے کہ عقل بیدار رہتی ہے اپنی اپنے مجرم کو ملامت کرتی ہے لیکن نفس پر نیند طاری ہے حق تعالیٰ عقل کے قریب ہے لیکن اس قرب کی نوعیت مجہول ہے

تم سو جاتے ہو، لکھنے کی قوت انگلیوں سے غائب ہو جاتی ہے۔ بیداری میں واپس آتی ہے، کیسے آتی ہے؟ یا تمہاری آنکھ میں "نور" کس راہ سے داخل ہوا؟ جب یہ ہی معلوم نہیں تو تمہارا خالق تمہارے اندر تمہارے کاروبار میں کیسے شریک ہے اس کو کیسے جان سکتے ہو، بہر حال "نور" آنکھوں میں آیا کس راہ سے آیا پورب سے آیا، پچھم سے آیا دکھن سے آیا اتر سے آیا نیچے سے آیا؟ کیا جواب ہے ؎

بے جہت داں عالم امر و صفات　　عالم خلق است با سوئے جہات

الامر والخلق عالم کی ان دو قسموں میں بھی فرق ہے؟

پھر فرمایا کہ تمہاری عقل ؎

بستۂ فصلست و صل ست ایں خرد　　ایں تعلق را خرد چوں پے برد

الحاصل عقل ایسے قدرتی قوانین میں جکڑی ہوئی ہے کہ "خالق" کو اپنی گرفت میں نہیں لا سکتی پس

جز کہ لا احصی نگوید او ز جاں

لا تتفکروا فی الخالق کا مطلب یہی ہے۔ ——— (مجلس ختم ہو گئی)

(دفتر چہارم) ———

(۶) دنیوی نظام اضداد پر قائم ہے

۱۲ اکتوبر ۱۹۵۱ء، بعد نماز جمعہ مولانا معنوی کی طرف دل نے کشش محسوس کی مجلس مبارک میں حاضر ہوا ارشاد ہو رہا تھا۔

بھائی! میرا کام تو کہنا ہے، کہتا رہونگا، بلاتا رہوں گا، ؎

لیک دعوت وارد ست از کردگار　　با قبول و نا قبول او را چہ کار

نوح پیغمبر علیہ السلام نو سو سال اسی فرض کو انجام دیتے رہے قوم نے نہ مانا تو کیا اپنی دعوت انہوں نے

ترک کر دی؟ کتوں کے بھونکنے سے کارواں کہیں کبھی رکا ہے؟ یا چودھویں رات کے چاند کو دیکھ کر کتے عوعو کرتے ہیں پھر چاند کی حرکت کبھی سست پڑتی ہے؟

فرمایا کہ بیشک نہ ماننے والوں کے انکار سے تکلیف پہنچتی ہے لیکن ان کا انکار جہاں سرکہ پیدا کر رہا ہے تو پیدا کرنے والا اسی مقدار میں "شہد" بھی اس میں ملا دیتا ہے پس نفسیاتی کیفیت سکنجبین بن جاتی ہے ؎

چونکہ سرکہ سرکگی افزوں کند پس شکر را واجب افزونی بود

یہ شہد کہاں سے آتا ہے "خم" (دل کے) اندر ایک باطنی راستہ سے دریا (ذات حق) سے آتا ہے۔

فرمایا کہ میاں! عالم کا یہ محسوس نظام اضداد پر قائم ہے، جنگ و صلح، فعل میں، قول میں، طبیعت میں ان ہی اضداد کا نام ہے ؎

ایں جہاں جنگ است چوں کل بنگری ذرہ ذرہ ہم چو دیں با کافری

ہاں! ذرہ آفتاب میں جب محو ہو جاتا ہے تو اب آفتاب سے جنگ ختم ہو جاتی ہے انا الیہ راجعون کی حقیقت ذرہ کو آفتاب بناتی ہے۔

ہاں! جب موجودہ نظام ختم ہو جائے گا اور دوسرا نظام عالم قائم ہو گا تو اس کی بنیاد اضداد پر نہ ہو گی یہاں تو ضد ضد کو کھائے جاتا ہے اور وہاں ضد ہی نہیں ہے تو بقاء کے سوا اور ہو گا کیا؟

لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا کی آیت میں اسی طرف اشارہ ہے کہ وہاں اضداد نہیں ہیں۔

(دفتر ششم)

(۷) وصول حق کے لیئے مدت کا سوال بے معنی ہے

۲۰ اکتوبر ۱۹۵۰ء آج جمعہ کا دن ہے اوراد یومیہ کے بعد خیال گزرا کہ مولانا معنوی کی مجلس میں حاضری کی سعادت حاصل کی جائے۔ نیا خیال یہ آیا کہ مثنوی کھولنے سے پہلے فاتحہ مولانا کے نام پڑھ لینا چاہیئے تو مناسب ہے سورۂ فاتحہ اور ثلث قرآن (الاخلاص) کو تین دفعہ پڑھ کر ثواب مولینا کی روح کو ایصال کیا گیا اور مثنوی شریف کھلی قصہ بیان ہو رہا تھا، اس شاہ زادے کا توفیقِ ربانی جس کی رفیق بنی۔ مولینا نے طویل عنوان اس قصہ کا خود ارقام فرمایا ہے جو بجائے خود عبرتوں سے معمور ہے شاہ زادے پر وہی دن جو کل آنے والا ہے جس میں بھائی بھائی سے بھاگے آج ہی آگیا اس پر واضح ہوا کہ تیس ہزار خانوں کا طبقہ جو تودۂ خاک اور مٹی کے ڈھیر کو قبضہ میں لا کر

قلعہ کشائی کا اعلان کرتا ہے۔ دراصل "کودکِ طبعی" ہی کا اس کے یہ نتیجہ ہے! بچے مٹی کے گھروندے بناتے ہیں کوئی بچہ گھروندا بنا کر آواز بلند کرتا ہے کہ دیکھو! یہ میرا قلعہ ہے کوئی اس کے گرد نہ پھٹکے اور کمزور بچے رشک و حسد کی نگاہ سے اس قلعہ کے فاتح کو دیکھتے ہیں۔

ارشاد ہوا کہ

رنگ کے مغالطہ سے بادشاہ کی روح نے خلاصی حاصل کی، کہنے لگا کہ یہ سونا یہ اطلس یہ سب کیا ہے صرف مختلف رنگ کے مظاہر کے مختلف نام ہیں، ورنہ سچ پوچھو تو "خاک ہائے رنگین" کے سوا ان کی اصل حقیقت اور کچھ نہیں ہے۔ شاہ زادے نے ایک "ہو" کے ساتھ چھلانگ لگائی اور رنگ و بو کے عالم سے اچانک نکل بھاگا۔

مولانا نے فرمایا:۔

گو شاہ زادہ نوعمر تھا لیکن اٰتیناہ الحکم صبیا (بچپن ہی میں فیصلہ کی صحیح قوت عطا کی گئی) کی نعمت سے یحییٰ علیہ السلام جیسے سرفراز ہوئے تھے۔ کچھ یہی سلوک قدرت نے شاہ زادے کے ساتھ کیا۔

پھر فرمایا کہ

"وصول" کے لیے وقت اور مدت کا سوال اس دربار میں بے معنی ہے جہاں کے کاروبار کی بنیاد کن فیکون کے حکم پر قائم ہے لوگ "فضل" کے لیے قابلیت کی شرط لگاتے ہیں لیکن "کن فیکون" حدود میں یہ سوال بے محل ہے۔

پھر کہانی شروع ہوئی مختصر کہانی یہ ہے کہ کسی بادشاہ کا ایک ہی لڑکا بڑا نیک بخت فرزند سعید تھا خواب میں بادشاہ نے دیکھا کہ وہ مر گیا اکلوتے اور ایسے لائق سعادت مند بچے کی موت کا اثر خواب ہی میں بادشاہ پر جو کچھ ہوسکتا تھا ہوا۔ مرنا چاہتا تھا مگر موت بھی نہیں آتی تھی کہ اچانک بیدار ہوگیا جس قسم کا غم ہوا تھا جاگنے کے ساتھ ہی اسی قسم کی مسرت اور خوشی بھی اس کو ہوئی۔

مولانا نے فرمایا کہ

غم بھی ایسا غم ہوا کہ مرنا چاہتا تھا۔ اور خوشی بھی ایسی ہوئی کہ مارے خوشی کے دم

نکلا جاتا ہے۔

مسرت والم کے درمیان زندگی قائم ہے۔ خاکی بدن کے ساتھ اس جان کے تعلق کی نوعیت بھی عجیب ہے۔ شدت غم میں بھی یہ تعلق ٹوٹنے کے قریب ہوجاتا ہے، اور فرط خوشی میں بھی روح قالب سے نکلنے کے لیے بے چین ہوجاتی ہے۔

فرمایا کہ

جان اس جسم کے ساتھ کچھ عجب طرح سے لٹکی ہوئی ہے غم کی پھونک سے بھی یہ چراغ بجھنے لگتا ہے اور خوشی کی پھونک سے بھی گل ہونے لگتا ہے۔

الغرض مسرت والم کہ ان ہی دونوں موتوں کے خطرے کے بیچ میں "جان زندہ" ہے ؎

درمیان ایں دو مرگ او زندہ است ایں مطوق شکل جائے خندہ است

موت کی ان دو گرفتوں میں جکڑی ہوئی جان کا یہ تماشا کتنا دلچسپ ہے

فرق نظر ہی سے ایک شئے موت بھی ہے اور زیست بھی۔ ایسے غمناک خواب کو قدرت نے اسی لیے دکھایا کہ جس سے بڑی خوشی بادشاہ کو ساری زندگی میں میسر نہ آئی تھی وہ حاصل ہو، اسی لیے اس عالم کے حالات کو سمجھو ایک ہی چیز ہے ایک رخ سے دیکھو تو موت ہے اور موت ہی دوسرے رخ سے ساز و سامان کا وہی سرمایہ ہے، دیکھو! دنیا کا طمطراق جس سے خوشی پیدا ہوتی ہے آخرت میں غم والم کا سبب بن جاتا ہے۔ خوابوں میں بھی یہی ہوتا ہے کہ رونے کی تعبیر ہنسنا ہے۔

قصہ پھر شروع ہوا بیداری کے بعد بادشاہ کو جو خوشی حاصل ہوئی تو سوچنے لگا کہ خواب میں جس قسم کا شکار ہوگیا تھا اس کے سدباب کی کوئی تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔ آخر جو پھول بیداری میں سامنے آیا ہے کیا ضمانت ہے کہ اسی زندگی میں کانٹا نہ چبھے گا۔ آخر کچھ تو کرنا چاہیے کانٹا جس وقت چبھے تو پھول نہ سہی پھول کی یادگار ہی سامنے ہو۔ بادشاہ سوچتا تھا کہ اس دنیا کا حال تو یہ ہے کہ ایک سوراخ سے تباہی آنے والی ہو تو اس کے روکنے کے اسباب تو بے شمار ہیں ؎

ہم بس کدامیں رہ را بندیم ما؟

آفات و بلیات موت کی دھمکیاں ہیں مولانا نے فرمایا:۔

دیکھو! سیکڑوں دریچے کھلے ہوئے ہیں جن سے موت جھانک رہی ہے ان دریچوں کے کواڑوں کی آوازیں کیا ہیں موت کی دھمکیاں ہیں جو مختلف بیماریوں اور آفتوں کی شکل میں سامنے آتی رہتی ہیں لیکن حرص کی چربی سب کی آنکھوں اور کانوں پر چڑھی ہوئی ہے وہ ان کواڑوں کی آواز سے بہرے بنے ہوئے ہیں۔

مولانا نے فرمایا:۔

میں جو یہ کہہ رہا ہوں۔ نفس کے سو بہانے ہیں اس کا اندازہ طب کی کتاب سے نہیں ہوگا ریت کے مانند امراض نظر آئیں گے جن میں آدمی گرفتار ہوتا رہتا ہے گویا آدمی کے بدن کو ایک پنجرہ اگر فرض کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہزاروں سوراخ اس پنجرے میں ہیں جن کی راہ سے موت اندر داخل ہو سکتی ہے زندگی کے ہر قدم پر بچھوؤں سے بھرے ہوئے بچھونے نظر آتے ہیں۔

ہر دو گامے پر زگژدمہا چہ است

عقلمند وہ ہے جو دل کا چراغ جلالے | اسی لیے مناسب ہے کہ جھکڑ میں بجائے ایک چراغ کے چند چراغ آدمی جلالے۔ ایک بجھ جائے تو شائد دوسرے سے کام چلے۔

فرمایا کہ

جو دانشمند ہیں وہ اسی لیے جسم کے ٹمٹماتے چراغ کے ساتھ دل کے چراغ کو بھی روشن کر کے رکھ چھوڑتے ہیں مطلب ان کا یہی ہوتا ہے کہ بدن کا چراغ اگر بجھ جائے تو دل والا چراغ جلتا رہے۔

الولد سرٌ لابیہ کی توضیح | القصہ بادشاہ اسی سوچ بچار میں تھا سمجھ میں کوئی صورت نہ آتی تھی آخر اس نے فیصلہ کیا کہ شاہزادے کی شادی کر دی جائے تاکہ شاہزادہ نہ رہے تو اس کی نسل باقی رہے

فرمایا کہ:۔

صورت کو موت ختم کر دیتی ہے لیکن معنی اولاد کی شکل میں باقی رہتا ہے۔ الولد سرٌ لابیہ (بیٹا باپ کا بھید ہے) اس قول نبوی کا یہی مطلب ہے۔

ارشاد ہوا کہ

لوگ اپنا ہنر پیشہ اپنے بچے کو اسی لیے سکھاتے ہیں کہ ان کی صورت جب مٹ

جائے تو معنی ان کا یا کمال ان کا زندہ رہے۔

تب بادشاہ نے طے کیا کہ کسی صالح صاحب سیرت و کردار بزرگ سے کوئی لڑکی حاصل کی جائے جس سے شاہزادے کا عقد کر دیا جائے۔ کیونکہ کسی بدکردار بادشاہ کی لڑکی سے اچھی نسل کی پیدائش کی اُمید درست نہ ہوگی،

مولانا نے فرمایا کہ

خوش (یعنی کیا خوب) جو بیچارہ مال و جاہ کا غلام اور قیدی ہے اسی کو لوگوں نے بادشاہ کا نام دے رکھا ہے۔ دیوانے زنگی کو کافور کے نام سے موسوم کر رہے ہیں، اور بادیہ کو عرب والے "مفازہ" (کامیابی کا میدان) کہتے ہیں

کہتے صدر اصل ہیں جو در اصل

صدر خوانندش کہ در صفِ نعال　　　جان او بستہ ست یعنی جاہ و مال

اصلی فقیر اور بھک منگے کا فرق بیگم کو علم ہوا کہ اس کے بچے کا عقد کسی فقیر ٹٹ پونجئے سے بادشاہ کرنا چاہتا ہے تو برہم ہوئی، بولی کہ "کفو" کا مسئلہ تو عقلاً و شرعاً ایک مسلم بات ہے بیگم نے یہ طعنہ بھی دیا کہ خرچ کے خوف سے روپیہ بچانے کے لیے تم بجائے بادشاہوں کے کسی فقیر کی لڑکی تلاش کر رہے ہو۔ بادشاہ نے بیگم سے کہا کہ تم نے بھک منگوں پر ان بزرگوں کو قیاس کیا جن کے فقر و ناداری کے نیچے قلبی غنا کا جذبہ کام کرتا ہے سمجھایا کہ فقیر کو دیکھو!

فقیر کی شناخت کا معیار ایک پیسہ مل جانے پر لوٹتا ہے تو سمجھو کہ اس کے پیچھے قناعت نہیں ہے اور جو خزانوں پر لات مارے یہی فقیری بادشاہی پر بھاری ہے۔ بیگم نے کہا کہ لڑکی کا فقیر باپ وان جہیز کیا دے گا؟ ننگی کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی؟ بادشاہ نے کہا، اور وہی اس قصّے کی جان ہے کہ:

غم سے نجات کی راہ دین کو جس نے غم بنالیا سارے غموں سے آزاد ہوگیا دین کو جس نے شکار کر لیا یقین کر دکہ حسن و مال بخت سب طفیل میں دین کے، اس کو مل جاتے

ہیں اونٹ آگے آگے چلتا ہے اور اس کی مینگنی پیچھے پیچھے آتی ہے۔

فرمایا ؎

پشم بگزیں شتر نبود ترا ۔۔۔ ور بود اشتر چہ قیمت پشم را

اون ہی پر قناعت کرکے جو بیٹھ جائے گا تو اونٹ سے وہ محروم رہے گا لیکن اونٹ کے خریدنے والے کے سامنے اون کی کیا قیمت باقی رہتی ہے ؟

——— (دفتر چہارم)

(۸) حضور اکرمؐ کا طریق اصلاح سراسر رحمت ہے

۳ نومبر ۱۹۵۰ء عربی و فارسی کی کمیٹی میں شریک ہونے کے لیے پٹنہ (بہار) کے عاصمہ میں بلایا گیا تھا واپسی کے بعد آج مولانا رومؒ کی خدمت میں حاضری کی آرزو پیدا ہوئی، آرزو الحمد للہ پوری ہوئی، ایک دلچسپ حکایت بیان کر رہے تھے کہ ایک سوار گھوڑے پر سوار جا رہا تھا نظر اس کی پڑی ایک شخص پر جو سویا ہوا تھا اور ایک سانپ اس کے منہ میں گھسا ہوا تھا اس منظر کو دیکھ کر سوار کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بجز اس کے کہ جو دبوس اس کے ہاتھ میں تھا اسی سے سونے والے کے منہ پر مسلسل اس نے چند ضرب لگائی۔ سونے والا غریب چونک کر اٹھا دیکھا کہ ایک سوار اس کے منہ پر مسلسل دبوس مار رہا ہے۔ اچھل کر بھاگا، ترک سوار پیچھے پیچھے اس کو رگیدتے ہوئے دبوس پر دبوس مارتا چلا جاتا تھا۔ بھاگ کر سیب کے ایک درخت کے نیچے پہنچا جس کے نیچے بہت سے سیب گرے پڑے تھے۔ سپاہی نے کہا کہ اس سیب کو کھا۔ بیچارہ کھاتا تو منہ سے واپس ہو جاتا آخر چلا کر سونے والا سپاہی سے کہنے لگا کہ بھائی آپ کا کیا قصور میں نے کیا کہ مجھے اس طرح بلاوجہ آپ ستا رہے ہیں، اگر مجھ سے خواہ مخواہ کی عداوت ہی ہو گئی ہے تو بجائے دبوس کے زیادہ مناسب ہے کہ تلوار سے میری گردن اڑا دو آخر آج کس کم بخت کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا کہ اس حال میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ سپاہی کو سونے والا طرح طرح کی بری بھلی باتیں کہتا جاتا اور بھاگتا جاتا تھا لیکن سپاہی بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ سونے والا اٹھتا اور گرتا دبوس کی مار کھاتا آخر جو کچھ اس کے پیٹ میں تھا قے کی شکل میں باہر آنے لگا اور اسی کے ساتھ سانپ بھی سونے والے کے منہ سے باہر گر پڑا۔ سانپ پر جب سونے والے کی نظر پڑی تو ہوش اڑ گئے اور سپاہی کے احسان کے نیچے اپنے آپ کو دبا پایا۔ مولانا فرماتے تھے کہ سونے

والے نے کہا کہ آپ تو میرے لیئے رحمت کا فرشتہ ہیں، یا خدا ہیں، ولی نعمت ہیں، اگر یہ سانپ میرے پیٹ سے نہ نکلتا تو میرا خاتمہ ہی ہو چکا تھا۔ کیسی مبارک ساعت تھی کہ آپ میرے سامنے آئے۔ میں تو مر چکا تھا۔ دوبارہ زندگی آپ ہی کی بخشی ہوئی ہے اس موقعہ پر مولانا کے بعض اشعار یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ سونے والا دبوس مارنے والے کو کہہ رہا تھا ؎

اے خنک آں را کہ بیند روئے تو یا درافتد ناگہاں در کوئے تو

تو مرا جویاں مثال مادراں من گریزاں از تو مانند خراں

فرمانے لگے کہ :۔

دھوبی بے چارہ گدھے کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ بھیڑیا
کہیں اسے نہ پھاڑ ڈالے مگر گدھا گدھا ہی ہوتا ہے وہ دھوبی کو دیکھ کر بھاگتا ہے۔

بہرحال سونے والے نے سپاہی سے پھر معذرت چاہی کہ نادانی میں خدا جانے آپ کو میں نے کیا کچھ کہہ دیا۔ کاش! اسی بات کو کہ میرے منہ میں سانپ گھس گیا ہے آپ فرما دیتے تو میری مجال تھی کہ اس قسم کی بیہودہ باتیں زبان سے نکالتا مگر آپ نے خاموشی کے ساتھ میرا علاج شروع کر دیا۔ اسی سے غلط فہمی ہو گئی۔ سپاہی نے تب جواب میں کہا کہ بھائی! اگر اصل راز سے تم کو آگاہ کر دیتا تو ڈر تھا کہ مارے ڈر کے تمہاری روح نہ کہیں پرواز کر جاتی ؎

گر ترا من گفتمے اوصاف مار ترس از جانت برآوردے مار

قصہ ختم کر کے حضرت فرمانے لگے کہ دیکھو انسانیت کے اندر جو دشمن چھپا ہوا ہے اگر اس کے تفصیلی حالات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کو آگاہ فرماتے تو لوگوں کا زہرہ آب ہو جاتا۔ اسی لیئے بجائے کہنے کے لوگوں کی تربیت اس طریقہ سے پیغمبر کرتے ہیں کہ مرض کا ازالہ ہو جائے اور مرض کی نوعیت سے وہ بے خبر رہتے ہیں۔ ابوبکرؓ کو دست نا بکاراں کے ہاتھ کو پیغمبرؐ نے اپنے ہاتھ میں لیا تب ریاضت کے تھوڑے سے ان کو درست کرنا شروع کیا جو بات ناممکن ہوتی تھی وہی ان کے لیے حال بن گئی اور جن پرندوں کے بازوؤں کے پر اکھڑ گئے تھے پھر ان میں نئے بال و پر پیدا ہو گئے۔

مولانا نے فرمایا کہ

"پیغمبر کا ہاتھ" | جس پر اللہ کا ہاتھ ہے اس کی درازی کا کون اندازہ کر سکتا ہے چاند کے

ٹکڑے پیغمبر کے اسی ہاتھ سے ہوئے اور یہ بھی معمولی بات ہے ورنہ پیغمبر کے مقدس ہاتھ کی رسائیوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

بہرحال سپاہی نے کہا کہ بھائی! جو واقعہ تھا اگر اس کا اظہار کر دیتا تو جس جان کو بچانا چاہتا تھا وہی جان نکل پڑتی نہ تم میں کھانے ہی کی قوت باقی رہتی اور نہ قے کرنے کی صلاحیت ہی اپنے اندر تم پاتے تم جس وقت مجھے بُرا بھلا کہہ رہے تھے اس وقت میری زبان پر "رب یسّر" کا وظیفہ جاری تھا۔

می شنیدم فحش و خرمی راندم　　"رب یسّر" زیر لب می خواندم

سپاہی نے کہا۔

از سبب گفتن مرا دستور نہ　　ترک تو کردن مرا مقدور نہ

نہ سبب ہی بیان کر سکتا تھا اور نہ یہ بس میں تھا کہ تمہیں چھوڑ دیتا۔

ہر زماں می گفتم از درد درون　　اھد قومی انھم لا یعلمون

گویا پیغمبر کا حال امت کے ساتھ کچھ اسی رنگ میں ہوتا ہے جب ہدایت پانے کے بعد آدمی دیکھتا ہے کہ پیغمبر نے سانپ سے بچا لیا تب کہتا ہے۔

دشمنی عاقلاں زینساں بود　　زہر ایشاں ابتہاج جاں بود

(دفتر چہارم)

(۹) استقامت ہی کامیابی کی ضامن ہے

۷ نومبر ۱۹۵۰ء، مولانا روم کا خیال آیا، حاضری دی گئی، ارشاد ہو رہا تھا ایک مسکین عشق کے مرض میں مبتلا ہوا ایک عورت پر اس کی طبیعت آ گئی، خواب و خور غریب پر حرام ہو گئے۔

مولانا نے فرمایا کہ :۔

عشق کا قاعدہ ہے کہ شروع میں ذرا سخت پکڑتا ہے جس کی وجہ ہے کہ۔

تا گریزد آنکہ بیرونی بود

اس عاشق کا حال یہ تھا کہ جس راستہ سے محبوبہ تک رسائی کی کوشش کرتا کامیابی نہ ہوتی تھی قاصد کو بھیجتا تو وہ راہزن بن جاتا، خط لکھتا، پڑھ کر سنانے والے غلط سلط سنا دیتے کبوتر کے پیر میں باندھ کر خط بھیجتا تو یہ ہی وہ گر پڑتا جس میں نامہ بندھا تھا، الغرض تدبیر کی ساری راہیں اس پر بند

ہو گئیں اور سوچ بچار کی جو فوج اس کے اندر تیار ہوتی رہتی تھیں اس کا جھنڈا ہی گر گیا پہلے تو اس کے غم کی تسلی انتظار کے جذبہ سے ہوتی، اب انتظار بھی اس کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کے بعد اس کا حال عجیب تھا کبھی سمجھتا کہ میرا مرض لاعلاج ہے اور کبھی جوش میں آتا تو اپنے عشق کو سرمایہ حیات قرار دیتا۔ الغرض کبھی آسمان پر رہتا اور کبھی زمین پر گرتا۔

آخر میں اسی بے سروسامانی کو اس کے لیے سامان بنا دیا گیا۔ اور اپنے عشق کے ساتھ مانوس ہو گیا باہر سے مغموم نظر آتا لیکن اندر اس کے مسرت و نشاط کا چشمہ ابلتا رہتا تھا۔

مولانا نے فرمایا کہ :-

سارے نبی آدم جن سے تم ملتے جلتے رہتے ہو ان کے اندر کا حال تم کو معلوم نہیں کتنے بولنے والے جو طوطی کی طرح بولنا جانتے ہیں، خاموش نظر آتے ہیں اور بہت سے چہرے جو دیکھنے میں تلخ و ترش دکھائی دیتے ہیں ان کی جان میں مٹھاس ہی مٹھاس ہوتی ہے۔

فرمایا کہ :-

قبرستان چلے جاؤ ساری قبروں میں تم کو باہر سے خاک ہی خاک نظر آئے گی لیکن در اصل ان قبروں کا حال ایک نہیں ہے جیسے گوشت و پوست تو ہر آدمی میں مشترک ہوتا ہے لیکن گوشت و پوست کے ان ہی ڈھانچوں میں کتنے غمگیں بھی ہوتے ہیں اور کتنے فرحان و شاداں بھی۔

فرمانے لگے کہ۔ ع توچہ دانی تا خوشی قال شان

جب تک آدمی لوگوں کی گفتگو نہ سنے جیسے نہیں اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کے اندر کیا ہے یہی حال اس دنیا کی اکثر چیزوں کا ہے۔ درخت ہلتا ہے، کلہاڑی کی ضرب سے بھی اور باد صبا کے جھونکوں سے بھی پھر کیا ہلنے کی دونوں حالت برابر ہے اسی طرح جوش و توش تو سب دکھاتے ہیں مگر کس میں سچائی ہے اور کون دکھاوے سے کام لے رہا ہے اس کے لیے ضرورت ہے۔

ع "ز دو دماغی دست آور پوشناس"

مولانا نے فرمایا کہ :-

خیر، ہوا یہ کہ آخر آٹھ سال گزرنے کے بعد اس عاشق مسکین کی رسائی اپنی محبوبہ تک ہوئی جس کی وجہ وہی تھی کہ اپنے مقصد پر وہ ڈٹا رہا۔

سایۂ حق بر سرِ بندہ بود عاقبت جوئندہ یابندہ بود
گفت پیغمبر کہ چوں کوبی درے عاقبت زاں در بروں آید سرے

یعنی بندہ پر حق کا سایہ رہتا ہے اور ڈھونڈھنے والے پالیتے ہیں، جس دروازے کو کھٹکھٹاؤ گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس سے سر نمودار ہوگا۔

مولانا فرمانے لگے کہ:۔

بھائی یہ ناممکن ہے کہ کسی گلی میں تم کسی کے انتظار میں بیٹھو اور جس کا انتظار کر رہے ہو اس کا چہرہ نظر نہ آئے ؎

چوں نشینی بر سرِ کوئے کسے عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

کہنے لگے:۔

کسی کنوئیں سے مسلسل مٹی نکالنے والے کے سامنے آخر کسی نہ کسی دن پانی ضرور جھلک پڑے گا۔

سمجھانے لگے کہ:۔

عام قاعدہ یہی ہے کہ کوشش سے نتیجہ پیدا ہوتا ہے کبھی اس کے خلاف بھی کوئی پیش آئے تو یہ ایک استثنائی بات ہوگی۔ آدمی کو چاہیئے شاذ و نادر مثالوں سے متاثر نہ ہو یہ نہ کہے کہ شیطان نے اتنے دن سر رگڑا، یا بلعم باعور نے سر مارا تو کیا ہوا؟ ہمارے ساتھ بھی شیطان یا باعور کی صورت کیوں پیش نہ آئے گی۔

فرمایا کہ

یہ گمراہی کی باتیں ہیں آخر تم نے کبھی یہ سنا ہے کہ کسی سال کھیتی خشک ہوگئی تو کسان نے کھیت بونا چھوڑ دیا ہو۔

مولانا نے پوچھا کہ کھا کر بعض دفعہ دیکھا گیا ہے کہ آدمی بیمار پڑ گیا۔ یا لقمہ حلق میں اٹک گیا اور کھانے والا مر گیا پھر کیا لوگوں نے اس مثال سے متاثر ہو کر روٹی کھانی چھوڑ دی۔ ہمت دلاتے ہوئے مولانا فرمانے لگے۔

دیکھو! دنیا آفتاب و ماہتاب کی روشنی سے جگمگا رہی ہے۔ تم خدا کے لیے کنوئیں کے مینڈک نہ بنے رہو اور نہ کہو کہ ہمیں روشنی نظر نہیں آتی۔

اور غصہ میں ارشاد ہوا کہ

ہرگز ہرگز یہ نہ کہنا چاہیئے کہ فلاں صاحب نے کاشت کی تھی ان کی کھیتی خشک ہو گئی یا ٹڈیوں کا دل کھیت کو اس کے چاٹ گیا ایسی صورت میں ہم کیوں کھیتی کریں میرے ساتھ بھی کہیں یہی صورت پیش نہ آجائے۔ فرمایا:۔

ہیں، مکن استیزہ، او رو کار کن   با توکل، کشت کن، بشنو سخن

دھمکاتے ہوئے کہنے لگے۔

نادر مثالوں کو پیش کر کر کے کاروبار کو چھوڑنے والے درحقیقت قدرت سے جنگ کرنا چاہتے ہیں ان کو سمجھنا چاہیئے کہ ایسا کریں گے تو اٹھنا قیامت تک نصیب نہ ہوگا اور ان نادر مثالوں کی پرواہ کیئے بغیر جو کاشت میں مشغول رہیگا دیکھو گے کہ انبار خانہ کو غلے سے اس نے بھر دیا۔

———— (دفتر سوم)

(۱۰) مسلمانوں کی بے دینی سے دین بیزاری پیدا ہوتی ہے

۱۲ نومبر ۱۹۵۰ئہ مولانا معنوی کی مجلس برکت ذخیرہ میں حاضری میسر آئی۔ مولینا اس قصہ کا ذکر فرما رہے تھے کہ ایک بدآواز کریہ الصوت مؤذن تھا جس کا دل میں اذان دیتا تھا وہاں کی آبادی اس کی آواز سے بیزار تھی۔ بچے راتوں کو ڈر جاتے تھے، سوتے ہوئے لوگ نیند سے چوک پڑتے۔ شورش آبادی میں پھیلی ہوئی تھی، آخر بستی والوں نے مشورہ کر کے چندہ کے ذریعہ سے کافی رقم جمع کی اور مؤذن صاحب کو حج پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ "زاد راہ" مہیا کر دیا گیا۔ مؤذن قافلہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ منزل بمنزل گزرتا ہوا قافلہ ایک ایسے علاقہ میں پہنچا جہاں صرف غیر مسلم اقوام کے لوگ آباد تھے۔ مؤذن کو اذان دینے کا تو شوق ہی تھا باوجود منع کرنے کے اس نے اذان پکار ہی دی، لوگوں کو اندیشہ تھا کہ کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو، غیر لوگ ہیں ان کی عورتیں اور بچے اگر ڈر گئے تو بدلہ لینے پر آمادہ ہوں۔ مگر خلاف توقع دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شخص ہاتھ میں کچھ تحفہ اور ہدیہ سوغات کی چیزیں

لیے چلا آرہا ہے۔ اور قافلہ میں آکر پوچھنے لگا کہ آپ کے قافلہ میں مؤذّن صاحب کون ہیں جنہوں نے آج آذاں دی تھی ان کی خدمت میں اس حقیر نذرانہ کو پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں لوگوں کو تعجب ہوا، بولے قصہ کیا ہوا؟ اس غیر مسلم نے کہا کہ بھائی! ایک زمانہ سے ہم لوگ مصیبت میں مبتلا تھے، ہماری ایک لڑکی جو حد سے زیادہ خوبصورت، خوب سیرت تھی۔ خدا جانے اس کے دل میں اسلام و ایمان کا شوق کہاں سے پیدا ہوا وہ اس دین کی ایسی گرویدہ ہوئی کہ لاکھ جتن کیے گئے مگر وہ اپنے خیال سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ ہوتی تھی۔ آخر آج جب آپ کے مؤذّن صاحب نے آذان دی تو اس مہیب دہشتناک آواز کو سن کر لڑکی نے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ مسلمانوں کی اذان ہو رہی ہے۔ سننے کے ساتھ لڑکی نے کہا کہ اسلام کی اذان کی یہی کیفیت اگر ہے تو میں اس اسلام سے باز آئی۔ ہمارے گاؤں میں آج بڑی خوشی ہے سارا گاؤں لڑکی کے اس حال پر بشاش ہے اور مؤذّن صاحب کی خدمت میں اسی کا نذرانہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔

قصہ ختم کر کے فرمانے لگے کہ جیسے مسلمانوں کے اس مؤذّن سے اسلام کو چھوڑ کر لڑکی کفر کی طرف واپس ہو گئی اسی طرح آج کل کے مسلمانوں کے اسلام سے لوگ بیزار ہو رہے ہیں۔ دینداروں کی بے دینی سے بے دینی پیدا ہو رہی ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ کفر کی پیدائش عموماً دین کی اسی مجازی شکل سے ہوئی ہے ورنہ دین سے ہمیشہ دین پیدا ہوا۔)

(۱۱) "جہانِ مردہ" اور "جہانِ زندہ" کا تقابل

مدت سے دونوں بزرگوں کی مجلسِ فیض سے غائب رہا۔ آج ۱۹۵۱ء کے پہلے ماہ جنوری کی پہلی تاریخ ہے۔ مولانا معنوی کا خیال آیا حاضری کی اجازت مرحمت ہوئی، ارشاد ہو رہا تھا، دو مستقل عالم ہیں، ایک جہان مردہ ہے اور دوسرا جہان زندہ ہے۔ ان الدار الاخرۃ لھی الحیوان۔ جہان زندہ کی ہر چیز زندہ ہے۔ موت سے کل اور جزء دونوں پاک ہیں۔

فرمایا کہ:۔

آدمی زندہ پر عاشق ہوتا ہے زندہ معشوق سے زندگی جب نکل جاتی ہے تو مردہ لاش کو اپنی آغوش میں کون لیتا ہے۔

فرمایا کہ:۔

یہی وجہ ہے کہ جو زندہ لوگ ہیں ان کا جی اس جہان مردہ میں نہیں لگتا۔ جانور گھاس کھا سکتے ہیں لیکن جو آدمی ہے اس کی خوراک گھاس کیسے بن سکتی ہے۔ بلبل کا دل پھول اور چمنستان میں لگتا ہے۔ ہاں! گندہ کیڑے کو گوبر میں آرام ملتا ہے۔

فرمایا کہ :-

عمرؓ کی عدالت جس نے نہیں دیکھی ہے اسے حجاج کی حکومت معیاری حکومت معلوم ہوتی ہے ؎ ہر کرا عدل عمرؓ ننمود دست پیش او حجاج خونی عادل ست

لڑکیاں جب زندوں کے کاروبار سے ناواقف ہوتی ہیں ان کو مردہ گڑیا کھیلنے کے لیے یا بچے استعمال سے جب تک ناواقف ہوتے ہیں ان کو بجائے لوہے کے لکڑی کی تلوار کھیلنے کے لیے دی جاتی ہے۔

اس طرح انبیاء علیہم السلام کا صرف صوری نقش کافروں کے سامنے ہے جو صرف آنکھوں کے اندر گھوم کر رہ جاتا ہے مگر جن کے سامنے نقش کے پیچھے والا عالم ہے۔ ان کو چند ٹیڑھی ترچھی لکیروں والے عالم کی پرواہ نہیں ہے۔

زاں جہاں ما راچو دور روشنی ست ہیچ ما پروائے نقش و سایہ نیست

پھر مولینا نے فرمایا :-

ایک ہی شخص کا بیرونی نقش اس جہاں میں ہے اور دوسرا نقش اسی کا چاند کی طرح آسمان پر ہے۔ پھر باہر و اندر ظاہر و باطن کے نقوش کے مسئلہ کو مختلف مثالوں سے سمجھاتے ہوئے فرمایا ؎

دست ظاہر می کند داد و ستد دست باطن بر یدید فرد صمد

آخری خلاصہ یہ نکلا کہ "ظاہری نقش" زمانے کے قید خانہ میں بند ہے اور باطن زمانی حدود سے آزاد ہے ؎

ایں کہ در وقت ست باشد تا اجل واں دگر یار ابد قرن ازل

جب پر یہ حال طاری ہو جاتا ہے تو مولانا نے فرمایا کہ :-

خلوت و چلہ برو لازم نماند ہیچ غرمے مرورا عازم نماند

فرمایا کہ :-

پانی میں ٹوکری کو کسی نے ڈالا، ٹوکری پانی سے بھر گئی اور اس غلط فہمی میں مبتلا کہ درحقیقت اس کے اندر پانی ہے جب تک دریا میں رہی معلوم ہوتا تھا کہ پانی اس میں ہے۔ لیکن جوں ہی دریا سے تعلق اس کا منقطع ہوا کچھ بھی اس میں باقی نہ رہا ۔

آں سبد خود را چو پر از آب دید ۔۔۔ کرد استغنا و از دریا برید
در جگر چوں قطرۂ آبش نماند ۔۔۔ بحر رحمت کرد و او را باز خواند

(دفتر پنجم)

(۱۲) حفاظتِ توبہ کی تاکید

بہت دن کے بعد مولانا معنوی کا خیال آیا حاضری آسان کی گئی، فرمایا ہے تھے قصہ اس شکاری کا جو جنگل میں گھاس سبزہ پھول کی ٹوپی بنا کر کنارے پڑا ہوا تھا اور دام کو بچھا کر گیہوں کے چند دانے وہاں ڈال دیئے تھے ایک چڑیا اس طرف سے گزر رہی تھی، اس حال میں شکاری کو دیکھ کر بولی۔ جناب آپ نے یہ جنگل کی زندگی کیوں اختیار کی ہے۔ شکاری بولا کہ موت سامنے ہے۔ مرنے سے پہلے موت کی تیاری کر رہا ہوں میرا ساتھی یعنی مرگ ناگہانی میرے لیے واعظ بن گیا۔ سب کچھ چھوڑ کر میں نے جنگل کی زندگی اختیار کی ہے۔ میری روح آب و گل کے قالب میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ اندر سے آواز آئی کہ میاں تم ہمیں بھول گئے تمہاری حالت تو اس بچے کی ہے جو گیند بلّی کھیلنے کے لیے کپڑے اتار کر کھیل میں مشغول ہو کسی نے کپڑے اور جوتیاں اس کی اٹھالیں۔ بچہ کھیل میں اس طرح مستغرق تھا کہ نہ کپڑے یاد رہے نہ جوتیاں جب رات آئی تب تلاش ہوئی۔ اب کیا کرے گھر جانے سے شرماتا تھا۔

مولینا نے فرمایا کہ :-

یہی وقت ہوتا ہے کہ چورنہ کا آدمی بیچھا سواری پر بیٹھ کر کرے۔ سواری؟ سمجھا بھی کیا ہے، اس کا نام توبہ ہے عجیب سواری ہے

مرکب توبہ عجائب مرکب ست ۔۔۔ بر فلک تازد بیک لحظہ ز پست

مگر آدمی کو چاہیئے کہ اس کی حفاظت کرے ورنہ کہیں وہ قصہ نہ پیش آئے کہ ایک غریب گھر سے "قیچ" چور لے بھاگا۔ قیچ والے نے پیچھا کیا کنوئیں کی مینڈھ پر چور بیٹھ کر شور

ہنگامہ کرنے لگا۔ قیچ والے نے کہا کہ کیا ہوا کیوں روتا ہے۔ بولا اسی کنوئیں میں میری تھیلی پانسو درہم کی گر گئی کوئی نکالے تو سو درم پانچواں حصہ اس کو دوں۔ قیچ والے نے کپڑے اتارے کنوئیں میں اترا۔ ادھر وہ کنوئیں میں اترا اور چور اس کے کپڑے لے کر جمپت ہو گیا۔ گئے تھے کہ قیچ چور سے چھینیں گے اور کھو دیا اپنا سب کچھ اسی طرح شیطان "توبہ" کی سواری سے بھی آدمی کو محروم کر دیتا ہے اس سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔

بہرحال شکاری نے جب ترک دنیا کی ڈینگ ماری تو چڑیا نے کہا کہ تم تو مسلمان ہو اسلام میں کہاں رہبانیت جائز ہے۔ اسی موقع پر مولانا نے فرمایا :-

مصلحت در دیں باجنگ و شکوہ   مصلحت در دین عیسٰی غار و کوہ

شکاری نے کہا کہ یہ حکم قوت والوں کے لیے ہے۔ ہم کمزوروں کے لیے تو پرہیز ہی بہتر ہے۔

(دفتر ششم)

(۱۳) صرف اللہ ہی سے مانگو

بعد مغرب مولینا سے استفادہ کی گدگدی پیدا ہوئی فرمانے لگے :-

معنی اللہ گفت آں سیبویہ   یولھون فی الحوائج ھم لدیہ

صد ہزاراں عاقل اندر وقت درد   جملہ نالاں پیش آں دیان فرد

گر ندیدندے ہزاراں بارہ بیش   عاقلاں جاں کے کشیدندش بہ پیش

ہیں از و خواہید نے از غیر او   آب در یم جو مجو در خشک جو

ور بخواہی از دگر ہم او دہد   بر کف میلش سخا ہم او نہد

آں کہ معرض را ز رز قارون کند   رو بدو آری بطاعت چوں کند

اللہ کے معنی سیبویہ نے لکھا ہے کہ یہ ہیں، ضرورتوں میں بے تابانہ جس کی طرف توجہ کی جائے۔

فرمایا کہ :-

بڑے بڑے دانا اور خردمند عقل کے پتلوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب درد ان کو پکڑتا ہے تو ساری عقل دھری رہ جاتی ہے اور اسی دینے والے کو پکارتے ہیں اگر تجربہ نہ ہوتا کہ فریاد رسی وہی فرماتا ہے تو لوگ اس کی طرف کیوں دوڑتے۔ بھائی!

پانی دریا سے چاہو، خشک ندی بے چاری کیا دے گی۔ پس اللہ ہی سے مانگو اس کے سوا اور کون ہے جو دے گا۔ غیر سے بھی ملتا ہے تو دینے والا وہی ہے وہی سخاوت کے جذبہ کو حرکت میں لاتا ہے، قارون جیسے نافرمان کو جو سونا دے، فرماں برداروں کو وہی کیا نہ دے گا

——————— (دفتر چہارم)

(۱۴) "شر" اور "خلق شر"

۲۷ جنوری ۱۹۵۱ء آج مولینا رومی سے شرف نیاز حاصل ہوا فرمانے لگے کہ ایک شخص پوچھنے لگا کہ کفر کے ساتھ راضی ہونا بھی کفر ہے اور کفر چونکہ حق تعالیٰ کے قضاء کا نتیجہ ہے اسی لیے قضاء الٰہی کے ساتھ راضی رہنا بھی ایمان ہے۔ ایمان و کفر کو کیسے جمع کروں ؟ مولینا نے اس شخص سے کہا کہ بھائی! تم نے قضاء اور مقضی کے فرق کو نہیں سمجھا ایک خطاط اچھے حروف بھی لکھتا ہے اور ان ہی حروف کو بگاڑ کر بھی لکھتا ہے ایسی صورت میں بھلائی اور برائی کے مرجع حروف ہیں نہ کہ خطاط کا کمال ہے۔ بلکہ ؎

قوت نقاش باشد آنکہ او ہم تواند زشت کردن ہم نکو

اور یہ کہ ؎

زشتی خط زشتی نقاش نیست بلکہ از وے زشت را بنمودنیست

یعنی بُرے حروف کی برائی کو نقاش اس ذریعہ سے ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ پس حروف کی خرابی سے حروف کی خرابی ظاہر ہوئی نہ کہ لکھنے والے کی برائی۔

اس موقع پر مولینا نے یہ فرماتے ہوئے کہ شر اور خلق شر کے فلسفہ کو زیادہ بڑھاتا ہوں تو خواہ مخواہ میرا وقت ضائع ہوتا ہے تسلی حاصل کرنے والوں کے لیے اتنا اشارہ ہی کافی سمجھا۔ (دفتر سوم) ———

دماغی نکتہ آرائیاں قلب کی غفلت کی نشانی ہیں

اور اسی کے بعد بڑے پتہ کی بات حضرت والا نے یہ ارشاد کی کہ بھائی یہ فلسفہ، یہ نکتہ نوازیاں ان ہی دماغوں میں عموماً آتی ہیں جن کا دل درد سے خالی ہے اور دین کی فکر سے جو غافل ہیں پھر ایک لطیفہ کا ذکر فرمایا کہ کسی بڈھے نے جوان عورت سے نکاح کیا۔ اور اس کے بعد اصلاح ساز کی دوکان پر پہنچکر اس نے فرمائش کی کہ میری داڑھی کے سفید بالوں کو نکال دو۔ اصلاح ساز جسے غالباً مولینا کے زمانہ میں "آئینہ دار" کہتے تھے اس نے بڈھے

کی ساری ڈاڑھی مونڈ ڈالی۔ اور ڈاڑھی کے بالوں کو اس کے سامنے رکھ کر بولا کہ سفید بالوں کو سیاہ بالوں سے اب آپ خود ہی جدا کر لیجئے مجھے تو ایک کام ہے اتنی فرصت نہیں کہ آپ کی فرمائش کی تعمیل کروں۔ اسی سلسلہ کا ایک دوسرا لطیفہ بھی مولینا کو یاد آ گیا کہ ایک شخص نے کسی غریب کے سر پر چپت رسید کی چپت کھانے والا بھنا گیا اور چاہا کہ مارنے والے سے بدلہ لے۔ چپت لگانے والے نے کہا کہ بھائی! ذرا ٹھہرو۔ پہلے میرے ایک سوال کا جواب دے دو، پھر جو چاہنا کرنا اور وہ سوال یہ ہے کہ سر پر آپ کے جس وقت میں نے چپت رسید کی تو تڑاق کی آواز اس سے پیدا ہوئی، اب آپ یہ فرمایئے کہ یہ آواز کس سے پیدا ہوئی؟ آپ کی چندیا سے پیدا ہوئی یا میرے ہاتھ سے؟ لیکن چپت کھانے والے نے کہا کہ خوب! میرا حال تو درد سے تباہ ہو رہا ہے اور میں تکلیف سے بےکل ہوں اور آپ مجھ سے فلسفہ دریافت فرما رہے ہیں کہ آواز ہاتھ سے پیدا ہوئی یا چندیا سے۔ آخر میں چپت کھانے والا جو درد سے بے چین تھا بولا، کہ:۔

تو کہ بے دردی ہمی اندیشی ایں نیست صاحب درد را ایں فکر ہیں

اسی کے بعد مولینا نے فرمایا؎

غفلت و بے دردیت فکر آورد درخیالت نکتۂ بکر آورد

حاصل جس کا یہی ہوا کہ نت نئے نکتے اور "نکتۂ بکر" یہ پیٹ بھروں کی باتیں ہیں بال کی کھال نکالتے ہیں۔ لیکن دین کے درد میں جو تڑپ رہا ہے اسے ان باتوں کی کہاں فرصت اس کا کام تو فقط اس قدر ہے؎

حکم حق را بر سر رو می نہد حفظ فکر خویش یکسو می نہد

درد والے صرف خدا کی باتوں پر کان لگاتے ہیں اور اپنی زندگی کو ان ہی کے مطابق بنانے میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔

———— (دفترِ سوم)

(۱۵) مثنوی کا ایک ظاہر ہے اور اس کے تحت اس کا باطن بھی ہے

۲ مارچ ۱۹۵۱ء
حضرتِ معنوی کی مجلس

فیض و برکت تک دل نے پہنچایا! اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ ان تاریک دنوں میں ایک کوردہ گاؤں کے اندر اس روشن و پاک مجلس تک رسائی میرے جیسے آسان کی گئی۔ آج مثنوی کے نکتہ چینوں کی نظر

سے گونہ گرانی پائی جارہی تھی اسی کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ ایک دلچسپ لفظ "خریط" استعمال فرمایا۔ بڑی بط کو خریط کہتے ہیں اور پھر مسخروں کے یہے یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ فرمارہے تھے کہ سنا ایک گدھے خانے سے کسی "مسخرے" نے سر نکالا اور کہنے لگا کہ مولوی رومی کی مثنوی کا آخر لوگوں میں اتنا چرچا کیوں ہے مجھے تو اس مثنوی میں اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا کہ بار بار مولوی صاحب دہرا دوہرا کر بس یہی کہتے ہیں کہ "پیغمبر کی پیروی اور اتباع ہی نجات کی راہ ہے" یعنی خریط کہہ رہا تھا ؎

کایں سخن کیست ست یعنی مثنوی قصۂ پیغمبر است و پیروی

خریط یہ بھی کہتا تھا کہ تصوف میں کوئی کتاب مولوی صاحب اگر لکھنا ہی چاہتے تھے تو اس میں چاہیئے تھا کہ صوفیہ کی گہری باتوں کو بیان کرتے ان کے بلند اسرار، عمیق رموز کی عقدہ کشائی کرتے کچھ فنا و بقاء کی تشریح کرنی چاہیئے تھی۔ بتاتے کہ تبتل کی راہ اختیار کر کے چلنے والے کس طرح ترقی کرتے ہوئے ؎

" پایہ پایہ تا ملاقات خدا "

پہنچتے ہیں، بجائے اس کے اس مثنوی میں ان قصوں اور کہانیوں کے سوا جن سے بچے خوش ہوں مجھے تو اور کوئی چیز نہیں ملتی۔ الغرض ساری مثنوی خریط کہتا تھا کہ ؎

جملہ سرتا سر فسانہ است و فسوں کودکانہ قصہ بیرون و دروں

خریط کی اس جاہلانہ تنقید نے مولینا میں جوش کی کیفیت پیدا کی، جلال میں بھرے ہوئے تھے۔ فرما رہے تھے کہ بھائی! میری مثنوی کے متعلق خریط نے اگر یہ رائے قائم کی تو کیا ہوا، بداندیشوں نے تو اللہ کی کتاب کے متعلق کیا کچھ نہیں کہا۔ خود قرآن ہی سے معلوم ہو رہا ہے کہ "اساطیر الاولین" اگلوں کی کہانیاں، کہنے والے بھی اس کتاب عزیز کے متعلق پائے جاتے تھے، وہی یہ بھی کہا کرتے تھے کہ نہ قرآن میں فلسفہ ہے اور نہ حکمت نہ تحقیق ہے اور نہ عالمانہ نکات و دقائق اس کتاب میں پائے جاتے ہیں لے دے کر کچھ تو ایسی باتیں ملتی ہیں کہ فلاں کام جائز ہے اور فلاں ناجائز، اللہ میاں اس فعل کو پسند کرتے ہیں، فلاں فعل ان کے نزدیک ناپسندیدہ ہے اس کے سوا کچھ آدم و ابلیس کے قصے ہیں۔ کچھ ہود و عاد والی آندھی، ابراہیمؑ کی آگ، نوحؑ کی کشتی، اس زمانہ کا طوفان یا یوسفؑ اور یعقوبؑ، زلیخا کی داستان، اسماعیلؑ کی قربانی، جبرئیل کا نام، کعبہ اور ہاتھیوں کے حملہ کا ذکر، بلقیس، سلیمانؑ، سبا کے افسانے الغرض اسی طرح کچھ داؤد، طالوت، شعیب، یونس (علیہم السلام) کی سرگزشتیں۔ مریم کس طرح حاملہ ہوئیں، ولادت

کے بعد کھجور کے درخت کو ہلا کر پھل گرانے کا حکم ان کو دیا گیا۔ یا یہ کہ یحییٰ، زکریا کی دعا سے پیدا ہوئے۔ صالح علیہ السلام نے پتھر سے اونٹنی نکالی، اونٹنی کی وجہ سے پانی کی تقسیم کا جھگڑا پیش آیا۔ ادریس، الیاس، عزیر کے نام، قارون زمین میں کس طرح دھنسایا گیا، بنی اسرائیل وادی تیہ میں چالیس سال تک کس طرح بھٹکتے رہے۔ موسیٰ کو درخت میں آگ نظر آئی ان کی لاٹھی اژدھا بن کر لہرانے لگی۔ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے۔ ذوالقرنین، خضر کے قصے اور کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف۔ ان کے چند معجزات، کہنے والے کہتے تھے کہ ان ہی چند سیدھی سادی باتوں کے سوا قرآن میں دھرا کیا ہے۔

مولانا پھر اسی خریطہ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ جب قرآن کے متعلق مخالفوں کی طرف سے یہ لطیفے پھیلائے جا رہے تھے تو قرآن نے اعلان کیا تھا کہ اگر اتنی ہی سادی اور سیدھی باتوں پر قرآن مشتمل ہے تو پوری کتاب کا نہ سہی اس کی ایک سورۃ یا ایک آیت ہی کا جواب بنا کر پیش کرو۔ قرآن ہی نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ انس و جن مل کر بھی اس کی کوشش کریں گے تو کامیاب نہ ہوں گے۔

(بظاہر مولانا بھی شاید یہی فرمانا چاہتے تھے کہ میری مثنوی بھی اگر واقعی جیسا تم کہتے ہو کوئی ہلکی پھلکی کتاب ہے تو کیوں لکھنے والے اسی قسم کی مثنوی لکھ کر اپنے آپ کو اور اپنی کتاب کو دنیا میں مقبول بنانے میں کامیاب نہیں ہوتے مگر یہ میرا اضافہ ہے مولانا نے یہ نہیں فرمایا۔ (مناظر احسن گیلانی)

مولانا کو تو موقع مل گیا قرآن پر بحث کرنے کا اور خریطہ کو اسی کے خبط کے حوالے کر کے فرمانے لگے کہ قرآن کا ایک تو ظاہر ہے، اس ظاہری پہلو کے نیچے باطنی پہلو بھی اس کتاب کی آیتوں کے ہیں باطن میں بھی چند طبقات ہیں باطنی پہلو کی ایک تہہ تک پہنچنے کے بعد جب دوسری باطنی تہہ سوچنے والوں کے سامنے آتی ہے تو وہ ششدر و حیران ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یوں ہی تہہ کے بعد تہوں کا سلسلہ ملتا ہی چلا جاتا ہے۔ تیسری تہہ تک پہنچنے کے ساتھ ہی آدمی کی عقل گم ہو جاتی ہے آگے تو ایک حد ایسی بھی آتی ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں ہے۔

فرمانے لگے کہ بھائی! لوگ آدمی کے قالب کو دیکھ کر تو وہی رائے قائم کر سکتے ہیں جو ابلیس نے کی تھی کہ مٹی اور پانی سے مل کر جو کیچڑ تیار ہوئی تھی اسی کیچڑ میں زندگی پیدا ہو گئی۔ ورنہ " اصل اس کی کیچڑ ہے" یہ ایک شیطانی مغالطہ ہے۔ کہنے لگے میاں! اولیاء اللہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ پہاڑوں اور بیابانوں میں رہتے ہیں لیکن سچ پوچھو تو آبادی میں بھی جس وقت وہ رہتے ہیں اس وقت بھی عوام کے لحاظ سے

وہ پہاڑوں کے غاروں ہی میں چھپے رہتے ہیں اور پہاڑوں کی بلندی پر بھی جو قیام فرما ہیں کیا ان کی حقیقی بلندی یہی ہے؟ تمہارے سامنے وہ پہاڑ پر نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ساتوں آسمانوں سے بھی وہ اونچے ہیں۔ بہرحال جن لوگوں کو آسمان بھی نہ چھو سکتا ہو ان کو ضرورت ہی کیا ہے کہ وہ پہاڑوں پر جاکر اپنے آپ کو مخلوق کی نگاہوں سے چھپائیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جن، بھوت، پری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں لیکن ان کو یہ شاید معلوم نہیں کہ واقعی انسان کی جو اصل حقیقت ہے وہ دیو اور پری سے بھی زیادہ مخفی اور پوشیدہ ہے۔ مولٰینا نے فرمایا کہ حضرت موسٰی کی لاٹھی جو اژدہا بن جاتی تھی، اژدہا بننے کے وقت ایک سانپ کی صورت میں وہ نظر آتی تھی مگر درحقیقت یہ اژدہا ایسا تھا کہ کائنات کو اپنے اندر چاہتا تو ہڑپ کرلیتا ؎ ظاہرش چوبے ولیکن پیش او کون یک لقمہ چو بکشاید گلو

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زبان مبارک سے کچھ حروف اور الفاظ نکلے تھے لیکن یہ ایسے حروف اور الفاظ تھے جن سے زندگی مردوں کے بدن میں واپس آجاتی تھی کہ مسیح علیہ السلام کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ کو نہ دیکھے نظر اس پر رکھے کہ مردہ جو پڑا ہوا تھا کلبلا کر اٹھ بیٹھا۔ موسٰی علیہ السلام کی لاٹھی کو کیا دیکھتے ہو اس کو دیکھو کہ سمندر کو پھاڑ کر اس نے رکھ دیا۔ مولٰینا پھر جوش میں آگئے اور فرمانے لگے میاں گرد کو کیا دیکھتے ہو اس سوار کو دیکھو جو اس گرد میں چھپا ہوا ہے۔

(دفتر سوم)

---

(۱۶) تنہا عقل محافظ حدود نہیں ہو سکتی!

۲۲ رمئی ۱۹۵۱ء حضرت معنوی کی مجلس انس و افادہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی اس وقت قصہ کے رنگ میں تقریر اس مسئلہ پر فرما رہے تھے کہ

"وقت جب آئے گا تو ہم اپنی عقل سے کام لے کر مشکلات پر قابو حاصل کرلیں گے"

اس قسم کا دعوٰی ہر عامی آدمی کے لیے مناسب نہیں ہے عقل تو بیشک لوگوں میں ہوتی ہے لیکن عقل سے کام لینے کے لیے جس عزم اور ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے اس سے عموماً لوگ محروم ہوتے ہیں فرمانے لگے کہ ایک صاحب تھے جن کی لڑکی جوان ہوگئی فکر شادی کی ہوگئی کفو اور خاندان میں مناسب بر نہیں ملا مجبوراً غیر خاندان کے لڑکے سے لڑکی کا عقد کر دیا مگر اسی کے ساتھ لڑکی کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ کرنے کو تیرا عقد گو اس مرد سے میں نے کر دیا ہے لیکن یہ خاندان کا آدمی نہیں ہے اور اس کا بھروسہ نہیں کہ

نباہنے کی کوشش کرے گا ایسی صورت میں مناسب یہی ہے کہ کوئی اولاد اس سے پیدا نہ ہو ممکن ہے کہ اولاد پیدا کر کے خود رفو چکر ہو جائے اور بچے کو تیرے گلے کا طوق بنا کر مصیبت میں مبتلا کر دے۔ مولینا کے اصل اشعار یہ ہیں ؎

گفت دختر را کزیں داماد نو — خویش را پرہیز کن حامل مشو
کز ضرورت بود عقد ایں گدا — ایں غریب خوار را نبود وفا
ناگہاں بجہد کند ترک ہمہ — بر تو طفل او بماند مظلمہ

لڑکی باپ کی نصیحت کو سنتی اور عرض کرتی کہ میں ایسا ہی کروں گی ہر دوسرے تیسرے دن باپ کا دستور تھا کہ لڑکی کو یاد دلاتا اور مزید تاکید کرتا۔

مگر خلوت میں میاں بیوی جمع ہونے لگے تو باپ کی نصیحت بے کار ثابت ہوئی، لڑکی حاملہ ہو گئی۔ باپ نے پوچھا کہ یہ کیا کیا؟ لڑکی نے جواب دیا کہ ابا جان روئی آگ کے سامنے لائی جائے گی تو جلنے سے کیسے محفوظ رہ سکتی ہے اور یہاں واقعہ یہ ہے کہ ؏

"آتش و پنبہ ست بےشک مرد و زن"

اس زمانہ میں بھی "مخلوط سوسائٹی" کے علمبرداروں کی طرف سے یہی نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ عقل کے زور سے حدود کی حفاظت میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن وقت پر عموماً تجربہ اسی کا ہوا کہ عقل کے استعمال صحیح کا موقع نہ ملا اور روئی میں آگ لگ گئی

(دفتر پنجم)

---

(۱۷) ہمجنسی میں عجیب جاذبیت ہے

۸ جولائی ۱۹۵۱ء، آج ۲ تاریخ عید کی ہے۔ ظہر کی نماز کے بعد حضرت معنوی کی محفل قدس کا خیال آیا۔ مجلس جمی ہوئی تھی صف نعال میں شریک ہو گیا فرما رہے تھے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں ایک عورت ہانپتی کانپتی حاضر ہوئی عرض کرنے لگی حضرت میرا بچہ چھت کی نالی کے پاس ایسی جگہ جا کر بیٹھ گیا ہے کہ کسی کی رسائی اس تک نہیں ہو سکتی اور بلاتی ہوں تو اندیشہ ہے کہ خوف سے وہ گر نہ پڑے کوئی صورت نجات کی سمجھ میں نہیں آتی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ تدبیر اس کی یہ ہے کہ اسی بچہ کا ہمجولی لڑکا ہو اس کو سامنے لے آؤ اپنے ہم عمر ہمجولی کو

دیکھ کر تمہارا بچہ خود بخود اس کے پاس آجائے گا۔ عورت نے یہی کیا، بہر کار گر ثابت ہوئی بچہ اپنے ہجولی بچے کو دیکھ کر خوشی سے اس کے پاس آگیا۔ یہ تھا تو قصہ اب مولینا قصہ کے نتائج کی طرف متوجہ ہوئے یاد دلایا قرآن میں پیغمبروں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ بشر کی صورت میں وہ کیوں بھیجے جاتے ہیں یہی ہم جنسی کا راز ہے ع " زانکہ جنسیت عجائب جاذبی ست "

اسی کے ساتھ ارشاد ہوا کہ جہاں کہیں تم کو طالب نظر آئے سمجھو کہ وہ اپنے ہم جنس ہی کا طالب ہے۔ حضرت علیٰؑ اور حضرت ادریسؑ آسمان پر گئے تو اسی لیے گئے کہ ملکوتی الصفات ہو چکے تھے۔ عالم ملکوت کی طرف کھنچ گئے اور جیسے وہ بلندی کی طرف گئے بعض لوگوں کو شیطانی صفات سے مناسبت تھی وہ شیطان کی طرف جھک پڑے۔ مولینا نے فرمایا کہ

شیطان کی طرف انسان کیوں جھکتا ہے؟ سب سے پہلی علامت اس بات کی کہ شیطان کی طرف آدمی جھک گیا، یہ ہے کہ شیطان کی پہلی بُرائی یعنی حسد کا شکار ہو جائے یہ پہلا مرض ہے۔ جس کا شیطان میں ظہور ہوا۔ فرمایا کہ حاسد غریب کا عجب حال ہوتا ہے ؎

ہر کرا دید او کمال از چپ و راست — از حسد قولنجش آمد، درد خواست

الغرض کمال ظہو کسی میں ہونا شرط ہے اور حاسد غریب پر قولنج کے دورے پڑنے لگتے ہیں درد سے تڑپتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ ؎

زانکہ ہر بدبخت خرمن سوختہ — می نخواہد شمع کس افروختہ

اپنی کھلیان میں آگ لگا کر چاہتا ہے کہ کسی کے گھر میں دیا روشن نہ ہو۔ (دفتر چہارم)

علاج حسد مولینا نے فرمایا کہ حسد کے مرض سے نجات پانے کی ایک ہی راہ ہے کہ آدمی خود اپنے اندر کسی کمال کو پیدا کرے۔ جب خود صاحب کمال ہوگا تو دوسروں کے کمال کو دیکھ کر نہ جلے گا۔ جلتے وہی ہیں جو خود کمال سے خالی ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جیسے خود مفلس ہیں دوسرے بھی مفلس ہو جائیں۔ (اور سارے کمالات میں بڑا کمال یہ ہے) کہ آدمی کسی باطنی شغل میں مشغول ہو جائے۔ ایک گھونٹ بھی اس شراب کی جسے میسر آجاتی ہے پھر اسی میں ایسا مست ہو جاتا ہے کہ پھر اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ سارے جہان میں کیا ہو رہا ہے۔ ارشاد ہوا کہ ایک مٹھی بھنگ میں خاصیت ہے کہ پینے والوں کو دونوں جہان سے تھوڑی دیر کے لیے غافل بنا دے۔ پھر باطن والی شراب کی خاصیت کا کون اندازہ کر سکتا ہے

نیند ہی کو دیکھو! طاری ہوئی اور دونوں جہان سے آدمی بے خبر ہو گیا۔ تم نے سنا ہوگا غریب مجنوں کھال کے عشق میں ایسا دیوانہ ہوا کہ سائے سے دوست و دشمن کی تمیز جاتی رہی۔

الغرض قدرت نے انسان کے اندر احساسات پیدا کیے ان احساسات کے لیے ایسی دوائیں قدرت نے مقرر کر رکھی ہیں جن میں ان کا مداوا ہے۔ مگر

مستی پیدا کرنے والی اس شراب کے استعمال سے پہلے ضرورت ہے کہ استعمال کرنے والا دیکھے کہ اس کی یہ مستی استعمال کرنے والے کو کدھر لے جاتی ہے ایک شراب وہ بھی ہے کہ پینے والا نفس کی خواہشوں میں غرق ہو کر سب کچھ بھول جاتا ہے اور شراب ہی کی ایک قسم وہ بھی ہے جو عقل کو ایک منزل سے منزل کی طرف کھینچ کر پہنچاتی ہے۔ حوصلہ اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ آسمانوں کے خیموں کو پھاڑ کر آگے کی راہ آدمی کے سامنے لے آتا ہے۔

پس صرف .... "مستی" مطلوب نہیں ہے بلکہ مست آدمی کس میں ہوا ہے۔ دیکھنے کی بات صرف یہ ہے۔ آخر گدھا بھی تو مست ہی ہوتا ہے لیکن کس چیز کا مست؟ جو کی چند مٹھیوں کا۔ اور مسیح علیہ السلام بھی مست تھے کس کے؟ حق کے۔

بہر حال ؎

ہیں بہر مستی دلا غرہ مشو   ہست عیسیٰ حق خر مست جو

شراب خمخانوں میں بھری ہوئی ہے احتیاط شرط ہے۔ کس خم کی شراب پی رہے ہو پہلے چکھ کر اندازہ کر لو، تم کو مست کرنے والی شراب ان ہی خمخانوں میں ایسی بھی مل جائے گی کہ ع

"مستیت آرد، کشاں تا رب دیں"

دین والے رب کی مستی جس سے پیدا ہو اسی شراب کو تلاش کرو ؎

تا رہی از فکر و وسواس و حیل   بے عقال عقل در رقص الجمل

یعنی یہی وہ مستی ہے جو آدمی کو اس مہلک مرض سے شفا بخشتی ہے۔ جس کا نام "وسواس" ہے، اور جیسے اونٹ ناچنے لگتا ہے اس شراب کا مست عقل کے بکیڑے (عقال) سے نکل کر محو رقص ہو جاتا ہے۔ (دفتر چہارم)

انبیاء کی طرف کون جھکتے ہیں؟ اس ناسوتی عالم میں حضرات انبیاء علیہم السلام بشری صورت،

ملکی سیرت کے ساتھ پیدا کیے جاتے ہیں ان کے دامن کو وہی تھامتے ہیں جو ان سے مناسبت رکھتے ہیں۔ آگ اور ہوا، دونوں کا قدرتی میلان بلندی کی طرف ہے۔ جب ان کو اپنے حال پر چھوڑا جائے اوپر ہی جانا چاہیں گے۔ خالی گھڑے کو جس میں ہوا بھری ہو۔ تم دریا میں الٹ کر رکھ دو یا سمندر میں لیکن کبھی وہ پانی کے اندر نہ جائے گا۔ اوپر ہی تیرتا رہے گا جس کی وجہ یہ ہے کہ ع

کہ دلش خالی ست در دے باد ہست

پس ~ میل بادش چوں سوئے بالا بود ظرف خود را ہم سوئے بالا کشد

آدمی میں عقل بھی ہے اور نفس بھی، عقل جس پر غالب ہے وہ پیغمبروں کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور نفس جس پر مستولی ہے شیطان کی طرف گھسٹتا ہے۔

(دفتر چہارم)

(۱۸) قرب حق کی دو قسمیں

حضرت معنوی کی مجلس معنی و حقیقت کا ولولہ موجزن ہوا حضوری کی سعادت کے ساتھ فوائد یہ حاصل ہوئے۔ فرماتے تھے قصہ اس گیدڑ کا جو رنگریز کے ٹب میں غوطہ کھا کر نکل آیا تھا جس کی وجہ سے طرح طرح کے رنگ سے گیدڑ کی کھال رنگین ہو گئی۔ باہر نکلنے کے بعد گیدڑ کو اپنے رنگ کے متعلق غلط فہمی ہوئی۔ خیال کرنے لگا کہ ایک قسم کا طاؤسی جسم قدرت کی طرف سے مجھے عطا ہوا ہے۔ اب معمولی صحرائی گیدڑوں کے مانند میں باقی نہ رہا۔ میں اور کچھ ہو گیا ہوں دوسرے گیدڑوں نے دیکھا کہ ہم لوگوں سے کچھ کنارہ کنارہ یہ رنگین گیدڑ رہنے لگا۔ ایک گیدڑ پہنچا اور بولا۔ بھائی! آپ ہیں کس حال میں؟ آپ کو کیا ہوا کہ ہم لوگوں سے کچھ الگ الگ رہنے لگے۔ اس نے کہا کہ تم نے یہ کیا مکر و فریب کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ تمہاری حالت تو اس شخص کی معلوم ہوتی ہے جیسے دنبے کی کھال مل گئی تھی۔ کھال میں کچھ چربی لگی تھی گھر سے جب نکلتا تو مونچھ میں اسی چربی کو مل لیتا۔ اور دوستوں میں بیٹھ کر مونچھ کو تاؤ دیتے ہوئے باور کراتا کہ گھر میں بہترین بریانی اڑا کر آ رہا ہوں۔ لیکن اس کا پیٹ اندر سے کوستا کہ خدا تیری مونچھ کو اکھاڑے۔ بندۂ خدا! اگر تو لوگوں کو جھوٹ باور نہ کراتا پھرتا کہ آج میں نے یہ کھایا ہے، وہ کھایا ہے تو شاید تیرے حال پر رحم کھا کر کوئی کچھ کھلا دیتا۔ یا کوئی دوست ہی تیری دعوت کر دیتا۔ کم از کم اپنا واقعی حال لوگوں پر نہ کھولتا تو یہی کرتا کہ چپ رہتا۔ لیکن اب سن چمڑا دنبہ کا جس میں چربی لگی ہوئی تھی اسے بھی بلی

لے بھاگی۔ اب اپنی مونچھ میں تو کیا لگائے گا؟

اسی سلسلہ میں مولینا فرماتے تھے کہ "قرب حق" کی دو مستقل قسمیں ہیں۔ خلق اور رزق کا قرب تو ایسا قرب ہے جس میں ہر خاص و عام کی حیثیت برابر ہے! اور قرب حق کی دوسری قسم کا نام "قرب وحی و عشق" ہے۔ یہی قسم قرب کی اولیاء اور انبیاء کے ساتھ مختص ہے۔

فرمایا کہ آفتاب کے ساتھ سوکھی شاخ کو بھی قرب کی نسبت حاصل ہوتی ہے اور شاخ تر کو بھی لیکن شاخ تر آفتاب کی گرمی سے شیریں اور مزیدار میووں کو پیدا کرتی ہے اور خشک شاخ کی خشکی میں خشکی کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

(۱۹) "الم نشرح" کی توضیح!

۷ اگست ۱۹۵۱ء، عجیب بات ہے آج کل سورۂ الم نشرح کے متعلق خیال دل میں گزر رہا تھا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ العسر (دشواری) کے ساتھ "یسر" کو اطلاقی رنگ دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ پیدا کیا گیا کہ کسی متعین دشواری کے ساتھ "یسر" اور آسانیوں کی متعدد شکلیں پیدا ہوتی ہیں ؎

اذا شتدت بک البلوی ففکر فی الم نشرح ‏ ‏ ‏ فعسر بین یسرین اذا فکرتہا فافرح

والا شعر مدرسوں میں عام طلبہ کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے لیکن نیا خیال یہ ذہن میں آیا کہ اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یاد دلایا گیا ہے کہ بند سینے کو آپ کے ہم نے کھول دیا یعنی غیبی علوم کے دروازے وحی کے ذریعہ آپ پر کھل گئے۔ پھر آپ کو تنہا اس دنیا میں کھڑا کر دیا گیا جو کفر و شرک سے بھری ہوئی تھی۔ کتنا بڑا بوجھ تھا جو آپ پر لادا گیا۔ اور اسی کا نتیجہ ہوا کہ اپنے گھر تک کے لوگ حتی کہ حقیقی چچا ابولہب جیسے لوگ تک دشمن ہو گئے وطن کو چھوڑنا پڑا۔ بڑا بوجھ تھا جس نے کمر ہی توڑ دی مگر بوجھ جس نے لادا تھا اسی نے اتار بھی دیا۔ دس لاکھ مربع میل عرب کی سرزمین آپ کے حیطۂ اقتدار میں آ گئی، کامیابی اور کیسی کامیابی جو اتار دیا ہم نے اس بوجھ کو جس نے توڑ دی پیٹھ تیری" اور بے مادر و پدر، ان پڑھ اُمّی، صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو اتنی رفعت بخشی گئی کہ نسل انسانی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کون نشاندہی کر سکتا ہے کسی ایسے آدم زاد کے نام کی ‏ ‏ ‏ جس کا نام چوبیس گھنٹوں کے اندر تیرہ سو سال سے ایشیا کے ہر ملک عرب، شام، مصر، ایران، سندھ و ہند، جزائر ہند، شرقی و غربی چین میں بھی لیا جاتا ہے! اور افریقہ کے بھی اکثر حصوں میں اور یورپ کے بھی بہت سے علاقوں میں! ولا ایسی شخصیت ہی نہیں ملتی

جس کی شہرت کا دائرہ اتنے وسیع ممالک کو محیط ہوا ور پنجوقتہ اذان میں رفع ذکر کی یہ صورت کسی کے لیئے اختیار ہی نہیں کی گئی۔

الغرض عدم شرح کے بعد شرح صدر، پشت شکن بار کے بعد اس بار کو رُسوائی کے ساتھ اتارنا اور چاہیئے تھا کہ جس سے زیادہ گمنام کوئی نہ ہوتا اسی کو ساری نسل انسانی میں رفع ذکر کی ایسی نعمت بخشی کہ جس کی نظیر تاریخ میں موجود نہیں۔

ان واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ اگر کیا جائے کہ ہر "دشواری" اسی لیئے آتی ہے تاکہ لیسر اور آسانی کی لذت آدمی کو محسوس ہو۔ بند آنکھ والے ہی کھلی آنکھ کی لذت کو، بوجھ سے جو دبایا جارہا ہے وہی بوجھ اترنے کی مسرت کو اور گمنام ہی نام آوری کی شہرت کی قدر و قیمت پہچان سکتا ہے۔

یہی خیال دماغ میں چکر کھا رہا تھا دل کو سمجھاتا تھا کہ "دشواری" جب آئے تو یہ سمجھو کہ "لیسر" اور آسانی کی لذت سے قدرت تم کو سرفراز کرنے والی ہے۔

آج مجلس معنوی میں حاضری ہوئی تو ہمیشہ کی طرح اسی خیال کا اعادہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا ؎

رنج وغم راحق پئے آں آفرید   تابدیں ضد خوشدلی آید پدید

اور یوں بھی تو سوچیئے ایک شاہزادہ بادشاہ کے گھر پیدا ہوتا ہے، پیدا ہونے کے ساتھ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کے نام کا چرچا پھیل جاتا ہے۔ شہر شہر قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں میں لوگ اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں اس شاہزادے کو وہ لذت کیا مل سکتی ہے جو ایک گمنام دیہاتی بچے کو اس وقت ملتی ہے جب پڑھ لکھ کر وہ زندگی کے میدان میں قدم رکھتا ہے اس کی تقریروں، تجربہ، اصابت رائے، سنجیدہ افکار سے دنیا متاثر ہوتی ہے ہر جگہ اس کا چرچا پھیلتا ہے۔ یقیناً گمنامی ہی کے بعد نام آوری سے مسرت ملتی ہے۔

رنج وغم کی یہ کتنی زبردست قیمت ہے یوں رنج وغم سے مسرت اور خوشدلی کی نعمت کو چکھ لینے کے بعد اس وادیٔ بے ہمال کے شکر سے چاہیئے کہ دل لبریز کر لیا جائے۔ اس "العسر" سے "لیسر" کو نکالا فاذا فرغت یعنی جب العسر سے لیسر کی پیدائش کے تجربات سے گزر کر "خیر و شر" والی اس زندگی کو ختم کر لو، تو الیٰ ربک فارغب اپنے پالنے والے کی طرف چل پڑ، دنیا ہی کے بعد تو جنت کا مزہ ملے گا۔ اگر آدم علیہ السلام کی طرح ہم جنت ہی میں پیدا ہوتے، اسی میں جوان ہوتے تو جنت بھی شاید ہمارے

لیے اسی طرح بے مزہ ہو کر رہ جاتی جیسے سنتے ہیں کہ کشمیر کے باشندے ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو ہزار ہا ہزار روپے صرف کر کر کے وہاں مرغزاروں، اور گل و گلزار کی بہاروں کو دیکھ دیکھ کر سر دُھنتے ہیں۔ مولینا عبدالباری ندوی کہتے تھے کہ کشمیریوں کو دیکھا کہ ان باہر سے آنے والے تماشائیوں کے تاثرات پر کشمیریوں کو تعجب ہوتا ہے کہ آخر انہیں مسرت کیا مل رہی ہے۔

مجلس معنوی میں دراصل ذکر ہو رہا تھا "نور" کا،

فرماتے تھے رات بے نور ہو جاتی ہے۔ رنگ حالانکہ باقی رہتے ہیں لیکن نور کے نہ رہنے سے رنگ بھی نظر نہیں آتا۔ پہلے رنگ پر نور منعکس ہوتا ہے اور نظر آدمی کی نور پر پڑتی ہے نور کے توسط سے رنگ نظر آتا ہے جیسے باہر میں یہ ہوتا ہے کہ آفتاب اور دوسرے اجرام نیرّہ کا نور رنگ پر پڑتا ہے تب رنگ نظر آتا ہے۔ آدمی رنگ ہی میں غرق ہو جاتا ہے اور نور کی طرف دھیان نہیں جاتا کہ یہ سارا کرشمہ اسی طرح فرمایا کہ آدمی کے باطن میں بھی سبز و سرخ و زرد رنگ نظر آتے ہیں۔ طریقہ ان رنگوں کے دیکھنے کا یہ ہے کہ ؎

در درون خود بیفزا درد را تا ببینی سبز و سرخ و زرد را

مولینا نے سمجھایا کہ بیرونی رنگ جیسے نور کے بغیر محسوس نہیں ہوتا اسی طرح اندرونی نور کو بھی یقین کرو کہ نور ہی کے توسط سے نظر آتا ہے، بیرونی جیسے آفتاب کے نور سے نظر آتا ہے اسی طرح اندرونی رنگ کو غیبی نور کے توسط سے آدمی پاتا ہے فرمایا ؎

این بروں از آفتاب و رسہاست کوز نور عقل و حس پاک جداست

گویا دل کا نور خود بالذات نور نہیں ہے بلکہ نور خدا کے سرچشمہ سے اس کا تعلق ہے یہ نور خدا نہ حواس کی گرفت میں آتا ہے اور نہ عقل کی، مثال مولینا نے دی ؎ "جان ز پیدائی و نزدیکیست گم"

اسی طرح نور حق بھی اپنی پیدائی اور نزدیکی کی وجہ سے محسوس نہیں ہوتا۔ نور حق کے سوا انوار ہیں چونکہ ان کی ضد تاریکی ہے اور ضد کا احساس اس کی ضد کے احساس سے ہوتا ہے خوشدلی کا احساس رنج دلی میں گرفتار ہونے کے بعد ہوتا ہے لیکن نور حق کا چونکہ ضد نہیں ہے اس لیے اس کو کیسے محسوس کرایا جائے

"چونکہ حق را نیست ضد پنہاں بود"

اور یہی مطلب حضرت والا کے اس شعر کا ہے ؎

نورِ حق را نیست ضدّے در وجود   تا بضد او را توان پیدا نمود

(دفتر اول)

(۲۰) راہِ صفا کی جفاؤں کی حقیقت

۲۶ اگست ۱۹۵۱ء آج کل برسات کا مہینہ ہے۔ ہندی میں اس کو بھادوں کہتے ہیں۔ اس سال برسات کی ابتدا عجب طریقے سے ہوئی۔ ابتدا میں ایک اچھی، بلکہ کافی سے زیادہ بارش ہوئی اس کے بعد بند ہوئی۔ حال یہ ہے کہ کبھی کبھی ناکافی ترشح ہو جاتا ہے جس علاقہ میں مقیم ہوں، یہاں دھان کی کاشت اصلی کاشت ہے۔ چونکہ دیہات ہے، کاروبار ہی یہاں کاشت کاری ہے۔ بارش کے نہ ہونے سے سارا گاؤں اداس ہے۔ خود فقیر کے ہاں بھی کچھ کھیتی ہوتی ہے اور غذائی سرمایہ خاندان کا اسی سے حاصل ہوتا ہے سخت پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ ساون کا مہینہ یوں گزرا کہ تجربۃً اس میں مغربی ہواؤں سے بارش ہوتی ہے مہینہ بھر صرف مشرقی ہوا چلتی رہی۔ اب بھادوں کا مہینہ آیا اس میں مشرقی ہوا سے بارش ہوتی ہے۔ اچانک بھادوں میں ہوا کا رُخ بدل گیا۔ اب مغربی ہوا چل رہی ہے آج دل گھبرایا حضرت معنوی کی مجلس کا خیال آیا۔ حاضری کی سعادت میسر ہوئی، ارشاد ہو رہا تھا۔
ان لوگوں پر تعجب ہے جو صفائی کے آرزومند ہیں، چاہتے ہیں کہ روح کی صفائی حاصل ہو۔ مگر جب ان کو صیقل کرنے کے لیے جفا کا ظہور ہوتا ہے تو اِدھر اُدھر بھاگتے ہیں شعر یہ تھا۔ فرمایا ؎

من عجب دارم ز جویائے صفا   کو رمد در وقت صیقل از جفا

عشق تو ایک دعویٰ ہے۔ ہر دعوے کے لیے گواہ کی ضرورت ہے گواہ کے بغیر دعویٰ صرف ہوا ہے، آدمی کو تو چاہیئے کہ دعویٰ دائر کرنے کے بعد قاضی کے اجلاس سے گواہوں کے پیش کرنے کا جو حکم ہو تو بخندہ پیشانی گواہوں کو حاضر کر دے۔ اس حکم پر کڑھنے اور افسردہ خاطر ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔
ارشاد ہوا کہ گنج (خزانہ) وہی پائے گا جو سانپ (مار گنج) کا بوسہ دینے پر تیار ہو گیا۔
لوگ سمجھتے ہیں کہ صفا کے لیے جو جفا کا ظہور ہوتا ہے تو اس جفا کا رُخ صفا چاہنے والے کی ذات کی طرف ہوتا ہے حالانکہ رخ اس کی طرف نہیں بلکہ صفا کو مکدر کرنے والے صفات کا ازالہ اس جفا سے مقصود ہوتا ہے۔ کمبل گرد سے اَٹا ہوا ہوتا ہے لوگ اس پر لاٹھی مارتے ہیں تو یہ لاٹھی کمبل پر پڑتی ہے یا گرد پر ؎

برنمد چوبے کہ آں رامرد زد　　　　برنمد آں رانزد برگرد زد

گھوڑے پر کوڑا مارنا کیا گھوڑے کو مارنا ہے یا گھوڑے کی بدعنوانی پر یہ کوڑے اس لیے پڑتے ہیں تاکہ وہ اپنی چال کو درست کرے۔

بہرحال جب انگور کے شیرہ کو قید نہ کیا جائے گا وہ شراب کی شکل کیسے اختیار کرسکتا ہے۔ ایک یتیم کو استاد نے تھپڑ مارا دیکھنے والا بگڑا کہ یتیم کو ستاتے ہو، مارتے ہو، استاد نے کہا کہ یتیم کو میں نے کیا مارا بلکہ اس شیطان (دیو) کو میں نے چپت لگائی ہے جو اس لڑکے کے اندر چھپا بیٹھا ہے، ماں بچے سے کہتی ہے کہ "مرجا جائے" تو بچے کو نہیں کہتی، بچے کی بری عادت کی موت کی آرزو کرتی ہے۔ مولینا نے اسی کے بعد فرمایا کہ،

"آدمی کو چاہیے کہ بڑے بڑے بول بولنے والوں کی صحبت سے بھاگے، وہ باتیں تو بہت کرتے ہیں لیکن جب وقت آتا ہے تو میدان میں ٹھہر نہیں سکتے بادام تھوڑا ہی ہو مگر شیریں ہو تلخ بادام کے ڈھیر سے بہتر ہے۔"

کہنے لگے یہودی موت سے کیوں بھاگتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اس کے متعلق شک کی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے مسافر جو راستہ سے ناواقف ہے ظاہر ہے راستہ اطمینان سے کیسے طے کرسکتا ہے اس کا حال اگر یہ ہو کہ ایک ایک قدم پر اِدھر دیکھتا ہے، اُدھر دیکھتا ہے، چلتا ہے۔ کہیں سے آواز آئی اِدھر نہ جانا راستہ نہیں ہے، بیچارہ ٹھٹک جاتا ہے۔ حالانکہ راہ پہلے سے معلوم ہو تو لوگوں کی چیخ پکار کی اسے کیا پروا ہوگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ:۔

بزدلوں کے ساتھ زندگی کی راہ طے کرنے کا ہرگز ارادہ نہ کرنا، جب کوئی وقت آئیگا اور تم ان کو پکاروگے تو تمہیں چھوڑ کر وہ بھاگ کھڑے ہوں گے، خواہ لاف زنی میں سحر طرازیوں سے ہی کیوں نہ کام لے رہے ہوں، (دفتر سوم)

اسی پریشانی میں "مجلس اکبر" کی حاضری سے بھی مشرف ہوا ارشاد ہو رہا تھا۔

"سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ آدمی کا دل جس چیز کو چاہے وہ میسّر نہ ہو۔"

اس کے بعد فرمانے لگے کہ

"ہم تک یہ روایت پہنچائی گئی ہے کہ حق تعالیٰ فرشتے سے کہتے ہیں کہ فلاں

شخص کی حاجت ابھی پوری نہ ہو کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ اس کی پکار سنوں۔"

اس روایت کو نقل کر کے شیخ نے کہا کہ جس شخص کی حاجت پوری نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ دکھ اپنے اندر محسوس کرتا ہے لیکن اس دکھ کا منشا حق تعالیٰ کا غصہ نہیں بلکہ رحمت ہوتی ہے۔ قرآن میں بھی اس "دیوار" کا جو ذکر کیا گیا ہے جس کے اندر اور باطن میں تو رحمت ہوگی اور باہر و ظاہر میں عذاب ہوگا۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ ظاہر باطن ہی کا تابع ہوتا ہے پس دکھ جو دراصل لذت کی نایافت کی تعبیر ہے اس میں بھی رحمت کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے اور ثابت ہو کہ "الآلام عوارض واللذات ثوابت" (سارے دکھ عارضی ہیں اور لذتیں برقرار رہنے والی ہیں) "فالعالم مرحوم بالذات مثالم ممالیعرض" (عالم کو رحم ہی کے لیے اصلاً حق تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور دکھ عالم کا صرف عارضی ہے)

شیخ نے بھی اس موقع پر وہی مثال پیش کی کہ بچے کو باپ مارتا ہے اور اس مار سے بچے کو دکھ بھی پہنچتا ہے لیکن درحقیقت اس دکھ میں بھی باپ کی مہربانی ہی پوشیدہ ہے۔

شیخ نے پھر بخاری کی اس روایت کا حوالہ دیا جس میں ایک عورت کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ان اللہ اشفق علی عبدہ من ھذہ علی ولدھا"۔ (اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہیں جتنی کہ یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہے۔) صفحہ ۲۷۵ ج ۳

(۲۱) حدیث جف القلم کی انوکھی تعبیر! ۲ ستمبر ۱۹۵۱ء مجلس معنوی کے حضور کا ولولہ دل میں موجزن ہوا، حاضر ہو گیا، فرما رہے تھے کہ

"جف القلم بما ھو کائن" (خشک ہو چکا قلم ہر اس بات کو لکھ کر جو آئندہ پیش آنے والی ہے) اس حدیث کا مطلب لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ فرمانے لگے ایک پہلو اس کا یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ کی فرمانبرداری اور نافرمانی ہر دونوں باتیں برابر نہیں ہیں قلم اس کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔ مثلاً سمجھانے لگے کہ یوں سمجھو کہ چوری اور امانت یہ دونوں باتیں برابر نتیجہ کے لحاظ سے نہیں ہیں۔ قلم اس قانون کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔ الغرض ہر کام اپنے لئے خاص نتیجہ اور اثر رکھتا ہے، جو کج چلے گا اس کی کج چال سے کج نتیجہ پیدا ہوگا۔ اور سیدھی راہ چلو گے تو سیدھا نتیجہ تمہارے سامنے آئیگا جس کا دوسرا نام سعادت ہے اسی طرح ظلم و ستم کرو گے تو نحوست تم کو پکڑے گی اور انصاف سے کام لو گے تو اس کا پھل تمہارے سامنے آئے گا۔

بہرحال اس کا یہ مطلب جو بیان کرتے ہیں کہ کام آدمی کے اختیاری حدود سے باہر ہو چکا ہے اور

اور جو کچھ ہونے والا ہوتا ہے اس کے ہونے سے پہلے قلم اس کو لکھ کر خشک ہو چکا تھا (اور اس مطلب کو سامنے رکھ کر ہر بدکار اپنی بدکاریوں میں بدکاریوں کا اضافہ کرتا چلا جاتا ہے، برائیوں کا مرتکب ہو کر آخر میں یہی کہتے ہوئے کہ جو برائی مجھ سے صادر ہوئی قلم تو پہلے اس کو لکھ کر خشک ہو چکا تھا پس ذمہ داری مجھ پر نہیں قلم پر (اور اس پر ہے جس نے قلم سے ہر ہونے والی بات کو پہلے ہی لکھ چھوڑا ہے، ہندی میں جس کی تعبیر اس مشہور شعر کے ساتھ کی گئی ہے ؎

نیا دُنہ کیو کیو ٹھکرائی　　　بن کیسے لکھ دیو برائی

(مناظر احسن گیلانی)

مولانا نے فرمایا کہ کیوں نہ اس حدیث کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ انصاف اور بے انصافی دونوں برابر نہیں ہیں قلم اس کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔ خیر و شر برائی اور بھلائی دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہوگا۔ یہ غلط ہے بلکہ بھلائی کا نتیجہ بھلا اور برائی کا نتیجہ بُرا ہے۔ قدرت کا یہ فیصلہ ازل میں ہو چکا ہے اور اپنے قلم ازل ہی سے قدرت نے یہ لکھ دیا ہے کہ ہر برائی بھی ثمرہ اور اثر کے لحاظ سے برابر نہیں ہے بلکہ ہلکی برائی کا نتیجہ بھی ہلکا اور بڑی برائیوں کا نتیجہ بھی بہت زیادہ بُرا ہوگا۔ اسی طرح قدرت نے خیر اور بھلائی کے سلسلے میں بھی یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ ذرّہ برابر نیکی اخلاص کے ساتھ جب بندے کی طرف سے پیش ہوگی تو قدرت کا ہاتھ اس ذرہ کو پہاڑ اپنے فضل و کرم سے بنا دے گا۔

ارشاد ہوا ایسا بادشاہ اور حکمران جس کی نظروں میں خائن اور دیانتدار ملازم دونوں ایک ہی جیسے سمجھے جاتے ہوں یا ایسے نوکر بادشاہ کے جو سامنے ہی نہیں بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے بھی اس سے لرزاں و ترساں ہوں اور جو اسی بادشاہ پر اور اس کی حکومت پر اعتراض کرنے والے تلاش کر کر کے اس بادشاہ کی کمزوریوں کو جو پھیلاتے رہتے ہوں دونوں کے ساتھ برابر سلوک روا رکھا جاتا ہو، تو تمہارا فیصلہ اس حکمران کے متعلق کیا ہوگا ؟

فرمانے لگے کہ میں تو یہی کہوں گا کہ ع

"شاہ بنود خاک تیرہ بر سرش"

الغرض اندھیر نگری کا ایسا اندھا راجا جس کی حکومت میں ٹکے سیر بھاجی اور ٹکے سیر کھاجہ[1] فرد نعمت ہوتا ہو

---

[1] ایک لطیف مٹھائی کا نام

بھلا ایسا راجہ۔ راجہ کہلانے کا کس طرح مستحق ہو سکتا ہے اس کے سر پر خاک ڈالدی جائے تو بہتر ہے (گیلانی)

بہرحال کائنات کا نظام جو چلا رہا ہے اس کے ملک میں یہ اندھیر نہیں ہو سکتا بلکہ ذرہ برابر بھی اپنی کوشش میں جو اضافہ کرے گا وہ اس کے صلے اور نتیجے کو اپنے آگے پائے گا اور قدرت کی ترازو میں یہ ذرہ برابر بھی تل جاتا ہے۔

مولٰنا رحمۃ اللہ علیہ اس کے بعد متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے :۔

" اندھیر نگری کے ان اندھے حکمرانوں کے ساتھ میں دیکھتا ہوں تمہارے دل کے تعلق کا یہ حال ہے کہ جان تک ان کے لیے لڑا دینے میں تم پس و پیش نہیں کرتے حالانکہ یہ بیچارے اندھے راجہ اور بادشاہ صحیح معنوں میں کچھ نہیں جانتے کہ واقعی ان کا وفادار کون ہے؟ اور کون غدار ہے۔ معمولی چغل خور ان کے کان میں کچھ پھونک آتا ہے اور بادشاہ عمر بھر کی خدمات پر تمہاری محض اس کی چغلی کی وجہ سے پانی پھیر دیتا ہے۔"

توجہ دلانے لگے :۔

" ذرا سوچو تو سہی کہ ہمہ شنوائی ہمہ بینائی والے بادشاہ کے ساتھ ایسی صورت میں تمہارے دل کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے وہی جہاں نہ چغل خوروں کی چلتی ہے نہ غمازوں کی۔"

اور ایک دلچسپ بات اسی کے ساتھ یہ بھی فرمائی کہ :۔

" چغل خوروں اور غمازوں کی وہاں تو چلتی نہیں تب اپنے دل کی بھڑاس وہ یوں نکالتے ہیں کہ ہمارے آگے وہ اس سمیع و بصیر پر گویا حملہ کرتے ہیں اور سمجھاتے پھرتے ہیں کہ میاں! بڑے صاحب نے تو پہلے لکھ لکھا کر قصہ ختم کر دیا ہے، جو کچھ بھی پیش آنے والا تھا اس کو لکھ کر ان کا قلم خشک ہو چکا پھر اپنا سر اس میں کھپانا کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے مالک کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کر کے حق وفاداری ادا کرنا چاہیئے، فضول ہے، میاں کہاں کی وفا اور کہاں کی جفا۔ تمہارے ہاتھ میں کچھ رکھا بھی گیا ہے؟"

ذرا تمتما کر تند و تیز لہجہ میں فرمانے لگے :۔

"قلم خشک ہو چکا (یعنی جف القلم بما ھو کائن) اس کا مطلب یہ کیوں نکالا جا رہا ہے کہ جفا اور وفا دونوں برابر اور نتیجہ کے لحاظ سے یکساں ہیں، بلکہ سنو! قلم یہ لکھ کر خشک ہوا کہ جو جفا کریگا جفا کے نتیجہ کو اپنے سامنے پائے گا اور جو وفا کرے گا وفا کے ثمر کو پائے گا۔"

ارشاد ہوا کہ:۔

"معافی اور درگزر کا بھی قانون ضرور ہے لیکن جو امیدیں تقویٰ کے ساتھ قائم ہوئی ہیں ان ہی اُمیدوں کو اپنے اندر وہ کیسے پال سکتا ہے، جو صرف عفو اور درگزر کے قانون اور رحم و کرم کے بھروسے جی رہا ہے۔"

پوچھنے لگے کہ:۔

چور نے چوری کی، فرض کرو حکومت کسی خاص وجہ سے اس کو چھوڑ بھی دے اور درگزر سے بھی کام لے لیکن حکومت میں جو مقام اور جو رتبہ وزیروں اور خزانہ کے ذمہ دار افسروں کا ہے کیا اسی مقام اور اسی رتبہ کا مستحق یہ چور ہو سکتا ہے جو صرف معافی اور رحم کے قانون کے زیر اثر سزا سے بچ گیا یا بچا دیا گیا۔"

جوش میں فرمانے لگے کہ:۔

یاد رکھو! بادشاہ کا لڑکا یا ولیعہد اگر بادشاہ کی خیانت کرے گا تو اس جرم کی سزا صرف یہی ہے کہ سر اس کے تن سے جُدا کر دیا جائے لیکن بادشاہ کا کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو وفاداری کا تجربہ جب اس سے ہوتا ہے تو باوجودیکہ غلام ہونے کے بادشاہ کا وہ محبوب بن جاتا ہے اور غلام بیچارہ تو پھر بھی آدم زاد ہوتا ہے۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ وفادار کتا بھی اپنے آقا کا چہیتا بن جاتا ہے، اسی سے سمجھنا چاہیئے کہ کتا جب آقا کا محبوب بن سکتا ہے اور بن جاتا ہے تو وفاداری شیر کی کس نتیجہ کو پیدا کر سکتی ہے۔"

آخر میں ارشاد ہوا:۔

"سچ تو یہ ہے کہ چور سے بھی جب کوئی معقول خدمت بن آتی ہے اور راستبازی کا کوئی عمل اس سے صادر ہوتا ہے تو اس کی یہی سچائی ہزار ہا ہزار دست درازیوں

کی جڑوں کو نکال کر باہر پھینک دیتی ہے۔"

پھر اسلامی تصوف کی تاریخ کے اس واقعہ کا ذکر فرمانے لگے کہ :-

"آج ہم فضیل (ابن عیاض) کو کن نظروں سے دیکھتے ہیں (سلسلۂ تصوف کے ایک گوہر تاباں وہ سمجھے جاتے ہیں) مگر ابتدا میں کون نہیں جانتا کہ ایک ڈاکو اور چور تھے کہتے ہیں کہ قافلہ پر دھاوا کرنے کے لیے کمیں گاہ میں رفیقوں کے ساتھ فضیل چھپے ہوئے تھے۔ صبح کا وقت تھا قافلہ سے ایک آواز بلند ہوئی یہ قرآن کی مشہور آیت تھی جس کا ترجمہ ہے کہ " ایمان والوں کے لیے کیا اس کا وقت نہیں آگیا ہے کہ ان کے دل اللہ کی یاد کی طرف جھک پڑیں اور ان باتوں کی طرف جنہیں خدا نے پیغمبر کے ذریعہ نازل فرمائی ہیں" فضیل کے کان میں آواز آئی اور سینے سے ان کے خروش بلند ہوا کہ

"ہاں وقت آگیا ، وقت آگیا"

واقعی وقت آچکا تھا ڈاکوؤں کے گروہ سے وہ باہر نکلے اور اہل اللہ کے مجمع میں شریک ہو کر اپنے وقت کے قطب اور آئندہ اللہ کی راہ پر چلنے والوں کے پیشوا بن گئے۔)

مولینا نے ان جادوگروں کا تذکرہ بھی کیا جو فرعون کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اتر آئے تھے لیکن حضرت موسیٰ کی پیشانی سے سچائی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں ان سے وہ تلملا اٹھے اور فرعون کی دھمکی کہ کھجور کے تنوں میں باندھ کر میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالوں گا اس کی بھی پروانہ کی اور اور کہنے لگے کہ " فاقض ما انت قاض " (تیرے جو جی میں آئے کر گزر) ص۲۶۵

اس بیان کے بعد مولینا نے مخاطب کر کے فرمایا کہ موسیٰؑ کے ساحروں میں سچائی اور صداقت کی جو تابناک روشنی چمک اٹھی یا فضیل میں توبہ و انابت کا جو سمندر موجزن ہوا تھا اس سے تم اپنی اس چند روزہ ٹوٹی پھوٹی عبادت و ریاضت کا موازنہ نہ کرنا سو سال کی عبادت ایک طرف اور ایک لمحہ کا وہ اخلاص جو ساحروں میں جلوہ گر ہوا تھا ایک طرف۔

پھر ایک دلچسپ قصہ سنانے لگے ، اللہ والوں کا معاملہ اللہ میاں کے ساتھ اور ہوتا ہے ہم عامی لوگ یہی معاملہ خدا کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ قصہ شہر ہرات میں پیش آیا۔ اس زمانہ میں مشہور خواجہ عمید

خراسانی حکومت کے وزیر تھے اپنے غلاموں کو وہ زرق برق لباس میں رکھتے۔ شہر میں ایک دن ان کے غلام بڑے تزک و احتشام کے ساتھ جا رہے تھے، ایک ظریف منچلے آدمی کی نظر غلاموں پر پڑی، پوچھا کہ یہ اطلس دربر، اور زریں کمر کون لوگ ہیں؟ اطلاع دی گئی کہ عمید خراسانی وزیر کے غلام ہیں۔ سنتے ہی دیکھا گیا کہ اس ظریف کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں اور کہہ رہا ہے کہ:۔

"غلاموں کے پالنے کا ڈھنگ کاش! ہمارے شہر کے وزیر سے آپ سیکھتے، دیکھئے یہ ہے بندہ پروری کا طریقہ"

مولینا نے فرمایا کہ منچلا آدمی دل والا تھا۔ اس وقت اس کے بدن پر چیتھڑے لٹک رہے تھے اور سردی کی شدت سے بیچارہ کانپ رہا تھا، دل میں موج آئی زبان سے یہ فقرے نکل پڑے۔ لیکن ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو اس قسم کی جرأت بیجا پر دلیر ہو جانا مناسب نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کے نیاز مندوں کو ناز کی بھی اجازت ہے، بادشاہ کے مصاحبوں کو دیکھ کر شہر کا کوئی عامی، بادشاہ کے ساتھ مذاق اور ہنسی کی گفتگو کی اگر جسارت کرے گا تو اس کا نتیجہ اسکو خود بھگتنا پڑے گا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھانے لگے کہ اس منچلے آزاد نے جو بات کہی وہ بھی کب ٹھکانے کی تھی نظر خواجہ عمید کے غلاموں کے زریں کمر بند پر پڑی، وہ ان ٹوپیوں کو تو دیکھ رہا تھا جو جواہر سے جگمگا رہی تھیں لیکن جس نے کمر بند نہیں کمر ہی عطا فرمائی، اور ٹوپیاں ہی نہیں جن سروں کو ٹوپیوں سے ہم چھپاتے ہیں ان کو اس کے سوا کوئی نہیں دے سکتا، الغرض ؎

حق میاں داد و میاں بر از کمر   گر کسے تاجے دہد او سر دہد

آگے قصہ کا تتمہ بھی سن لیجئے مولینا ہی نے بیان کیا ہے کہ:۔

"اس واقعہ کے کچھ ہی دن بعد خواجہ عمید سے بادشاہ بدگمان ہوا اور پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ وزیر صاحب تو جیل روانہ ہوئے اور ان کے غلاموں کو بادشاہ نے شکنجے میں کس کس کر دریافت کرنا شروع کیا کہ اپنے روپے وہ کہاں کہاں رکھتا تھا، جہاں جہاں اس کے دفینے محفوظ ہیں ان کا پتہ دو، ورنہ سب کی گردنیں اڑا دی جائیں گی۔ ایک مہینہ تک غلاموں پر ظلم و ستم کا سلسلہ بادشاہ کی طرف سے مسلسل جاری رہا لیکن غلاموں میں کوئی نہ کھلا، آخر عبرت کے لئے ان ہی غلاموں میں سے ایک غلام کے

ٹکڑے ٹکڑے سب کے سامنے کر کے دکھائے پھر بھی نہ یہ قتل ہونے والا غلام ہی کھلا اور نہ اس کو دیکھ کر دوسرے غلام افشائے راز پر آمادہ ہوئے۔"

جس دن غلام کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا یہ دردناک واقعہ پیش آیا اسی دن کے بعد جرات پھر آئی وہی ظریف من چلا آدمی جو اللہ میاں کو بندہ پروری کے متعلق خواجہ عمید سے سبق پڑھنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ع

" بندہ پروردن بیاموز اے

اسی کے خواب میں آنے والا آیا اور کان میں اس کے کہہ رہا تھا ع

" بندہ بودن ہم بیاموز و بیا "

مطلب یہ تھا کہ بندہ پروری کا طریقہ خواجہ عمید سے میں سیکھوں تم نے جو یہ کہا تھا تو میں کہتا ہوں کہ بندہ بننے کا طریقہ بھی خواجہ عمید کے غلاموں سے تم کو سیکھنا چاہیئے۔

(دفتر پنجم)

---

(۲۲) اللہ والوں پر اللہ کی محافظت

۱۶ ستمبر ۱۹۵۱ء مجلس معنوی تک رسائی کی عزت حاصل ہوئی۔ قصہ بیان کر رہے تھے خود ہمارے ہندوستان کا شعر تھا ؎ آن شنیدستی کہ در ہندوستاں ، دید دانائے گروہے دوستاں

یعنی ایک دانشمند کی نظر دوستوں کے ایک گروہ پر پڑی، یہ مسافر لوگ تھے۔ زاد راہ ختم کر چکے تھے بھوکے پیاسے تھے اور بڑی مسافت طے کر کے وہاں پہنچے تھے انہیں آگے بھی جانا تھا۔ دانشمند ان مسافروں کو دیکھ کر خوش ہوا اور گرمجوشی سے ملا۔ سلام و کلام کا سلسلہ دونوں کے درمیان جاری ہوا۔ مسافروں کو دانشمند نے سمجھانا شروع کیا۔

" میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ بھوک اور پیاس کی مصیبت میں مبتلا ہیں اور اس کربلا کے میدان میں آپ تکلیفوں کا شکار ہو گئے۔ لیکن میری ایک بات سنئے، آگے آپ کو ہاتھیوں کا جنگل ملے گا۔ جس میں ہاتھی کے بڑے موٹے فربہ بچے دوڑتے ہوئے نظر آئیں گے ان کا شکار بھی بآسانی آپ لوگ کر سکتے ہیں اور ان کے گوشت کا کباب بھی بڑا لذیذ ہو گا۔ مگر یاد رکھیے کہ جہاں یہ بچے آپ کو نظر آئیں گے وہیں کہیں ان بچوں کی مائیں ہتھنیاں بھی چھپی ہوں گی۔ ان ہتھنیوں کا دستور ہے کہ ان کے بچے کو شکار کر کے جو کھا جاتے ہیں خواہ سیکڑوں میل بھاگ کر دور کیوں نہ نکل گئے ہوں لیکن ان کا پیچھا کرنے سے وہ باز

نہیں آتیں اور اپنے بچوں کے کھانے والوں تک پہنچکر ختم ہی کر کے دم لیتی ہیں۔ دانشمند ان کو طرح طرح سے سمجھاتا رہا اور راز بتایا کہ ان ہتھنیوں کی قوت شامہ میں غیر معمولی ذکاوت ہوتی ہے۔ سونگھ کر وہ پتہ چلا لیتی ہیں کہ کس نے ان کے بچوں کا گوشت کھایا ہے پھر حد سے زیادہ بے رحمی کا برتاؤ ان کے ساتھ غصہ میں کرتی ہیں، دانشمند نے چونکاتے ہوئے کہا کہ ؎

آتش و دود آید از خرطوم او　　الحذر زاں بچۂ مرحوم او

" غضبناک ہتھنیوں کے سونڈ سے آگ کا دھواں نکلتا رہتا ہے۔ خبردار، خبردار ان کے بچے کو نہ چھونا،" مگر ہوا یہ کہ مسافروں نے دانشمند کی باتیں تو سن لیں اور آگے بڑھ گئے۔ راستہ میں جیسا کہ دانشمند نے کہا تھا واقعی وہ جنگل آگیا جس میں ہاتھیوں کے بچے کلیلیں کر رہے تھے ان کے نرم نرم فربہ گوشت کو دیکھ کر ہر ایک کا دل للچانے لگا۔ بآسانی پایا کہ ہاتھ بھی آسکتے ہیں۔ آخر ایک بچے کو ہاتھی کے ان بھوکے مسافروں نے پکڑ لیا۔ اور دانشمند کی نصیحت کہ کچھ بھی ہو جائے گھاس پات ہی کھانا پڑے لیکن ہاتھی کے بچے کو نہ چھونا، اس کی پروا کسی نے نہ کی صرف ایک مسافر بیچارہ دانشمند کی نصیحت کو یاد دلاتا رہا۔ لیکن حرص اور لالچ اور بھوک کی شدت نے سب کو بہرا بنا دیا۔ اور بچہ پکڑا گیا۔ ذبح کیا گیا لکڑیاں جمع کر کے کباب اس کے گوشت کا ان مسافروں نے لگایا اور خوب پیٹ بھر کر اس کو نوش جاں کیا۔ البتہ وہی ایک مسافر ان کو منع کرتا رہا اس نے کھانے میں شرکت نہ کی۔ کھا پی کر جب سیر ہو گئے تو درخت کی چھاؤں کے نیچے سب لیٹ گئے، اور وہی اکیلا مسافر جس نے کھانے میں شرکت نہ کی تھی بھوک کی تکلیف کی وجہ سے جاگتا رہا۔ اچانک کیا دیکھتا ہے کہ ایک دیوانی ہتھنی تیزی کے ساتھ بھاگتی ہوئی سامنے سے آرہی ہے، دل اس کا تھرا گیا، سمجھ گیا کہ جس کا بچہ ذبح کر کے کھایا گیا ہے وہی ہتھنی، جیسا کہ دانشمند نے کہا تھا، آگئی۔ بھاگ نہیں سکتا تھا، سوچ ہی رہا تھا کہ سر پہ ہتھنی اس کے کھڑی ہوئی تھی وہی چونکہ جاگ رہا تھا ہتھنی نے پہلے تو اس کے منہ کو سونگھا اور پیٹ کو بھی سونڈ سے ٹٹولا لیکن اس نے گوشت ہاتھی کے بچے کا چونکہ نہیں کھایا تھا، اس کو چھوڑ دیا اور اب سونے والوں کی طرف متوجہ ہوئی ایک ایک کا منہ سونگھتی جاتی تھی اور بچے کے گوشت کی بو محسوس کر کر کے سونڈ سے اس کو اوپر اٹھاتی اور چرخ دے کر زمین پر ٹپک دیتی تھی جس سے ہڈیاں چور چور ہو جاتی تھیں یہی سلوک اس نے ہر ایک کے ساتھ کیا جس کے منہ سے گوشت کی بو آتی تھی۔ بالآخر سب ہی کو مار ڈالا۔

اس قصہ کے ساتھ مولینا نے فرمایا کہ، دیکھو! جیسے ہتھنی اپنے بچوں سے الگ ہو کر جنگل میں چرتی ہے اور بچوں کو بظاہر تنہا چھوڑ دیتی ہے مگر اس کی توجہ مسلسل بچے ہی کی طرف رہتی ہے جو بھی اس کے بچے پر ہاتھ ڈالے گا۔ ہتھنی اس کو ختم کر دیتی ہے، کچھ یہی حال اللہ کے ان دوستوں کا سمجھو جو بظاہر دنیا میں تنہا نظر آتے ہیں ان کے پاس ساز و سامان بھی حفاظت کا نہیں ہوتا لیکن ولایت کا رشتہ خدا کے ساتھ ان کا جو ہوتا ہے اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان پر ہاتھ ڈالنے والے تباہ و برباد کر دیئے جاتے ہیں۔

کہنے لگے کہ قرآن ہی میں دیکھو اکیلے موسیٰ یا نوح علیہم السلام ان لوگوں کا کیا کر سکتے تھے جو ان کے برسر مقابلہ کھڑے ہو گئے تھے لیکن خدا کے ساتھ ان کا جو رشتہ تھا اس نے دشمنوں کو ختم کر دیا۔

فرمانے لگے؛ بیچارے لوط علیہ السلام کو ان کے شہر والے نکال دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مگر جاؤ بیت المقدس کے راستہ میں سیاہ پانی کی ایک جھیل تم کو ملے گی، لوطؑ کی قوم کا شہر اسی مقام پر تھا، بستی الٹ دی گئی اور سیاہ پانی ایک جھیل کی شکل میں وہاں جھلک رہا ہے۔

فرمانے لگے بھائی! اس قصے کو میں کہاں تک طول دوں، جگر کیا پہاڑ بھی پگھل جائیں جب ان قصوں کو سنایا جائے مگر جگر گدازی کے اس منظر کو ہر ایک دیکھنے کی اپنے اندر تاب نہیں رکھتا ان دیکھنے والوں کو تم دیکھنے والا سمجھتے ہو جنہیں اونٹ میں صرف اون نظر آتا ہے مگر اس میں جو گوشت اور چربی اور دوسرے کمالات ہیں ان سے وہ اندھے ہیں۔ عجیب لوگ ہیں حرص اور لالچ کے زیر اثر ایک ایک بال کی نوک کھال نکالتے ہیں لیکن واقع میں جو اونٹ ہے اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ (کائنات کے ذرے ذرے کو اپنی تحقیقات کا تختہ مشق بنائے ہوئے ہیں لیکن کائنات کا ظہور جس وجود کے ساتھ وابستہ ہے اسی سے یہ اندھے ہیں۔ (گیلانی))

یہ دنیا کے حریص ناچتے ہیں لیکن ان کا ناچ ریچھ کا ناچ ہے جس کا نہ کوئی مطلب ہے نہ معنی لیکن کبھی کبھی رقص کی حالت ان لوگوں پر طاری ہو جاتی ہے جو اپنی خودی سے نکل کر بے خودی میں ڈوب جاتے ہیں اپنے ہاتھ سے جب نکل بھاگتے ہیں تو ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہیں۔ اس رقص اور ان تالیوں کا مطلب ہی اور ہے۔ ریچھ کے رقص پر ان کو قیاس کرنا غلط ہے۔

بہر حال کان سے خرافات کی روئی جب نکل جاتی ہے تب آدمی سنتا ہے ان تالیوں کو جو ذہنوں

کے پتّے بجا رہے ہیں۔

فرمانے لگے کہ کان کو، لاحاصل، بے نتیجہ مسخرگی باتوں اور دروغ بافیوں سے پاک رکھنے کی کوشش کرو، تم کو روح اور جان والے شہر اپنی روشنی اور چمک دمک کے ساتھ دکھائی دینے لگیں گے۔ دیکھو! اپنے منہ کو مذاق اور ٹھٹول سے پاک کھو اور دوست کے چہرے کی داستان کے سواء اور کسی چیز کا تذکرہ نہ کرو۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا تھے؟ "حق" کے لیے ان کا وجود صرف کان اور صرف آنکھ بن کر رہ گیا تھا۔

ہتھنی سونگھ سونگھ کر اپنے بچے کے گوشت کھانے والوں کا پتہ چلا لیتی ہے اس چیز کا ذکر کرتے ہوئے مولینا نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے بندوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی غیبت کرتے ہیں ان کو بھی چونک جانا چاہیے کہ سونگھنے والا سونگھ سونگھ کر ان کا سراغ لگا ہی لے گا اور صرف وہی بچ جائے گا جس کے منہ سے گوشت کی بو نہ آئے گی۔ فرمانے لگے ہائے ہائے! جب منکر نکیر قبر میں ہر ایک کے منہ کو سونگھیں گے اور گوشت کھانے والوں کو نہ کھانے والوں سے الگ کریں گے یہ وہ وقت ہو گا کہ کوئی حیلہ حوالہ کام نہ آئے گا۔ منہ کو الائچی چبا کر یا لونگ رکھ کر خوشبو کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی اپنے ساتھ پھوڑے پھنسیاں لے کر قبر میں جو جو پہنچیں گے ان پر، ان کے گھاؤ پر منکر و نکیر کے جب گرز پڑیں گے۔ اس وقت اُس دکھ اور تکلیف کا لوگوں کو اندازہ نہیں ہے۔ فرمانے لگے کہ قبر سے پہلے اسی دنیا میں عزرائیل کا جب گرز پڑتا ہے تو تم میں کوئی اس گرز کو کیا دیکھتا ہے؟ مگر بڑے بڑے پہلوانوں کا بھی کچومر نکل جاتا ہے۔ حالانکہ نہ لکڑی کا دستہ گرز کا نظر آتا ہے اور نہ لوہا۔

ارشاد ہوا کہ، ہاں! کبھی بیماریوں میں بیماروں کو گرز بھی نظر آتا ہے اور اس کا دستہ اور لوہا سب کچھ، بیمار چلاتا ہے کہ میرے سر پر کوئی تلوار چلا رہا ہے بھالے کوئی بھونک رہا ہے لیکن تیمار دار کہتے ہیں کہ خواہ مخواہ تم کو مالیخولیا ہو گیا ہے۔ نہ یہاں کوئی تلوار ہے اور نہ بھالا نہ نیزہ۔ لیکن بیمار کہے جاتا ہے کہ میں تو سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ (دفتر سوم)

<u>انسانی جسم اور اس کی قدر دانی کی تاکید</u> مولینا نے فرمایا کہ بعض اوقات مرنے والوں کو مرنے سے پہلے اس قسم کے مناظر نظر آتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ دنیا سے رشتہ اس حرص کا کمزور ہو جاتا ہے اور دوسری دنیا کی چیزیں اب ان کے آگے ہویدا ہونے لگتی ہیں اور یوں ان کی بینائی تیز ہو

جاتی ہے کہنے لگے لوگ سمجھتے ہیں کہ نزع کی حالت مرنے سے کچھ دیر پہلے طاری ہوتی ہے۔ حالانکہ اگر سوچا جائے تو نظر آئیگا کہ ہر لمحہ آدمی پر نزع کی یہ کیفیت طاری ہے جسم سے جان کا رشتہ کمزور پڑتا چلا جاتا ہے اسی لیے چاہیئے کہ ہر لمحہ اپنے ایمان کی نگرانی آدمی کرتا رہے۔ فرمایا کہ عمر آدمی کی سمجھو کہ ایک تھیلی ہے اور دن رات کی مثال روپے کی ہے۔ تھیلی سے روپے اگر خرچ ہوتے رہیں گے اور ان کی جگہ نئے روپے اس میں نہ ڈالے جائیں گے تو تھیلی بالآخر خالی ہو کر رہے گی پہاڑ ہی کیوں نہ ہو، اگر ہر روز ایک پتھر نکالا جائے اور اس کی جگہ پتھر جمایا نہ جائے تو یقیناً ایک دن وہ بھی آئیگا کہ پہاڑ بھی ختم ہو جائیگا۔

ارشاد ہوا کہ چالاکی اور زیرکی کا اقتضاء یہ ہے کہ تھیلی سے جتنا نکالا جائے اسی قدر نئے روپوں سے بھرا جائے۔ یوں یہ تھیلی کبھی ختم نہ ہوگی عمر کی تھیلی میں نئے سکوں کے بھرنے کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تم سجدوں میں سجدوں کا اضافہ کیے جاؤ قرآن میں فرمایا گیا کہ جو کائنات کی مرکزی قوت سے استفادہ کرنا چاہتا ہے اس کو " واسجد" کے حکم کی تعمیل میں سرگرمی دکھانی چاہیئے " اقترب" کا نتیجہ خود بخود سامنے آتا چلا جائے گا۔

فرمانے لگے تمہاری تگ و دو دیکھتا ہوں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں جاری ہے لیکن دین کی راہ میں مٹھے بیل بن کر بیٹھ جاتے ہو۔ حالانکہ کام اگر کچھ آئیگی تو وہی دوا دوش، سعی دکوشش جو دین کی راہ میں کروگے۔ مولینا کا شعر تھا ؎

در تمامی کارہا چندیں مکوش   جز بکارے کہ بود در دیں مکوش

(ترجمہ) " ہر معاملہ میں اتنی دوڑ دھوپ سے کام نہ لو بس دین کا کام ایسا کام ہے جس کے لیے کدوکاوش کرنی چاہیئے۔"

اسی کے ساتھ مولینا کہنے لگے کہ ذرا ان لوگوں کو دیکھو جو مقبروں اور گورستانوں کی آبادی کا مطلب یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ بڑے بڑے گنبد ان میں کھڑے کیے جائیں، پختہ سنگین تعویذ قبروں کی بنائی جائیں کہنے لگے کہ گورستان کی صفائی تو اندر کی صفائی سے حاصل ہوتی ہے احمق باہر کو صاف کرتے ہیں چاہیئے کہ آدمی اپنی موجودہ زندگی میں اپنی خودی کی قبر کھودے اور ہمیشہ کے لیے اسی میں ما و من کے قصے کو دفن کردے۔ الغرض ؎ گورخانہ قبہ ہا و کنگرہ   نبود از اصحاب معنی آں مرہ

یعنی یہ قبول اور کنگروں والے قبرستانوں کی اہل معنی کے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہے۔

(دفتر سوم) ————————

(۲۲۳) حرص و طمع آدمی کو اندھا کر دیتی ہے | ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء، پھر وہی زنجیر جس سے تیس سال کی جدوجہد کے بعد خلاصی میسّر آئی ہے بعض لوگوں کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں کہ کھڑک رہی ہے۔ چاہا جا رہا ہے کہ وہی زنجیر پھر پہنا دی جائے۔ پہلے اگر نقرئی تھی تو اب طلائی رنگ چڑھا کر لانے والے سامنے لا رہے ہیں۔ مولینا معنوی یاد آئے ان کی معنوی مجلس تک افتاں وخیزاں پہنچا۔ فرمارہے تھے:۔

حرص اور طمع سے آدمی اندھا بن جاتا ہے۔ شعر تھا ؎

حق ترا باطل نماید از طمع   در تو صد کوری فزاید از طمع

یعنی "سچ"، طمع اور حرص کی وجہ سے تجھے جھوٹ دکھائی دے گا اور اس حرص و طمع کی وجہ سے اندھاپن میں اندھاپن کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔"

پھر سمجھانے لگے، عالم کے اس نظام کو سمجھو، کیا ہو رہا ہے یہاں ہر رزق کے لیے قدرت نے یہاں رزق مقرر فرمایا ہے ؎   "رزقہا را، رزقہا او میدہد"

مٹی کیچڑ بن کر گھاس کے لیے روزی بنتی ہے اور گھاس جانوروں کی روزی بنتی رہتی ہے۔ اور حیوان جب گھاس کی روزی پا کر خوب تنومند فربہ اور موٹا ہو جاتا ہے تب وہی حیوان انسان کی روزی بن جاتا ہے۔ فرمایا دیکھ رہے ہو سارے عالم میں یہی قانون عام نافذ ہے۔

"جملہ عالم آکل و ماکول داں"

(یعنی سارے عالم کو تو اس میں ہر کھانے والا خود بھی دوسرے کی غذا ہے۔ کھانیوالا کھایا جاتا ہے)

اور دوسری بات یہ سمجھو کہ روزی کا تابع کھانے والوں کا مزاج ہوتا ہے۔ مٹی کھانے والوں کو دیکھا ہوگا کہ چہرے ان کے زرد، رونق سے محروم طرح طرح کے امراض کے شکار ہیں۔ یہ غذا ہی کا اثر تو ہے۔ جو کھانے والے کے جسم پر نمایاں ہوتا ہے۔

تیسری بات غور کرنے کی یہ ہے کہ روزی کی ایک قسم جب یہاں بند ہوتی ہے۔ تو قدرت کی طرف سے دوسری روزی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ بچے کا دودھ جب ماں چھڑا دیتی ہے تو کیا بچہ بھوکا مر

جاتا ہے ؟ دودھ سے بہتر غذا قدرت کی طرف سے بچّے کے لیے مہیا ہوجاتی ہے۔ دودھ چھوٹا تو روٹی، پلاؤ، کباب اور قورمہ کی رکابیاں اس کے سامنے رکھی جاتی ہیں۔

مولینا نے فرمایا، بلکہ آگے بڑھ کر ذرا اور سوچو، ماں کے دودھ سے پہلے بچّے کو جب وہ رحمِ مادر میں ہوتا ہے کیا غذا ملتی ہے ؟ حیض کا خون ! پھر یہی خون والی روزی بھی بند ہوجاتی ہے تب وہ قورمہ اور پلاؤ، سیب و انگور، بالائی اور برفی شکر پارے اور گلاب جامن والی روزی سامنے آجاتی ہے۔

" پھر نتیجہ کچھ سمجھ میں آیا "

کاش ! طمع کا پردہ آنکھوں پر حائل نہ ہوتا۔ تو آگے بھی لوگوں کی نظر جاسکتی تھی۔ دکھانے والے اللہ کی طرف سے دکھانے والے۔ اللہ کا پیغام لانے والے کیا دکھارہے ہیں۔ کیا سنا رہے ہیں ؟ مولینا نے فرمایا مگر شکم مادر سے باہر کی دنیا کا پیغام لے کر اگر اس بچّے کے پاس کوئی پہنچے جو ماں کے رحم میں اوندھا پڑا رہتا ہے اور چاروں طرف سے گندگی اسے گھیرے اور لپیٹے رہتی ہے اور ان ہی گندگیوں نجاست کی چادر میں لپٹا ہوا ہے چارہ ناف کی راہ سے ایام کے زمانے کا خون چوستا رہتا ہے۔ اسی پر اس کی زندگی اور نشو و نما کا دار و مدار ہے اس موقع پر شکم مادر کے باہر کی دنیا کا پیغام اگر اسے دیا جائے سنانے والا سنائے کہ :-

" دیکھ جس رحم میں تو الٹ پلٹ ہو رہا ہے اس سے باہر ایک پر فضا وسیع دنیا ہے۔ مسرتوں اور لذتوں کے ساز و سامان سے پٹی ہوئی دنیا ہے۔ نت نئی نعمتوں سے لبریز ہے اس میں اونچے اونچے پہاڑ اگر ایک طرف اپنی شوکت و صولت کا نظارہ پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف فراٹے بھرنے والے دریا اور سمندر اپنے دیدہ زیب منظر سے نگاہوں کو مسرور دلوں کو نشاط و نور سے بھر دیتے ہیں۔ الغرض جدھر دیکھو ؎

" کوہ ہا و بحر ہا و دشتہا بوستانہا، باغہا و کشتہا "

کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ اوپر آسمان کا وسیع خیمہ تنا ہوا جس میں سورج اور چاند تارے جگمگاتے رہتے ہیں۔ رحم مادر سے قدم باہر نکالو تو سہی یہ سارا سماں تمہارے پیش نظر ہو جائے گا جس کے لیے تمہیں کوئی قیمت ادا نہ کرنی پڑے گی "

مولینا نے فرمایا لیکن جانتے ہو رحم مادر سے باہر کے متعلق اس " پیغام " کے پہنچانے والے

کے ساتھ پیٹ کی گہرائیوں میں پڑے ہوئے اس بچے کا برتاؤ کیا ہوگا ؟ اس کے سوا کہ پیغام پہنچانے والے کی یہ ساری باتیں اسے محض خود تراشیدہ وافسانہ معلوم ہوں، وہ اور کیا کہے گا۔ ناممکن ہے، محال ہے، یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ بس اسی کی رٹ لگاتا رہے گا۔ آخر جب تاریکی اور تنگی کے سوا کسی اور چیز کا اسے تجربہ ہی نہیں ہوا ہے تو رحم سے باہر کی دنیا کی وسعتوں اور فراخیوں کا اندازہ وہ کیسے کرے۔ مولینا نے فرمایا بس یہی حال ہے ان لوگوں کا جو اس دنیا کے رحم میں الجھے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔ پیغام دینے والے مسلسل دیتے چلے جا رہے ہیں کہ اس دنیا کے بعد بھی ایک اور عالم ہے جس کے مقابلہ میں ایک اندھے کنوئیں اور تیرہ و تار غار سے زیادہ وقعت اس دنیا کی نہیں ہے۔ مگر خون کی خرابی کا مزہ اور اس مزے کے لالچ میں اسیر ہونے والے بچے کے لیے رحم "سے باہر کچھ نہیں ہے" کا فیصلہ، صحیح فیصلہ قرار پاتا ہے۔ یہی حال ہے ان لالچیوں کا جن کی نگاہوں پر دنیا کی مسرتوں اور لذتوں کی خواہش کا پردہ پڑا ہوا ہے، اور اس دنیا سے باہر بھی دنیا ہے اس کے امکان تک کے دروازے کو ان کی عقل پر اسی خواہش کا زور بند کیے رہتا ہے۔ الحاصل ؎

طمعِ ذوقِ ایں حیات پر غرور ازحیات راستینت کرد دور

"موجودہ زندگی کی پُرفریب حرص نے "حیات راستیں (سچوں کی زندگی) کے خیال کو تجھ سے دور کر رکھا ہے"

پھر مولینا نصیحت فرمانے لگے کہ :-

"سچوں کی طرح تم بھی اس دنیا کے لالچ کی طرف سے اپنے اندر بیزاری پیدا کرو اسی کے بعد تمہارے سامنے وہ آستانہ آجائے گا جس پر سر رکھنے کے ساتھ ہی پستی بلندی سے بدل جاتی ہے۔"

کہنے لگے :-

"میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ اس آستانے پر پہنچنے کے ساتھ ہی پہلا اثر اپنے اندر پاؤ گے کہ خوشی و غم کی جھنجھٹوں سے تم اپنے کو پاؤ گے کہ چھوٹ گئے، تب تمہاری جان کی آنکھ روشن ہو جائے گی اور (جو اب تک باطل بیں تھی) حق بیں بن جائے گی۔ تمہارے اندر صرف دین ہی کا نور چمک اٹھے گا جس میں کفر کی سیاہی کا کوئی ریشہ نہ ہوگا"

فرما رہے تھے کہ تم امن وامان چاہتے ہو، ڈر اور خوف سے چاہتے ہو کہ نجات مل جائے، تو پھر

"پند پیراں را پذیرا شو بجاں"

یہ "پیراں" وہی لوگ ہیں جو اس دُنیا کے رحم میں لوٹنے والوں کے پاس اس سے بھی زیادہ وسیع عالم کے نظام کا پیغام پہنچاتے رہے ہیں کہ اس سراپا انتشار اور صرف اضطراب والی دنیا کے مقابلہ میں ایک عالم بھی ہے۔ جہاں صرف سکون ہے۔ اضطراب نہیں ہے۔ جہاں صرف آسودگی ہے بے اطمینانی نہیں

ایں جہان و ساکنانش منتشر
و آں جہاں و ساکنانش مستمر

(دفتر سوم) ________

نعت

عرضِ اَحسن

(باستانۂ نبوّتِ کبریٰ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)

ہر ایک سے ٹکرا کر ہر شغل سے گھبرا کر ہر فعل سے شرما کر ہر کام سے پچھتا کر
آمد بدرت بنگر

اے خاتمِ پیغمبر یا قاسم الکوثر اے سرورِ ہر سرور اے رہبرِ ہر رہبر
اے آں کہ توئی افسر ہر کہتر و ہر مہتر فی المبداء و المحشر اے ہستیِ تو محور
للاکبر و الاصغر اے طلعتِ تو مظہر للاوّل و الآخر اے رحمِ جہاں پرور
آقائے کرم گستر آمد بدرت بنگر

امروز چہ مہانے ناکارہ و نادانے آلودۂ عصیانے آغشتہ دامانے
بازیچۂ شیطانے از کردہ پشیمانے
آمد بدرت بنگر نے مونس و نے یاور

نے ساز نہ سامانے نے علم نہ عرفانے نے دین نہ ایمانے نے فضل نہ احسانے
از خانہ ویرانے وز کلبۂ احزانے وز محبس و زندانے ناشکری و کفرانے
آمد بدرت بنگر کالحائر و المضطر
با چاک گریبانے با سینۂ بریانے با دیدۂ گریانے با اشک فراوانے
با نالہ و افغانے با شورشِ پنہانے با دانشِ حیرانے با عقلِ پریشانے

لہ یہ نعت حضرت گیلانی کی شخصیت کے گوناگوں مناظر کا آئینہ ہے، وفورِ عشقِ نبویؐ، کمالِ علمی، جمالِ عرفانی
غلبۂ جذب، آزادیِ رسوم، سوزِ ملتِ بیضا اور جوشِ کفر شکنی وغیرہ۔

درصورت عطشانے درگریۂ درمانے خواہد ز تو فرمانے پروانۂ غفرانے

آمد بدرت بنگر البائس والمعتر

شاہا تو بہ من منگر بر رحمت خود بنگر انصاف تو کن آخر غیر از تو مرا دیگر

من ناظر والناصر والشافع و مستغفر

تو جوشش رحمانی تو سایۂ یزدانی تو شاہد ربانی تو جلوۂ سبحانی

تو مرکز اعیانی تو جوہر فراوانی تو مبدءِ اکوانی تو مقصد امکانی

تو مرجع و پایانی تو جانی و جانانی ہم روحی و روحانی تو زبدۂ انسانی

تو نیر فارانی تو درۂ عدنانی

تو مہبط قرآنی

تو خاتم ادیانی ہاں دینی و ایمانی

اے آنکہ تو درمانی ہر رنج و پریشانی بنگر کہ مسلمانی تورانی و ایرانی

ہم ہندوئی و افغانی ہم مصری و سوڈانی از نزغۂ شیطانی وز جذبۂ حیوانی

وز دانش نفسانی وز شورش عمرانی یونانی و رومانی افرنجی و برطانی

درسکرت و ہیمانی در لطمۂ نادانی

در ورطۂ ظلمانی

در فتنہ و طغیانی فِی البَغیِ وَعَدوانی

ہاں دست دعا بکشا از ذروۂ اَو اَدنیٰ وز قبۂ مَا اَوحیٰ اے مرضی تو ترضیٰ

اے ملت تو بیضاء وَاللَّیلُ لَقَد یَغشیٰ والکفر قَدِ استَعلیٰ ذَا اُمَّتِکَ الضُّعفیٰ

فِی سَیطَرَةِ الاَعداء ہاں سَہمک لَا یُطفیٰ

در میتک لا یخفیٰ

وَاللہُ ھُوَ الاَعلیٰ والحقُّ فَلَا یُعلیٰ

تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں؟

بارگاہِ رسالت میں التجا و التماس

ہر ہر عضو گرا ہوا تھا، چلنا پھرنا تو دور کی بات ہے، قسم ہے اس خدائے زندہ و توانا کی، جو مردوں سے زندوں کو اور زندوں کو مردوں سے نکالتا ہے کہ ایک سیکنڈ دو سیکنڈ کے لیے بھی بیٹھنے کی آرزو جس سیاہ بخت کے لیے مہینوں سے صرف آرزو بنی ہوئی تھی ابخت کی بیداری کے بعد دیکھا جا رہا تھا، کہ اب وہ اٹھ رہا ہے، اٹھتا چلا جا رہا ہے، جس کی موت کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ وہ دوبارہ گویا زندوں میں پھر شریک کر دیا گیا۔ ہسپتال والوں نے چند ہی دنوں بعد حکم دے دیا کہ اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ پھر آگے کیا قصے پیش آئے ان کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ شعور اور احساس میں ایک خیال کے سوا دوسرا خیال یا ایک جذبہ کے سوا دوسرا کوئی جذبہ باقی نہ رہا تھا۔ اس زمانے میں بہار میں تھا۔ بہار کی دیسی آبادی جو دیہاتوں میں رہتی ہے ایک خاص قسم کی زبان بولتی ہے اس زبان میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن التجا و التماس کے لیے اس کا پیرایہ حد سے زیادہ موزوں و مناسب ہے، بے ساختہ اسی زبان میں کچھ مصرعے ابلنے لگے اسن کر تو اردو زبان کے سمجھنے والے بھی اس کو شاید سمجھ سکتے ہیں لیکن اردو زبان کے املائے حدود میں مگدھی یا بہاری زبان مروجہ کے ان الفاظ کو لانا دشوار ہے۔ کتابی شکل میں صحیح طور پر جیسا کہ چاہیے شاید وہ سمجھے بھی نہیں جا سکتے لیکن عرض چونکہ اسی زبان میں کیا گیا تھا بجنسہٖ ان ہی الفاظ کو (نیچے) نقل کر دیتا ہوں ـــــ "درشن" کی آرزو اس عجیب و غریب اضطراری نظم کی روح تھی، بہار کے نائب امیر شریعت مولینا سجاد مرحوم اگرچہ بظاہر فقیہ النفس والصورت تھے۔ مگر ذاتی تجربہ کے بعد یہ

ماننا پڑتا تھا کہ باطن ان کا فقیہ سے زیادہ فقیر تھا۔ قرابت کے تعلقات کی وجہ سے گیلانی بھی کبھی تشریف لاتے تھے اسی زمانہ میں اتفاقاً ان کی تشریف آوری ہوئی، اس نظم کے سننے کا موقعہ ان کو بھی ملا، سنتے جاتے تھے، اور روتے جاتے تھے، خصوصیت کے ساتھ اس بند پر تڑپ تڑپ گئے، ہچکیاں ان کی بندھ گئیں، یعنی دوسرا بند

تمری دوار یا کیسے چھوڑوں　　　تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں

تمری گلی کی دھول بٹوروں　　　تم رے نگر میں دم بھی توڑدوں

جی کا اب ارمان یہی ہے

اٹھوں پھر اب دھیان یہی ہے

"تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں" اس استفہامی مصرعہ کو بار بار دھراتے اور بیقرار ہو ہو کر بلبلاتے، اور ہے بھی یہ سوال کچھ اس قسم کا، آج انسانیت زمین کے اس خاکی کرّے پر تڑپ رہی ہے۔ زندگی کا مطلب کیا ہے ؟ اس سوال کو حل کرنا چاہتی ہے۔ ایک اس سوال کے جواب کی صحیح توقع کی جائے ؟ اس تنہا واحد آستانے سے لوٹنے والا خود سوچے کہ کہاں جائے گا۔ کن کے پاس جائے گا۔ موسٰی ہوں یا عیسٰی، ابراہیم ہوں، یا یعقوب علیہم السلام یا ان کے سوا کوئی اور اس راہ کے ان سب راہبروں نے اپنے اپنے وقتوں میں جو راہ پیش کی تھی جب وہ ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں، تاریخ جانتی ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو ان بزرگوں کی بتائی ہوئی راہ نہیں مل سکتی، تو اب دنیا کہاں جائے۔ اور اس کے سوا کہ سے جلوہ ات تعبیر خواب زندگی (اقبال) کا فیصلہ کرتے ہوئے "تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں" کہتا ہوا اسی چوکھٹ کے ساتھ چمٹ جائے، جس کے سوا تنہات والوں کو غیب تک پہنچنے اور پہنچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہیں ہے

(مناظر احسن گیلانی)

پیارے محمدؐ جگ کے سجن　　　تم پر واروں تن من دھن

تمری صورتیا من موہن　　　کبھیو کراہو[1] تو درشن

---

[1] کبھی کرا دیجیے

جیا کنھڑے دلوا[1] ترسے
کرپا کے بدرا[2] کہیا[3] برسے

تمری دواریا کیسے چھوڑوں | تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں | تمرے نگر میں دم بھی توڑوں

جی کا اب ارمان یہی ہے
اٹھوں پھر اب دھیان یہی ہے

صلی اللہ علیک نبیا | تمرے دوارے آیا دکھیا
بھنیا[4] اکی پکڑھو راجا | اپنے حسین و حسن کا صدقا

ڈھوا[5] گھریں ناؤ کو اس کے
اب نہیں ہم ہیں اپنے بس کے

سیس پہ اکے پاؤں[6] دھرہو | پیت کی اگیا من میں بھر ہو
بھدر[7] رہوا پہ تنک[8] کرپا[9] کرہو[10] | سیتو میں الیس[11] کر گجرھو[12]

راجا تمری دیوڑھی بڑی ہے
رحمت تمرے نام پڑی ہے

اندھرا[13] کے تم رہیا بتا[14] ہو | ہردے[15] کا اکے جوت جگا ہو
ڈگری[16] پہ اپنے اکو چلا ہو | بودھا[17] کے تم بُدھی[18] بنا ہو

کھینچو اکو پاپ نرکھ سے
دھو دیہو کالیکھ[19] منہ کا اکے

تمرے پیا کی اونچی اٹریا | ہمری نے ہی واں پہ گجریا

---

[1] کڑھتا ہے دل [2] بادل [3] کب [4] بازو [5] موجِ عظیم [6] پاؤں [7] حد درجہ بدبخت [8] ذرا [9] مہربانی [10] کیجیے [11] ایسا [12] گرگزر یئے [13] قوی باطنی [14] راستہ [15] بیوقوف کو [16] دانش مند بنا دیجیے [17] سیاہی [18] بھٹک مجتک [19] نظر

تبلا[1] تبلا رہی نخبر[2] یا پکھلی[3] ہے اک تمری دواریا

ان کھر پتوا[4] تمرے سے چلی ہے

کھوجوا[5] بھی اُن کا تمرے سے ملی ہے

پی کی پتیاں[6] تم ہی سے لہو ان کھر تبیاں[7] تم ہی سنی لہو

ہمنی کے نندیا سے تم جگے لہو[8] مرل تھلبئی تم ہی جلے[9] لہو

ڈھرمی[10] بھے لوں تم ری دیا[11] سے

مکتی[12] بھی ہوا ای ہی تمری دوُوا[13] سے

---

[1] دیکھی ہوئی ہے [2] ان کا [3] پتہ [4] سراغ [5] خط [6] باتیں [7] جگایا [8] مرے ہوئے تھے [9] مومن ہوئے [10] مہربانی سے [11] نجات بھی ہوئی [12] آپ کی دعا سے [13] جلایا۔

ضمیمہ

(۱)

شیخ اکبرؒ کا اجمالی تعارف

محمد بن علی ابن عربی، اسم گرامی اور محی الدین آپ کا لقب تھا، اور عام طور پر شیخ اکبر کے لقب سے معروف ہیں، سلسلۂ نسب آپ کا حاتم طائی تک پہنچتا ہے۔ ۱۷ رمضان المبارک ۵۶۰ھ (۱۱۶۵ء) کو پیر کی شب آپ کی ولادت بمقام اندلس ایک علمی گھرانے میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمانوں کی سیاسی قوت اندلس میں آخری سانس لے رہی تھی۔

آپ علوم ظاہری و باطنی کی اعلیٰ جامعیت کے حامل اور مسلک وحدۃ الوجود کے پیشوا ہیں۔ آپ کی نسبت باطنی شیخ ابوالحسن علی بن عبداللہ بن جامعؒ موصلی سے حاصل ہے جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے فیض یافتہ ہیں شیخ اکبرؒ کو ۶۰۱ھ میں خلافتِ باطنی بمقام موصل عطا ہوئی۔

شیخ نے پہلا حج ۵۹۸ھ میں کیا اور اسی سال فتوحات مکیہ کی تالیف شروع فرمائی جو ۶۳۵ھ میں ختم ہوئی۔

شیخ کے بعض معاصر علماء اور صوفیہ نے شیخ پر سخت نکتہ چینی کی ہے لیکن ان ہی کے مقابل بعض نہایت جلیل القدر ہستیوں نے آپ کے متبع سنت اور عارف محقق ہونے کی شہادت دی ہے۔ مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ نے بعد ملاقات فرمایا کہ وہ (شیخ اکبر) تو حقائق کا سمندر ہیں۔ اصل یہ ہے کہ شیخ نے جن اسرار و رموز کو کھولا ہے وہ اس قدر باریک و نازک ہیں کہ عام علماء اور صوفیہ کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ بھی نہیں ہے کہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے غلبۂ حال میں یہ معارف بیان فرما دیئے ہوں بلکہ جیسا کہ خود شیخ کا بیان ہے وہ اس اظہار پر مامور تھے۔ نہ ظاہر کرتے تو جلا دیئے جاتے۔

شیخ کی ذات کثیر الکرامت تھی حسی و معنوی بے حد کرامات آپ سے ظاہر ہوئی ہیں۔

کثرتِ تصانیف میں شیخ کا مقام ابن سینا اور غزالی پر بھی فائق ہے۔ ۶۳۲ھ میں خود شیخ نے کسی ضرورت سے اپنے کتب و رسائل کی تعداد شمار کی تھی تو وہ (۲۷۹) تھی اس کے بعد بھی آپ نے چھ برس حیات پائی۔ مولانا جامیؒ کا خیال ہے کہ آپ کی تصانیف کی تعداد پانچ سو سے متجاوز ہے۔ پھر اس تعداد میں ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جو کئی کئی جلدوں میں ہیں، مثلاً شیخ کی تفسیر کلام پاک (۹۵) جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔

شیخ کی بیشتر کتابوں کا موضوع عرفان و احسان ہی ہے۔ سب سے مشہور کتابیں فصوص الحکم اور الفتوحات المکیہ ہیں۔ ان میں فصوص "اعظم مولفاتِ ابن عربی" شمار کی جاتی ہے۔ خواجہ برہان الدین ابو نصر پارساؒ کا قول ہے کہ "فصوص جان ہے اور فتوحات دل" حقیقت یہ ہے کہ ان کتابوں کو ضبط فرما کر شیخ نے عرفاء اور اعلیٰ سالکین پر احسانِ عظیم فرمایا۔

۲۲ یا ۲۸ ربیع الثانی ۶۳۸ھ (۱۱۶۲ء یا ۱۱۶۳ء) کو اس عظیم المرتبت عارف ربانی نے بمقام دمشق رحلت فرمائی اور موضع صالحیہ میں اس کے جسم خاکی کو پیوند خاک کر دیا گیا۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

(غ۔م)

(۲)

شیخ رومیؒ کا مختصر تعارف

نام نامی محمد، لقب گرامی جلال الدین، مشہور مولانا روم کے لقب سے ہیں آپ کا ددھیال صدیقی اور ننھیال علوی ہے۔ ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ کو بمقام بلخ (خراسان) آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ شیخ اکبر قدس سرہٗ کے معاصر ہیں۔

مولینا کو متداول علوم عقلی و نقلی میں کامل دستگاہ حاصل تھی، سلطان روم علاؤالدین کیقباد کی درخواست پر آپ ۶۲۶ھ میں قونیہ (ترکی) تشریف لائے یہاں آپ کی بڑی عزت و منزلت تھی، ۶۴۲ھ تک مولانا نے عالمانہ شان کی زندگی بسر فرمائی۔ درس تدریس کے علاوہ وعظ اور اس

سے بڑھ کر مثنوی نویسی آپ کا خاص شغل تھا۔ لیکن اسی سنہ میں آپ کی ملاقات محمد بن علی بن ملک داد المعروف بہ شمس تبریز قدس سرہٗ سے ہوئی۔ شکوہِ علمی نے فقر کے آگے سپر ڈال دی، مولینا، شمس کے دست گرفتہ اور مرید ہو گئے اس ارادت سے حالت دفعتہً بدلی، بقول علامہ شبلی مرحوم :-

"مولینا جب تک تصوف کے دائرے میں نہیں آئے آپ کی زندگی عالمانہ جاہ وجلال کی اک شان رکھتی تھی ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء اور طلبہ بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا۔ سلاطین و امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی کہ درس و تدریس، افتا وافادہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا لیکن وہ پچھلی زندگی کی محض ایک یادگار تھی ورنہ زیادہ تر محبت و معرفت کے نشہ میں سرشار رہتے تھے۔"

اب مولانا علامہ عصر کے بجائے شیخ وقت اور عارف یگانہ کی حیثیت اختیار کر گئے اور اہل قال کے بجائے اب طالبانِ معرفت کا رجوع آپ کی طرف بڑھ گیا۔

۶۳۸ھ میں جب شیخ اکبر نے وفات پائی تو ان کے اطراف جو حلقۂ اربابِ عشق و معرفت کا جمع تھا اس نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے مولینا کی صحبت اختیار کی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ اکبرؒ اور مولانا رومؒ توحید اور اسرارِ باطنی میں ایک ہی مذاق کے حامل ہیں۔ بحر العلوم مولانا عبد العلیؒ کی شرح مثنوی سے جس میں مولانا کے اشعار کی وضاحت میں جابجا شیخ اکبرؒ کے اقوال لائے گئے ہیں، ان دونوں بزرگوں کے متحد الذوق ہونے کا کھلا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت شمسؒ کے انتقال کے بعد مولینا نے اپنے پیر بھائی اور طالب حسام الدین چلپی کی تحریک پر وہ مثنوی تحریر فرمائی جو مثنوی معنوی کے نام سے مشہور اور اربابِ تصوف کا ایک مستند صحیفہ ہے!

مثنوی نے عقلیت اور ظاہر پرستی کے پرخچے اڑا دیئے اور ہر زہر کا تریاق عشق الٰہی کے جذبہ کو قرار دیا۔ فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

چونکہ مثنوی کی بنیاد ایک لازوال حقیقت (عشق الٰہی) پر ہے اس لیے اس نے خود مثنوی کو بھی ایک لافانی کتاب بنا دیا ہے، اور آج بھی تشنگانِ عشق و معرفت اس سے اسی طرح سیراب ہیں

جیسے اُس کے ابتدائی صدیوں میں تھے!

اڑسٹھ ۶۸ برس تین ماہ کی عمر پاکر یہ آفتاب معرفت ۵ جمادی الثانی ۶۷۲ھ کو غروب آفتاب کے وقت ہمیشہ کے لیے اس عالم فانی سے روپوش ہوگیا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ مولینا کا مزار آج بھی قونیہ میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔!

(غ ۔ م)

(ننگ اسلاف کاتب: محمد حفیظ قریشی دھیدوالی ضلع سیالکوٹ)